بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

ترجمہ: اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

معالم العرفان
فی
دروس القرآن

افادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ

خطیب جامع مسجد نور

بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

مرتب

الحاج لعل دین ایم اے [علوم اسلامیہ]

ناشر

مکتبہ دروس القرآن

فاروق گنج ○ گوجرانوالہ

روزانہ درسِ قرآن پاک

تفسیر

سورۃ الاعراف

(مکمل)

جلد (۸)

افادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی دامت مجدہم

خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

بیسواں ایڈیشن

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ الاعراف مکمل) جلد ۸

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب .... الحاج لعل دین ۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمہ اللہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری، گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت .... 270 روپے (دو سو ستر روپے)

طبع بیسواں ایڈیشن .... اکتوبر 2013ء

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ
(۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور
(۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور
(۴) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور
(۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
(۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
(۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی
(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا گاگی، ایبٹ آباد
(۹) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
(۱۰) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور
(۱۱) کتب خانہ صفدریہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

سورۃ الاعراف مکمل

فہرست مضامین معالم العرفان فی دروس القرآن جلد ۸

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ (۷: ۴۶)

اس سورۃ کا نام سورۃ الاعراف اس کی آیت ۴۶ اور ۴۸ میں آمدہ لفظ اعراف کے نام پر ہے۔ اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان ایک اونچی جگہ کا نام ہے حساب کتاب کے بعد کچھ لوگ جنت میں چلے جائیں گے، کچھ دوزخ میں اور بعض لوگ اعراف کے مقام پر ہوں گے جہاں سے وہ جنت والوں اور دوزخ والوں دونوں گروہوں کا نظارہ کر سکیں گے۔ اس سورۃ مبارکہ میں اعراف اور اصحاب اعراف کا ذکر ہے اور اُن کا آپس میں مکالمہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اسی نسبت سے اسے سورۃ الاعراف کا نام دیا گیا ہے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کا زمانہ نزول مکی زندگی کا آخری دور ہے یہ وہ زمانہ ہے جب مکی زندگی میں نبوت کے بارہ سال گزر چکے تھے قریش کی طرف سے دین کی شدید اور مسلسل مزاحمت ہو رہی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے جس کی وجہ سے بعض اہل ایمان حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کا انتقال ہو چکا تھا اور حضور علیہ السلام دنیوی سہارے کے بغیر تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ آپ کو طائف والوں سے بھی مایوسی ہو چکی تھی۔ آپ حج کے موقع پر مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت دیتے مگر کوئی سننے کے لیے تیار نہ ہوتا ادھر آپ پریشانی کے عالم میں تھے اور

اُدھر قریش آپ کے قتل کے منصوبے بنا رہے تھے۔
اِن ناسازگار حالات میں اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلی دی کہ آپ دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ قوم کو اُن کے عبرتناک انجام سے ڈرائیں۔ اُنہیں یاد دلائیں کہ اُن سے پہلے بھی کتنی ہی قومیں اپنے پیغمبروں کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انسان کی پیدائش کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور اس ضمن میں آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ابلیس کی مخالفت کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے درمیان انسان کو گمراہ کرنے کے متعلق طویل مکالمہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو یاد دلایا ہے کہ ابلیس نے اُن کے جدِ امجد کو جنت سے نکلوا دیا تھا، لہٰذا وہ اس کے ہر حربے سے بچنے کی کوشش کریں۔ ضمناً اللہ تعالیٰ نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کو سخت وعید اور اہلِ ایمان کو جنت کی خوشخبری بھی سنائی ہے۔ اہلِ اعراف اور اُن کے جنتیوں اور دوزخیوں کے ساتھ مکالمے کا ذکر ہے۔ دوزخیوں کا جنتیوں سے پانی کے سوال کا ذکر بھی ہے جس کے جواب میں جنتیوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم والوں پر یہ چیزیں حرام کر دی ہیں۔

اس سورۃ کا ایک اہم موضوع تاریخ رسالت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیاء حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، اور حضرت موسیٰ علیہم السلام اور اُن کی قوموں کا ذکر کیا ہے۔ اِن انبیاء کی دعوت اور قوموں کے جوابات کا تفصیل سے ذکر کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ دیکھو ان لوگوں نے اپنے انبیاء کی کس طرح مخالفت کی اور پھر وہ کس کس عذاب میں مبتلا کئے۔ اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام واقعات نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی فرمائشیں پوری ہونے کے باوجود اُن کی نافرمانیوں کا تفصیلاً تذکرہ کیا گیا ہے، حتیٰ کہ ہفتہ کے دن حیلے بہانے سے مچھلیاں پکڑنے کی

پاداش میں انہیں بندر اور خنزیر کی شکلوں میں تبدیل کر کے صفحۂ ہستی سے نابید کر دیا گیا۔
اس سورۃ مبارکہ میں توحید باری تعالیٰ اور شرک کی تردید کو بھی خاص طور پر موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کی ابتداء عہد الست سے کی ہے اور لوگوں کو یاد دلایا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت کا اقرار عالم ارواح میں کر چکے ہو۔ اس دنیا میں آکر اس عہد کو فراموش نہ کر دینا ورنہ قیامت کے دن تمہارا کوئی عذر نہیں سنا جائیگا۔ اسی موضوع کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ کا ذکر بھی آگیا ہے اور انہی اچھے ناموں سے پکارنے کی تلقین کی گئی ہے۔ آداب ذکر الٰہی کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کو اپنے دل میں زاری، خوف اور چپکے چپکے پکارنے کی وصیت کی گئی ہے اس سلسلے میں تعدی اور غفلت سے منع فرمایا گیا ہے۔ شرک کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ بچے کی پیدائش سے پہلے اللہ سے دعائیں کرتے ہیں کہ اگر اس نے صالح بچہ عطا کیا تو اس کا شکر بجا لائیں گے، مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔ حضور علیہ السلام سے متعلق عقیدے کی درستگی کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ آپ کے علم غیب کی واضح الفاظ میں نفی کی گئی ہے اور آپ سے کہلوایا گیا ہے کہ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو بہت سی بھلائی اکٹھی کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی مگر فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں معاد کا ذکر بھی آگیا ہے۔ وقوع قیامت کے متعلق سوال کے جواب میں حضور علیہ السلام سے کہلوایا گیا ہے کہ اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، البتہ قیامت جب بھی آئے گی، اچانک ہی آجائے گی، لہٰذا اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے
اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سلسلہ دروس القرآن کی یہ آٹھویں جلد پیش خدمت ہے سورۃ البقرہ نو جلدوں میں پیش کی گئی تھی، اس کے بعد ہر جلد مکمل سورۃ پر مشتمل تھی آگے سورتوں کی طوالت کم ہو گئی ہے لہٰذا امید ہے کہ آئندہ جلد دو مکمل سورتوں انفال اور توبہ پر مشتمل ہوگی۔ مکتبہ دروس القرآن کی پوری ٹیم کی مخلصانہ مساعی، قارئین کی دعوات اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و اعانت سے اس منصوبے پر کام جاری ہے۔ دعا کریں

کہ اللہ تعالیٰ اسے[1] پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

احقر العباد

(الحاج) لعل دین ایم اے

(علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن - لاہور

---

[1] تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن بیس ضخیم جلدوں میں مکمل شائع ہو گئی ہے۔ (فیاض)

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ
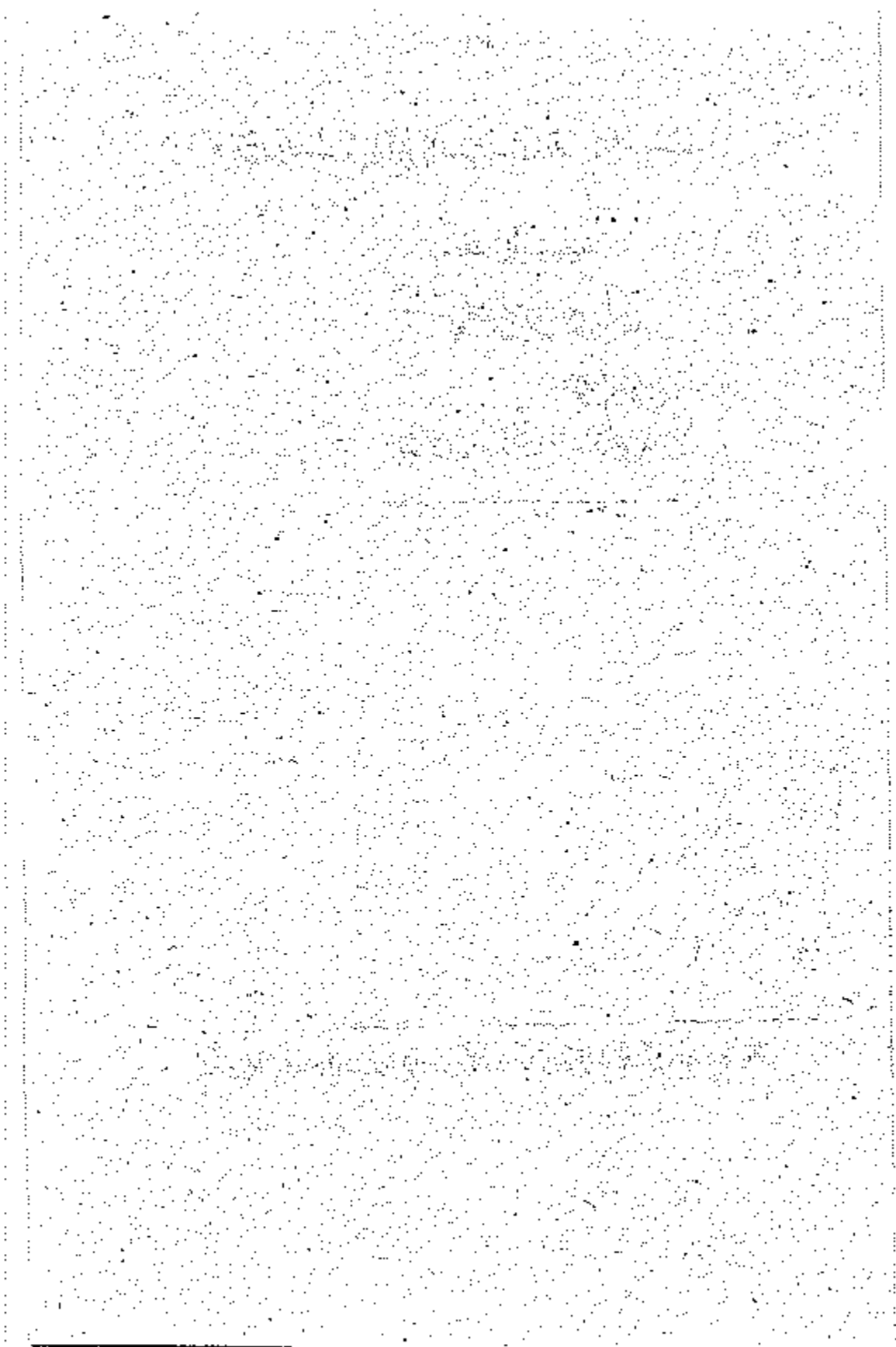
سخنہائے گفتنی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ خَاتَمِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۔۔ اَمَّا بَعْدُ

آج سے کچھ عرصہ قبل مسلمان نوجوانوں نے صلیبی درندوں کی افواج میں بھرتی ہو کر اُن کی ہمنوائی میں اپنے ہی بھائیوں کے سینے مشین گنوں، رائفلوں اور توپوں سے چھلنی کیے انہیں لوٹا اور اُن کے گھر بار برباد کیے، بچوں عورتوں کو گرفتار کیا مقامات مقدسہ کی بیحرمتی کی، بیت اللہ پر گولیاں چلائیں مسلمانوں کی رہی سہی طاقت خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے میں کفار کا ساتھ دیا۔ اس دور کو ہم غلامی کے بدترین اور سیاہ دور سے یاد کرتے ہیں جب کہ مسلمانوں نے چودہ پندرہ روپے کی ماہوار ملازمت پر بھرتی ہو کر یہ سیاہ ترین کارنامے انجام دیے

آج جبکہ ہم ہر سال بڑے دھوم دھام سے جشن آزادی مناتے ہیں۔ اور اپنی آزادی کا چالیس سال سے زیادہ عرصہ گزار چکے ہیں۔ تھوڑا سا غور کرنے پر خوب واضح ہو جائیگا کہ نہ ہم آزاد ہیں اور نہ ہی آزادی کی کوئی رمق ہم میں موجود ہے، اور یہ غلامی ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ یہ اس غلامی کے منحوس اثرات ہی ہیں کہ جتنی مقدار میں ہم ہر سال اپنے ہی بھائیوں کو ذبح کرتے ہیں۔ ان کی عزت و آبرو کو پامال کرتے ہیں، مال و اسباب لوٹتے اور ان کی جائیدادوں پر ناجائز قبضہ کرتے ہیں اتنی مقدار میں شاید اغیار بھی نہ کرتے ہوں، رشوت، ناجائز سفارش، ہر محکمہ اور کام میں جعل سازی

کم ہمتی، کام چوری، دھوکہ، فریب اور جھوٹ، شرم و حیا کی تمام حدیں پھلانگ چکا ہے۔ نہ ہم قانون کی بنیاد اسلامی طریقہ پر رکھ سکے نہ معیشت کو اسلامی خطوط پر استوار کر سکے، نہ اسلام کے اخلاقی مقام کو اپنا سکے اور نہ ہی غیر اسلامی تعلیم کو بدل سکے، لاقانونیت ہمارا قانون، دھوکہ فراڈ اور لوٹ کھسوٹ ہماری معیشت اور بے حیائی ہماری ثقافت بن چکی ہے۔ ہمارا تمام فرائض سے اہم اور پہلا فرض یہ تھا کہ تمام نظاموں کو پاؤں تلے روندتے، وارثان انبیاء نظام خلافت کے طور طریقوں اور قوانین کی تعلیم عام کرنے کے ساتھ ساتھ رجال تیار کرتے اور پھر مسلمانوں کا ہر طبقہ مل کر نظام خلافت قائم کرتا جس کا مقصد تھا اور تمام مسلمان ممالک سے یہودیوں اور صلیبیوں کے اثرات کو ختم کر دیتے۔ لیکن افسوس کہ منحوس غلامی نے ہماری سوچوں کو محدود، مقاصد کو گھٹیا، دماغوں کو خشک، ارادوں کو کمزور اور ہمتوں کو پست کر کے، ناز و نعمت کے کرشموں اور نفسانی خواہشات کے مضبوط پھندوں میں بری طرح جکڑ دیا ہے یا پھر بھوک و افلاس کے خوفناک شکنجے میں کس دیا۔

ان دروس میں جہاں قارئین کرام کو عام فہم زبان میں قرآنی و اسرار و رموز تفسیری نکات فقہی مسائل، اسلامی عقائد، نظام اسلام کی توضیح اور غیر اسلامی نظاموں اور فرقہائے باطلہ کا مکمل رد ملیگا۔ وہاں یہ درس غلامی کی چادر اوڑھے گہری نیند سوئی ہوئی مسلمان قوم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے نظر آئیں گے

زیر نظر جلد کے درس ۲۱ میں استاذی المحترم حضرت صوفی صاحب مدظلہ مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں "مسلمانوں کا پہلا ساڑھے چھ سو سال کا دور آزادی کا دور تھا۔ انہیں دنیا میں عروج حاصل تھا، آزادی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مگر تاتاریوں کے حملے کے بعد مسلمانوں پر زوال آیا اور ان پر جزوی غلامی کا دور شروع ہوا، اس وقت یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلمان غلام بھی ہو سکتا ہے، علمائے وقت کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ کہ مسلمانوں کی اجتماعیت

کر کیسے برقرار رکھا جائے انگریز غلامی کے سائے گہرے ہوتے گئے اور بلآخر
آخر میں انگریزوں کا زمانہ آیا جس میں انہوں نے مسلمانوں کو اخلاقی اور اقتصادی غلامی
میں مبتلا کر دیا۔ مسلمانوں سے ان کی تعلیم ختم کر کے اپنی تعلیم رائج کی جس کا نتیجہ یہ
ہوا کہ مسلمان ذہنی غلامی میں پھنس گئے۔ وہ اپنی سوچ اور فکر سے بھی محروم ہو گئے
اور ان کی فکر کا واحد معیار انگریزی تعلیم رہ گئی۔ آج بھی تمام مشرقی ممالک ذہنی
طور پہ انگریز کے غلام ہیں۔"

تھوڑا سا آگے چل کر حضرت فرماتے ہیں۔

"اقتصادی غلامی بھی بہت بڑی لعنت ہے جس کے سامنے مسلمان بے بس
ہیں، ان کی ذہنی غلامی نے انہیں اس حد تک پست کر دیا ہے کہ کوئی باعزت
کام کر ہی نہیں سکتے۔ آزاد اقوام کی شایان شان یہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی
میں مہارت حاصل کریں۔ صنعت و حرفت میں ترقی کریں اور دوسروں کے
دست نگر بننے کے بجائے اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔"

اسی درس میں ایک اور جگہ حضرت فرماتے ہیں۔

"غلامی میں رہ کر انسان پست اور گھٹیا کام کرنے کا عادی ہو جاتا ہے،
فتنہ فساد، کھیل تماشے، عیاشی اور فحاشی اس کے محبوب مشغلے ہوتے ہیں،
اپنوں سے دشمنی اور اغیار سے دوستی اس کا معمول بن جاتا ہے۔"

علاوہ ازیں زیر نظر جلد تفسیر سورۃ اعراف میں توحید، رسالت، صداقت قرآن
ایمانیات، اخلاقیات، قیامت کے علاوہ معاشرتی مسائل۔ حلت و حرمت
کا قانون، عبادات اور فاتحہ خلف الامام جیسے مضامین بھی کافی عمدہ طریقہ پر آگئے
ہیں۔ سورۃ اعراف میں چونکہ قصص کا کافی حصہ ہے تو قصص و واقعات کو
بڑے اچھے پیرایہ میں مربوط طور پہ یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ جو کہ مختلف جگہوں
اور کتب سے مستغنی کر دیتا ہے۔ واقعات کے ضمن میں بہت سے مسائل
سلوک و تصوف اور عروج و زوال کے بہت سے اسباب کا ذکر بھی ہو گیا ہے

اس جلد میں گذشتہ جلدوں کی نسبت روانی بہت زیادہ ہے، اور گذشتہ جلدوں کی طرح اس میں بھی فلسفہ ولی اللّٰہی کی گہری چھاپ خوب نمایاں ہے۔ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دروس عصر حاضر میں قرآن و سنت، اسلاف صالحین کے مزاج کے مطابق قرآن پاک کی ایک عمدہ تفسیر اور وقت کی ایک اہم ضرورت ہے

آخر میں الٰہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب مدظلہ، انجمن محبانِ اشاعتِ قرآن کے جملہ اراکین و معاونین اور اس کی اشاعت میں حصہ لینے والے دیگر تمام حضرات کی فوز و فلاح اور بخشش کا ذریعہ بنائے اور ان کی سعی جمیل قبول فرمائے اور قیامت تک زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

فقط

محمد اشرف

فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم، وفاق المدارس العربیہ پاکستان

۷ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۵ دسمبر ۱۹۹۰ء
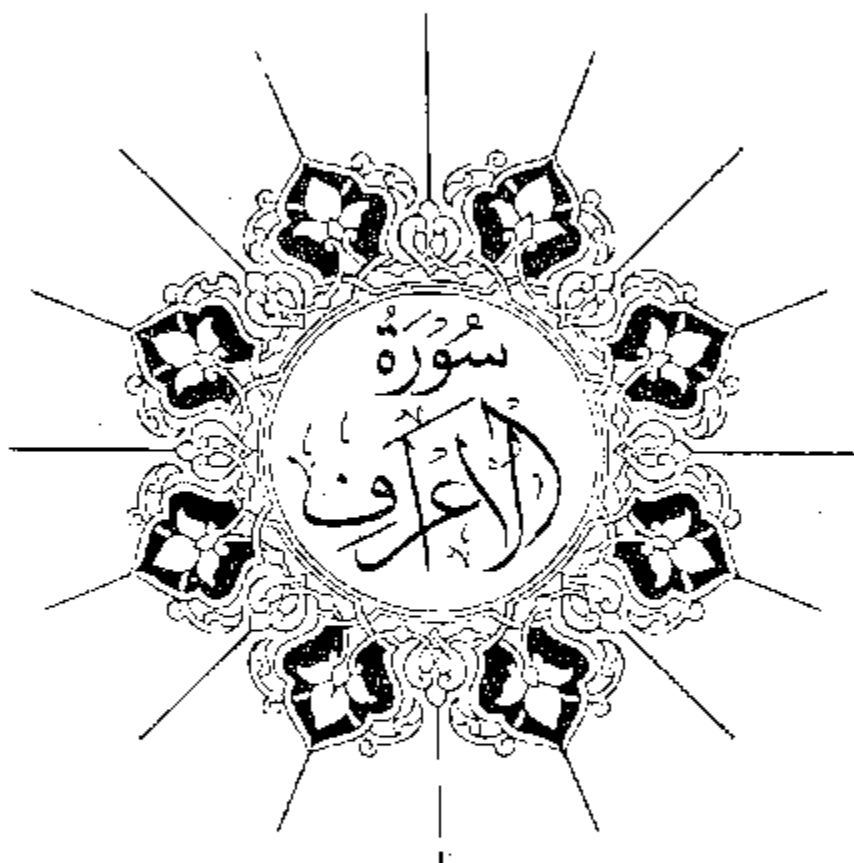
سُورَةُ
الأعراف

سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَسِتُّ اٰيَاتٍ وَّاَرْبَعٌ وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

سورۃ اعراف مکی ہے اور یہ دو سو چھ آیات اور اس میں چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسْــَٔـلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْــَٔـلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾

ترجمہ :- الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ یہ ایک کتاب ہے ۔ اتاری گئی ہے آپ کی طرف ۔ پس نہ ہو آپ کے سینے میں تنگی اس سے تاکہ آپ ڈرائیں اس کے ساتھ اور نصیحت ہو یہ ایمان والوں کے لیے ﴿۲﴾ (اے لوگو!) اتباع کرو اس کی جو اتاری گئی ہے تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے اور نہ

اتباع کرو اس کے سوا دوسرے رفیقوں کی تم بہت کم نصیحت
حاصل کرتے ہو (۳) اور بہت سی بستیاں جن کو ہم نے
ہلاک کیا، پس آیا ان کے پاس ہمارا عذاب رات کے وقت
یا وہ دوپہر کے وقت قیلولہ کر رہے تھے (۴) پس نہیں تھی
ان کی پکار جب کہ آئی ان کے پاس ہماری گرفت مگر یہ کہ انہوں
نے کہا، بیشک تھے ہم ظلم کرنے والے (۵) پس ہم ضرور پوچھیں
گے ان لوگوں سے کہ جن کی طرف رسول بھیجے گئے ہیں اور ہم
ضرور سوال کریں گے رسولوں سے بھی (۶) پھر ہم بیان کریں گے
ان پر علم کے ساتھ، اور ہم غائب نہ تھے (۷)

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الاعراف ہے اور یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی اس
کا زمانہ نزول قریب قریب پہلی سورۃ کے ساتھ ہی ہے بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ
یہ سورۃ، سورۃ ص کے بعد نازل ہوئی۔ اس میں ۲۰۶ آیات ۳۶۲۵ کلمات اور ۱۴۳۱۰ حروف
ہیں۔ یہ سورۃ طوال یعنی لمبی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ سورۃ فاتحہ کو چھوڑ کر اب تک آنے والی
ساری سورتیں سبع طوال میں شامل ہیں۔ اس کے بعد سورۃ نحل تک کو مثانی کہا جاتا ہے۔ یہ
طوال کے بعد دوسرے نمبر پر آنے والی سورتیں ہیں۔ پھر ایک سو تک آیات والی سورتیں
ہیں جن کو مئین کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد سب چھوٹی سورتیں مفصلات ہیں۔ جو قرآن پاک
کے آخر تک چلتی ہیں۔ اعراف ایک مقام کا نام ہے چونکہ اس سورۃ میں اعراف کا تفصیلی
ذکر آیا ہے۔ اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ الاعراف ہے۔

مضامین سورۃ

یہ سورۃ متفرق مضامین پر مشتمل ہے، اور اس میں دین اسلام کے کم و بیش
تمام مرکزی مضامین کا اعادہ کیا گیا ہے۔ سابقہ سورتوں کی طرح توحید کا بیان اور شرک کی تردید
اس سورۃ میں بھی آئی ہے۔ معاد یعنی قیامت اور محاسبے کے تذکرے کے ساتھ ساتھ جزائے
عمل کا بیان بھی ہے۔ گذشتہ سورۃ میں اٹھارہ انبیاء علیہم السلام کا ذکر کر کے ان کے طریقے

کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس سورۃ میں رسالت کی مزید تفصیلات آئیں گی۔ اس سورۃ میں تاریخ رسالت کا خصوصی ذکر ہے کہ مختلف انبیاء نے تبلیغ دین کے لیے کون کونسا طریقہ اختیار کیا اور بنی نوع انسان کو ہدایت کا سامان کس طرح بہم پہنچایا۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تفصیل کے ساتھ ذکر آئے گا۔ اس کے علاوہ بعض دیگر مسائل بھی سورۃ ہذا میں بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

اصلاح جمیع عالم

گزشتہ سورتوں کے تعارف میں بیان ہو چکا ہے کہ سورۃ بقرہ میں زیادہ تر روئے سخن یہود کی طرف تھا، ان کے باطل عقائد کی نشاندہی کر کے انہیں ہدایت کی طرف آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ پھر سورۃ آل عمران میں نصاریٰ کو روئے سخن بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد سورۃ مائدہ میں زیادہ تر مشرکین عرب کو مخاطب کر کے ان کی اصلاح احوال کے لیے انتظام کیا گیا تھا۔ پھر سورۃ انعام میں مجوسی اور صابی قوموں کو موضوع سخن بنایا گیا تھا۔ اب اس سورۃ مبارکہ میں تمام اہل جہان کی اصلاح کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ گویا اس سورۃ کا مرکزی مضمون اصلاح جمیع عالم ہے یعنی اس میں تمام اقوام اور مذاہب والوں کو خطاب کیا گیا ہے چنانچہ اس میں اہل ایمان سے لے کر اہل کتاب یہود و نصاریٰ، مشرکین، مجوسی اور صابی قوموں تک کا تذکرہ ہے۔ سورۃ حج میں اس کی مزید تفصیلات بھی آئیں گی۔

نبوت عامہ

جیسا کہ پہلے عرض کیا اس سورۃ میں رسالت کا مضمون بھی شامل ہے چنانچہ یہاں پر حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت عامہ کا خصوصی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو جمیع عالم کی اصلاح کے لیے تمام اقوام عالم کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے چنانچہ اسی سورۃ میں آگے آئے گا قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا آپ

کر دیجئے کہ اے لوگو! میں کسی ایک قبیلے قوم یا بستی کی طرف مبعوث نہیں ہوا ہوں بلکہ میرا پیغام دنیا جہان کی جملہ اقوام کے لیے ہے اور اس کائنات میں قیامت تک پیدا ہونے والے ہر شخص کی اصلاح کا پروگرام میرے پاس ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی نبوت دو حیثیت سے ہے۔ چونکہ قریش کی سعادت آپ کے ساتھ وابستہ ہے اس لحاظ سے آپ قومی نبی ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ تمام عالم کے لیے خدا کے نبی اور رسول ہیں۔ لہٰذا یہ آپ کی بین الاقوامی حیثیت ہے جس کی بنا پر آپ بین الاقوامی نبی ہیں۔ بہرحال اس سورۃ مبارکہ میں آپ کی بین الاقوامی حیثیت سے اصلاح عالم کا پروگرام ہے اس کے ساتھ ساتھ تاریخ رسالت بیان کرنے سے حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرامؓ کو جرأت دلانا مقصود ہے کہ رسالت کی تاریخ اسی طرح چلتی رہی ہے لہٰذا آپ اس پروگرام پر خود عامل بن جائیں اور پھر اس کو دوسروں تک پہنچائیں۔

سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط

سورۃ انعام کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اپنے مخاطبین کو کہلوایا تھا اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ کیا میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی راہنمائی کے لیے سامان مہیا کرے چنانچہ اس سورۃ مبارکہ کی ابتدا اللہ تعالیٰ نے كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ سے کی ہے۔ گویا اس نے اپنی آخری کتاب قرآن حکیم نازل فرما کر ہدایت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اور پھر ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتارا گیا ہے اس کی پیروی بھی کرو۔ اس کے احکام پر خود عمل پیرا ہو کر دوسروں کی تربیت بھی کرو۔ یہ گویا سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط ہو گیا۔

حروف مقطعات

اس سورۃ مبارکہ کی ابتدا حروف مقطعات ۔ الٓمّٓصٓ ۝ سے کی گئی ہے ان حروف کے معانی کے متعلق مفسرین نے مختلف تاویلات پیش کی ہیں۔ تاہم یقین کے ساتھ ان کے معانی کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تفسیر جلالین[1] میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ان حروف کے متعلق اسی حد تک اعتقاد رکھنا چاہیئے (اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا) ان کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے ہم اسی پر ایمان لاتے ہیں اور اسی کی تصدیق کرتے ہیں۔ لہٰذا ان حروف کے معانی و مطالب کے سلسلے میں یہی طریقہ اختیار کرنا زیادہ اسلم ہے تاکہ انسان گمراہی اور فتنے سے بچ سکے تاہم امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے ذوقی اور الہامی طریقے سے ان حروف کی تشریح اس طرح کی ہے کہ الف کا اشارہ کسی اسم یا حقیقت کی طرف ہوگا، لہٰذا اسے ہم اللہ کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ لام کا اشارہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف سمجھ سکتے ہیں اور م سے مراد حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ پروگرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام کی وساطت سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نازل ہوا۔ اب ص کا اشارہ یا تو صورت کی طرف ہو سکتا ہے۔ یا صعود بمعنی بلندی کی طرف۔ گویا اس کتاب میں وہ پروگرام پیش کیا گیا ہے جو انسان کو عالم بالا کی طرف لے جاتا ہے۔ بہرحال بعض مفسرین نے اس قسم کی تشریح محض تفہیم کے لیے کی ہے تاکہ بعض کمزور اذہان میں فتور نہ آنے پائے، ورنہ اصلیت یہی ہے کہ ان حروف کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

نزول کتاب ورآپ

ارشاد ہوتا ہے کِتٰبٌ یہ ایک کتاب ہے اُنْزِلَ اِلَیْکَ جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے۔ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْہُ پس آپ کے سینے میں اس کی وجہ سے تنگی نہیں ہونی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ

[1] جلالین ص ۱۳

جب حضور نبی کریم علیہ السلام نے اسلام کی دعوت پیش کی تو لوگوں نے ضد اور عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی مخالفت کی جس کی وجہ سے آپ کے دل میں گھٹن پیدا ہوتی تھی اور آپ کو تنگی محسوس ہوتی تھی۔ آپ اکثر خیال فرماتے کہ لوگ ہماری دعوت کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ کیا یہ ہماری بات سُن کر سمجھ بھی سکتے ہیں یا نہیں اور پھر اسے کس حد تک قبول کرتے ہیں۔ عربوں کی طرف سے حضور کو بڑی تکالیف پہنچیں۔ آپ سوچتے رہتے تھے کہ گھر کے لوگ ہی نہیں مانتے تو باقی اقوام عالم کا کیا بنے گا۔ اس طرح آپ کے قلب مبارک میں گھٹن پیدا ہوتی تھی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ آپ تنگی محسوس نہ کریں بلکہ آپ اپنا کام جاری رکھیں، خدا تعالیٰ اس پروگرام کو ضرور کامیاب کریگا۔ اسی طرح کی تسلی سورۃ الانشراح میں بھی ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کیا ہم نے آپ کے سینہ مبارک کو کھول نہیں دیا وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ اور آپ کے بوجھ کو ہلکا نہیں کر دیا؟

بعض مفسرین تنگی سے شک اور تردد مراد لیتے ہیں۔ یعنی یہ پروگرام جو اللہ نے نازل فرمایا ہے، یہ بالکل برحق ہے، اس کی کامیابی میں کسی قسم کا شک یا تردد نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسرے مقام پر موجود ہے فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (الانعام) آپ شک نہ کریں۔ یہ سو فیصد قطعی اور برحق پروگرام ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کو ہدایت دینا چاہتا ہے۔

کتاب کی غرض و غایت

فرمایا نزول کتاب کا مقصد یہ ہے لِتُنْذِرَ بِهٖ کہ آپ اس کے ذریعے کفر، شرک اور معاصی کا ارتکاب کرنے والوں کو ڈرائیں۔ جس قدر برائیوں کی کثرت ہے اُسی قدر انذار کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ پوری دنیا میں نظر دوڑا کر دیکھ لیں، کُل پانچ ارب کی آبادی میں سے ایک ارب لوگ بھی ایمان دار نہیں ہیں۔ غالب اکثریت فسق و فجور، غلط عقائد اور غلط اعمال کی

پیروکار ہے۔ ہر نبی بشیر اور نذیر ہوتا ہے۔ وہ ہر ایمان والے نیکوکار کو کامیابی کی بشارت سناتا ہے اور غلط کار کو اُس کے بُرے انجام سے ڈراتا ہے اہلِ ایمان کے لیے تو فرمایا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (سورۃ یونس) اُن کے رب کے پاس اُن کے لیے سچائی کا قدم ہے اور فلاح و کامیابی اُن کے مقدر میں ہے مگر اکثر لوگ چونکہ گمراہ ہیں اور شیطانی کاموں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اس لیے اُن کا انذار بھی ضروری ہے۔ انذار کی اسی ضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انذار کو مقدم رکھا ہے۔ کہ آپ اس قرآن کے ذریعے لوگوں کو ڈرائیں اور نزول کتاب کی دوسری غرض یہ ہے کہ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ یہ کتاب اہل ایمان کے لیے نصیحت بن جائے گویا اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے دو مقصد بیان فرمائے ہیں، ایک نافرمانوں کو ڈرانا اور دوسرا اطاعت گزاروں کے لیے باعث نصیحت ہونا۔

اتباعِ کتاب

فرمایا اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ اے انسانو! اتباع کرو اُس چیز کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔ رب تعالیٰ کی طرف سے اُس کی ربوبیت عامہ کے تقاضے کے تحت تمہاری فلاح و کامیابی کے لیے جو ہدایت، دین، شریعت، قانون اور دستور نازل کیا گیا ہے، اس کی پیروی کرو۔ دوسرے مقام پر فرمایا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (آل عمران) یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ یہ اللہ کا دیا ہوا پروگرام ہے۔ اس کے علاوہ کسی ملت، قوم یا ملک کا قانون ہو وہ باطل ہے۔ روس، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور چین کے دساتیر سب غلط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کردہ قانون پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے اسے حبل اللہ المتین قرار دیا ہے کہ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے جو اللہ نے عالمِ بالا سے زمین پر لٹکائی ہے

جو اس کو پکڑے گا وہ نجات پا جائے گا۔

وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ــــ اور نہ اتباع کرو اس کے سوا دوسرے رفیقوں کی۔ یعنی جو شخص کتاب اللہ کے ماسوا کسی دوسری چیز سے راہنمائی حاصل کرے گا وہ گمراہ ہو جائیگا اور جو اس کتاب کے مقابلے میں اکڑ دکھائیگا خدا تعالیٰ اس کی گردن توڑ دے گا۔ آجکل ڈیموکریسی کا پروگرام ہو یا اشتراکیت کا یا سرمایہ داری کا سب کے سب باطل ہیں شہنشاہیت اور ملوکیت کے پروگرام بھی غلط ہیں، فرمایا ان کا اتباع مت کرو، یہ تمہیں گمراہی کی طرف لے جائیں گے۔

اصحاب اعراف

اصحاب اعراف کا ذکر اس سورۃ کے پانچویں رکوع میں آتا ہے۔ حضرت مولانا امام شاہ ولی محدث دہلویؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اعراف پر تھوڑا سا کلام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جو لوگ قرآن پاک کو براہ راست سمجھ کر اس پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور پھر اس کو آگے لیجاتے ہیں، وہ مومن ہیں اور سابقین ہیں۔ جو لوگ اس پروگرام کو براہ راست تو نہیں سمجھ سکتے تاہم کسی ہادی، راہنما یا پیشوا کے واسطے سے سمجھ کر اس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ اصحاب یمین کہلاتے ہیں۔ اور جو شخص اس پروگرام کو پا کر اس کا انکار کر دیتا ہے۔ وہ کافروں میں شمار ہوتا ہے۔ فرمایا اس کے علاوہ جتنے گروہ بھی ہیں وہ سب اصحاب اعراف ہیں۔

قرآن سے غفلت

اسلام کے ابتدائی دور میں ہدایت کا مرکز مکہ اور مدینہ تھا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ عراق تشریف لے گئے۔ خلافت راشدہ کے بعد مرکز اسلام شام بنا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بغداد، بخارا اور خراسان کو اسلام کی مرکزیت حاصل ہوئی قاہرہ بھی دین کا مرکز ہوا اور پھر ہندوستان میں دہلی کو بھی یہ شرف حاصل ہوا، مگر اب دنیا میں اس پروگرام کو آگے بڑھانے والے لوگ بالکل کمزور ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے دین اسلام کی تبلیغ نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اور یہ قرآن پاک سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک سے غفلت پوری بنی نوع انسان کے لیے تباہ کن ہے، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے

ہر خطے کے لوگ طرح طرح کے مصائب اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قوم کی تباہی دو چیزوں میں دیکھی ہے، ایک قرآن سے دوری اور دوسری فرقہ بندی۔ آپ دونوں چیزوں کے سخت خلاف تھے۔ قرآن کو پس پشت ڈال دینا اور اس سے کوئی راہنمائی نہ حاصل کرنا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ اس زمانے میں اکثر و بیشتر مسلمانوں کا تعلق قرآن پاک سے محض رسمی عزت و احترام تک رہ گیا ہے۔ اس کو ریشمی غلاف میں لپیٹ کر اونچی جگہ پر رکھا جاتا ہے اس کی طرف پشت نہیں کی جاتی یا ایصال ثواب کے لیے اس کی تلاوت کر لی جاتی ہے مگر اس کو سمجھنا اور پھر اس پر عمل کرنا مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح فرقہ بندی کی وبا عام ہو چکی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف تکفیر کے فتوے، نعرہ بازی اور بغض و عناد نے قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اسی طرح ملوکیت بھی اسلام کے راستے میں رکاوٹ بنتی رہی ہے۔ بنی امیہ، اور بنی عباس کے دور میں پھلنے پھولنے والی ملوکیت نے اسلام کے پودے کو پنپنے نہیں دیا۔ درمیان میں عمر بن عبدالعزیزؒ، صلاح الدین ایوبیؒ، محمود غزنویؒ، ناصر الدینؒ اور عالمگیرؒ جیسے اچھے لوگ بھی پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اس پودے کی آبیاری کی مگر ان کے علاوہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اکثر و بیشتر صاحبان اقتدار جاہ و مال اور عیش و عشرت میں مبتلا رہے ہیں۔ صفین سے پہلے تک تو اسلام کے ساتھ وابستگی رہی ہے مگر اس کے بعد اس پروگرام کو ترک کر دیا گیا۔ البتہ اس پروگرام کی حقانیت کی وجہ سے پہلے بھی فرداً فرداً صاحب ارادہ لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔ مگر مسلمانوں میں اجتماعیت کا تصور ختم ہو چکا ہے اس وقت دنیا کی پچاس مسلمان ریاستوں میں سے کوئی بھی اپنے پاؤں پر قائم نہیں ہے۔ ہر طرف ذلت اور مردنی چھائی ہوئی ہے۔ شام، لبنان اور افغانستان کی حالت ذرا دیکھ لیں۔

ایران اور عراق کی طرف نظر دوڑائیں، فلسطینیوں کی جلاوطنی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زبوں حالی ہمارے سامنے ہے۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ دنیا کے کسی ایک خطے میں مسلمان کی جان ضائع ہوتی تھی تو پورا عالم اسلام تڑپ اٹھتا تھا مگر آج کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ دشمنان دین مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں مگر باقی مسلمان خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ مشرق میں کسی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور مغرب میں دوسرا مسلمان تڑپ نہ اٹھے تو وہ سچا مسلمان نہیں۔

بہرحال فرمایا اتباع کرو اس چیز کی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔ تمہارے پروردگار کی جانب سے اور نہ اتباع کرو اس کے سوا دوسرے کارسازوں کا۔ مگر ان واضح احکام کے باوجود قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ بہت کم لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دن بدن قرآن سے دوری ہوتی جا رہی ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ دوسرے کارسازوں سے وہ نام نہاد محققین بھی مراد ہیں جو کلام پاک کے غلط معانی اور غلط تاویلیں کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ مرزا قادیانی نے یہی کام کیا سرسید اور پرویز بھی یہی کام کرتے رہے ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآن پاک کا حقیقی پروگرام دوسری قوموں کے سامنے پیش کر کے انہیں اس طرف راغب کیا جاتا مگر افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان کہلانے والے خود مسلمان کو اس حقیقت سے دور لے جا رہے ہیں۔

بعض قوموں کی ہلاکت

ارشاد ہوتا ہے وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا دنیا میں کتنی بستیاں ہیں جن کے رہنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ انہوں نے نبیوں کی زبان پر اعتماد نہ کیا اور مَآ أُنزِلَ إِلَيْكُمْ کا اتباع نہ کیا بلکہ اپنی من مانی کرتے رہے اور شیطان کے پیچھے چلتے رہے فَجَآءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا پھر ہماری سزا ان کے پاس ایسی حالت میں آئی کہ وہ سو رہے تھے اور اچانک ان پر عذاب مسلط ہو گیا

اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ یا اُن کی ہلاکت اُس وقت ہوئی جب کہ وہ دوپہر کے وقت آرام کر رہے تھے۔ لوگ اپنے انجام سے بے خبر محوِ خواب تھے کہ اللہ کی گرفت آئی اور انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ دنیا میں کتنے طوفان آ گئے ہیں زلزلے آتے ہیں۔ اور ہنستے بستے گھرانے ملیامیٹ ہو جاتے ہیں۔ ابھی قریب زمانے کا واقعہ کہ پچاس ہزار افراد پر مشتمل آبادی آنِ واحد میں زلزلے کا نشانہ بنی اور پیوندِ خاک ہو گئی۔ فرمایا جب اُن پر سزا وارد ہو گئی فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ تو اُن کی پکار اِس کے سوا کچھ نہ تھی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ کہ انہوں نے کہا کہ بیشک ہم ہی خطا کار تھے۔ یعنی یہ عذاب ہماری ہی کرتوتوں کی وجہ سے آیا ہے۔ جب خدا کی پکڑ آ جاتی ہے تو پھر اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں۔

انبیاء اور امم سے بازپرس

آگے فرمایا سن لو! فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ ہم ضرور بازپرس کریں گے اُن لوگوں سے جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا۔ ان سے دریافت ہو گا کہ تم نے ہمارے رسولوں کی بات کو کیوں نہ مانا۔ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ اور ہم رسولوں سے بھی پوچھیں گے کہ تم نے ہمارا پیغام اپنی امتوں تک پہنچایا یا نہیں۔ اگرچہ رسولوں نے دنیا میں اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیا مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بازپرس ہونے پر وہ بھی پریشان ہو جائیں گے۔ پھر شہادتیں پیش ہوں گی اور اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائیں گے۔ اسی بازپرس کے پیشِ نظر حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں سے فرمایا تھا کہ میرے بارے میں تم سے پوچھا جائیگا تو تم کیا جواب دو گے تو سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا قَدْ اَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَبَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ یعنی آپ نے پوری امانت ہم تک پہنچا دی، پوری پوری تبلیغ کی اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ بہر حال رسولوں اور امتیوں سب سے سوال جواب ہو گا۔

اس کے بعد فرمایا فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ پھر ہم اپنے علم کے ذریعے ان پر بیان کر دیں گے یعنی اُن کے اعمال کی تفصیلات اُن کے سامنے پیش کر دیں گے جس سے انہیں مجال انکار نہیں ہوگا۔ اور ایسا ہم اس لیے کر دیں گے وَمَا كُنَّا غَآئِبِينَ کہ ہم اُن سے غائب نہ تھے بلکہ ہمیشہ اُن پر نگاہ رکھتے تھے اور اُن کی ہر حرکت ہمارے مشاہدے اور علم میں تھی اللہ تعالیٰ نے ہر مقام پر اپنی نگاہ کو مختلف انداز سے بیان فرمایا ہے۔ کہیں فرمایا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ "اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔" کہیں فرمایا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ "اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کی نظروں سے کوئی چیز مخفی نہیں۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ :- اور (اعمال کا) وزن کیا جانا اس دن برحق ہے ۔ پس جس شخص کے اعمال نامے بھاری ہوں گے ، پس یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے ﴿۸﴾ اور جس کے اعمال نامے ہلکے ہوں گے یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈالا ، اس واسطے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے ﴿۹﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے جگہ دی تم کو زمین میں اور بنائے ہیں ہم نے تمہارے لیے اس زمین میں معیشت کے سامان ۔ بہت کم ہی تم شکریہ ادا کرتے ہو ﴿۱۰﴾

ربطِ آیات

سورۃ اعراف کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اتباع کا حکم دیا ہے ۔ جو چیز اللہ تعالیٰ نے تمہاری بہتری کے لیے وحی کے ذریعے نازل کی ہے ۔ صرف اسی کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ کسی دوسرے پروگرام کی پیروی نہ کرو کیونکہ یہ تمہارے لیے خسارے کا باعث ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو دین حق دے کر

پہنچانے کے لیے ہمت و جرأت دلائی اور فرمایا کہ آپ کے دل میں کسی قسم کی گھٹن یا تنگی نہیں ہونی چاہیئے اور نہ ہی اس معاملہ میں کسی شک وتردد میں پڑنا چاہیئے۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر کئی انبیاء کا ذکر کیا ہے، اُن کے طریق پہ روشنی ڈالی ہے اور پھر اُن کے راستے میں آنے والی مشکلات اور اُن پہ قابو پانے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اسی سورۃ میں اللہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت عامہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی کے پروگرام کے مخالفین کی ناکامی کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح انہیں عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ گذشتہ درس میں وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا گزر چکا ہے۔ فرمایا منکرین کو بسا اوقات اس دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے اگرچہ یہ لازمی نہیں مگر اللہ تعالیٰ عاصیوں کو چھوڑتا نہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں فَلَا يَتْرُكُ عَاصِيًا اللہ کسی گنہگار سے صرف نظر نہیں کرتا بلکہ کسی نہ کسی شکل میں اسی دُنیا میں مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔ پھر جب اس دُنیا کی زندگی اختتام کو پہنچتی ہے تو محاسبے کا حتمی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ بہرحال بعض لوگوں کو اس دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے اور بعض بچ رہتے ہیں مگر آخرت میں محاسبے کے عمل سے سب کو لازماً گذرنا ہو گا۔

مضامینِ قرآن

مکی سورتوں میں زیادہ تر توحید، رسالت، معاد اور قرآن کی صداقت کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض متفرق مضامین بھی ہیں مگر نسبتاً کم تعداد میں۔ البتہ مدنی سورتوں میں جزوی مسائل زیادہ بیان کیے گئے ہیں۔ سورۃ الاعراف بھی چونکہ مکی سورۃ ہے لہٰذا اس میں بھی عقائد اور حقائق پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس میں توحید، رسالت، اور معاد کا خصوصی بیان ہے۔ عقائد کے سلسلے میں جزائے عمل پر ایمان لانا نہایت ہی اہم ہے

کیونکہ اس دنیا میں اچھے اور برے اعمال کا دارومدار اسی یقین پر ہے کہ ایک دن قیامت برپا ہوگی اور سب کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے۔ جس طرح انسان کا اپنا وجود ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اسی طرح جزائے عمل کا واقع ہونا بھی قطعی اور اٹل ہے۔ جو شخص اس حقیقت کا انکار کرے گا وہ گمراہی میں مبتلا ہو کر دائمی ناکامی کا منہ دیکھے گا۔

اعمال کا وزن

آج کی آیت میں جزائے عمل کے ضمن میں اعمال کے وزن کا بیان ہے قرآن پاک کے دیگر مقامات پر بھی اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے احادیث نبوی میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ کی روایت کردہ حدیث میں جہاں ایمان کے متعلق سوال ہے، وہاں جواب یہ ہے اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ.... یہ کہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائے، مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر تمہارا یقین ہونا چاہیئے اور تقدیر پر بھی ایمان ہونا چاہیئے۔ اس روایت میں اَنْ تُؤْمِنَ بِالْمِیْزَانِ کے الفاظ بھی ہیں کہ تمہارا میزان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ تو یہاں پر بھی یہی بات ذکر کی گئی ہے وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ حشر کے دن اعمال کا تولا جانا برحق ہے۔ البتہ اعمال کے وزن کے متعلق یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی اعمال تو عرضی چیز ہے، ان کی شکل وصورت اور وجود تو ہوتا نہیں جیسے کسی نے نماز پڑھی یا روزہ رکھا، درود پاک پڑھا، ذکر و اذکار کیا، یہ ایسے اعمال ہیں جو انسان اپنے اعضاء کے ساتھ انجام دیتا ہے، تو ان کا وزن کیسے ہوگا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اعمال کی شکل وصورت اور وجود اور پھر ان کا وزن احادیث سے ثابت ہے۔ اس زمانے میں سائنس نے بعض ایسی اشیا کا وزن بھی ثابت کر دیا جو بظاہر بے وزن چیزیں معلوم ہوتی ہیں بلکہ ان کا خارجی وجود ہی نہیں ہے۔ مثلاً ہوا کا دباؤ یا وزن بیرومیٹر کے ذریعے معلوم کیا جاتا ہے انسانی جسم کی حرارت کو ماپنے کے لیے

تھرما میٹر موجود ہے، اسی طرح خون کا دباؤ (BLOOD PRESSURE)
معلوم کرنے کے آلات بھی موجود ہیں۔ اور اگر پھر بھی اعمال کے وزن کی کیفیت
کسی کے ذہن میں نہ آسکے تو جن کاغذات پر اعمال نامے لکھے ہوں گے وہ
کاغذ تو تولے جاسکتے ہیں۔ اس کا ذکر بھی حدیث شریف میں موجود ہے۔
بہر حال اعمال کے وزن کے متعلق اسی طرح ایمان ہونا چاہیئے جس طرح
باقی چیزوں پہ ایمان لانا ضروری ہے

اعمال کی شکل وصورت

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بات دوسرے طریقے پہ بھی سمجھائی
ہے کہ اس ناسوتی جہان میں جو اعراض اور معانی ہیں وہ عالم مثال میں وجود رکھتے
ہیں۔ حدیث شریف میں موجود ہے کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران قیامت
کے دن سائبان کی شکل میں ظاہر ہوں گی اور ان کے درمیان سے روشنی چمک
رہی ہوگی۔ یہ ایسے ہی ہوں گی جس طرح بادل کا سایہ یا پرندوں کا گھنڈ ہوتا ہے
گویا ان کی ایک شکل صورت ہوگی اور ظاہر ہے کہ پھر وزن بھی ہوگا۔
صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قبر میں عقائد سے متعلق سوال وجواب
ہوں گے۔ وہاں پوچھا جائیگا مَنْ رَّبُّكَ تیرا رب کون ہے مَا
دِيْنُكَ اور تیرا دین کیا ہے وَمَنْ نَّبِيُّكَ اور تیرا نبی کون ہے مَا
كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ اس شخص کے بارے میں تو کیا
کہتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایسے مشکل وقت میں بعض لوگوں کے
سامنے ایک نہایت حسین وجمیل نوجوان ظاہر ہوگا۔ اس کا چہرہ منور ہوگا مگر
اس سے خوشبو آرہی ہوگی۔ صاحب قبر اس سے دریافت کرے گا کہ تم
کون شخص ہو، وہ جواب دیگا اَنَا عَمَلُكَ الصَّالِحُ میں تیرا نیک عمل
ہوں۔ تیری تسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس شکل وصورت میں متشکل کرکے
بھیجا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کے متعلق بھی آتا ہے کہ قرآن کریم بھی نہایت
خوبصورت شکل میں آئے گا، مومن آدمی پوچھے گا، تم کون ہو؟ وہ کہے گا میں

وہی قرآن پاک ہوں جسے تم رات کو پڑھا کرتے تھے اور جس کے حکم سے دن کو پیاسے رہتے تھے یعنی روزہ رکھتے تھے۔

حدیث شریف میں آتا ہے وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيزَانَ جب کوئی مومن آدمی الحمد للہ کہتا ہے تو یہ کلمہ میزان کو بھر دیتا ہے۔ بہرحال یہ معنوی چیزیں بھی جسم رکھتی ہیں جو عالم مثال میں ظاہر ہوں گی، اور انہیں تولا جا سکے گا۔ البتہ اعمال کا وزن اللہ تعالیٰ اس واسطے نہیں کریں گے کہ وہ ان سے بے خبر ہے بلکہ وہ تو ان کی حقیقت سے ازل سے واقف ہے اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ اس نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ تاہم اعمال کا وزن انسانی ذہن کے مطابق کیا جائے گا تاکہ کوئی آدمی عذر نہ کر سکے اور اُسے اپنے اچھے اور بُرے اعمال کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانی اعمال کی حفاظت کے لیے کئی انتظام کیے ہیں۔ فرشتے ہر شخص کے اعمال نوٹ کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط میں بھی محفوظ ہیں۔ لوح محفوظ میں بھی درج ہیں۔ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ کائنات اور اس کی طبیعت اور مزاج میں بھی اعمال محفوظ ہیں بلکہ خود انسان کے اپنے حافظے میں بھی محفوظ رہتے ہیں۔ سورۃ انبیا میں ہے وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھ دیے جائیں گے اور کسی شخص سے زیادتی نہیں کی جائے گی بلکہ پورا پورا حساب کیا جائے گا۔ بہرحال اعمال کا تولا جانا برحق ہے اور جزا یا سزا کا فیصلہ انہی اعمال کی بنا پر ہوگا۔

ایمان ذریعہ ثقل

اعمال میں ثقل اور پاکیزگی ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا ایمان جس قدر درست ہوگا اور اعمال میں اخلاص ہوگا، اسی قدر ان کا وزن بڑھ جائے گا۔ اس کے برخلاف ریاکاری کی وجہ سے عمل کا وزن

ہلکا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اَخْلِصْ فِیْ دِیْنِکَ یَکْفِیْکَ قَلِیْلٌ مِّنَ الْعَمَلِ اپنے دین میں اخلاص پیدا کر لو تو تھوڑا عمل بھی تمہیں کفایت کر جائے گا۔ ترمذی شریف اور بعض دوسری کتابوں میں یہ مشہور حدیث ہے جسے آپ سنتے رہتے ہیں کہ قیامت والے دن ایک شخص پیش ہوگا جس کے اعمال ننانوے رجسٹروں پر مشتمل ہوں گے اور ہر رجسٹر حدِ نگاہ تک لمبا چوڑا ہوگا۔ یہ رجسٹر برائیوں سے پُر ہوں گے۔ اللہ فرمائے گا۔ اے بندے! یہ تیرے اعمال ہیں؟ عرض کرے گا۔ ہاں باری تعالیٰ یہ سب میرے ہی اعمال ہیں۔ یہ سارے بُرے اعمال میں نے ہی کیے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک چھوٹا سا پرچہ (بطاقہ) حاضر کرنے کا حکم دے گا۔ بندہ عرض کریگا مولا کریم! میرے ان بڑے بڑے سیاہ رجسٹروں کے مقابلے میں اس چھوٹے سے پرزے کی کیا حیثیت ہے۔ اللہ فرمائیگا اپنے میزان کے وقت حاضر ہو، تیرا رب کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔ اس کاغذ پر کلمہ توحید لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تحریر ہوگا۔ جب وہ پلڑے میں ڈالا جائے گا تو ننانوے رجسٹروں سے بھی وزنی نکلے گا جس سے وہ بندہ بڑا متعجب ہوگا۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ یہ ایسے شخص کا معاملہ ہے جو ساری عمر کفر، شرک اور بدعات میں رہا۔ مگر آخری وقت خلوص دل کے ساتھ کلمہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد اُسے مزید نیکیاں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لہٰذا یہی کلمہ اس کے لیے کفایت کر یگا۔

حدیث شریف میں ایک دوسرے شخص کا واقعہ بھی آتا ہے۔ کفر و اسلام کی جنگ جاری ہے۔ اس دوران ایک کافر شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے، حضور! اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا مجھے جنت مل جائیگی۔ فرمایا ہاں۔ چنانچہ اُس شخص نے کلمہ پڑھ لیا اور جہاد میں شریک ہو گیا۔ پھر وہ لڑتے لڑتے شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو گیا حالانکہ

لہ فیض القدیر ص۲۱۹ ج۱ بحوالہ مستدرک عن معاذ ؓ (فیاض)

ابھی تک نہ اُس نے کوئی نماز پڑھی تھی، نہ روزہ رکھا تھا اور نہ کوئی دوسرا
عمل کیا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اُس کے متعلق فرمایا عَمِلَ قَلِیْلاً
وَّاُجِرَ کَثِیْرًا اُس شخص نے عمل تو تھوڑا کیا مگر بڑے اجر بہت زیادہ
مل گیا۔ ایسے ہی لوگوں کے چھوٹے چھوٹے اعمال بڑے بڑے گناہوں کا
کفارہ بن جائیں گے اور وزن میں بھاری ہو جائیں گے۔

درود شریف کی برکت

ابن ابی دنیاؒ کی روایت میں آتا ہے کہ قیامت کے دن حضرت
آدم علیہ السلام دو سبز کپڑے پہنے ایک مقام پر بیٹھے ہوں گے۔ لوگ اُنکے
سامنے سے گزر رہے ہوں گے۔ بعض کامیابی کی منزل کی طرف جا رہے ہوں
گے اور بعض ناکامی کی جانب۔ اتنے میں ایک شخص کو گرفتار کر کے جہنم
کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا۔ حضرت آدم علیہ السلام پوچھیں گے تم کو کدھر
لے جایا جا رہا ہے۔ عرض کرے گا، حضور! میں نبی آخر الزمان کی امت
کا آدمی ہوں، میرے پاس کوئی نیکی نہیں، سب برائیوں کے انبار ہیں لہذا
مجھے دوزخ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ آدم علیہ السلام پریشان ہو کر حضور
علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آواز دیں گے اے محمد! یہ آپ کی امت کا آدمی
ہے۔ اس کی فکر کریں۔ اس پر حضور علیہ السلام فرشتوں سے کہیں گے، اے
پروردگار کے قاصدو! اس کو چھوڑ دو، یہ میری امت کا آدمی ہے۔
فرشتے عرض کریں گے نَحْنُ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا نَعْصِیْ مَا
اَمَرَ اللّٰہُ ہم بڑے سخت گیر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی
نہیں کرتے، چنانچہ اس شخص کو جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ پھر
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی داڑھی مبارک کو ہاتھ میں پکڑ کر خدا کی بارگاہ
میں التجا کریں گے اور اس کے لیے دعا کریں گے تو اللہ کا حکم ہوگا۔
کہ اس شخص کو روک دو۔ پھر حضور علیہ السلام اپنے پاس سے ناخن کے
برابر ایک چھوٹا سا پرزہ نکالیں گے، اُس کا وزن کیا جائیگا تو وہ ساری برائیوں

سے زیادہ وزنی نکلے گا۔ ارشاد ہوگا سَعِدَ سَعِدَ یہ شخص نیک بخت ہوگیا۔ اور
اُسے جنت کا حکم ہو جائیگا۔ وہ شخص بڑا حیران ہوگا اور فرشتوں سے پوچھے گا کہ یہ
کون شخص ہے جس نے مجھے عزت دلائی تو حضور علیہ السلام فرمائیں گے، میں
تیرا نبی ہوں اور تو میری امت کا آدمی ہے۔ یہ پرزہ وہ درود شریف ہے جو
تو نے کسی اخلاص کے ساتھ پڑھا تھا۔ آج وہی مقبول ہو کر تیری برائیوں پر
غالب آگیا ہے۔ حضور فرمائیں گے کہ تیرا یہ عمل ضرورت کے وقت تمہارے
پاس پہنچ گیا ہے۔ درود شریف کی اتنی اہمیت ہے اور یہ اتنا اعلیٰ عمل
ہے۔ بلکہ اخلاص و محبت کے ساتھ درود شریف پڑھنا افضل العبادات میں
سے ہے بشرطیکہ یہ خلوص و محبت کے ساتھ برمحل پڑھا جائے، محض شور و شر،
فتنہ پروری، بے محل اور غلط طریقے سے پڑھا جانے والا درود قابلِ قبول
نہیں ہوگا۔ اس کے لیے پورے آداب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

بھاری اور ہلکے اعمال

ارشاد ہوتا ہے، اعمال کا وزن برحق ہے فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ
پس جس کے اعمالنامے بھاری ہوں گے فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ
وہ فلاح پا جائیں گے، کامیاب ہو جائیں گے۔ حظیرۃ القدس، علیین اور
جنت میں پہنچ جائیں گے۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ اور جس کے
اعمال نامے ہلکے ہلکے ہوں گے فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ یہ وہی
لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا، فکر اور عقیدہ درست نہیں
کیا۔ اعمال صحیح طریقے سے انجام نہیں دیے، موقع اور محل کے مطابق نہیں
کیے اور ان میں اخلاص کا فقدان تھا، لہذا یہ ہلکے نکلیں گے، ظاہر ہے کہ
جو کام خلاف سنت ہوگا وہ بیکار محض ہے۔ عمل وہی مقبول ہے، جو
حضور علیہ السلام کے طریقے کے مطابق ہوگا اور وزن بھی اُسی کا زیادہ ہوگا۔
اپنی خواہش اور خلافِ سنت انجام دیے جانے والا عمل مردود ہوگا۔ حضور علیہ السلام
کا ارشاد ہے کہ جو عمل ہمارے طریقے کے مطابق نہیں ہوگا، وہ اگرچہ عمل کثرت

ہو سکو گمراہ ہو جائیگا۔

فرمایا جن لوگوں کے اعمال ناسے ہلکے ہوں گے انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ؕ اس واسطے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے کسی نے انکار کیا، کسی نے مانتے ہوئے بھی اس کے مطابق عمل نہ کیا اور کسی نے مطلب غلط بیان کیا، یہ سب درجہ بدرجہ ظلم کرنے کے مترادف ہوگا۔ دنیا میں کتنے بے راہ رو فرقے پیدا ہو چکے ہیں، کوئی پرویزی ہے، کوئی چکڑالوی ہے، کوئی منکر حدیث ہے، یہ سب آیات الٰہی کے ساتھ زیادتی کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

ن فی الارض آگے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری بات بطور احسان یاد دلائی ہے۔ اے بنی نوع انسان! وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ ہم نے تمہیں زمین میں جگہ دی ہے۔ مَكَّنّٰا کا معنیٰ قبضہ دے دیا ہے، جما دیا ہے، تمہیں زمین میں تسلط دے دیا ہے جس طرح چاہو اسے استعمال کرو۔ چنانچہ کوئی نہریں کھودتے ہیں، کوئی کانیں نکالتے ہیں کوئی عمارات بناتے ہیں، زمین کو ایسی پوزیشن میں بنایا ہے کہ وہ تمہاری خدمت کے لیے ہمہ تن تیار رہتی ہے۔ اس میں ہل چلاؤ، اناج پیدا کرو، طرح طرح کی سبزیاں اور پھل حاصل کرو، تمہیں زمین پر کنٹرول دے دیا گیا ہے۔ یہ تمکین فی الارض ہے۔ اور اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ فرمایا دوسری چیز یہ ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ اور اس میں تمہارے لیے معیشت کے سامان پیدا کر دیئے ہیں زمین سے متعلقہ مختلف قسم کے روزی کے وسائل مہیا کر دیئے ہیں تاکہ تم کماؤ اور کھاؤ پیو۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ لوگوں کی ننانوے ۹۹ فیصد اکثریت انہی دو چیزوں کا غلط استعمال کرتی ہے۔ زمین پر جاہ و اقتدار کو بھی غلط استعمال کرتے ہیں اور مال و دولت کو بھی ضائع کرتے ہیں حالانکہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کسی ملک، ادارے

یا گھر پر اقتدار دیا ہے تو اس کو صحیح طور پر استعمال کرو۔ اپنے زیرِ دستوں کی خدمت کرو نہ کہ ان کو تنگ کرو۔ اسی طرح مال بھی جائز اور صحیح طریقے سے خرچ کرو۔ مستحقین کی اعانت کرو۔ جہاد فی سبیل اللہ، تبلیغ دین اور محتاجوں کی اعانت پر خرچ کرو۔ عیاشی، فحاشی، کھیل تماشے اور شادی اور مرگ کی غلط رسومات پر خرچ نہ کرو۔ آج دیکھ لیں روپیہ کن کاموں پر صرف ہو رہا ہے۔ کوئی اکا دکا اللہ کا بندہ ہو گا جس کا مال جائز طریقے پر خرچ ہوتا ہے، ورنہ غالب اکثریت رسم و رواج اور جھوٹے نام و نمود کی غلام بن چکی ہے۔

اقامتِ دین

اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ ضرورت اقامتِ دین کی ہے آج دنیا کی کل پانچ ارب کی آبادی میں سے چار ارب مخلوق ایمان کی پیاسی ہے مگر ان تک ایمان پہنچانے والا کوئی نہیں۔ نہ کوئی مال خرچ کرتا ہے اور نہ محنت کرتا ہے۔ اتنا بڑا کام ان دو چیزوں کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے اگر مسلمانوں کے مال و دولت کا رُخ ایمان کے متلاشیوں کی آبیاری کی طرف ہو جائے تو یہ مال کا بڑا اعلیٰ و ارفع مصرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مال ذاتی عیش و عشرت اور رسوماتِ باطلہ کے فروغ کے لیے نہیں دیا بلکہ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے عنایت کیا ہے۔ غیر مسلم اقوام میں تبلیغ دین کی سخت ضرورت ہے۔ جس کے لیے مال اور وقت درکار ہے۔ تبلیغی جماعت والے جو کچھ کر رہے ہیں یہ تو کل ضرورت کا ایک فیصد بھی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی غنیمت ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ باقی ۹۹ فیصدی کام کون کرے گا؟ آپ ذرا حساب لگا کر دیکھیں کہ کل دولت کا کتنے فیصد اقامتِ دین کے لیے خرچ ہو رہا ہے، جواب صفر آئیگا۔ یہ دین تو بالکل برحق ہے اور اللہ تعالیٰ اسے قائم بھی رکھے گا مگر ہم اپنی ذمہ داری کس حد تک پوری کر رہے ہیں۔ کچھ غریب غرباء لوگ اور علمائے حق ہر دور میں موجود رہے ہیں جو حتی الامکان کام کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے مگر اس معاملہ میں اجتماعیت بالکل ختم ہو

کر رہ گئی ہے۔ پوری دُنیا کے مسلمان رُو بہ زوال ہیں اور ذلّت کے کام انجام دے رہے ہیں۔ مسلمان حکمران کبھی عیش و عشرت میں پڑے ہوئے ہیں یا جنگ و جدال میں مصروف ہیں دین کی تقویت کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے جاہ و مال دونوں چیزیں عطا فرمائیں۔ ذرا بتاؤ تو سہی ان کو دین کے لیے کس حد تک استعمال کیا جا رہا ہے۔

فرمایا ہم نے تمہیں دو عظیم نعمتیں عطا فرمائیں یعنی زمین میں اقتدار بھی دیا اور مال و دولت بھی دیا مگر قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ تم بہت کم ہی شکریہ ادا کرتے ہو۔ ان نعمتوں کا شکریہ اس طرح ادا ہوگا کہ ان کا مصرف صحیح طریقے سے کیا جائے۔ اس کا بہترین مصرف وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کا منشا ہے یعنی لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (الفتح) دین کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے۔ دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنے کے لیے تاکہ کوئی دوسرا دین یا ازم اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ فرمایا ان نعمتوں کو اکثر لوگ غلط ہی استعمال کرتے ہیں اور شکریہ ادا نہیں کرتے مگر اس کے لیے لازماً باز پرس ہوگی اس کے بعد اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مسئلہ اور اس ضمن میں بہت سے دیگر حقائق سمجھائے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ :- اور البتہ تحقیق ہم نے پیدا کیا ہے تم کو پھر صورتیں بنائی ہیں تمہاری - پھر کہا ہم نے فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم (علیہ السلام) کو - پس سجدہ کیا انھوں نے مگر ابلیس نے۔ نہ تھا وہ سجدہ کرنے والوں میں سے ﴿۱۱﴾ فرمایا رب تعالیٰ نے کہ کس چیز نے روکا تجھ کو کہ تو نے سجدہ نہ کیا - جب کہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا - تو شیطان نے کہا میں بہتر ہوں اس سے - پیدا کیا تو نے مجھ کو آگ سے اور پیدا کیا ہے تو نے اس کو مٹی سے ﴿۱۲﴾ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اتر جاؤ یہاں سے - پس نہیں لائق تمہارے لیے کہ تم تکبر کرتے اس میں۔ پس نکل جاؤ ، بیشک تم ذلیلوں میں سے ہو ﴿۱۳﴾

ربط آیات سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے نزول اور اسکی اشاعت کا تذکرہ

کیا اور سکذبین کو اس دنیا اور آخرت کے انجام سے آگاہ کیا۔ پھر گذشتہ درس میں انسانی اعمال کی حفاظت اور آخرت میں اُن کے وزن کا بیان آیا اور اس کے نتیجے میں نجات یا خسارے کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر اللہ نے اُن دو عظیم نعمتوں کا ذکر کیا جو اس نے انسان کو عطا فرمائی ہیں یعنی زمین میں اقتدار اور معیشت کے سامان۔ مگر بطور شکوہ یہ بھی بیان فرمایا کہ اکثر لوگ ان نعمتوں کی ناقدری کرتے ہیں اور ان کا غلط استعمال کرتے ہیں اور بالآخر ناکام رہتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ بہت قلیل لوگ ہیں جو ان نعمتوں کا حق ادا کرتے ہیں۔

انعامات کے ہی ضمن میں آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسان جیسے انعام کا ذکر فرمایا ہے۔ انسانی تخلیق اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک نمونہ ہے اس مقام پر نسل انسانی کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسان کے ازلی ابدی دشمن شیطان اور اس کی کارگزاری کا بھی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یاد دلایا ہے کہ یہ تمہارا دیرینہ دشمن ہے لہٰذا اس سے ہمیشہ محتاط رہنا چاہیئے۔ اگر اس کے پھندے میں پھنس گئے تو ناکام ہو جاؤ گے۔ بہرحال یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ انسان کی تمام ترقیات کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں ہے اور پھر آپ کے زمین پر آنے اور یہاں نشوونما پانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کو ترقی اور عروج حاصل ہو اور اس کا واحد ذریعہ اتباع ہدایت ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی وحی کا اتباع کرے گا تو وہ اپنے جد امجد کا کھویا مقام جنت دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے عمل کا وسیع میدان چھوڑ دیا ہے۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش میں اُن کے خلیفۃ اللہ ہونے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ گذشتہ سورۃ الانعام کے آخر میں بھی خلافت الٰہی کا ذکر ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کیا اور نائب کا فرض یہ ہے کہ

وہ اپنے حاکم اعلیٰ کی مکمل فرمانبرداری کرے اور اُس کے دیے ہوئے قانون کو
نافذ کرے۔ آدم علیہ السلام کی وساطت سے پوری نوع انسانی اللہ تعالیٰ کی طرف
سے منصب خلافت پر فائز ہے۔ گذشتہ سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات
یاد دلائی ہے وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰٓئِفَ الْأَرْضِ اسی اللہ
نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ خلافت کے
حق کو ٹھیک ٹھیک ادا کرو۔

تخلیق نوع انسانی

ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَٰكُمْ البتہ تحقیق ہم نے تمہیں
پیدا کیا۔ نسل انسانی کی پیدائش کی ابتداء اس طرح کی کہ سب سے پہلے تمہارے جد امجد حضرت
آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ خَلَقَهُۥ مِن تُرَابٍ (آل عمران) آپ کی پیدائش
مٹی سے ہوئی اور پھر آگے اللہ تعالیٰ نے توالد اور تناسل کے ذریعے نسل انسانی
کو پھیلایا۔ اللہ تعالیٰ نے مٹی سے آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بنایا، پھر اُس میں روح
ڈالی اور اس طرح نسل انسانی کی ابتدا فرمائی

ثُمَّ صَوَّرْنَٰكُمْ پھر یعنی پیدا کرنے کے بعد ہم نے تمہیں صورت
بخشی۔ لفظ ثُمَّ سے اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کیا انسانی شکل و صورت پیدائش
کے بعد بنتی ہے؟ نہیں بلکہ انسان اپنی شکل و صورت کے ساتھ ہی پیدا ہوتا
ہے۔ دراصل بعض اوقات ثُمَّ تاخیر کے لیے نہیں بلکہ عطف کے
لیے بھی آتا ہے۔ تو یہاں پر عطف ہی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے
تمہیں پیدا کیا اور صورت بخشی۔ بعض مفسرین کرام پیدائش سے مراد جد امجد حضرت
آدم علیہ السلام کی پیدائش لیتے ہیں اور اس کے بعد تمہیں یعنی انسانی نسل کو
پیدا کیا اور شکل و صورتیں عطا کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی شکل و صورت
تو شکم مادر ہی میں بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هُوَ الَّذِي
يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ "وہی اللہ ہے جو رحموں
میں تمہاری صورت بناتا ہے جیسی چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم مادر میں قطرۂ آب کو

تصویر کشی کرتا ہے۔ غرضیکہ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر خلق کا تعلق حضرت آدم علیہ السلام سے ہے اور تصویر کا تعلق نوع انسانی سے ہے۔

بعض مفسرین اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ خلق اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ جب اعیانِ ثابتہ کے دور میں اس صفت کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی عینِ ثابت تشخص کو قائم فرما دیا جب کہ خارج میں ابھی اس کا وجود نہیں تھا۔ پھر اس مادی جہان میں آکر انسان کا خاکی وجود تیار ہوا اور چار ماہ میں اس کا جسم بنا۔ پھر امرِ الٰہی جسے روحِ الٰہی بھی کہتے ہیں چوتھے مہینے میں آکر جسم کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور پھر وہ ایک مکمل انسان بن جاتا ہے شکمِ مادر میں ساری منزلیں طے کرنے کے بعد اُسے اس جہان میں وارد ہونے کا موقع ملتا ہے غرضیکہ ہر انسان کا تشخص تو بہت پہلے سے قائم ہے اور خدا تعالیٰ کے علم میں ہے مگر اس کا ظاہری جسم بعد میں بنتا ہے۔ دنیا میں آکر انسان پھر اپنی آخری منزل کی طرف رواں ہو جاتا ہے پھر یا تو اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے یا تنزل میں پہنچ جاتا ہے۔

عظمتِ انسان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا اُسے شکل و صورت بخشی اور اسے ساری مخلوق پر عظمت عطا کی۔ انسانی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے اُسی نے اپنے مقربین فرشتوں کو حکم دیا ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی طرف سجدہ کرو۔ امام شاہ ولی اللہؒ کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کی خدمت اور مصلحت کے لیے ملائکہ کو تقریباً ۸ سال پہلے پیدا کر دیا تھا۔ گویا تخلیقِ کائنات کا مقصود انسان کی پیدائش ہے اور باقی چیزیں اللہ نے اس کی خدمت کے لیے پیدا فرمائیں پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کی بلندیٔ عظمت کا اظہار کرنے کے لیے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ ہر شریعت میں سجدہ عبادت

صرف اللہ تعالیٰ کے لیے روا رہا ہے اور اُس کے علاوہ کسی کے سامنے یہ سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے جس سجدے کا حکم فرشتوں کو دیا وہ تعظیمی سجدہ تھا جو بعض شریعتوں میں مباح تھا مگر ہماری شریعت میں تعظیمی سجدہ بھی روا نہیں ہے البتہ تعظیم ہو سکتی ہے جیسے ملاقات کے وقت ہوتی ہے مگر انتہائی تعظیم عبادت کا دوسرا نام ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے بہرحال یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے کرایا گیا تھا۔

بعض فرماتے ہیں کہ جس سجدہ کا ذکر ہو رہا ہے یہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تھا البتہ اس کے لیے حضرت آدم علیہ السلام بمنزلہ قبلہ کے تھے۔ جس طرح اب مسلمان قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی طرف رُخ کر کے اللہ تعالےٰ کو سجدہ کیا تھا (یا فرشتوں کا سجدہ اس تجلی اعظم کی طرف تھا جو آدم علیہ السلام کے قلب مبارک پر پڑ رہی تھی) بہرحال اگر اس کو آدم علیہ السلام کی ذات پر محمول کیا جائے تو یہ تعظیمی سجدہ تھا نہ کہ سجدۂ عبادت۔

فرشتوں کا سجدہ

بہرحال اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ سب نے سجدہ کیا ما سوائے ابلیس کے سورۃ الحجر میں آتا ہے فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہاں تمام فرشتوں سے مراد ملاء اعلیٰ کے علاوہ باقی تمام فرشتے ہیں اگرچہ ملاء اعلیٰ کے فرشتے سجدہ کرنے کے حق میں تھے مگر فی الحقیقت انہوں نے خود سجدہ نہیں کیا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ملاء اعلیٰ کے علاوہ باقی ملائکہ عنصرین کہلاتے ہیں اور ان کا درجہ ملاء اعلیٰ سے کم ہے۔ ملائکہ عنصرین کا وجود مختلف عناصر سے بنا ہوا ہے اسی طرح شیطان اور جنات کا وجود بھی مختلف عناصر کا مرکب ہے اس لحاظ سے ابلیس کو فرشتوں کے ساتھ نسبت تھی مگر نہ وہ فرشتہ نہیں تھا۔ فرشتوں میں رچا بسا تھا اور اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار

تھا۔ صوبہ بہار کے خواجہ یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ابلیس نے سات لاکھ برس خدا تعالیٰ کی عبادت کی مگر جب امتحان کا وقت آیا تو ناکام ہو گیا۔ اسی لیے خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ کسی انسان کو عبادت یا کسی اور چیز پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔ نامعلوم کب انسان کسی ابتلا میں مبتلا ہو جائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں برصیصا نامی ایک راہب گزرا ہے جس نے چار سو سال تک خدا کی عبادت کی مگر اس کا انجام کفر پر ہوا۔ اسی طرح بلعم بن باعوراء بھی نیک اور صاحب کرامت آدمی تھا مگر موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی وجہ سے ایمان کی دولت سے محروم ہو کر اس دنیا سے گیا۔ لہٰذا ہر شخص کو ہمیشہ عاجزی اور انکساری کا اظہار کرنا چاہیئے اور غرور و تکبر کو قریب نہیں آنے دینا چاہیئے خواجہ صاحب کا مذکورہ قول کسی حدیث سے تو ثابت نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کی کشفی بات ہو یا کسی تاریخ نے واقعہ نقل کیا ہو۔ خواجہ صاحب کی بات ایسے ہی نہیں ہو سکتی، آپ بہت بڑے بزرگ ہوئے ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین چشتیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے، اُن کے مکتوبات میں یہ درج ہے

ابلیس کا انکار

فرمایا ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس سے دریافت کیا قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو تو نے سجدہ کیوں نہ کیا یعنی کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے منع کیا تو شیطان نے اپنا فلسفہ چھانٹتے ہوئے کہا قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ یعنی میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں لہٰذا میں اُس کے سامنے کیسے جھک سکتا ہوں، میں تو صرف تیرے سامنے ہی سجدہ ریز ہوں گا۔ شیطان نے اپنی برتری کے لیے یہ دلیل پیش کی خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے جبکہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے، لہٰذا میں اُس سے افضل ہوں حدیث شریف

میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ تیار کیا تو ملائکہ دیکھ رہے تھے۔ ابلیس نے بھی اس کا بغور جائزہ لیا اور کہنے لگا کہ یہ مجسمہ اندر سے کھوکھلا ہے اور اس میں کوئی چیز داخل کی جا سکتی ہے یعنی انسان کو بہکایا جا سکتا ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ انسان واقعی کھوکھلا ہے اور وسوسے کے ذریعے اسے ورغلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آگے آ رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مردود قرار دے دیا تو پھر اُس نے بنی آدم کو ورغلانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی، جو اسے دی گئی اور اب قیامت تک انسان کا دشمن ہے اور ہر طریقے سے اسے ورغلانے کی کوشش کرتا ہے۔

یہاں پر ایک اور اشکال کی وضاحت بھی ہو جانی چاہیے کہ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم صرف ملائکہ کے لیے تھا۔ سورۃ البقرہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ آتے ہیں وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حکم صرف ملائکہ کو تھا تو پھر ابلیس نے سجدہ نہ کر کے کون سی حکم عدولی کی؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے الفاظ اِذۡ اَمَرۡتُکَ سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتوں کے علاوہ ابلیس کو بھی سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ملائکہ خواہ ملاءِ اعلیٰ کے ہوں یا ملائکہ عنصرین اُن کو سجدے کا حکم ہوا تو یہ حکم ابلیس کے لیے بھی تھا وہ انکار کر کے ہمیشہ کے لیے ملعون ٹھہرا۔

آگ اور مٹی میں افضلیت

ابلیس نے اپنی برتری کی جو وجہ بیان کی وہ یہ تھی کہ آگ کو مٹی پر فوقیت حاصل ہے۔ آگ میں روشنی، چمک اور بلندی پائی جاتی ہے جب کہ مٹی ایک حقیر چیز ہے جو پاؤں تلے روندی جاتی ہے۔ یہ شیطان کی سوچ تھی حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ آگ بھی ایک عنصر ہے اور مٹی بھی۔ اس لحاظ سے تو کسی کو فوقیت حاصل نہیں مگر یہ شیطان کی بدقسمتی ہے کہ وہ فضیلت کے اصلی عنصر کو نہ سمجھ سکا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آگ کی نسبت مٹی کو زیادہ افضلیت حاصل ہے کیونکہ خاک میں حلم، بردباری، انکساری وغیرہ پائی جاتی ہے جب کہ آگ میں حرارت تیزی، خفت، طیش اور چھچھورا پن پایا جاتا ہے۔ یہی چیزیں ابلیس میں بھی پائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے اُس میں ہلکا پن پایا جاتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی تجلیات سے مستفید ہونے کی صفت صرف انسان میں پائی جاتی ہے حتیٰ کہ ملائکہ بھی اللہ کی صفاتی تجلیات سے ہی مستفید ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی حال جنات کا ہے۔ حضرت مجددؒ اس کی مثال یوں بیان فرماتے ہیں کہ سورج کی روشنی لطیف چیزیں میں نمایاں نہیں ہوتی بلکہ کثیف چیزیں میں ہوتی ہے۔ جیسے ہوا ایک لطیف چیز ہے، سورج کی روشنی اس پر پڑتی ہے مگر اپنے آپ کو نمایاں نہیں کر سکتی۔ جب یہی روشنی زمین اور اُس پر موجود اشیا پر پڑتی ہے تو بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح فرشتے اور جنات چونکہ لطیف مخلوق ہیں اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی تجلیات کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور صرف صفاتی تجلیات سے مستفید ہوتے ہیں جب کہ انسان ایک کثیف مخلوق ہونے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی ذاتی تجلیات کا متحمل ہونے کا اہل ہے۔ اس معاملہ میں غالب نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔

ع لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

یہاں پہ صبح کی نسیم طیب کو شیشے اور چمن کو اس کے زنگار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح شیشہ بغیر زنگار کے تصویر پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح بغیر چمن کے نسیم طیب بھی اپنا جلوہ نہیں دکھا سکتی۔ گویا زنگار رنگ پھول اور پھل چمن کے مرہون منت ہیں۔ مطلب یہ کہ انسان میں ایک قسم کی کثافت پائی جاتی ہے جس پہ خدا تعالیٰ کی ذاتی تجلیات کا جلوہ ظاہر ہو سکتا ہے جو کہ

ملائکہ اور جنات جیسی لطیف مخلوق پر نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے فوقیت ابلیس ناری کو حاصل نہیں بلکہ انسان خاکی کو ہے۔

بشار ابن برد آتش پرست تھا اور شاعر تھا، اُس نے شیطانی فلسفے کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ابلیس افضل من ابیکم ادم
فتبینوا یامعشر الاشرار
النار عنصرہ وادم طینۃ
والطین لا یسمو سمو النار

اے گروہِ انسان ابلیس تمہارے جدامجد آدم علیہ السلام سے افضل ہے۔ ابلیس کا عنصر آگ ہے جب کہ آدم مٹی سے ہے اور مٹی آگ کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی۔ غرضیکہ شیطان کی دلیل غلط تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آدم خاکی میں وہ کمال رکھا ہے جو ابلیس اور آگ کو حاصل نہیں۔

حسد اور تکبر

حسد اور تکبر دو مہلک بیماریاں ہیں۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسرے کی نعمت پر حسد کرنا بہت بری خصلتیں ہیں۔ ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے۔ مَنْ فَارَقَ رُوْحُہٗ الْجَسَدَ وَھُوَ بَرِیْئٌ مِّنَ الْکِبْرِ وَالْغُلُوْلِ وَالدَّیْنِ دَخَلَ الْجَنَّۃَ جس شخص کی روح اُس کے جسم سے اس حالت میں جدا ہو کہ اُس میں تین چیزیں تکبر، خیانت اور قرضہ نہ پایا جائے، وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ ان تینوں عیوب سے پاک آدمی جنت کا مستحق ہے بشرطیکہ اس میں ایمان موجود ہو حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے لَا یَفْخَرْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّلَا یَبْغِیْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَعْضٍ تم میں سے بعض بعض پر فخر نہ کرے اور نہ ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کرے۔ ہمیشہ آپس میں تواضع سے پیش آنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبات کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

اَخْبَتُوْا اِلٰی رَبِّهِمْ اپنے رب کے سامنے عاجزی کرو، بلندی نصیب ہوگی۔ تکبر صرف اللہ کو سزاوار ہے لہٰذا "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" (سورۃ مدثر) اپنے رب کی کبریائی بیان کرو۔ حدیث قدسی میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعَظَمَةُ اِزَارِي یعنی بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میرا تہبند ہے۔ جو ان چیزوں کو اپنے اوپر فٹ کرنا چاہے گا، میں اُسے ذلیل کر دوں گا، کیونکہ عظمت و کبریائی، بلندی اور تکبر خدا کی ذات کے ساتھ لائق ہے، اس کے علاوہ کوئی حقدار نہیں۔ ابلیس نے بھی تکبر کیا، اپنے آپ کو بڑا اور افضل سمجھا اور آدم کو حقیر جانا لہٰذا وہ راندۂ درگاہ ہوا۔

ابلیس کی رسوائی

جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی اور تکبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا جنت سے نکل جاؤ وَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا تیرے لائق نہیں تھا کہ تو یہاں غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتا تجھے تو عاجزی کا اظہار کرنا چاہیے اور تعمیل حکم کرنی چاہیے تھی۔ فَاخْرُجْ یہاں سے نکل جاؤ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ تم ذلیلوں میں سے ہو۔ غرور کی وجہ سے شیطان پر ذلت کا ٹھپہ لگ گیا۔ جو بھی غرور کریگا، ذلیل و خوار ہوگا۔ اس کے برخلاف مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ جو عاجزی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بلند کریگا۔ یہ مکالمہ اگلی آیات میں بھی چل رہا ہے آدم علیہ السلام کی تخلیق اور شیطان سے مکالمے کے ضمن میں بہت سی باتیں سمجھائی گئی ہیں، جن میں ہمارے لیے بڑی تعلیم ہے۔

قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

ترجمہ :- کہا (شیطان نے) مہلت دے مجھے اُس دن تک جب یہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے ﴿۱۴﴾ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) بیشک تو مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے ﴿۱۵﴾ کہا (ابلیس نے) پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا ہے، میں ضرور بیٹھوں گا اُن کے لیے تیرے سیدھے راستے میں ﴿۱۶﴾ پھر آؤں گا اُنکے پاس آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے اور نہ پائے گا تو اُن میں سے اکثروں کو شکر گزار ﴿۱۷﴾ فرمایا (رب تعالیٰ نے) نکل جاؤ یہاں سے مذمت کیے ہوئے اور دھکیلے ہوئے، البتہ جو تیری پیروی کرے گا اُن میں سے تو میں بھر دوں گا جہنم کو تم سب سے ﴿۱۸﴾

ربط آیات: سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کا ذکر فرمایا اور اس کے اتباع کا حکم دیا، پھر نافرمانی کرنے والوں کا انجام بیان فرمایا۔ محاسبے کے عمل اور اعمال کے وزن سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد انسان پر کیے جانے والے دو انعامات کا ذکر کیا، ایک زمین پر تسلط اور دوسرا ذرائع معیشت، پھر انسان کی تخلیق کا مسئلہ بھی بیان فرمایا۔ انہیں بہترین شکل و صورت عطا کی اور زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔ نیز آدم علیہ السلام کو مسجودِ ملائکہ بنایا تاکہ اس کی اولاد کی برتری تمام مخلوق پر ثابت ہو جائے۔

پھر اسی ضمن میں یہ بھی بیان فرمایا کہ شیطان لعین نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور غرور میں مبتلا ہو کر اپنی بڑائی کا اظہار کیا۔ اور اپنے آپ کو آدم علیہ السلام پر فوقیت دینے کی کوشش کی۔ شیطان نے اپنی برتری کے متعلق یہ فلسفہ بیان کیا کہ اُسے آگ سے پیدا کیا گیا ہے جب کہ آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے اس تکبر کا رد کیا کیونکہ تکبر کرنا صرف خدا تعالیٰ کی شان ہے۔ مخلوق کی شان عاجزی اور انکساری میں ہے۔ جس نے اکڑ دکھائی اللہ نے اُسے ذلیل قرار دیا اور اُسے اپنی رحمت کے مقام سے دور کر دیا۔ پھر ضمناً یہ بات بھی آگئی کہ آگ کو خاک پر کوئی برتری حاصل نہیں، آگ میں طیش، غصہ، تپش اور بلندی ہے جو کہ تکبر کی نشانی ہے جب کہ مٹی میں سکون، وقار، عاجزی اور انکساری ہے اور مخلوق کے لیے یہی چیز بہتر ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا بِئْسَ الْعَبْدُ وہ آدمی کتنا بُرا ہے جو خدا تعالیٰ کی ہستی کو فراموش کر دیتا ہے، غفلت اختیار کرتا ہے اور تکبر کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی سمجھا دی کہ شیطان کی طرح جو بھی تکبر کرے گا وہ ذلیل و خوار ہوگا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے یُحْشَرُ الْمُتَکَبِّرُوْنَ کَاَمْثَالِ الذَّرِّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ قیامت والے دن متکبر لوگ چیونٹیوں

کی طرح چھوٹے چھوٹے بنا کر اٹھائے جائیں گے تاکہ وہ ذلیل ہو جائیں۔ پھر جب یہ حساب کتاب کی منزل آئیگی تو ان کے قد معمول کے مطابق بڑے ہو جائیں گے۔
شیطان کو ذلیل کرنے والی دوسری چیز حسد تھی۔ بزرگان دین کا قول ہے کہ خَلَا جَسَدٌ مِّنْ حَسَدٍ یعنی شاید ہی کوئی جسم حسد سے خالی ہوگا۔ یہ بھی بہت بڑی بیماری ہے بہر حال ان دو وجوہات سے شیطان بارگاہ رب العزت سے مردود ہوگیا اور اللہ نے فرمایا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ یہاں سے نکل جاکہ تم ذلیل ہو۔ اس طرح شیطان نہ صرف اپنی لاکھوں سال کی عبادت گنوا بیٹھا بلکہ اپنی صلاحیت بھی کھو بیٹھا۔

شیطان کی دعا

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور شیطان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پہ کیا ہے۔ اس میں ایک طرف تو انسان کو اپنی حیثیت یاد دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پہ انعامات کیے ہیں، اُسے اپنا خلیفہ بنایا ہے لہذا اس کا فرض ہے کہ وہ ایسے کام انجام دے جو اس کی شان کے لائق ہیں اور دوسری طرف اُسے اس کے دشمن شیطان سے خبردار کیا ہے اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ترجمہ: شیطان تمہارا دشمن ہے، اس کو دشمن ہی سمجھو۔ اسی سورۃ میں شیطان کی دشمنی کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں آئیں گی کہ وہ کس طرح لوگوں کو گمراہ کر کے کفر اور شرک کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ مگر لوگ بالکل بے خبر ہیں، انہیں سمجھ ہی نہیں آرہی ہے کہ انہیں کس طرف سے جایا جا رہا ہے جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مردود قرار دے دیا تو اس وقت اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کی قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ مجھے مہلت دے دیں اس دن تک جس دن یہ اٹھائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے درخواست قبول فرمائی اور فرمایا قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ جاؤ تمہیں حسب خواہش مہلت دے دی گئی۔ دوسرے مقام پہ آتا ہے۔ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ الخ

تمہیں معلوم وقت تک مہلت دی۔ یہاں پر وقت سے مراد حساب کتاب کا وقت نہیں بلکہ پہلی دفعہ صور پھونکے جانے کا وقت ہے۔ یعنی اُس وقت تک تجھے لوگوں کو ورغلانے کی اجازت ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ بزرگانِ دین کا قول نقل کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی دُعا قبول ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ وہ خدا تعالیٰ کا مقرب بن گیا ہے اور نہ اُسے اِس پر مغرور ہونا چاہیئے کیونکہ دُعا کی قبولیت کسی کی بحیثیت مجموعی قبولیت کی علامت نہیں۔ دیکھو شیطان راندۂ درگاہ ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کی دُعا بھی قبول فرمالی اور اُسے قیامت تک کے لیے مہلت دیدی۔ اسی طرح دُعا تو کسی کافر اور بڑے نافرمان کی بھی منظور ہو سکتی ہے مگر یہ کوئی بزرگی کی نشانی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقرب کی بنیاد ایمان، توحید اور نیکی ہے۔ سورۃ حجرات میں موجود ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اللہ کے نزدیک صاحب عزت وہ شخص ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے محض کرشمہ ظاہر ہونے کی بنا پر بھی کوئی شخص اللہ کا مقرب نہیں بن سکتا کیونکہ کرشمے تو دجال کے ہاتھ سے بھی ظاہر ہوں گے اور دنیا دنگ رہ جائے گی۔

شیطان کا عزم

جب شیطان کی یہ دُعا قبول ہو گئی کہ اُسے قیامت تک مہلت دیدی گئی ہے تو اُس نے اپنے عزم کا اظہار اُسی وقت کر دیا۔ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ شیطان نے کہا، پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرا دیا ہے۔ شرارت تو بیشک میری ہی تھی، میں نے ہی تکبر کا اظہار کیا۔ اب جبکہ تو نے میرے متعلق فیصلہ کر ہی دیا ہے تو اب میرا ارادہ یہ ہے لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ کہ میں بنی نوع انسان کیلئے تیرے سیدھے راستے پر ضرور بیٹھوں گا اور انہیں گمراہ کر کے تیرے صراطِ مستقیم سے ہٹانے کی کوشش کروں گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی جہاد کیلئے جاتا ہے تو راستے میں شیطان ملتا ہے

اور اُس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ جہاد میں جا رہے ہو، مارے جاؤ گے تمہاری بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے، اس کام سے باز آجاؤ۔ اس طرح جو آدمی زکوٰۃ کا مال لے کر نکلتا ہے، اس کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ اتنی رقم دے کر تم قلاش ہو جاؤ گے۔ سورۃ بقرہ میں آتا ہے اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے کہ مال خرچ نہ کر بیٹھنا، خود کنگال ہو جاؤ گے۔ نمازی جب نماز کے لیے نکلتا ہے تو شیطان پھر حملہ آور ہوتا ہے کہ کوئی کام کی بات کرو جس سے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کا فائدہ ہو محض ٹکریں مارنے سے کیا فائدہ۔ غرضیکہ شیطان ہر طریقے سے انسان کو نیکی کے کام سے روکنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اُس نے چیلنج کر رکھا ہے کہ اے مولا کریم! میں تیرے سیدھے راستے میں بیٹھوں گا اور اُس پر چلنے والے ہر انسان کو ورغلانے کی کوشش کروں گا کہ وہ اس راستے سے ہٹ کر میرے گروہ میں شامل ہو جائے۔

آگے اور پیچھے سے اغوا

شیطان نے کہا کہ اے اللہ! میں تیرے صراطِ مستقیم پر بیٹھ جاؤں گا ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ پھر اس راستے پر چلنے والوں کے پاس آگے سے بھی آؤں گا وَمِنْ خَلْفِهِمْ اور اُن کے پیچھے سے بھی آؤں گا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اس کی تفسیر یوں بیان فرماتے ہیں کہ آگے سے مراد آخرت ہے۔ انسان اپنی آخری منزل کی طرف ہی رواں دواں ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ شیطان نے کہا کہ میں انسان کو آخرت کے معاملہ میں گمراہ کروں گا اس کے دل میں وسوسہ ڈالوں گا کہ قیامت یعنی آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے نہ کوئی حساب کتاب کی منزل آئے گی، نہ دوزخ جنت کوئی چیز ہے یہ سب بنائی ہوئی کہانیاں ہیں لہٰذا تم آگے کا کچھ فکر نہ کرو۔ غرضیکہ شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان کا آخرت پر اعتقاد ضعیف کر دے تاکہ وہ محاسبے کے عمل سے بے نیاز

ہوکر سرمائی کرتا پھرے اور اس طرح بالآخر جہنم میں پہنچ جائے۔
اور پیچھے سے مراد یہ دنیا ہے یعنی میں دنیا کے راستے سے بھی آکر لوگوں کو گمراہ کروں گا۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ میں اس دنیا کے لوازمات کو لوگوں کے لیے مزین کر کے دکھاؤں گا لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ (الحجر) میں دنیا کو لوگوں کے سامنے اس خوبصورت انداز سے پیش کروں گا کہ وہ اس کے گرویدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ میں لوگوں کو عجب طمع اور عجائب رسم پر ڈال دوں گا۔ وہ یا تو ذاتی زیب و زینت میں مصروف رہیں گے، کوٹھی، کار، اور بنک بیلنس کے چکر میں پھنسے رہیں گے بیوی بچوں میں الجھے رہیں گے یا پھر قوم اور برادری کے رسم و رواج میں پھنس کر رہ جائیں گے کبھی شادی کے لیے زیورات، کپڑے، جہیز اور فرنیچر کے چکر میں پھنسے رہیں گے اور کبھی مرنے پر ساتے اور چالیسویں کریں گے، کبھی عرس منائیں گے، کبھی چادریں چڑھائیں گے۔ اس طرح لگا کر میں انہیں اللہ کے سیدھے راستے سے ہٹا دوں گا۔

دائیں اور بائیں سے اغوا

شیطان نے یہ بھی کہا کہ میں آؤں گا تیرے بندوں کے پاس وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ ان کے دائیں سے وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ اور ان کے بائیں سے۔ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق دائیں سے مراد نیکی اور حسنات ہے جب کہ بائیں سے مراد برائی ہے۔ نیکی میں گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو نیکی کرنے ہی نہ دی جائے یا یہ کہ نیکی کرنے کے باوجود اس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ اس معاملے میں بھی شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ نیکی سے روکنے کی صورت تو یہ ہے کہ وسوسہ اندازی کے ذریعے کسی کو جہاد، نماز، زکوٰۃ یا حج سے روک دے یا کسی غریب کی امداد نہ کرنے دے اور اگر نیکی کا کام انجام دینے کے باوجود اس میں ریاکاری کا عنصر شامل ہو جائے تو وہ کی ہوئی نیکی بھی ضائع ہو گئی۔ یا نیکی کے ضیاع کی یہ صورت بھی ہے کہ وہ

حضور علیہ السلام کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ ہو۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَّيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ (بخاری مسلم) جو کام ہمارے طریقے کے مطابق نہ ہو، وہ مردود ہے۔ بدعات کی اسی لیے مذمت کی جاتی ہے کہ وہ کام حضور علیہ السلام کے طریقے کے مطابق نہیں ہوتا۔ اس طرح گویا شیطان دائیں یعنی نیکی اور دین کے کاموں میں بہکانے کی کوشش کرے گا۔

اور بائیں طرف یعنی برائی سے مراد یہ ہے کہ شیطان انسان کو برائی کے کاموں کی ترغیب دے۔ اُس نے اعلان کیا کہ میں برائیوں کو مزین کر کے دکھاؤں گا اور لوگوں کو گمراہ کروں گا۔ سورۃ بقرہ میں ہے اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ شیطان تمہیں برائی اور بے حیائی کی ترغیب دیتا ہے۔ ایسا وسوسہ ڈالتا ہے اور ایسی حکمت بیان کرتا ہے کہ انسان برائی پہ آمادہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ گھبرا، کوئی دیکھنے والا نہیں، کوئی نہیں پوچھے گا، کبھی کہتا ہے پکڑا جائیگا تو فلاں چھڑا لیگا، کبھی کہتا ہے کوئی بات نہیں ابھی بڑی عمر ہے۔ توبہ کر لینا۔ غرضیکہ ہر طریقے سے انسان کو ورغلانے کی کوشش کرتا ہے۔ بائیں طرف سے نفسانی خواہشات بھی مراد ہیں۔ ساری عمر انسان انہی کی تکمیل میں لگا رہتا ہے اور نیکی کرنے کا موقع نہیں ملتا حتیٰ کہ انسان کی موت کا وقت آ جاتا ہے۔

بہرحال جب شیطان مردود ٹھہرا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی جو عطا کی گئی تو اُس نے کہا کہ میں تیرے بندوں کو چار سمتوں یعنی آگے۔ پیچھے، دائیں اور بائیں سے آ کر گمراہ کروں گا۔ ان کے دلوں میں وسوسے ڈالوں گا پھر کوئی منکر ہو جائیگا اور کوئی شک میں پڑ جائیگا تو میرا کام پورا ہو جائے گا۔ دوسرے مقام پہ آتا ہے۔ کہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو جو چاہے کر لے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ

(لیکن) میرے بندوں پہ تیرا داؤ نہیں چلے گا۔ البتہ جو تیرا اتباع کریں گے۔ اُن کا انجام بہت بُرا ہوگا۔

اوپر اور نیچے کی جہت

اس مقام پر چار جہتوں کا ذکر آیا ہے حالانکہ کل چھ جہات ہیں شیطان نے اغوار کے لیے اُوپر اور نیچے کی جہت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ نیچے سے تو غضبِ الٰہی یا سزا ہی آسکتی ہے، اس لیے اس طرف سے شیطان کے بہکانے کا کوئی چانس نہیں۔ اور اُوپر کی طرف سے بھی شیطان کا بس نہیں چل سکتا کیونکہ اُوپر کی طرف سے صرف اللہ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ البتہ باقی چاروں اطراف سے شیطان کے بہکاوے اور گمراہی کا امکان ہے۔ اس کے متعلق سعدی صاحبؒ نے بھی کہا ہے۔

بر سائبانِ حسنِ عمل اعتماد نیست
سعدی مگر بہ سایۂ لطفِ خدا رود

یعنی ہمیں اچھے عمل کے سائبان پر تو کچھ اعتبار نہیں لہٰذا سعدی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں ہی جا رہا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے شیطان کی خواہش پر اُسے مہلت دے دی خواہ وہ اس کے بندوں کو بہکانا ہی چاہتا تھا۔ مہلت دینا بھی اللہ کی رحمت کا فیضان ہے۔ وہ بسا اوقات مجرموں کو مہلت بھی دے دیتا ہے۔

اکثریت ناشکر گزار ہے

شیطان نے کہا کہ اے اللہ! میں تیرے بندوں کو چاروں جہات سے گمراہ کروں گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا، وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ اور تو نہیں پائیگا ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والے، یعنی لوگوں کی اکثریت میرے بہکاوے میں آجائیگی۔ دوسرے مقام پر اللہ نے فرمایا کہ اُس وقت شیطان نے یہ بات محض اندازے سے کہی تھی کہ میں تیرے بندوں کو ہر طریقے سے گمراہ کروں گا وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ

ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۃ سبا)
مگر ابلیس نے اپنے اندازے کو سچا کر دکھایا اکثر لوگوں نے دنیا میں شیطان
ہی کا اتباع کیا اور ناشکر گزار ثابت ہوئے ۔ ہر زمانے اور ہر دور میں اکثریت
منکرین ہی کی رہی ہے ۔ اکثر لوگ شیطان کے پیچھے لگنے والے ہوتے ہیں ۔
شیطان نے اپنا یہ عزم تخلیق آدم کے وقت کیا تھا جو کہ ایک گمان کی بات
تھی مگر اب اس نے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے ۔

بہر حال شیطان کے اس ارادے کے جواب میں اللہ تعالے نے
اسی وقت کر دیا قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا یہاں سے نکل جاؤ ۔ جس مقام
پر بھی یہ مکالمہ ہوا، وہ جنت تھی یا کوئی اور جگہ، اللہ نے فرمایا یہاں سے
دفع ہو جاؤ ۔ مَذْءُوْمًا مذمت کیے ہوئے ۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے
حکم کی خلاف ورزی کر کے اور اس کے بندوں کو بہکانے کی مہلت حاصل کر کے
شیطان قابلِ مذمت ٹھہرا نہ کہ قابلِ تحسین ۔ تو فرمایا نکل جاؤ مذمت کیے ہوئے
مَّدْحُوْرًا دھکیلے ہوئے یعنی رجیم اور مردود ۔ شیطان حکم عدولی کی وجہ سے
اللہ کی رحمت سے دھکیلا ہوا یعنی دور ہو گیا ۔ اب اس کے قبضہ میں صرف
اغوا اور وسوسہ اندازی ہی رہ گئی ہے ۔ اور پھر آگے آخرت میں چل کر بہت
برا انجام ہوگا ۔ آگے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح کر دی لَمَنْ
تَبِعَكَ مِنْهُمْ ان میں سے جو کوئی تیرا اتباع کریگا یعنی بنی نوع انسان
میں سے جو آدمی تیرے بہکاوے میں آجائیگا لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ
مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ تو میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو تم سب سے ۔ یعنی جو
بھی شیطان کی پیروی کرے گا اس کو بھی اور اس کے پیچھے لگنے والوں
سب کو جہنم میں داخل کروں گا گویا قیامت کے دن تابع اور متبوع سب
جہنم کا ایندھن بن جائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیطان اور اس کے
سب پجاری جہنم رسید ہوں گے ۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے

وقت ہی واضح کردی۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ
حضرت حوا کا ذکر بھی آرہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ شیطان کی کشمکش بھی دور
تک چلی گئی ہے۔ شیطان نے مشرکین کو شرک اور بے حیائی کی باتوں پہ
جس طریقے سے لگایا، اُس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ
حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا
مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ
لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا
نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا
مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَاۤ
اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ
فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا
يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰىهُمَا
رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ
لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

ترجمہ :- اور (فرمایا اللہ تعالیٰ نے) اے آدم (علیہ السلام)! رہو تم
اور تمہاری بیوی جنت میں پس کھاؤ جہاں سے تم چاہو اور نہ قریب
جانا اس درخت کے، پس ہو جاؤ گے تم زیادتی کرنے والوں
میں سے (۱۹) پس وسوسہ ڈالا اُن دونوں کے لیے شیطان نے
تاکہ ظاہر کر دے اُن دونوں کے لیے وہ چیز جو چھپائی گئی ہے
اُن دونوں سے اُن کی شرمگاہوں میں سے ۔ اور کہا (شیطان نے)

نہیں منع کیا تم کو تمہارے رب نے اس درخت سے مگر اس لیے کہ کہیں ہو جاؤ تم فرشتے یا ہو جاؤ تم ہمیشہ رہنے والوں میں سے (۲۰) اور قسم اٹھائی اس نے ان دونوں کے سامنے کہ میں تمہارے لیے خیرخواہوں میں سے ہوں (۲۱) پھر اتارا (شیطان نے) ان دونوں کو دھوکے کے ساتھ۔ پس جب چکھا ان دونوں نے درخت کو ظاہر ہو گئیں ان دونوں کے لیے ان کی شرمگاہیں۔ اور شروع کیا ان دونوں نے کہ ڈھانپنے لگے اپنے جسموں پر جنت کے پتوں سے۔ اور پکارا ان دونوں کو ان کے پروردگار نے کیا میں نے تم کو منع نہیں کیا تھا اس درخت سے اور کیا میں نے تم کو نہیں کہا تھا کہ بیشک شیطان تمہارے لیے کھلا دشمن ہے (۲۲)

ربطِ آیات

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کے نزول اور اس کے اتباع کا حکم دیا۔ جزائے عمل کے ضمن میں قرآن کریم کی مخالفت کرنے والوں کو برے انجام سے آگاہ کیا۔ پھر انسان کی تمکین فی الارض اور اس کے لیے سامانِ معیشت کا ذکر کیا۔ اس کے بعد انسان کی تخلیق اور اس کے اشرف ہونے کا بیان ہوا۔ اللہ نے آدم علیہ السلام کو مسجودِ ملائکہ بنایا اور دنیا میں اپنا نائب مقرر فرمایا۔ پھر ابلیس کے تذکرے میں فرمایا کہ اس نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا پھر اس انکار کی توجیہ یہ بیان کی کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور آدم علیہ السلام مٹی سے۔ آگ چونکہ مٹی کی نسبت ارفع ہے لہذا میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک اعلیٰ ہستی کم تر ہستی کے سامنے سجدہ نہیں کر سکتی شیطان کے اس تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے راندۂ درگاہ کر دیا۔ اس وقت شیطان نے اللہ کی بارگاہ میں کہا کہ تو نے میری گمراہی کا حکم تو لگا دیا ہے۔ اب مجھے وقتِ معلوم تک مہلت دیدے تاکہ میں تیرے بندوں کو آگے پیچھے، دائیں اور بائیں سے آ کر گمراہ کروں۔ اور تیرے بندوں کی اکثریت ناشکر گزار ہوگی۔ اس وقت تو شیطان نے یہ

بات اندازے سے کی تھی مگر بعد میں یہ سچ ثابت ہوئی۔ اللہ نے فرمایا یہاں سے
نکل جاؤ، جو شخص تمہارے پیچھے لگے گا انہیں تمہارے سمیت سب کو جہنم رسید کر دونگا

جنت میں سکونت

تخلیق آدم اور انکی برتری کے اظہار کے بعد اب آج کی آیات میں آدم
علیہ السلام کے جنت میں رہائش اختیار کرنے کا بیان ہے۔ اس دوران ابلیس
شیطان کی دشمنی، حسد اور عداوت کے ساتھ ساتھ آدم علیہ السلام کی لغزش
کا تذکرہ ہے اور پھر اس سے پیدا ہونے والے بعض واقعات کو ذکر کیا گیا ہے
چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَيَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم (علیہ السلام) تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو،
تمہیں وہاں سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام
کی تخلیق کا مسئلہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پہ بیان ہوا ہے۔ اس کا اکثر
حصہ سورۃ بقرہ میں چوتھے رکوع میں بیان ہو چکا ہے وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ
إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ وہاں پر میاں بیوی کے جنت
میں سکونت اختیار کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آدم علیہ السلام اور آپ کی زوجہ
کی تخلیق کا مسئلہ بھی اللہ نے سورۃ نساء کی ابتداء میں ذکر کیا ہے وَخَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا۔ آپ ہی کے جسم سے اللہ نے آپ کا جوڑا بھی نکالا تھا جو کہ
اللہ تعالیٰ کی حکمت تامہ اور قدرت کاملہ کا مظہر تھا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے
دونوں کو جنت میں رہنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

بنیادی ضروریات

رہائش کے لیے مکان انسان کی بنیادی ضروریات میں شمار ہوتا ہے
اقوام متحدہ سمیت رہائش کا مسئلہ دنیا کے ہر ملک کے لیے پریشان کن مسئلہ
بنا ہوا ہے جس کے لیے بڑے بڑے منصوبے تیار ہوتے ہیں مگر پوری
دنیا میں اس مسئلہ پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق
کے ساتھ ہی اس کی رہائش اور دیگر ضروریات کا مسئلہ درپیش ہوا تو اللہ تعالیٰ
نے سب سے پہلے آپ کی رہائش کا بندوبست کیا اور فرمایا کہ تم اور تمہاری زوجہ جنت

میں رہو، سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے لیے چار چیزوں کا ذکر فرمایا ہے کہ تم جنت میں رہو، وہاں تمہارے لیے یہ آسائشیں ہوں گی" اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى کہ وہاں تمہیں نہ بھوک کا فکر ہوگا اور نہ تم ننگے رہو گے، نہ پیاس ستائے گی اور نہ دھوپ، گویا دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی بنیادی ضروریات خوراک، لباس، پانی اور مکان کا انتظام کر دیا۔ اس زمانے میں اقوامِ متحدہ کے منشور کے تحت انسان کی بنیادی ضروریات کا بڑا چرچا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی ان کا ذکر کر کے ان چیزوں کو انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل کر لیا۔

اب ان چاروں چیزوں کے علاوہ بنیادی ضروریات میں تعلیم اور صحت کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

دراصل بنیادی ضروریات کی عدم فراہمی کی ذمہ داری بہت حد تک صاحبانِ اقتدار پر عاید ہوتی ہے۔ جب تک دولت کی تقسیم صحیح طریقے سے نہیں ہوگی یہ مسئلہ لاینحل رہیگا۔ قدیم زمانے سے دنیا میں ملوکیت کا دور دورہ رہا ہے یا ڈکٹیٹرشپ مسلط رہی ہے جسکی وجہ سے وسائل کی تقسیم صحیح نہیں ہو سکی۔ بعض لوگ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے پاس ضرورت سے زیادہ وسائل ہوتے ہیں مگر لوگوں کی اکثریت مصائب کا شکار رہتی ہے۔ لوگ آرام طلبی اور غلط امور میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں لہو و لعب ان کا دل پسند مشغلہ ہے، لہٰذا جن کے پاس وسائل ہیں وہ اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں اور دوسروں کے حقوق کا خیال نہیں کرتے جسکی وجہ سے مختلف طبقات کی تفاوت کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ چار بنیادی باتیں

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۵۳ ج۱ و ہمعات ص۸۹ (فیاض)

تمام ادیان میں ہمیشہ اٹل رہی ہیں۔ یہ اصول طہارت، اخبات (عاجزی اجتناب
خبیس باتوں سے اجتناب) اور عدل ہیں۔ یہ اصول ہماری شریعت میں بھی
بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ عدل سے مراد یہ ہے "اٰتِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ
حَقَّہٗ" ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو اور بنیادی حقوق میں اللہ نے یہ چار چیزیں
بیان فرمائی ہیں خوراک، لباس، پانی اور رہائش کے لیے جگہ جہاں وہ آرام کر
سکے اور گرمی اور سردی سے بچاؤ کر سکے۔ اس طرح تعلیم بھی انسان کی بنیادی
ضرورت ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنی عقلی ضروریات کو پورا کر سکے
پھر بنیادی تعلیم میں دینی تعلیم سب سے مقدم ہے۔ اتنی تعلیم ہر مرد و زن کے
لیے لازمی ہے جس سے وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پہچان سکے۔
طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (وَّمُسْلِمَۃٍ)
کا یہی معنیٰ ہے۔ اکثر انسانیت تعلیم سے بھی محروم ہے اتنی تعلیم تو جبری ہونی
چاہیئے جس سے انسان اپنے حقوق و فرائض کی پہچان کر سکے۔

بے علم نتواں خدا را شناخت

علم کے بغیر تو انسان خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ نہ اپنے حقوق کو پہچان سکتا ہے
اور نہ ہی نوع انسان کے حقوق کی پاسداری کر سکتا ہے۔ بہرحال یہ بنیادی
چیزیں ہر انسان کو نصیب ہونی چاہیئے۔ غذا انسان کو لازماً حاصل ہونی چاہیئے
کسی کو اچھی کسی کو کم تر، تاہم کوئی بھی اس سے محروم نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی
طرح مکان، لباس اور صحت بھی انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں۔

شجرِ ممنوعہ

فرمایا اے آدم علیہ السلام! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو فَکُلَا
مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا اور کھاؤ جہاں سے چاہو اور جو چیز چاہو۔ لیکن
وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ اور اس درخت کے قریب نہ جانا اگر
ایسا کرو گے، اس درخت کا پھل کھاؤ گے فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ
تو ہو جاؤ گے نقصان اٹھانے والوں میں سے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

آزمائش تھی کہ اس درخت کا پھل نہ کھانا۔ باقی جہاں سے جی چاہے کھاؤ۔ اور جتنا چاہو استعمال کرو۔

جس درخت سے منع کیا گیا وہ کونسا درخت تھا؟ اسکی تصریح قرآن پاک یا حدیث میں نہیں ہے۔ البتہ تورات میں مختلف قسم کی روایات ملتی ہیں۔ اس کو انجیر کا درخت بھی کہا گیا ہے۔ بعض نے گندم کا پودا اور بعض نے انگور کہا ہے بعض فرماتے ہیں کہ بائیبل کی روایت کے مطابق اس درخت سے مراد خیر و شر کی پہچان کا درخت ہے۔ بہرحال کوئی بھی درخت تھا جس کے قریب جانے سے منع فرمایا گیا اور فرمایا اگر قریب جاؤ گے تو ظلم کرنے والے ہو جاؤ گے۔

شیطانی وسوسہ

فرمایا فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ پس وسوسہ ڈالا ان دونوں کے لیے شیطان نے۔ عربی زبان میں وسوسہ باریک اور مخفی آواز کو کہا جاتا ہے زیور کی معمولی سی جھنکار کو بھی وسوسہ کہتے ہیں۔ تو شیطان نے آدم علیہ السلام اور حوا کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ شیطان کو بہشت سے نکلنے کا حکم ہو چکا تھا مگر وہ ابھی نکلا نہیں تھا، لہذا وہ وسوسہ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ وسوسہ ایک نفسیاتی عمل ہے جس کے لیے قریب آنا ضروری نہیں ہے اور اعضائے مستورہ نظر نہیں آتے تھے مگر جب یہ حصے کھل گئے تو آپ سخت پریشان ہو گئے۔

اکل شجر کی وجوہات

شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو بہکانے کے بہانے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس درخت سے اس لیے منع کیا ہے اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ کہ تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ یا پھر جنت میں ہمیشہ رہنے والے نہ بن جاؤ۔ شیطان نے ان کو یقین دلایا کہ اللہ نے تمہارے مفاد کے خلاف تمہیں اس درخت سے روک دیا ہے۔ مَلَکٌ فرشتہ ہوتا ہے اور مَلِکٌ بادشاہ کو کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں قرأتیں درست ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ ممنوعہ پھل کھانے

سے یا تم فرشتے بن جاؤ گے یا تمہیں یہاں کی دائمی بادشاہی مل جائے گی۔ یہ مفہوم
سورۃ طٰہٰ میں بھی ملتا ہے۔ وہاں اس طرح آتا ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا
اور هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝
بھلا میں تم کو ایسا درخت بتلاؤں جو ہمیشہ کی زندگی اور کبھی نہ زائل ہونے والی
بادشاہت ہے۔ گویا یہ لالچ دیا۔ یہ دور سے بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ اگر آدم
علیہ السلام جنت میں ہوں اور شیطان وہاں سے نکل کر دور کھڑا دیکھ رہا
ہو، تو پھر بھی وہ وسوسہ اندازی ہو سکتی تھی۔ شیطان نے دور کھڑا ہو کر ایسی
حرکات کیں جنہیں دیکھ کر آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا۔ یا دور
سے اس کی آواز سن کر کوئی خیال پیدا ہو گیا۔ بہر حال شیطان وسوسہ اندازی
میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس کا مقصد یہ تھا لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ
عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا تاکہ ظاہر کر دے ان دونوں کے لیے
وہ چیز جو چھپائی گئی ہے ان دونوں سے ان کی شرمگاہوں میں سے
یعنی وسوسہ اندازی کا اثر یہ ہوا کہ آدم علیہ السلام اور حوا کے ستر کھل گئے۔ جو
چیز ان کی نظروں سے پوشیدہ رکھی گئی تھی وہ ظاہر ہو گئی۔ سوءات کے
کئی معنے آتے ہیں جیسے عام برائی اور جسم کے مستورہ حصے۔ اس مقام پر یہ
جسم کے مستورہ حصے مراد ہیں۔ حدیث شریف میں یہ لفظ اس طرح استعمال
ہوا ہے لَا تَنْظُرْ اِلٰى سَوْاَةِ اَخِيْكَ اپنے بھائی کے ستر کی
طرف مت دیکھو بلکہ بعض روایات میں ستر دیکھنے والے کو ملعون کہا گیا
ہے۔ اگر انسان کے مستورہ حصے کھل جائیں تو نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے
پہلے آدم علیہ السلام اور حوا نورانی لباس میں ملبوس تھے۔ شیطان نے وسوسہ
اندازی کی۔ اور ساتھ قسم بھی اٹھائی وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا
لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ کہ میں تمہارا بڑا خیر خواہ ہوں، تمہارے فائدے کی بات
بتا رہا ہوں، لہٰذا اس ممنوعہ پھل کو کھا لو۔ بہر حال جب شیطان نے اللہ

کے نام کی قسم کھائی تو آدم علیہ السلام اُس کے جھانسے میں آ گئے۔

آخر اس کا نتیجہ یہ ہوا فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ شیطان نے ان دونوں کو یہ دھوکہ دے کر نیچے اتروا دیا۔ دَلّٰی دلالت سے ہے اور یہ راہنمائی کے معنوں میں آتا ہے۔ اگر بفتح دال ہو تو اس کا معنی جرأت دلانا ہوتا ہے اور اگر دِلا ہو تو معنی نیچے اتارنا ہے۔ اس مقام پر یہی معنی عبارت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ اب نیچے اتارنے کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ نیچے اتارنا فکر کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ شیطان نے اُن کی فکر اتنی کمزور کر دی کہ وہ اللہ کے حکم پر قائم نہ رہ سکے۔ نیچے اتارنا مرتبے کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے۔ کہ زوجین کو جس اعلیٰ منصب پر فائز کیا گیا تھا اُس سے نیچے اتارنے کا ذریعہ بن گیا۔ اور جنت سے نیچے اتارنے کا مطلب تو بہرحال ہے ہی۔ غرضیکہ شیطان وسوسہ اندازی کے ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو نیچے اتارنے کا سبب بنا۔

آدم علیہ السلام کی لغزش

ممنوعہ شجر کی قربت حضرت آدم علیہ السلام کی محض لغزش تھی، اسے گناہ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کو اجتہاد میں غلطی لگی تھی۔ فَنَسِیَ اٰدَمُ ایک بات تو یہ تھی کہ آدم علیہ السلام بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کا امتناع والا فرمان بھول گئے۔ اور دوسری بات کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو سمجھنے میں غلطی کی کسی چیز سے امتناع بعض اوقات فرض ہوتا ہے اور بعض اوقات استحبابی۔ مثلاً قرآن پاک کا حکم ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ تو نماز فرض ہے یہ فرضی حکم ہے۔ اس کی تعمیل لازمی ہے۔ اور بعض احکام ضروری نہیں ہوتے جیسے ارشاد باری تعالیٰ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (المائدہ) جب احرام کھول دو تو شکار کرو۔ ظاہر ہے کہ احرام کے بعد شکار نہ فرض ہے نہ واجب اور نہ سنت مؤکدہ بلکہ محض مباح ہے کہ احرام کھل جانے کے بعد تمہیں شکار کرنے کی اجازت ہے۔ اب اگر کوئی شخص احرام کھولنے کے بعد شکار نہیں کرتا تو اس پر کوئی جرم نہیں ہوگا اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نے بھی شاید امتناع شجر کو محض استحبابی حکم سمجھا اور اس کی تعمیل ضروری نہ سمجھی اور پھل کھا لیا۔ بہرحال اس لغزش کی یہ دو وجوہات

اسو کیتی ایں۔

زوجین کی ستر پوشی

غرضیکہ شیطان نے آدم علیہ السلام اور حوا کو وسوسہ کر دیا۔ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ پھر جب دونوں نے اس درخت کو چکھا بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ان دونوں کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں۔ مستورہ حصے ایک دوسرے کو نظر آنے لگے۔ اس حالت میں وہ سخت پریشان ہوئے اور فوراً ستر پوشی کی کوشش کی وَطَفِقَا اور ان دونوں نے شروع کیا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ٹانکنے لگے اپنے جسموں پر جنت کے پتے۔ پتوں کو جوڑ کر اپنے اعضائے مستورہ کو چھپانے لگے، لباس تو وہاں کوئی تھا نہیں جو پہن لیتے لہٰذا انہوں نے پتے جوڑ کر آگے پیچھے ستر پوشی کی گویا ستر پوشی انسان کی فطرت میں داخل ہے جب برہنہ ہو گئے تو آدم علیہ السلام اور حوا دونوں کو سب سے پہلے ستر پوشی کی فکر ہوئی کہ حیاداری کا یہی تقاضا تھا۔ آج بھی افریقہ میں بعض وحشی قبائل ایسے ہیں جو لباس سے بے نیاز ہیں مگر ستر پوشی وہ بھی کرتے ہیں اور گھاس پھونس اکٹھا کر کے اعضائے مستورہ کو ڈھانپنا ضروری سمجھتے ہیں۔ برہنگی تو شیطان کی تعلیم سے ہوئی تھی لہٰذا یہ شیطانی فعل ہے مگر بعض حلقوں میں یہ چیز آج بھی فیشن میں داخل ہے۔ نیم عریانی حالت میں ناچ گانا یا ایسے باریک کپڑے پہننا جو ستر پوشی کے تقاضے پورا نہ کرتے ہوں، بالکل غیر فطری بات ہے۔ بلکہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ جرمنی میں برہنہ لوگوں کی ایک انجمن قائم ہوئی تھی۔ اس کے تمام ممبران مرد اور عورتیں اپنے ایوان فطریہ میں برہنگی اختیار رکھتے تھے ولوں پر ستر پوشی انجمن کے قواعد کے خلاف تھی تاہم قرآن پاک سے واضح ہوتا ہے کہ ستر پوشی ایک فطری تقاضا ہے جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے اسکے باوجود اگر کوئی بغاوت کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہ اسکے لیے خود ذمہ دار اور قابل مواخذہ ہے ستر پوشی حیاداری ہی کا دوسرا نام ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيْمَانِ یعنی حیاداری ایمان کا ایک حصہ ہے۔ نیز فرمایا لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا حَيَاءَ لَهٗ جس کی حیا نہیں اس کا ایمان نہیں۔

شیطان کی دشمنی

جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حوا کو اس پریشانی میں دیکھا تو فرمایا وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَا ان دونوں کو انکے پروردگار نے پکارا اور کہا اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ کیا میں نے تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے منع نہیں کیا تھا؟ وَاَقُلْ لَّكُمَا اور کیا میں نے تم دونوں سے نہیں کہا تھا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے اس سے محتاط رہنا مگر تم پھر بھی اس کے بہکاوے میں آ گئے۔

سورۃ طٰہٰ میں موجود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ اس نے انکار کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا یٰاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى "اے آدم شیطان تمہارا اور تمہاری بیوی کا کھلا دشمن ہے، یہ تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے لہٰذا اس سے خبردار رہنا مگر اس تنبیہ کے باوجود آدم علیہ السلام اور حوا شیطان کے بہکاوے میں آ گئے جس وجہ سے انہیں جنت سے محروم ہونا پڑا۔

غرضیکہ اللہ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود تم نے یہ غلطی کیوں کی۔ اب اس کے بعد اگلی آیات میں حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کا بیان ہوگا شیطان کا جواب متکبرانہ تھا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ کہ میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا مگر اب آدم علیہ السلام اور انکی بیوی کا جواب عجز و انکساری کا مظہر ہوگا یہیں سے انسان کی اجتماعی اور احتیاج کی زندگی شروع ہوگی۔ سب سے پہلے لباس کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کیونکہ برہنگی کو تنہائی میں بھی پسند نہیں کیا گیا۔ اب جو آدم علیہ السلام اور حوا کا جواب آ رہا ہے اسمیں بھی زندگی کے بہت سے حقائق سمجھائے گئے ہیں۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿٢٥﴾ ع

ترجمہ: کہا اُن دونوں (آدم اور حوا) نے: اے ہمارے پروردگار ہم نے زیادتی کی ہے اپنی جانوں پر، اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ﴿٢٣﴾ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) اُتر جاؤ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانے کا سامان ہے ایک وقت تک ﴿٢٤﴾ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے): تم اسی زمین میں زندہ رہو گے، اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم دوبارہ نکالے جاؤ گے ﴿٢٥﴾

ربطِ آیات

پہلے اللہ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق اور جنت میں اقامت اختیار کرنے کا ذکر فرمایا یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، چلو پھرو اور جہاں سے بھی چاہے کھاؤ پیو مگر ایک درخت کے قریب نہ جانا۔ اُدھر جب شیطان نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو اُس کا حسد اور تکبر ظاہر ہو گیا تھا۔ اُس نے اللہ تعالیٰ سے

مہلت۔ بلکہ چیلنج کر دیا تھا کہ میں تیرے سیدھے راستے میں بیٹھوں گا اور تیرے بندوں کو چاروں طرف سے گمراہ کروں گا۔ اس وقت آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں مقیم تھے اور جنت سے مراد وہی جنت الماویٰ ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ بعض لوگ مذکورہ جنت کو اس دنیا کے کسی باغ پر محمول کرتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہی جنت جہاں سے آدم علیہ السلام کو نکالا گیا اور اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جس کا پھر وارث بنائے گا "تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا" (مریم)
اس جنت کا وارث ہم اس شخص کو بنائیں گے جو کہ متقی ہو گا مطلب یہ ہے کہ جس مقام پر ابتدا آدم علیہ السلام کو رکھا گیا ہے وہ جنت الماویٰ ہی ہے

آدم علیہ السلام کی تخلیق تو خلافت ارضی کے لیے ہوئی تھی "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر انکشاف کیا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اور اُسے زمین پر ہی جانا تھا مگر عارضی طور پر اُسے پہلے جنت میں رکھا گیا کیونکہ یہ اس کا ابدی ٹھکانا ہے۔ اور پھر اس کی نعمتیں دکھا کر اس کی طرف رغبت دلانا بھی مقصود تھا کہ اگر نسلِ انسانی خلافت کا صحیح صحیح حق ادا کرے گی تو اس کا ابدی ٹھکانا یہ جنت ہو گی۔ پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی شامل تھی کہ اُسے زمین پر کس طریقے سے بھیجنا ہے اس سلسلہ میں شیطان کے وسوسے نے بھی اپنا کام کیا، اس کی نوع انسانی سے عداوت بھی ظاہر ہو گئی اور آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنے کا جواز بھی پیدا ہو گیا۔

آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں رہنے کی اجازت دیتے وقت بتلا دیا تھا "إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ" (طٰہٰ) یہ شیطان تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے "فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ" (طٰہٰ) یہ کہیں تمہیں جنت سے نہ نکال دے پھر تم مشقت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس دنیا کی زندگی میں کوئی شخص مشقت سے خالی نہیں مگر جنت میں کسی قسم

کی نہ مشقت اور نہ پریشانی ہوگی۔ نہ محنت کر کے روزی کمانے کی فکر ہوگی۔ اور نہ کسی چیز کے مہیا کرنے کی تکلیف اٹھانا پڑے گی، بلکہ ہر چیز بلا مشقت حاصل ہوگی۔ بایں ہمہ آدم علیہ السلام اُس بات کو بھول گئے اور شیطان نے اپنا کام شروع کر دیا۔ چنانچہ اُس نے آدم علیہ السلام اور حوا کے دل میں وسوسہ ڈال کر انہیں ممنوعہ پھل کھانے پہ آمادہ کر لیا۔ وہ پھلدار درخت انجیر، گندم یا انگور تھا۔ اس کی تشریح موجود نہیں، تاہم بعض نے اُسے علم و خبر سے آگاہی کے پھل سے موسوم کیا ہے کہ بائبل میں اسی کا ذکر ہے اور بعض مفسرین نے اسے مباشرت کا پھل بھی کہا ہے۔ اولاد انسان کا پھل ہوتا ہے اور اس کا ذریعہ زوجین کی مباشرت ہوتا ہے لہذا اُس پھل کو مباشرت پہ بھی محمول کیا گیا ہے۔ بہر حال جو بھی پھل تھا وہ آدم اور حوا علیہما السلام نے چکھ لیا، کھا لیا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ اُن کا جنت کا لباس اُتر گیا اور وہ دونوں برہنہ ہو گئے۔ حیا چونکہ انسانی فطرت میں داخل ہے اس لیے برہنگی کی وجہ سے میاں بیوی سخت پریشان ہوئے اور ستر پوشی کے لیے انہوں نے درختوں کے پتے ٹانکنے شروع کر دیے اور اُن سے اپنے ستر کو ڈھانپا۔ اِدھر اللہ نے آواز دی کہ اے آدم اور حوا کیا میں نے تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے منع نہیں کیا تھا اور تمہیں آگاہ نہیں کر دیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے اس کے فریب میں نہ آ جانا۔ اس واقعہ کے متعلق سورۃ طٰہٰ میں آتا ہے فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا آدم علیہ السلام بھول گئے اور ہم نے اُن کا ارادہ کمزور پایا یا تو ممانعت والی بات اُن کے ذہن میں نہ رہی اور یا وہ یہ سمجھے کہ حکم امتناعی واجبی حکم نہیں ہے بلکہ محض اباحت کی بات ہے۔ اگر یہ پھل کھا بھی لیں گے تو کوئی ایسی گرفت نہیں ہوگی۔ اُدھر شیطان نے بھی بہکانے کی قسم اٹھا رکھی تھی آدم علیہ السلام کا عزم کمزور پایا تو اس کا داؤ چل گیا۔

انبیاء کی لغزش

مفسرین کرام اس بات پہ بحث کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی یہ اجتہادی خطا

غلطی گناہ میں شمار ہوتی ہے یا لغزش میں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ صغیرہ گناہ ہے اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ گناہ نہیں بلکہ معمولی سی لغزش ہے۔

قرآن وحدیث میں انبیاء علیہم السلام سے جو بھی لغزشیں مذکور ہیں وہ زلات کہلاتی ہیں۔ اور یہ ایسی چیز ہے جو صغیرہ گناہ سے بھی کم درجہ کی ہوتی ہے ظاہر ہے گناہ کا کام وہ ہوتا ہے جو ارادے اور مشیت سے کیا جائے اور انبیاء علیہم السلام کو عصمت کی گارنٹی حاصل ہوتی ہے لہٰذا وہ گناہ کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ البتہ بلا ارادہ چھوٹی موٹی خطا کا سرزد ہو جانا ممکن ہے۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی ملتی ہے قبطی آدمی بنی اسرائیل پر زیادتی کر رہا تھا۔ آپ نے قبطی کو ایک مکا رسید کیا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ مکے کی ضرب شدید تھی یا آدمی کمزور تھا جو برداشت نہ کر سکا۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ اس لیے وہ بھی گناہ میں شمار نہیں ہوتا بلکہ وہ تو مظلوم کی امداد تھی۔ تاہم موسیٰ علیہ السلام کو اس پر سخت پشیمانی ہوئی۔ قیامت والے دن جب تمام لوگ سفارش کے لیے کہیں گے تو آپ جواب دیں گے کہ میرے ہاتھ سے ایک آدمی مارا گیا تھا حالانکہ لَمْ أُوْمَرْ بِقَتْلِهَا مجھے اس کے متعلق کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا، لہٰذا میں اللہ کے حضور سفارش کے لیے حاضر نہیں ہو سکتا۔ الغرض! اہل سنت والجماعت اس امر پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو صغیرہ یا کبیرہ ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے، البتہ ان سے لغزش سرزد ہو سکتی ہے۔

چونکہ انبیائے کرام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا انتظام ہوتا ہے، اس لیے ان کی معمولی لغزش بھی قابل گرفت ہوتی ہے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جس قدر کسی کو اللہ کا قرب حاصل ہو اسی قدر وہ لغزش پر قابل مواخذہ بھی ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا آدمی کوئی بڑے کام کا ارتکاب بھی کر بیٹھے تو اتنا قابل گرفت نہیں ہوتا جتنا ایک قریبی آدمی ہوتا ہے انبیائے کرام چونکہ مقربین الٰہی ہوتے ہیں اس لیے انہیں معمولی لغزش پر بھی

سخت تنبیہ ہو جاتی ہے۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ موجود ہے ایک نابینا صحابی سے ذرا سی بے اعتنائی برتی تو اللہ تعالیٰ کی آیات نازل ہو گئیں "عَبَسَ وَتَوَلّٰی ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی" (سورۃ عبس) اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام وغیرہم پر بھی ابتلا آئی مولانا روم نے بھی اس بات کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے ؎

بود آدم دیدۂ نورِ قدیم
موئے در دیدہ بود کوہِ عظیم

آدم علیہ السلام تو نورِ قدیم کی آنکھ تھے۔ انکی آنکھ میں بال بھی پہاڑ بن گیا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ کامل الایمان مومن وہ ہوتے ہیں جو معمولی غلطی اور صغیرہ گناہ کو بھی بڑا گناہ خیال کر کے ڈر جاتے ہیں کہ کہیں گرفت نہ ہو جائے۔ اس کے برخلاف منافق کی حالت یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے گناہ کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے جیسے ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو آدمی آسانی سے اڑا دیتا ہے۔ آدم علیہ السلام چونکہ شانِ رفیع کے مالک تھے اس لیے اس غلطی پر فوراً پریشان ہو گئے۔ اور یہی مٹی کی خاصیت ہے کہ اس میں عاجزی، انکساری، تواضع، فروتنی، حلم اور بردباری پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس غلطی پر حضرت آدم علیہ السلام فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

معافی کی درخواست

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد آدم علیہ السلام تین سو سال تک اپنی لغزش پر روتے رہے اور اس کے بعد جیسا کہ سورۃ البقرہ میں آتا ہے "فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ" آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے جن کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دستِ بدعا ہوئے۔ یہ وہی کلمات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر بیان فرمایا ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ان دونوں نے کہا، اے ہمارے پروردگار! یہاں پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کے ذریعے ہی

درخواست کی۔ یہ وہی صفت ہے جس میں کسی بھی شخص کی بتدریج تربیت کا مفہوم پایا جاتا ہے اور عام طور پر دعاؤں میں لفظ رَبَّنَا سے ہی اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا جاتا ہے جیسے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اسی طرح آدم اور حوا علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ہم نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے۔ اپنی غلطی کا فوراً اقرار کر لیا شیطان کی طرح کوئی حجت بازی نہیں کی، بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کیا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا وَتَرْحَمْنَا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔ تیری رحمت کے سوا ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا، ہم تیری مہربانی کے محتاج اور تیری رحمت کے طالب ہیں۔ انسان کی شان و بلندی عاجزی اور انکساری میں ہی ہے۔ لہٰذا ایمان والے کا شیوہ یہی ہے کہ وہ ہر وقت اپنی کمزوریوں پر نگاہ رکھے اور غرور و تکبر کے قریب تک نہ جائے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ دوسری جگہ موجود ہے فَتَابَ عَلَیْہِ (البقرہ) اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، اب اس لغزش پر گرفت نہیں ہوگی۔ تاہم وہ فَتَشْقٰی کے مصداق اس دنیا میں آکر مشقت کی زندگی میں پڑ گئے۔ آپ ایک ہزار برس تک زمین میں موجود رہے اور مشقت کی زندگی گزاری۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ اور بعض دیگر سورتوں میں بھی وضاحت فرما دی ہے کہ آدم علیہ السلام کو اسی وقت بتا دیا تھا کہ اگر جنت میں دوبارہ آنے کی خواہش ہے تو پھر ایمان اور تقویٰ کا سامان ساتھ لانا ہوگا۔

باہمی دشمنی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَالَ اھْبِطُوْا زمین پر اتر جاؤ اور وہاں پر تمہیں تین چیزیں پیش آئیں گی۔ پہلی بات یہ ہوگی بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہوں گے۔ ان بعض سے آدم علیہ السلام

اور شیطان بھی مراد ہو سکتے ہیں اور اس کا مطلب عام انسان بھی آپس میں ہو سکتے ہیں۔ شیطان تو ابتداء سے ہی انسان کا حریف ہے۔ اُسے اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (الحجر) مہلت مل چکی ہے لہٰذا وہ انسان کو گمراہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ تاہم انسانوں کی آپس میں دشمنی اور عداوت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس عداوت کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہی سے ہو گئی تھی۔ سورۃ مائدہ میں تفصیل موجود ہے۔ کہ شادی کے مسئلہ پر ایک بیٹا دوسرے کا دشمن بن گیا اور آخر اُسے قتل ہی کر دیا۔ یہ دشمنی قیامت تک انسانوں میں قائم رہے گی۔ کبھی دو خاندانوں میں عداوت ہوتی ہے تو کبھی دو برادریوں میں کبھی دو قومیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوتی ہیں تو کبھی دو سلطنتوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے اور بیٹا باپ سے عناد رکھتا ہے۔ اسی لیے فرمایا بعض تمہارے بعض کے دشمن ہوں گے اور اس دشمنی میں شیطان کا ہاتھ بھی ہے اور خود انسانوں کی اپنی کوتاہی بھی شامل ہے۔ البتہ کامیاب وہی ہو گا، جو ان کمزوریوں اور کوتاہیوں سے بچ کر نکل جائے گا۔

زمین بطور قرارگاہ

اللہ تعالیٰ نے دوسری بات یہ فرمائی وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور ایک وقت تک نفع اٹھانے کا سامان ہے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے سے پہلے بتا دیا تھا کہ نوع انسانی کا مستقر اور دارالعمل زمین ہی ہے۔ اسی لیے حصن حصین کی روایت میں آتا ہے کہ مُردے کو دفن کرتے وقت یہ کلمات پڑھو

بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ - مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى

ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اسی میں لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائیں گے۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہی بات بیان فرمائی ہے۔ کہ

تمہاری قرارگاہ زمین کو بنایا گیا ہے جہاں تم ایک خاص وقت تک مستفید ہوگے نیز زمین کے علاوہ اور کوئی جگہ تمہارے رہنے کے لیے نہیں ہوگی۔ اگر ہوگی تو محض عارضی، ورنہ تمہارا اصل ٹھکانا زمین ہی ہے۔ آدمی بعض اوقات چند گھنٹوں کے لیے فضا میں پرواز کرتا ہے اور زمین سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے مگر یہ عارضی علیحدگی ہوتی ہے۔ بالآخر اسے زمین پر ہی واپس آنا ہوتا ہے اور اگر خدانخواستہ فضا میں کوئی حادثہ پیش آجائے، انسان ہلاک ہو جائے اور اس کے اعضا منتشر ہو جائیں تب بھی اس کے بچے کھچے اجزا زمین پر ہی آتے ہیں ایسی چیزوں کی نوعیت عارضی ہوتی ہے لیے شاذ واقعات کو عام قانون پر محمول نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا انسان کا اصل ٹھکانا زمین ہی ہے۔

موجودہ سائنسی دور میں لوگ لمبے عرصہ تک فضا میں پرواز کرتے رہتے ہیں بلکہ زمین سے قریب ترین سیارے چاند پر انسان پہنچ چکا ہے مگر یہ سب کچھ عارضی مدت کے لیے ہے اور جو شخص خلائی پرواز پر جاتا ہے وہ بالآخر زمین پر ہی واپس آتا ہے۔ وہاں اس کی مستقل رہائش کا کوئی بندوبست نہیں ہوسکتا۔ سائنسدانوں کے بیان کے مطابق چاند پر جانے کے لیے جس خلائی لباس کی ضرورت ہے وہ چار لاکھ روپے میں تیار ہوتا ہے کیونکہ چاند کے بعض حصوں میں اس قدر گرمی ہے کہ عام لباس میں انسان وہاں ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ فوراً جل کر کوئلہ بن جائے۔ اسی طرح چاند کے بعض حصوں میں سردی انسان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ پھر یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ چاند پر ایک پونڈ انسانی خوراک پہنچانے کے لیے تیس ہزار پونڈ خرچ آئے گا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں زمین سے باہر چاند پر بھی مستقل رہائش ناممکن ہے چہ جائیکہ باقی سیاروں مریخ وغیرہ کی بات کی جائے جو زمین سے کروڑوں میل دور ہیں اور جن کی سائنس دان ابھی تک محض تصویر کشی ہی کر پائے ہیں۔ مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے ضمن

میں فرماتے ہیں کہ خرقِ عادت کے طور پر کسی کا زمین سے باہر رہنا اس آیت کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ تو عام انسان کی بات ہے کہ زمین کے علاوہ اس کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اس وقت دوسرے آسمان پر اقامت پذیر ہیں اور جیسا کہ معراج کے واقعہ میں آتا ہے حضور علیہ السلام کی اُن سے ملاقات بھی ہوئی مگر یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مصلحت کے تحت ہوا ہے اور پھر بالآخر ایک مدت کے بعد انہیں بھی زمین پر واپس آنا ہے یہیں فوت ہوں گے اور اسی مٹی میں دفن ہوں گے۔

زندگی موت اور بعثت

تیسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ تم اسی زمین میں زندہ رہو گے۔ یہی مشقت اور عملی زندگی ہے۔ اسی زندگی میں اپنا اصل مقام جنت حاصل کرنے کی سعی کرنا ہو گی وَفِيهَا تَمُوتُونَ اپنی زندگی کی مدت پوری کرنے کے بعد اسی زمین میں تمہاری موت واقع ہو گی اور اسی میں دفن ہو گے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا "ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ" (سورۃ عبس) پھر اس کو موت دی اور قبر میں دفن کرایا۔ انسان کے لیے عام قانون یہی ہے۔ کہ آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل اور قابیل سے لیکر آج تک زمین میں ہی دفن ہوتے آئے ہیں۔ اگر کوئی شخص سمندر کی لہروں کی نذر ہو گیا یا جلا دیا گیا یا کسی درندے کے پیٹ میں چلا گیا، پھر اس کے اجزا بالآخر زمین ہی کا حصہ بنتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا اس قسم کے واقعات بہت قلیل ہوتے ہیں اس لیے عام سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور انسان کا تعلق کسی نہ کسی طرح زمین سے قائم رہتا ہے۔

فرمایا تم اسی زمین میں زندہ رہو گے۔ اسی میں مرو گے وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ اور پھر اسی زمین سے دوبارہ نکالے جاؤ گے۔ جب دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو تمام مردے اٹھ کھڑے ہوں گے اور میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے اس کے بعد محاسبے کا عمل شروع ہو گا۔ یہ

زمین ختم ہو جائیگی "یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ" (ابراھیم) پھر اس کی جگہ نئی زمین لائی جائے گی۔ پُل صراط کی منزل اور محاسبے کے دوسرے معاملات اس نئی زمین پر طے ہوں گے۔ اور پھر وہاں سے ابدی ٹھکانے جنت الماویٰ تک پہنچیں گے۔ جہاں سے آدم علیہ السلام کو نکالا گیا تھا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: اے اولادِ آدم! تحقیق ہم نے اتارا ہے تمہارے لیے لباس جو ڈھانپتا ہے تمہارے اعضائے مستورہ کو اور تمہارے لیے زینت کا ذریعہ ہے اور تقوے کا لباس ہی بہتر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں (۲۶) اے اولادِ آدم! نہ فتنے میں ڈالے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے نکالا تمہارے ماں باپ کو جنت سے وہ اتارتا تھا ان سے ان کے لباس تاکہ دکھائے ان کو ان کے اعضائے مستورہ۔ بیشک دیکھتا ہے تم کو وہ اور اس کا قبیلہ جہاں تم ان کو نہیں دیکھتے بیشک ہم نے بنا دیا ہے شیطان کو رفیق ان لوگوں کے لیے جو ایمان نہیں لاتے (۲۷)

ربط آیات — پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کتاب ہدایت کے ذکر کے بعد تخلیق آدم کا ذکر فرمایا اور اس کے ساتھ شیطان کی عداوت اور دشمنی کا ذکر کیا۔ پھر شیطان کے بُرے عزائم کا تذکرہ بھی ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی لغزش اور میاں بیوی کے بارگاہِ رب العزت میں گڑگڑا کر دعا کرنے کی بات کی۔ اللہ نے جنت سے اُتر جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا اور ایک مقررہ مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ مقررہ مدت کسی انفرادی انسان کی موت کے ساتھ پوری ہو جاتی ہے اور پھر اجتماعی طور پر قیامت کو یہ وقت پورا ہو جائے گا۔ فرمایا اسی زمین میں تم زندہ رہوگے، اسی میں مروگے اور پھر قیامت کو اسی زمین سے زندہ کیے جاؤ گے۔

لباس کی اہمیت — اب اللہ تعالیٰ نے تمام اولادِ آدم کے لیے لباس کا حکم دیا ہے یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے نافذ ہے۔ جب شیطان نے جنت میں آدم علیہ السلام کا لباس اتروا دیا تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں لباس پہننے کا حکم دیا کیونکہ برہنگی خلافِ فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لباس پہننے کے حکم کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی باتیں ارشاد فرمائی ہیں اور لباس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ[۲] میں فرماتے ہیں کہ پوری متمدن دنیا میں بسنے والے انسان خواہ وہ کسی دین، مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں، اس بات پر متفق ہیں اَنَّ الْعُرْیَ شَیْنٌ وَّاللِّبَاسَ زَیْنٌ لباس پہننا باعثِ زینت ہے جب کہ برہنگی اور عریانی عیب ہے، ستر پوشی اور لباس اچھی چیز ہے اسلام اس کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص فطرت سے نکل جائے اور غیر فطری امور کی انجام دہی سے اپنے مزاج اور طبیعت کو ہی مسخ کر ڈالے تو ایسے شخص کا کوئی اعتبار نہیں، ورنہ ہر متمدن شخص لباس کو زینت اور ستر پوشی کا ذریعہ

سمجھا ہے۔ بہر حال یہاں پر اللہ تعالیٰ نے لباس کا تذکرہ بطور احسان فرمایا ہے۔

نزولِ لباس

ارشاد ہوتا ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اے اولادِ آدم! قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا تحقیق ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے۔ یہاں پر لفظ اَنْزَلْنَا غور طلب ہے کیونکہ لباس بنانے کے لیے کپاس تو زمین سے پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اتارنے کا ذکر کیا ہے۔ دراصل اتارنا بعض اوقات پیدا کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے سورۃ حدید میں آتا ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ یعنی ہم نے لوہا نازل کیا۔ ظاہر ہے کہ لوہا زمین سے نکلتا ہے مگر اس کے لیے بھی نزول کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے یعنی پیدا کیا ہے۔ مویشیوں کے متعلق فرمایا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ ہم نے تمہارے لیے آٹھ جوڑے مویشی نازل کیے۔ یہاں بھی نازل کرنے سے مراد پیدا کرنا ہی ہے۔

مفسرین کرام لفظ "اتارنے" کی یہ توجیہہ بھی بیان کرتے ہیں کہ کپاس، پٹ سن وغیرہ جن سے عام طور پر لباس تیار ہوتا ہے۔ زمین ہی سے پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح جن جانوروں کی اون یا کھال سے لباس بنایا جاتا ہے۔ وہ بھی زمین ہی کی پیداوار ہیں مگر ان اشیا کی پیداوار اور نشوونما کے لیے پانی کی اشد ضرورت ہے جو کہ اللہ تعالیٰ آسمان ہی سے نازل کرتے ہیں، اس لیے لباس کو اَنْزَلْنَا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لباس خیر و برکت کی چیز ہے اور ایسی چیزوں کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتا ہے، اس لیے طرزِ کلام میں لباس کو "نازل فرمانا" کہا گیا ہے۔

سترِ عورت

آگے اللہ تعالیٰ نے لباس کی غرض و غایت اور اس کے فوائد اس انداز میں بیان فرمائے ہیں یعنی اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ

سَوْاٰتِکُمْ جو تمہارے اعضائے مستورہ کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اعضائے مستورہ کا کھل جانا پوری متمدن دنیا میں معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے اللہ نے لباس کا پہلا فائدہ یہ بتایا کہ یہ تمہاری ستر پوشی کرتا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا حضور! ہم جسم کا کتنا حصہ کھول سکتے ہیں اور کتنا حصہ مخفی رکھیں یا دوسروں کا کتنا حصہ دیکھ سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اِحْفَظْ عَوْرَتَكَ اَوْ سَوْاٰتَكَ یعنی اپنے اعضائے مستورہ کو چھپاؤ اور کھلا نہ چھوڑو۔ اِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ اَوْ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ سوائے اپنی بیوی یا لونڈی کے۔ صحابی نے پھر عرض کیا، حضرت! اگر ہم تنہا ہوں تو پھر کیا حکم ہے۔ فرمایا فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُّسْتَحْيٰ مِنْهُ پھر اللہ کا زیادہ حق ہے کہ انسان اُس سے حیا کرے۔ مقصد یہ ہے کہ بلا مقصد تنہائی میں بھی اعضائے مستورہ کھولنے کی اجازت نہیں۔ پھر پردے کا یہ بھی حکم ہے کہ مردوں کے لیے بھی حلال نہیں کہ ایک دوسرے کے مخفی اعضا کو دیکھیں اور نہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک دوسری کے سامنے بے پردہ ہوں ایک روایت میں اس طرح آتا ہے مَلْعُوْنٌ مَنْ نَظَرَ اِلٰى سَوْاٰتِ اَحَدٍ وہ شخص ملعون ہے جو کسی کے ستر پر نظر ڈالتا ہے۔ یہاں تک کہ ران کی حفاظت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے اَلْفَخِذُ عَوْرَةٌ ران کا بھی پردہ ہے اس لیے محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ناف سے لے کر گھٹنے تک کے حصہ کو ڈھانپنا فرض عین ہے

لباس کے احکام

قرآن وحدیث میں لباس کے متعلق بہت سے احکام وارد ہوئے ہیں۔ محدثین نے اپنی کتابوں میں کتاب اللباس کے نام سے باب باندھے ہیں جن میں اللہ اور اس کے رسول اکرمؐ کے احکام متعلقہ لباس بیان کیے ہیں۔ ویسے بھی عربی کا مقولہ ہے اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ لوگ لباس کے ساتھ ہی متمدن نظر آتے ہیں۔ انسان کی حیثیت، وقار اور شان و شوکت

لباس ہی سے وابستہ ہوتی ہے۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ جس لباس سے اعضائے مستورہ کی پردہ پوشی کی جاتی ہے، وہ فرض ہے اور باقی لباس سنت ہے۔ چنانچہ عبادت کے لیے صاف ستھرا لباس ہونا چاہیئے، خاص طور پر جمعہ اور عیدین کی نماز کے لیے اگر نیا لباس میسّر نہیں تو کم از کم دُھلا ہُوا تو ہونا چاہیئے۔ خصوصاً صاحبِ ثروت آدمی کو اچھا لباس زیب تن کرنا چاہیئے۔ اگر پھٹا پُرانا لباس پہنے گا تو ناشکر گزاری کا مرتکب ہوگا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک شخص کو میلے کچیلے کپڑے پہنے دیکھا، فرمایا کیا تیرے پاس مال ہے۔ عرض کیا، ہاں میرے پاس بھیڑ بکریاں، گائے، بیل، اونٹ اور لونڈی غلام ہیں تو آپ نے ارشاد فرمایا فَلْیُرٰی اَثَرُ نِعْمَۃِ اللّٰہِ عَلَیْکَ وَکَرَامَتِہٖ (احمد و نسائی) تو پھر اللہ کے انعام و احسان اور اس کے فضل و کرم کا اثر تم پر نظر آنا چاہیئے۔ پھٹا پُرانا لباس تو مجبور آدمی پہنتا ہے تم اچھا لباس پہنا کرو۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کُلْ مَا شِئْتَ وَالْبَسْ مَا شِئْتَ مَا اَخْطَأَتْکَ اِثْنَتَانِ سَرَفٌ وَّمَخِیْلَۃٌ جو جی چاہے کھاؤ اور پہنو جب تک کہ دو چیزیں نہ ہوں یعنی اسراف اور تکبر، یہ دونوں چیزیں مکروہ تحریمی میں داخل ہیں۔ کھانا پینا اور پہننا مباح ہے مگر ان دو شرائط کے ساتھ۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اپنے ترجمہ قرآن میں اس مقام پر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ دشمن نے تم سے جنت کے کپڑے اُتروا لیے پھر ہم نے تمہیں دنیا میں لباس کی تدبیر سجھائی کہ لباس اس طرح بنا کر پہنو۔ چنانچہ اب وہی لباس پہننا چاہیئے جس میں پرہیزگاری ہو۔ مرد کے لیے اس دنیا میں ریشمی لباس حرام ہے البتہ جنت میں وَلِبَاسُھُمْ فِیْھَا حَرِیْرٌ (الحج) اُن کے لیے ریشمی لباس ہوگا۔ اسی طرح اس دنیا میں شراب حرام ہے مگر جنت میں شراب طہور نصیب ہوگی۔ اسی طرح اس جہان میں مرد صرف چاندی

کی انگوٹھی پہن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سونا اور چاندی حرام ہے مگر جنت میں انہیں سونے اور چاندی کے زیورات پہنائے جائیں گے۔

لباس سے متعلق بعض اور بھی احکام ہیں۔ مثلاً مرد ریشمی لباس نہ پہنیں اور دامن دراز نہ کریں۔ ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا مکروہ تحریمی ہے، شلوار، تہبند، پتلون یا چادر ہو مرد کے لیے ٹخنے ننگے ہونے چاہئیں ورنہ نماز بھی مکروہ ہوگی۔ البتہ عورت کو اجازت ہے۔ صحیحین کی روایت میں ہے۔

مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

جو کوئی فخر کے طور پر اپنا کپڑا نیچے کرے گا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

حضور علیہ السلام نے عورت کو باریک کپڑے پہننے سے بھی منع فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت اسماء کو باریک دوپٹہ پہنے ہوئے دیکھا جس سے چھن کر بال نظر آرہے تھے، آپ ناراض ہوگئے اور فرمایا جب عورت بالغ ہو جاتی ہے تو اس کے چہرے اور ہاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آنا چاہیئے۔ اور جوان عورت بلاوجہ چہرہ بھی نہ کھولے، تاہم یہ ستر میں داخل نہیں۔ ضرورت کے وقت منہ ننگا کر سکتی ہے۔ ایسی وضع قطع کا لباس پہننا جس سے جسم کے بعض حصے نظر آئیں، یہ بھی بے حیائی کی بات ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ عورت بہت باریک لباس نہ پہنے۔ نیز سورۃ نور کے احکام وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ کے مطابق اپنی زینت کا اظہار نہ کرے سوائے خاوند یا دیگر محرم مردوں کے سامنے۔ بہرحال لباس فرض بھی ہے، سنت بھی ہے، حرام بھی ہے، مکروہ بھی ہے اور مباح بھی ہے۔ فخر و تکبر والا لباس جائز نہیں۔ اسی طرح میلا کچیلا لباس مکروہ ہے۔ لباس کے معاملہ میں اسراف بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ باقی سب لباس مباح ہیں، ہر ملک کے باشندے مقامی وضع قطع یا آب و ہوا گرمی سردی کی مناسبت سے لباس پہن سکتے ہیں

نئے لباس کی دعائیں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نیا لباس پہننے کی بعض دعائیں بھی منقول ہیں مثلاً نیا لباس پہننے پر آدمی یوں کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَزَقَنِیْ مِنَ الرِّیَاشِ مَا اَتَجَمَّلُ بِہٖ فِی النَّاسِ وَاُوَارِیْ بِہٖ عَوْرَتِیْ (مسند احمد) اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے یہ لباس زینت عطا کیا اور جس سے میں لوگوں میں آرائش حاصل کرتا ہوں اور اپنی ستر پوشی کرتا ہوں۔ سنن ابو داؤد میں یہ دعا بھی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ ھٰذَا وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ اللہ تعالیٰ کے لیے حمد و شکر ہے جس نے مجھے یہ کپڑا پہنایا اور بغیر میری محنت و سعی کے یہ مجھے عطا فرمایا۔ ترمذی شریف[1] میں حضور علیہ السلام کی یہ دعا بھی منقول ہے اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا کَسَوْتَنِیْہِ اَسْئَلُکَ خَیْرَہٗ وَخَیْرَ مَا صُنِعَ لَہٗ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّہٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَہٗ اے اللہ، تیرا شکر ہے تو نے مجھے یہ کپڑا پہنایا میں تجھ سے مانگتا ہوں اس لباس کی بہتری اور اس مقصد کی بہتری جس کے لیے یہ بنایا گیا ہے، نیز میں تیری پناہ پکڑتا ہوں اس کپڑے کی برائی سے اور اس مقصد کی برائی سے جس کے لیے یہ بنایا گیا ہے۔ لباس کے متعلق اس کے علاوہ بھی بعض دعائیں اور احکام موجود ہیں۔

لباس ذریعۂ زینت

فرمایا اے اولادِ آدم ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا جس کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ یہ پردہ پوشی کرتا ہے اور دوسرا وَرِیْشًا ط یہ لباس باعثِ زینت بھی ہے۔ زیب و زینت لباس کی ہو یا گھر کے فرنیچر وغیرہ کی اس کے لیے عربی میں ریاش کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح پرندے کے پَر اس کے لیے زینت کا باعث ہوتے ہیں اور جس طرح بعض درندوں کو اللہ نے خوبصورت کھال پہنا دی ہے جس سے ان کی زینت ہوتی ہے اسی طرح انسان کے لیے لباس بمنزلہ زینت ہے۔

[1] ترمذی شریف ص۲۰۲ ج۱ (فیاض)

قدیم زمانے سے کپاس کا دھاگہ لباس کے لیے خام مال کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے مگر آجکل پٹرول کے گاد سے دھاگا تیار کر کے مختلف الانواع لباس تیار کیے جا رہے ہیں مگر سوتی لباس سے بہتر کوئی لباس نہیں نائلون یا ٹیرون چونکہ پٹرول کی باقیات سے تیار ہوتا ہے اس لیے یہ آگ بھی جلد پکڑتا ہے اگر آدمی کے کپڑوں میں آگ لگ جائے تو اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے آجکل میڈیکل سائنس والے تحقیق کر رہے ہیں کہ یہ لباس انسان کے لیے کس حد تک مفید ہے۔ اگرچہ نائلون کا دھاگہ خوشنما، نرم اور دیرپا ہے مگر انسانی جسم کے لیے سوتی کپڑے سے بہتر کوئی کپڑا نہیں ہو سکتا۔ کپاس اللہ تعالیٰ نے کمال درجے کی بنائی ہے جو انسانی جسم سے عین مطابقت ہے طنطاویؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ انسان کی دو بنیادی ضرورتوں خوراک اور لباس کا مادہ ایک ہی ہے ان کے عناصر کی ترکیب میں صرف فیصدی (PERCENTAGE) کا فرق ہے مثال کے طور پر اگر گندم میں آکسیجن کا حصہ بیس فیصدی ہے تو کپاس میں دس فیصدی ہے۔ بہرحال فرمایا کہ لباس انسان کے لیے پردہ پوشی اور زینت کا باعث ہے۔

تقویٰ کا لباس

آگے فرمایا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ تقویٰ کا لباس ہی بہتر ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ تقوےٰ سے مراد ایمان اور نیکی ہے کہ لباس کے ساتھ ساتھ یہ دو چیزیں بھی ہونی چاہئیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ تقوےٰ کا لباس وہ ہے جو بے تکلف ہو اور ناجائز نہ ہو۔ حضور علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ جیسا لباس مل جاتا پہن لیتے اور کسی تکلف میں نہ پڑتے۔ آپ نے اپنی زندگی میں قیمتی لباس بھی زیب تن فرمایا ہے مگر عام طور پر آپ معمولی لباس پہنتے تھے۔ بزرگانِ دین بھی مختلف لباس پہنتے تھے۔ مثلاً خواجہ ابوالحسن شاذلیؒ اور مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ عمدہ لباس پہنتے تھے البتہ امام احمد بن حنبلؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سادہ لباس

پہنتے تھے۔ آپ عاجزی اور تواضع کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ تاہم جس قسم کا لباس میسر ہو، مباح ہے بشرطیکہ حرام سے اجتناب کیا جائے۔ ہمیشہ تکلیف اٹھا کر کوئی خاص لباس فراہم کرنا پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ یہ چیز رفاہیت بالغہ میں داخل ہے اور اس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ کا لباس ہی بہر صورت بہتر ہے۔ فرمایا یہ لباس ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ انسانوں کو لباس پہننے کا حکم دیا گیا ہے لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

شیطان سے احتیاط

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اے اولادِ آدم خبردار کہیں شیطان تمہیں فتنے میں نہ ڈال دے۔ تمہیں بہکا نہ دے کیونکہ شیطان دو دروازوں کے ذریعے انسانوں کو گمراہ کرتا ہے ایک شبہات اور دوسرا شہوات، یا تو انسان کے دل میں شکوک و شبہات ڈال کر انسان کو بدعقیدہ بنا دیگا یا اُسے خواہشات میں مبتلا کر کے تباہ و برباد کر دیگا۔ اسی لیے فرمایا کہیں شیطان تم کو فتنے میں نہ ڈال دے كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ جیسا کہ اُس نے تمہارے ماں باپ یعنی حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کو جنت سے نکالا۔ شیطان نے اُن دونوں کو بہکا کر يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا اُن سے اُن کا لباس اتار رہا تھا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا تاکہ اُن کو اُن کے اعضائے مستورہ دکھا دے۔ دراصل آدم اور حوا علیہما السلام کو نہ تو شیطان نے خود جنت سے نکالا تھا اور نہ اُن کا لباس اتارا تھا بلکہ یہ تو اس کے بہکانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا۔ تاہم چونکہ شیطان اس کا سبب بنا لہٰذا یہ اُس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

شیطان کی ابتداء سے یہ کوشش ہے کہ انسان سے غیر فطری حرکت کرائے یعنی اُس کو برہنہ کرے۔ اُس وقت اُس کا داؤ حضرت

آدم اور حوا علیہما السلام پہ چلا تھا اور اب جدید تمدن میں بھی وہ لوگوں کو اسی طرف لگا رہا ہے۔ نیم عریانی جدید تہذیب میں فیشن بن چکی ہے۔ چنانچہ نیم برہنہ تصاویر کی نمائش اور نیم برہنہ حالت میں ناچ گانا جدید دور کے لوازمات میں شامل ہیں شیطان ایسی چیزوں کو خوب مزین کر کے دکھاتا ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کے دام میں گرفتار ہو کر اُس کی خواہش کی تعمیل کرنے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خبردار کیا ہے کہ شیطان بہت مکار دشمن ہے اس سے ہوشیار رہنا۔ اس کو یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ وہ اور اُس کا قبیلہ تو تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتا ہے مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ شیطان عام طور پہ انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور بعض حالات میں ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے جنات کو چند مرتبہ وعظ و تبلیغ کی۔ آپ نے انہیں قرآن پاک پڑھایا اس کے علاوہ بھی کبھی کبھار نظر آجاتے ہیں مگر عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ فرمایا اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بیشک ہم نے شیطان کو اُن لوگوں کا ساتھی بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے شیطان ایسے لوگوں پہ مسلط ہو کر انہیں بہکاتے رہتے ہیں تاکہ اُس کے متبعین کی تعداد میں اضافہ ہو اور وہ سب کو لے کر جہنم میں جائیں۔ تو فرمایا شیطان چونکہ خطرناک دشمن ہے جو نظر بھی نہیں آتا۔ لہٰذا اس سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

بزرگانِ سلف فرماتے ہیں کہ ایسے مکار دشمن سے پناہ بھی بڑی ذات کی پکڑنی چاہیئے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کافی ہے چونکہ وہ شیطان کی تمام حرکات کو دیکھ رہا ہے اور شیطان اُسے نہیں دیکھ سکتا لہٰذا شیطان سے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا چاہیئے۔ انسان

اسی قلعے میں محفوظ رہ سکتا ہے ورنہ اُس کا اعلان ہے کہ وہ چاروں اطراف سے انسان پر حملہ آور ہو کر اُسے گمراہ کرنے کی سعی کرے گا۔ شیطان سے پناہ کے لیے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کے الفاظ سب لوگ جانتے ہیں۔ یا پھر لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھنا چاہیے جو کہ عرش کے خزانوں میں ایک خزانہ ہے۔ بہر حال شیطان سے بچاؤ کی تدبیر یہ ہے کہ کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جائے اور اُس کی پناہ اختیار کی جائے۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿٢٩﴾ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿٣٠﴾ يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾ ع ۲ / ۱۰

ترجمہ :- اور جب کرتے ہیں (یہ منکر لوگ) کوئی بے حیائی کا کام تو کہتے ہیں کہ پایا ہم نے اس پر اپنے آباؤ اجداد کو اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے ۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ، بیشک اللہ تعالیٰ نہیں حکم دیتا کسی بے حیائی کی بات کا کیا تم کہتے ہو وہ بات اللہ پر جو تم نہیں جانتے (۲۸) اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ، حکم دیا ہے میرے پروردگار نے

انصاف کا اور یہ کہ قائم کرو اپنے چہروں کو (اللہ کے لیے) ہر
نماز کے وقت ، اور پکارو اُسی کو اس حال میں کہ خالص اُسی
کی اطاعت کرنے والے ہو ۔ جیسا کہ اُس نے تمہیں پیدا کیا ہے
اسی طرح تم دوبارہ لوٹو گے (۲۹) ایک فرقے کو اُس نے
ہدایت دی ہے اور ایک فرقہ ایسا ہے جس پر گمراہی کی
بات ثابت ہو چکی ہے بیشک انہوں نے بنا لیا ہے شیطان
کو اپنا ساتھی اللہ کے سوا ، اور گمان کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ
ہیں (۳۰) اے اولادِ آدم ! اختیار کرو اپنی زینت ہر نماز کے
وقت اور کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ
اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (۳۱)

ربطِ آیات

وحی الٰہی کے اتباع کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نافرمانی کرنے والوں کا
انجام بیان کیا ۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اور زمین میں اُن کی خلافت
و نیابت اور شیطان کے اغوا اور عداوت کی ساری کارگزاری اللہ نے بیان فرمائی جو
شیطان نے آدم علیہ السلام کے ساتھ کی تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا علیہما السلام کی لغزش
اور اُس پر تنبیہ کا حال بیان فرمایا ۔ پھر اُن کو معاف کیا اور زمین پر اترنے کا حکم دیا ۔ اور فرمایا
کہ ایک مقررہ مدت تک اس زمین تمہارا ٹھکانا ہوگا ۔ یہیں مرو گے اور قیامت کو اسی زمین
سے اٹھائے جاؤ گے ۔ شیطان کی عداوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اُس نے جنت
میں آدم اور حوا علیہما السلام کا لباس بھی اتروا دیا تھا اور انہیں جنت کے پتے تا کہ
کر اپنے اعضائے مستورہ کو چھپانا پڑا ۔ اسی ضمن میں اللہ نے زمین پر استعمال ہونے والے
لباس کا ذکر بھی کیا اور فرمایا کہ اے بنی آدم ! ہم نے تمہیں دنیا میں لباس کا طریقہ سکھایا
جو کہ انسان کے لیے ستر پوشی اور زینت کا باعث ہوتا ہے ۔ ستر پوشی انسان کے لیے
فرض ہے اور اعضائے مستورہ کا چھپانا انسانی فطرت میں داخل ہے ۔ اس کی مکمل

تشریح کل عرض کر دی تھی۔

لباس کا دوسرا بڑا فائدہ انسان کے لیے زینت ہے۔ آگے بھی زینت اختیار کرنے کا حکم آرہا ہے۔ زینت کی کئی قسمیں ہیں، یہ جائز بھی ہے اور ناجائز بھی، مباح بھی ہے اور سنت بھی، مکروہ بھی ہے اور حرام بھی۔ انسان کو جائز زینت ہی اختیار کرنی چاہیئے۔ فرمایا لباس بیشک انسان کے لیے باعث زینت ہے مگر تقویٰ اور پرہیزگاری کا لباس سب سے بہتر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو تنبیہ فرمائی کہ دیکھو کہیں تمہیں شیطان بہکا نہ دے۔ اُس نے جنت میں تمہارے جدِ امجد کا لباس اتروا دیا تھا۔ شیطان اور اس کی ذریت تمہارے کھلے دشمن ہیں اور تمہیں نظر بھی نہیں آتے لہٰذا ان سے بچاؤ کا سامان اختیار کرو۔ جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن پر شیاطین مسلط ہو کر انہیں بہکاتے رہتے ہیں۔

برہنہ طواف

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے منکرین توحید کی ایک قباحت کا ذکر فرمایا ہے وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً جب یہ لوگ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا تو کہتے ہیں ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اس چیز پر پایا ہے یعنی وہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اس بے حیائی سے مفسرین برہنہ طواف مراد لیتے ہیں۔ جب باہر کے لوگ حج کے لیے آتے تھے تو وہ اپنے روزمرہ کے لباس میں طواف کرنا درست خیال نہیں کرتے تھے بلکہ قریش سے عاریتاً لباس لے کر اس میں طواف کرتے تھے۔ اس کی تاویل انہوں نے یہ کر رکھی تھی کہ جس لباس میں ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اُس میں اللہ کے پاک گھر کا طواف نہیں کر سکتے۔ پھر خاندانِ قریش بعض حاجیوں کو اپنے تعلقات یا وسعت کی بناء پر لباس مہیا کرتے تھے اور جو لوگ لباس کے حصول میں ناکام رہتے، وہ برہنہ حالت میں طواف کرتے۔ اس میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوتے البتہ مرد دن کے وقت اور عورتیں رات کے وقت برہنہ طواف کرتیں۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے

کہ طواف کرتے وقت عورتیں اپنی زبان سے یہ بھی کہتیں الیوم یبدو بعضہ
او کلہ فما بدا منہ فلا احلہ یعنی آج ستر کا بعض
حصہ یا کل حصہ کھل جائیگا مگر آج کے دن ہم اسے بُرائی کے لیے جائز قرار
نہیں دیتے۔ اس طرح مرد و زن ننگے طواف کرتے۔

فاسد تاویلات

فرمایا کہ جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ برہنہ حالت میں طواف کیوں
کرتے ہو تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طریقے پر پایا ہے جس
طرح وہ طواف کرتے تھے، ہم بھی اُسی طرح کرتے ہیں، اور اُس کی وجہ یہ
ہے کہ ہم اپنے گناہ آلود کپڑوں میں اللہ کے پاک گھر کا طواف نہیں کر سکتے
سورۃ بقرہ میں اباؤ اجداد کی اندھی تقلید کے متعلق یہ بھی آتا ہے "اَوَلَوْ كَانَ
اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ" اگرچہ اُن
کے باپ دادا بے عقل اور غیر ہدایت یافتہ ہی ہوں مگر یہ انہی کے رستے
پر چلنے کے لیے مصر ہیں۔ اگر کسی کے سلف صحیح رستے پر گامزن ہوں
تو اُنکی پیروی کرنا اچھی بات ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا
تھا "وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ"
میں تو اپنے آباؤ اجداد حضرات ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی ملت
کا اتباع کرتا ہوں مگر مشرکین اور اہل بدعات کے راستے پر چلنے کی کیا تُک
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو عقل اور فہم عطا کیا ہے، لہٰذا یہ دیکھنا اُنکی
ذمہ داری ہے کہ وہ صحیح رستے پر جا رہے ہیں یا غلط راستے پر۔ محض اباؤ اجداد
کی تقلید کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکیں گے۔ قوم اور برادری
کو معیار اتباع بنانا کمزور اور بودی دلیل ہے اللہ کا حکم تو یہ ہے "اِتَّبِعُوْا مَآ
اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ" اپنے رب کی طرف سے نازل شدہ چیز کا
اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین اور شریعت کے احکام ہی قابل اتباع
ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنیوالی ہدایت کی پیروی

کی جائے۔ بعض چیزیں ذہنی طور پر بھی فاحشات میں داخل ہیں جیسے قرآن پاک میں بخل اور کمینگی کو بھی فحش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ زنا، لواطت اور عریانی بھی بےحیائی میں شامل ہیں اور انہی میں سے ایک فحاشی برہنہ طواف ہے حالانکہ بیت اللہ شریف کا طواف اہم ترین عبادت ہے جسے ان لوگوں نے برہنہ ہوکر فحاشی میں بدل دیا۔

اللہ پر افتراء

فرمایا برہنہ طواف کو ایک تو انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی طرف منسوب کیا۔ اور دوسری بدترین دلیل یہ پیش کی وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہ دیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اللہ تعالیٰ تو کسی بےحیائی اور فحاشی کا حکم نہیں دیتا۔ وہ تو پاک ذات ہے، وہ بُری بات کا حکم کیوں دیگا، برائی پر آمادہ کرنا تو شیطان کا کام ہے۔ برائی کا اللہ کی طرف انتساب تو عقل سلیم کبھی تسلیم نہیں کرتی لہذا تمہارا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے برہنہ طواف کا حکم دیا ہے۔ فرمایا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کیا تم اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی بات کہتے ہو جس کو جانتے نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ پر صریح جھوٹ باندھنے والی بات ہے۔ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ برہنہ طواف کا کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔

قیام عدل

فرمایا اس کے برخلاف قُلْ اے پیغمبر! آپ کہ دیں اَمَرَ رَبِّىْ بِالْقِسْطِ میرے رب نے تو عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ قسط ایسے درمیانے راستے کو کہتے ہیں جو افراط و تفریط سے پاک ہو۔ چنانچہ توحید عدل ہے اور شرک اور غلو افراط و تفریط میں داخل ہے اسی طرح بےحیائی بھی افراط میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں عدل اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور عدل کیا ہے۔ العدل هو الوسط من كل شئ المتجافي عن الافراط والتفريط یعنی عدل اُس درمیانے راستے کو کہا جاتا ہے جو افراط و تفریط

سے پاک ہو۔ اللہ تعالیٰ اعتدال اور انصاف کا حکم دیتا ہے اور افراط و تفریط سے منع کرتا ہے، بھلا وہ کیسے بے حیائی کا حکم دے سکتا ہے۔ یہ تو مشرکین کی اپنی اختراع ہے جسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

اخلاص فی العبادت

فرمایا، آپ یہ بھی کہہ دیں وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ اور قائم کرو اپنے چہروں کو ہر نماز کے وقت۔ یہاں پر مسجد سے مراد نماز ہے بعض اوقات کسی چیز کا جزو بیان کر کے مراد پوری چیز لی جاتی ہے۔ جیسے وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا یَرْكَعُوْنَ (المرسلت) یعنی جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے حضور جھک جاؤ تو نہیں جھکتے۔ جس طرح یہاں پر رکوع سے پوری نماز مراد لی گئی ہے۔ اسی طرح اس آیت میں مسجد سے نماز مراد ہے۔ چہرے کو قائم کرنے کا ظاہری معنی تو قبلہ کی طرف منہ کرنا ہے اور اس کا وجوب "فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ" (البقرہ) میں ہے کہ تم جہاں بھی ہو منہ اسی کی طرف کر دو۔ اور باطنی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت خلوص کے ساتھ کرو۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ظاہر و باطن سے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گا تو افراط و تفریط باقی نہیں رہے گی اور اعتدال کی راہ قائم ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں بے حیائی کی نوبت کہاں آسکتی ہے۔

نماز باجماعت

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مسجد سے مراد مطلق مسجد بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے چہروں کو مسجدوں کی طرف کر لو۔ اور مسجد کی طرف نماز باجماعت کے لیے جانا ہوتا ہے، لہٰذا اس میں نماز باجماعت کی تاکید پائی جاتی ہے بعض فقہائے کرام کے نزدیک نماز باجماعت فرض ہے جب کہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک واجب اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اُن کے اُستاذ امام ابو الحسن کرخیؒ نماز باجماعت کو فرض کفایہ فرماتے ہیں یعنی اگر بستی یا محلہ کے بعض آدمی جماعت کے ساتھ نماز ادا کر لیں تو فرض

ادا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی بھی ایسا نہ کرے تو سب گنہگار ہوں گے حضور علیہ السلام نے نماز باجماعت کی سخت تاکید فرمائی ہے اور فرمایا کہ اگر کسی بادیہ، گاؤں، جنگل یا صحرا میں تین آدمی بھی موجود ہوں اور وہ نماز باجماعت ادا نہ کریں تو اُن پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ نماز باجماعت کا درجہ اکیلے پڑھنے کی نسبت ستائیس گنا بڑھ جاتا ہے۔ جماعت سے غیر حاضر رہنے والوں کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سخت وعید سنائی ہے۔ فرمایا میں چاہتا ہوں کہ جماعت کھڑی کرا دوں اور کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر جاؤں اور نماز میں شامل نہ ہونے والے لوگوں کے گھروں کو لکڑیاں ڈال کر آگ لگا دوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں ہے کہ جماعت کی حاضری ترک کرو گے تو تارک سنت اور منافق بن جاؤ گے۔ اور اگر ایسا ہوا لَضَلَلْتُمْ تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ الغرض! اس آیت میں مذکور مسجد سے مطلق مسجد بھی مراد ہو سکتی ہے، جماعت کی حاضری پر بھی محمول کر سکتے ہیں نماز میں رُخ کا تعین بھی ہو سکتا ہے اور نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا بھی مراد لے سکتے ہیں۔

فرمایا وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارو اس حال میں کہ خاص اُسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہو۔ وہی عبادت کے لائق ہے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور عبادت میں ریاکاری کو داخل نہ ہونے دو۔ مگر تم سو فیصدی اس کے خلاف کرتے ہو۔ غلط باتوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہو، جو کہ بڑے ظلم کی بات ہے۔

بعث بعد الموت

فرمایا یاد رکھو! كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ جس طرح تم کو پیدا کیا تھا اُسی طرح تم دوبارہ لوٹو گے۔ قیامت برحق ہے، وہ برپا ہوگی اور جزائے عمل ضرور واقع ہوگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مَا بَدَاَ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ جس حالت میں تم اس دنیا میں ہو گے اُسی حالت میں قیامت کو اٹھائے جاؤ گے۔ اگر دنیا میں تم ایمان پر قائم رہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہے

اصل زمین پہ جہاں نہ خاتمہ ہو گیا تو وہاں بھی ایماندار ہی اٹھو گے۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ آتے ہیں یُبْعَثُ مَا مَاتَ عَلَیْہِ انسان اُس چیز پہ دوبارہ اٹھایا جائے گا جس پہ اُس کی موت واقع ہوئی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (البقرہ) تمہیں ہر وقت اس بات کے لیے کوشاں رہنا چاہیئے کہ تمہاری موت ایمان پر آئے۔ جو فرمانبرداری کی حالت میں فوت ہو گا وہ اُسی حالت پہ اٹھے گا اور جو نافرمانی کی حالت میں مریگا اُس کی بعثت بھی نافرمانی کی حالت میں ہی ہو گی۔ غرضیکہ جزائے عمل بالکل برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ جس مقام پہ اُس کی توحید اور ایمان کا ذکر ہوتا ہے، ساتھ رسالت کا تذکرہ بھی ہوتا اور ساتھ ساتھ قیامت کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ تو یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے جہاں ایمان اور اخلاص کا ذکر کیا ہے ساتھ بعث بعد الموت کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔

ہدایت یافتہ اور گمراہ لوگ

ارشاد ہوتا ہے فَرِیْقًا ھَدٰی ایک فریق کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی ہے وہ منصف مزاج تھے، اُن کی صلاحیت ٹھیک تھی اور قویٰ درست تھے۔ لہٰذا وہ ہدایت پا گئے۔ اور اس کے برخلاف وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْھِمُ الضَّلٰلَۃُ اور ایک گروہ پہ گمراہی ثابت ہو گئی۔ جب کسی کی استعداد صحیح نہ ہو یا اُس کا استعمال غلط ہو تو پھر اُن کی حالت یہ ہوتی ہے اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ بیشک خدا کے نزدیک بدترین جاندار بہرے اور گونگے ہیں جو عقل کو استعمال نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کا شکوہ کیا ہے کہ اُس نے عقل جیسا اعلیٰ جوہر عطا کیا مگر ایک گروہ نے اس سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا۔ جو کوئی عقل سے کام لے گا اُسے صحیح طریقے پر استعمال کرے گا، وہ ہدایت پا جائے گا۔ گمراہی کی بات پر اصرار کرنے سے انسان کی استعداد اور صلاحیت ہی ضائع ہو جاتی ہے پھر اگر وہ معافی نہ مانگے تو دل پہ سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ پھر وہ بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ سارا دل زنگ آلود

ہو کر وہ شخص اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ اُس فہرست میں شامل ہو جاتا ہے جس کے
متعلق فرمایا كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ اُن کے اعمال کی وجہ سے اُن کے دلوں پر زنگ چڑھ جاتا ہے
اور دل تاریک ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ جو کوئی برائی پر اصرار کرتا ہے
کفر، شرک اور بدعات میں مبتلا ہوتا ہے اُسے ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

گمراہوں کی خام خیالی

فرمایا اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
انہوں نے اللہ کے علاوہ شیاطین کو اپنا رفیق بنایا۔ وہ شیطان کے پھندے
میں پھنس چکے ہیں اور اب جس قسم کا وہ وسوسہ ڈالتا ہے اُسی قسم کے کام انجام
دیتے ہیں حتیٰ کہ عریانی اور فحاشی کو عبادت سمجھنے لگتے ہیں اور برائی کو نیکی پر
محمول کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ تعجب کی بات یہ ہے ۔ وَ
يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں
یعنی جو کچھ کر رہے ہیں بالکل ٹھیک کر رہے ہیں۔ اہل بدعات اور غلط رسوم کے
پجاری ہمیشہ یہی گمان کرتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام انجام دے رہے ہیں ۔
سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ
بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا
آپ کہ دیجیے کیا ہم تمہیں نہ بتائیں کہ اعمال کے اعتبار سے زیادہ گھاٹے
والے کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی دنیا کی کوشش رائیگاں گئی، مگر
وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں حالانکہ وہ سو فیصدی شیطان کے
پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ شرک کرنے والے، بدعات کے کام
انجام دینے والے حتیٰ کہ ننگا طواف کرنے والے بھی یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ
بڑا نیکی کا کام کر رہے ہیں قبروں پر گنبد بنانے والے، اُن پر چادریں چڑھانے
اور عرس منانے والے حتیٰ کہ ڈھول بجانے اور قوالی کرنے والے بھی یہ

اعلیٰ درجے کی نیکی اور کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان کا موں سے اللہ راضی ہو رہا ہے یا شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔
بلاشبہ جن پر گمراہی ثابت ہو چکی ہے۔ انہوں نے شیاطین کو اپنا رفیق اور ساتھی بنا لیا ہے۔ تمام غلط کار اپنی پالیسی اور طرزِ عمل کو بالکل درست عمل خیال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مذمت بیان فرمائی ہے۔

نماز کے وقت زینت

آخر میں پھر وہی بات آئی جو حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرے میں شروع ہوئی تھی۔ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ اے اولادِ آدم! ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا مسجد سے اگر مطلق مسجد مراد ہو تو مطلب نماز کی حاضری ہے۔ اور اگر مسجد سے سجدہ مراد لیا جائے تو مطلب مکمل نماز ہے۔ اس کو طواف پر بھی محمول کر سکتے ہیں کیونکہ اَلطَّوَافُ حَوْلَ الْبَیْتِ مِثْلُ الصَّلٰوۃِ اِلَّا اَنَّکُمْ تَتَکَلَّمُوْنَ فِیْہَا بیت اللہ شریف کا طواف بھی نماز کی مانند ہی ہے سوائے اس کے کہ نماز میں کلام نہیں کیا جا سکتا جب کہ طواف میں یہ مباح ہے۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ جب نماز برہنگی کی حالت میں نہیں ہو سکتی اور اس کے لیے ستر عورت ضروری ہے تو طواف ایسی حالت میں کیسے ہو سکتا ہے جب کہ وہ بھی نماز کی مثل ہی ہے۔ مرد کے لیے ستر عورت ناف سے لیکر گھٹنوں تک ہے اور گھٹنے اس کے اندر ہیں۔ یہ فرض عین ہے۔ بلکہ امام احمدؒ تو فرماتے ہیں کہ نماز کے لیے کندھوں پر کپڑا ہونا بھی فرض ہے تاہم باقی آئمہ اسے فرائض میں شامل نہیں کرتے۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے اس کے لیے چہرے، کلائی تک ہاتھوں اور ٹخنوں تک پاؤں کے علاوہ سارا جسم ستر ہے حتیٰ کہ سر کے بال بھی پردہ میں داخل ہیں۔ اگر بال کھلے ہیں تو بھی نماز نہیں ہو گی۔ تو فرمایا نماز کے وقت زینت پکڑو اور زینت لباس سے ہوتی ہے۔ اس

سے متعلق کل عرض کیا تھا کہ لباس فرض بھی ہے، سنت بھی، مباح بھی اور حرام بھی جس کی تفصیلات بیان ہو چکی ہیں۔

عورت کیلئے پردہ کا حکم

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ مبارک ہے کہ جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور ہاتھوں کے سوائے کوئی حصہ جسم نظر نہیں آنا چاہیئے۔ امام مالکؒ ہاتھ کو بھی پردے میں شمار کرتے ہیں لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک تین اعضا مستثنا ہیں یعنی پاؤں ہاتھ اور چہرہ۔ اگر ان کے علاوہ عورت کے جسم کا کوئی حصہ کھلا ہوگا تو نماز نہیں ہوگی۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ چہرہ اگرچہ ستر میں داخل نہیں لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ جوان عورت گھر سے باہر جاتے وقت چہرے پہ نقاب ڈال لے کیونکہ حسن و خوبی کا اظہار چہرے ہی سے ہوتا ہے۔ اور اکثر فتنے چہرہ کھلنے سے ہی پیدا ہوتے لہذا بغیر ضرورت ان اعضاء کو نہیں کھولنا چاہیئے، شامی میں یہی لکھا ہے البتہ بعض اوقات مجبوری کی حالت میں پڑے کے بعض اعضاء کو کھولنا مباح ہو جاتا ہے مثلاً کہیں شناخت کرانا مقصود ہو یا کہیں شہادت دینا ہو یا بیماری کی صورت میں ماہر معالج کو کوئی حصہ جسم دکھانا ضروری ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔ افسوس کا مقام ہے کہ انگریزی تہذیب نے عورت کو بالکل بے پردہ کر دیا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے۔ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ" (سورۃ نور) عورتیں اپنی زیب و زینت کا اظہار نہ کریں اور اپنے سینوں پہ اپنی اوڑھنیاں اوڑھے رکھیں اس کے برخلاف اگر عورتیں چہرے کی زیب و زینت کے ساتھ بلا پردہ باہر نکلیں گی تو اس سے فتنے ہی پیدا ہوں گے۔

اسراف کی ممانعت

فرمایا ہر نماز کے وقت زینت اختیار کرو وَكُلُوا وَاشْرَبُوا کھاؤ پیو، وَلَا تُسْرِفُوا مگر فضول خرچی نہ کرو۔ کھانا پینا عام حالات میں مباح ہے مگر بعض حالات میں فرض ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بھوک کی وجہ سے

جان بلب ہے مگر کھانا نہیں کھاتا تو وہ مردار کی موت مریگا۔ ایسی حالت میں
اس کے لیے کھانا فرض ہو جاتا ہے۔ لیکن اسراف یہ ہے کہ کوئی شخص حلال مال
کو حرام کے کاموں میں خرچ کرے یا ضرورت سے زیادہ خرچ کرے۔ باطل
رسومات کے تمام اخراجات اسراف میں شامل ہیں اور قابل مؤاخذہ ہیں لوگ مکان
بنانے پر اسراف کرتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ بڑا مکان یا اس پر غیر ضروری
نقش و نگار فضول خرچی میں شامل ہے خوراک کے معاملے میں بھی اکثر اسراف
ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور مرنے کی تقریبات پر پُرتکلف اور وافر مقدار کے
کھانے بلاشبہ اسراف میں داخل ہیں۔ امراء کی دیکھا دیکھی غربا بھی اس دوڑ میں
شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر مقروض ہو جاتے ہیں، یہ دوسری
قباحت ہے۔ جہیز کی ادائیگی میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے
کی کوشش اور پھر زیورات کی دوڑ سب اسراف کے مختلف طریقے ہیں۔ اللہ
نے اسراف کے تبذیر کے مرتکبین کو شیطان کے بھائی کہا ہے۔ فرمایا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ
الْمُسْرِفِينَ اللہ تعالیٰ فضول خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ایسے
لوگ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتے ہیں۔ نَهَىٰ عَنْ إِضَاعَةِ الْمَالِ
مال کو بلاوجہ ضائع کرنے سے منع کیا گیا ہے جس طرح حرام کمائی میں برکت نہیں
ہوتی اسی طرح حرام خرچ بھی بے برکت ہوتا ہے۔ ہمیشہ اعتدال کی راہ اختیار
کرنی چاہیئے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْىَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ :- اے پیغمبر ! کہہ دیجئے ، کس نے حرام قرار دیا ہے اللہ کی زینت کو جو اس نے نکالی ہے اپنے بندوں کے لیے اور پاکیزہ چیزیں رزق سے ۔ آپ کہہ دیجئے یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں اور یہ خالص ہوں گی ان کے لیے قیامت کے دن ۔ اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیتیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں (۳۲) اے پیغمبر! آپ

کہہ دیجئے ! بیشک حرام قرار دیا ہے میرے پروردگار نے بےحیائی کی باتوں کو جو ظاہر ہوں ان میں سے یا پوشیدہ ۔ اور گناہ اور ناحق سرکشی (کو حرام قرار دیا ہے) اور یہ کہ تم شریک بناؤ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی چیزوں کو جن کے بارے میں اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری ۔ اور یہ کہ تم کہو اللہ پر وہ بات جو تم نہیں جانتے (۳۳) اور ہر ایک امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے ۔ جب آ جائے گا ان کا وعدہ تو نہیں پیچھے ہٹیں گے اس سے ایک گھڑی اور نہ آگے ہوں گے (۳۴)

ربط آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے وقت زینت اختیار کرنے کا حکم دیا تھا ۔ اس ضمن میں ستر پوشی کو اولیت حاصل ہے ۔ ستر پوشی انسان کے لیے ہر وقت ضروری ہے مگر نماز کے لیے تو اس کا خاص طور پر اہتمام ہونا چاہیئے ۔ اس کے برخلاف برہنہ طواف کرنے والوں کی مذمت بیان کی گئی اور واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا بلکہ یہ بات شیطان نے مشرکین کے ذہنوں میں ڈال رکھی ہے کہ جس لباس میں ہم روزمرہ کے کام انجام دیتے ہیں اور گناہوں کا ارتکاب بھی کرتے ہیں ، وہ لباس اللہ کے پاک گھر کے طواف کے لیے مناسب نہیں ۔ چنانچہ اس کے لیے وہ مکے کے بیرزادوں سے عاریتاً لباس حاصل کرتے تھے یا پھر برہنہ طواف کو ترجیح دیتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بےحیائی قرار دے کر اس سے منع فرمایا اور پردہ پوشی کا حکم دیا ۔ یہ مرد کے لیے ناف سے لیکر گھٹنوں تک کا حصہ جسم پردہ میں شامل ہے اور اس کا ڈھانپنا فرض عین ہے ۔ البتہ عورت کے لیے اس کا سارا جسم پردہ ہے سوائے ہاتھوں اور چہرے کے ۔ عورت کے لیے ہر وقت باپردہ رہنا ضروری ہے اور نماز کے لیے اس کا خاص اہتمام ہونا چاہیئے اللہ تعالیٰ نے بےحیائی کے کاموں سے منع فرمایا اور کھانے پینے کی اجازت دی اور اسراف سے روکا ۔

حلت و حرمت کی بنیاد

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے حلت و حرمت کا مسئلہ بیان فرمایا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ حلال یا حرام وہ چیز نہیں جو تمہارے ذہن کی اختراع ہو بلکہ کسی چیز پر حلت و حرمت کا حکم لگانا اللہ تعالیٰ کی ذات کا کام ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین کے کچھ بگڑے ہوئے لوگ تو ترک دنیا اختیار کر لیتے تھے، کچھ عبادت بھی کرتے تھے، مگر مشرک ہی ہوتے تھے، وہ متحنث کہلاتے تھے۔ احبار اور رہبان قسم کے یہ لوگ اپنی مرضی سے بعض حلال اور جائز چیزوں کو بھی ناجائز قرار دیتے تھے وہ نہ تو اچھے لباس کو جائز قرار دیتے تھے اور نہ اچھی خوراک کو، بلکہ انہوں نے یہ چیزیں از خود اپنے آپ پر حرام کر رکھی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا ہے۔ اور اچھے لباس اور اچھی خوراک کو حسب توفیق جائز قرار دیا ہے جب تک کہ ان میں حرام کی ملاوٹ نہ ہو۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے اِلْبَسُوْا مَا شِئْتُمْ جو لباس تمہارا جی چاہے پہنو جس میں تکبر اور اسراف نہ ہو، حرام لباس کی بھی اجازت نہیں۔ نفیس اور قیمتی لباس بھی اگر حلال ذرائع سے میسر ہو پہن سکتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے ایک جوڑا خریدا تھا جس کی قیمت ستائیس اونٹنیاں تھی۔ اسی طرح یہ بھی آتا ہے کہ دومۃ الجندل کے حاکم اکیدر نے آپکی خدمت میں ایک جوڑا بھیجا تھا جس کی قیمت پینتیس ۳۵ اونٹ کے برابر تھی آپ نے یہ لباس بھی زیب تن فرمایا، تاہم عام طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عادت مبارک تھی کہ سادہ لباس پہنتے تھے۔ آپ نے عمدہ لباس پہننے کے لیے کبھی تکلف نہیں فرمایا۔

تکبر کی تعریف

حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جب آپ نے تکبر کی مذمت بیان فرمائی تو لوگوں نے دریافت کیا حضور! اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ ثَوْبًا حَسَنًا وَّنَعْلُهٗ حَسَنًا وَّ مَرْکَبُهٗ حَسَنًا یعنی اگر کسی شخص کا لباس اچھا ہو جوتا اچھا ہو اور سواری اچھی ہو، تو یہ کیا تکبر کی علامت ہے؟ فرمایا، نہیں، بلکہ یہ تو جمال کی نشانی ہے۔ اَللّٰهُ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَالَ اللہ تعالیٰ

خود جمیل ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے ولٰکِنَّ الْکِبْرَ غَمْطُ النَّاسِ وَبَطَرُ الْحَقِّ "بلکہ تکبر یہ ہے کہ لوگوں کو حقیر سمجھا جائے اور حق بات کو ٹھکرا دیا جائے" کسی دوسرے کو مال میں کمی کی وجہ سے حقیر جاننے یا خاندانی کمتری خیال کرنے۔ یہ تکبر کی نشانی ہے اسی طرح کوئی شخص اپنے آپ کو علم میں اعلیٰ اور دوسرے کو حقیر سمجھے تو یہ بھی تکبر ہے کوئی شخص اچھے مکان اور اچھی سواری کی وجہ سے تکبر کرے اور دوسرے کو حقیر جانے تو وہ بھی اسی صف میں شامل ہوگا۔ اور تکبر ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قطعی حرام قرار دیا ہے۔

مباح اور ناجائز زینت

چونکہ متحنثین نے اچھے لباس اور اچھی خوراک کو از خود حرام قرار دے رکھا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ؟ کس نے حرام قرار دیا ہے۔ اللہ کی زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے۔ زینت کی اولین چیز انسان کا لباس ہوتا ہے، نہانا دھونا، میل کچیل صاف کرنا، دُھلا ہوا ستھرا لباس پہننا، خوشبو لگانا، تیل استعمال کرنا، سرمہ لگانا، عورتوں کا مہندی لگانا یہ سب زینت کی چیزیں ہیں اور بالکل جائز ہیں، ان کو حرام قرار دینے والا کون ہے؟ یہ تو پسندیدہ چیزیں ہیں۔ البتہ اگر تکلیف اٹھا کر اپنی وسعت سے زیادہ زیب و زینت کا اہتمام کیا جائے تو وہ درست نہیں۔ اسی طرح عورتیں اپنے بال لمبے ظاہر کرنے کے لیے دوسری عورتوں کے بال استعمال کریں تو یہ ممنوع امر ہے۔ دانت صاف کرنے کے لیے مسواک یا کوئی دوسری چیز استعمال کرنا درست ہے مگر غیر موزوں قدرتی دانتوں کو رگڑوا کر درست کرنا یا ان کی جگہ خوبصورت دانت لگوانا یا دانتوں پر سونے چاندی کا خول چڑھانا بناوٹی زینت میں شمار ہوتا ہے اور قبیح فعل ہے۔ عام حالات میں اگر دانت ضائع ہو جائیں تو ان کی جگہ نئے دانت لگوائے جا سکتے ہیں مگر محض زینت کی خاطر دانتوں کے درمیان

فاصلہ قائم کرنا، گھٹنے ابروؤں کو کشادہ کرنا جسم کے کسی حصے پہ داغ کے ذریعے پھول بوٹے بنوانا درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جائز طریقے سے زیب و زینت اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔

پاکیزہ رزق

اللہ نے فرمایا وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ روزی میں سے پاکیزہ چیزیں کس نے حرام قرار دی ہیں؟ حلال، لذیذ، عمدہ اور ستھرا کھانا ہو تو اس کو کون حرام کہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے تو ایسی روزی کو حلال قرار دیا ہے مگر اس میں بھی تکلف نہیں کرنا چاہیئے، اپنی حیثیت کے مطابق کھانا کھانا چاہیئے، البتہ حرام اور مشتبہ چیز کو کھانے کی اجازت نہیں مگر راہب لوگوں نے تو جائز روزی کو حرام کہہ رکھا ہے جو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ البتہ بعض آدمی مصلحت کی خاطر اچھے لباس اور اچھے کھانے سے پرہیز کرتے ہیں وہ جائز ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ عمدہ لباس محض اس لیے نہیں پہنتے تھے کہ ان کی دیکھا دیکھی ان کے عمال بڑے فیشن کے طور پر نہ اختیار کر لیں۔ آپ پیوند زدہ کپڑے پہنتے تھے، معمولی کھانا کھاتے تھے تاکہ لوگ ان کی پیروی کریں اور تکلیف میں نہ پڑیں۔ اگر آپ کے کسی حاکم نے اعلیٰ لباس پہنا تو آپ نے ڈانٹ پلائی کہ تمہیں دیکھ کر باقی لوگ بھی ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور پھر یہ تکلیف کا باعث ہوگا۔ ملوکیت میں یہی تو لعنت ہوتی ہے کہ ان کے پیش نظر عیاشی ہوتی ہے اور پھر عام لوگ بھی انہی کے نقش قدم پہ چلتے ہیں کیونکہ مشہور مقولہ ہے اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ یعنی لوگ اپنے ملوک کے طریقے پہ ہی چلتے ہیں۔

بعض بزرگان دین کے پیش نظر بھی یہی مصلحت رہی کہ کہیں لوگ تعیش میں نہ پڑ جائیں، لہٰذا انہوں نے سادہ خوراک اور معمولی لباس استعمال کیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمدہ ضروریات زندگی ناجائز ہیں۔ بہت سے متقدمین خوش پوشی کی مثال بھی پیش کرتے ہیں۔ امام حسینؓ نے شہادت

کے وقت ریشم کا لباس پہنا ہوا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے چار سو درہم کی چادر اوڑھی۔ امام محمدؒ بھی اچھا اور عمدہ لباس پہنتے تھے۔ امام ابوالحسن شاذلیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی خوش پوشی کا نمونہ تھے۔ یہ زینت ہے اور اللہ نے اسے حلال قرار دیا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ صاحب استطاعت آدمی اگر محض اللہ کی رضا کی خاطر معمولی لباس پر اکتفا کرتا ہے، تو وہ شخص بلند مرتبت ہے اللہ تعالیٰ اُسے بہت زیادہ اجر دیگا۔ بعض لوگ دوسروں کو اچھا لباس پہنا کر خوش ہوتے ہیں، وہ بھی عنداللہ ماجور ہوں گے۔ امام ابوحنیفہؒ کپڑے کے صنعتکار اور بہت بڑے تاجر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی وسعت عطا کی تھی آپ خود بھی اچھا پہنتے تھے اور اسلام کے راستے میں بھی دل کھول کر خرچ کرتے تھے، غریب غربا، علماء اور طلباء کی خدمت کو باعث سعادت سمجھتے تھے۔ امام حسینؓ کے فرزند امام زین العابدینؒ اعلیٰ کپڑا پہنتے اور کچھ دیر استعمال کے بعد کسی غریب کو دے دیتے۔ ایک دفعہ آپ نے بڑا قیمتی کمبل خریدا اور پھر صدقہ کر دیا۔ بہرحال جائز زینت اختیار کرنا روا ہے اور اسی طرح پاکیزہ اور حلال روزی کھانے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔

ان انعامات کے مستحقین

اچھی زینت اور پاکیزہ کھانے کے استحقاق کے متعلق فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا یہ نعمتیں دنیا کی زندگی میں اہل ایمان کے لیے ہیں، وہ انہیں استعمال کر سکتے ہیں خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اور قیامت والے دن خاص طور پر ایمان والوں کے لیے ہوں گی۔ مقصد یہ ہے کہ اچھا لباس اور اچھی خوراک دنیا میں تو اہل ایمان کے علاوہ کافر، مشرک، دہریے، ملحد اور منکرین خدا کو بھی میسر ہیں، انہیں بھی استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ مگر قیامت کو یہ چیزیں اہل ایمان کے لیے خاص ہوں گی، وہاں منکرین ان

سے استفادہ نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ وہ تو عذاب میں مبتلا ہوں گے۔
بعض فرماتے ہیں کہ اس حصہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو یہ نعمتیں بغیر مشقت کے حاصل نہیں ہوتیں۔ اور اگر ہوتی بھی ہیں تو دائمی نہیں ہوتیں، ان کے چھن جانے کا ہر لمحہ امکان ہوتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو انسان کی اپنی موت تو ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے۔ جونہی موت کا بگل بج گیا، سب کچھ ختم ہو گیا، لہذا دنیا میں یہ نعمتیں بالکل عارضی ہیں۔ اس کے برخلاف آخرت کی نعمتیں دائمی ہوں گی اور بغیر کسی مشقت کے حاصل ہوں گی۔ ان کے چھن جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

فرمایا کَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیتیں یعنی احکام ان لوگوں کے لیے جو علم اور سمجھ رکھتے ہیں۔ صاحب عقل لوگ سمجھ جائیں گے کہ مشرکین کا طریقہ غلط ہے۔ اللہ کی حلال کردہ اشیا حلال اور قابل استعمال ہیں۔ تاہم اس نے ساتھ یہ پابندی لگا رکھی ہے کہ اس کی نعمتوں کو استعمال کر کے اُن کا شکریہ بھی ادا کرو۔

حرام اشیاء

آگے اللہ تعالیٰ نے بعض حرام چیزوں کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں۔ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ بیشک حرام قرار دیا ہے میرے رب نے بے حیائی کو۔ اور اس میں زنا، لواطت، عریانی، نیم عریانی، گالی گلوچ، بخل، بداخلاقی، فحش گانے اور ناول وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان چیزوں سے انسان کا اخلاق برباد ہوتا ہے فرمایا ہر فحش بات حرام ہے مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ ہو۔ انگریز کے قانون میں تو برائی وہ ہے جسے سرعام کیا جائے اور اندرون خانہ انجام دی گئی برائی پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا مگر اسلام میں ہر ظاہر اور پوشیدہ برائی بہرحال برائی اور قابل مواخذہ ہے۔ اللہ نے سے

حرام قرار دیا ہے۔
فحاشی کے علاوہ وَالْاِثْمَ گناہ کی ہر بات بھی حرام ہے۔ چوری،
جوا، شراب نوشی، ترک فرائض وغیرہ سب گناہ میں شامل اور حرام ہیں۔ فرمایا
وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ اور ناحق سرکشی بھی حرام ہے۔ کسی کے ساتھ ظلم و
زیادتی کرنا، کسی کا ناحق مال کھانا، کسی کا حق غصب کرنا، تہمت لگانا، یہ
سب اسی مد میں آتے ہیں، لہٰذا یہ بھی حرام ہیں۔ اللہ نے فرمایا وَاَنْ
تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ
کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراؤ جن کے بارے میں اُس نے کوئی
دلیل نازل نہیں کی۔ شرک بھی قطعی حرام اور اکبرالکبائر میں شامل ہے۔ مشرکین
بہت سی باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف ناحق منسوب کرتے تھے جیسا کہ گذشتہ
درس میں گزر چکا ہے کہ وہ برہنہ طواف کو اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے
یا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے وہ بعض جانوروں کو از خود حرام قرار دے کر
اس کی نسبت اللہ کی طرف کر دیتے تھے۔ کہ اللہ نے ایسا ہی حکم دیا ہے
فرمایا وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یہ بھی حرام
ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے۔ مثلاً خدا کے لیے بیوی
اور اولاد کا ثابت کرنا یا ایسی چیزوں کی حلت و حرمت اللہ کی طرف منسوب
کرنا جو فی الحقیقت اُس نے نہ کی ہو۔ بعض رسومات باطلہ کو اللہ کی طرف
منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ اللہ نے اُن کا حکم نہیں دیا ہوتا۔ سب
چیزیں حرام ہیں۔

گناہوں کے اثرات

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مختلف گناہوں کے اثرات اپنی نوعیت
کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً زنا کی وجہ سے نسب میں خرابی پیدا
ہوتی ہے اسی لیے زنا کو فحش قرار دیا گیا ہے۔ شراب نوشی سے انسان کی
عقل خراب ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے گالیاں بکتا ہے اور قتل و غارت کا

مرتکب ہو جاتا ہے۔ شراب جیسی قبیح چیز کے متعلق کہا گیا ہے الخمر جماع الاثم شراب تمام گناہوں کی جامع ہے۔ عربی میں شراب کو مجسم گناہ بھی کہا جاتا ہے جیسے ؎

شربت الاثم حتی ضل عقلی
کذالک الاثم یذهب بالعقول

میں نے شراب نوشی کی حتیٰ کہ میری عقل جاتی رہی۔ یہ شراب عقل کو اسی طرح گم کر دیتی ہے۔ شراب کے علاوہ بھنگ، چرس، ہیروئن وغیرہ تمام نشہ آور چیزیں ہیں جو دماغ میں فتور پیدا کرتی ہیں۔

سرکشی جیسے قبیح گناہ کی وجہ سے انسان کی عزت و آبرو خراب ہو جاتی ہے جب کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کرتا ہے کسی کا مال چھینتا ہے کسی کو قتل کرتا ہے، گالی نکالتا ہے تو یہ چیزیں اُسے بے آبرو کر کے رکھ دیتی ہیں۔

شرک کا ارتکاب کرنے سے انسان کی روح ناپاک ہو جاتی ہے "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" بیشک شرک کرنے والے ناپاک ہیں۔ وہ اگرچہ بظاہر صاف ستھرے ہوں مگر اُن کی روحیں ناپاک ہوتی ہیں۔ اسی طرح غیر اللہ کی نیاز کھانے والوں کا باطن پلید ہو جاتا ہے۔ یہ مختلف قسم کے گناہ ہیں جو حرام ہیں اِن سے بچنا چاہیئے البتہ اچھا لباس پہنو، پاک کھانا کھاؤ، خدا تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کا شکریہ ادا کرو۔

مقررہ وقت

فرمایا وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے جس طرح ایک فرد اپنی زندگی کے ایام پورے کر کے رخصت ہو جاتا ہے اسی طرح ہر قوم اور گروہ بھی اپنے وقت پر ختم ہو جاتا ہے۔ فرد کی نسبت قوموں کی عمریں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ بعض قومیں دنیا میں ہزاروں سال تک بڑی دھوم دھام سے برسرِ عروج رہتی ہیں پھر جب اُن میں اسباب حیات کمزور پڑ جاتے ہیں تو وہ مغلوب ہو جاتی ہیں یا دنیا سے بالکل مٹ

جاتی ہیں۔ مسلمان دنیا میں صدیوں تک چھائے رہے مگر اب انحطاط پذیر ہیں
ان میں وہ اخلاق باقی نہیں رہا جس سے قومیں زندہ رہتی ہیں۔ اب ان کی
حالت مردہ قوم کی سی ہے، دنیا میں کہیں بھی وقار حاصل نہیں۔ دنیا میں اس وقت
مسلمانوں کی پچاس ریاستیں ہیں مگر فرداً فرداً سب دوسروں کی دست نگر ہیں۔
اس انحطاط کے باوجود مسلمانوں میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کا شعور
موجود ہے مگر اس کے لیے جس محنت و سعی کی ضرورت ہے، وہ مفقود
ہے۔ اگر مسلمان اجتماعی طور پر کوشش کریں تو نشاۃ ثانیہ میں عزت و وقار حاصل
کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں قوموں کے عروج و زوال کا خوب
حال بیان کیا ہے۔ قوموں کی خوبیاں اور خامیاں بھی بیان کی ہیں اور زوال کے
اسباب کی نشان دہی بھی کی ہے۔ آپس کی فرقہ بندی، لڑائی جھگڑا، جہالت وغیرہ
ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے قومیں اپنا مقام کھو بیٹھتی ہیں اور جب ایک دفعہ
گر جاتی ہیں تو پھر صدیوں تک اٹھنا محال ہو جاتا ہے۔

فرمایا ہر امت کے ایک وعدے کا وقت ہے فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ
پھر جب اُن کے وعدے کا وقت آجاتا ہے لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ تو نہ پیچھے ہٹتے ہیں اور نہ آگے ہوتے ہیں بلکہ عین وقت
پر ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ کہ جب کسی قوم کی اجتماعی زندگی کا وقت
پورا ہو جاتا ہے، تو پھر اسے مزید مہلت نہیں دی جاتی اور وہ ختم ہو جاتی ہے
وقت سے پہلے واقع ہونے کی بات بالطبع کی گئی ہے اصل بات یہی ہے
کہ تاخیر نہیں ہوتی یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی دکاندار سے چیز کا بھاؤ پوچھ
کر کہا جاتا ہے کہ کچھ کمی بیشی کر دو۔ اس سے مراد کمی ہی ہوتا، بیشی تو کبھی بھی مراد نہیں
ہوتی اسی طرح یہاں بھی فرمایا گیا ہے کہ وقت مقررہ سے آگے پیچھے نہیں
ہوتا یعنی مقررہ وقت میں تاخیر نہیں کی جاتی بلکہ عین وقت پر کام تمام ہو جاتا ہے،
حلال و حرام کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے قوموں کے وقت مقررہ

کا ذکر اس لیے فرمایا ہے تاکہ مذکورہ حلت و حرمت کے قوانین کی پاسداری کرو۔ تمہارے لیے یہی نجات کا راستہ ہے اور اگر اس پر کاربند نہ رہ سکے تو پھر تمہارا مقررہ وقت تو لازماً آئے گا۔ جب یہ مہلت ختم ہو جائیگی اور تمہیں پکڑ لیا جائے گا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰۗىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

ترجمہ:- اے اولادِ آدم! جب آئیں گے تمہارے
پاس رسول تم میں سے۔ بیان کریں گے تم پر میری آیتیں
پس جو شخص بچ گیا اور اُس نے اصلاح کی، پس نہیں
خوف ہو گا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۳۵) اور
وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا
اُن سے، یہی لوگ ہیں دوزخ والے، وہ اس میں ہمیشہ

سہنے والے ہوں گے (۳۶) پس کون زیادہ ظالم ہے اُس سے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے یا اُس کی آیتوں کو جھٹلاتا ہے یہی لوگ ہیں جنکو پہنچے گا اُن کا حصہ جو کتاب میں لکھا ہوا ہے ، یہاں تک کہ جب آجائیں اُن کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے جو اُن کو وفات دیتے ہیں (اُن کی جانیں قبض کرتے ہیں) تو وہ کہیں گے تم کہاں تھے ، تم کس کو پکارتے تھے اللہ کے سوا۔ وہ کہیں گے ، وہ ہم سے گم ہو گئے ہیں اور گواہی دیں گے اپنے نفسوں پر کہ بیشک تھے وہ کفر کرنے والے (۳۷)

اولادِ آدم سے خطاب

اِس آیت میں اولادِ آدم سے خطاب کے متعلق مفسرین کرام کی دو رائیں ہیں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ اگرچہ خطاب تمام اولادِ آدم کو اکٹھا ہے مگر فی الواقع یہ ہر نبی کے زمانہ میں علیحدہ علیحدہ ہوتا رہا ہے، تاہم یہاں پر بیان اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اس کی مثال رسولوں سے خطاب میں بھی ملتی ہے جیسے فرمایا يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (المومنون) اے گروہ رسل! پاک اور حلال چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال انجام دو یہاں بھی بظاہر خطاب تو تمام رسولوں کو ہے مگر یہ حکم ہر رسول کی بعثت کے ساتھ فرداً فرداً نازل ہوتا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح یہاں پر خطاب تو پوری اولادِ آدم کو ہے مگر حقیقت میں یہ ہر رسول کے زمانے میں نازل ہوتا رہا ہے جو اُسے اپنی اپنی امتوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔

مفسرین کرام کی دوسری رائے یہ ہے کہ یہ خطاب تمام انبیاء سے اکٹھا کیا گیا تھا اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے پختہ عہد لیا تھا وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (آل عمران) اور پختہ عہد یہ تھا کہ جب میری کتاب اور حکمت آئے اور

پھر جب میرا آخری رسول آجائے تو اُس پر ایمان لانا اور اُس کی مدد کرنا۔ یہ عالمِ ارواح کی بات ہے۔ اور اسی طرح اُس جہان میں ایک عہد تمام اولادِ آدم سے بھی لیا گیا تھا۔ جسے عہدِ الست کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام ارواح کو نکال کر پوچھا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں۔ قَالُوْا بَلٰى تو سب نے بیک زبان کہا تھا کیوں نہیں؟ مولا کریم! تو ہی ہمارا پروردگار ہے تو اس وقت تمام اولادِ آدم سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا تھا کہ جو خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے گا نیکی کے کام انجام دے گا، شرک سے بچتا رہے گا، وہ فلاح پا جائے گا۔ اور اس کے خلاف کرنے والا ناکام و نامراد ہوگا۔

الغرض! یہ خطاب مجموعی طور پر اولادِ آدم سے ہے۔ جیسا کہ پیچھے بھی اس قسم کا خطاب گزر چکا ہے "يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" یعنی اے اولادِ آدم عبادت کے وقت زینت اختیار کرو اپنی ستر پوشی کرو اور برہنگی سے پرہیز کرو۔ اس سے پہلے یہ بھی آتا ہے "يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا" اے اولادِ آدم ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے جو تمہاری ستر پوشی کرتا ہے اور باعثِ زینت بھی ہے۔

سورۃ البقرہ میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے حکم پر شیطان نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ تو اللہ نے فرمایا "يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ" اے آدم علیہ السلام! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جب چاہو اس میں سے کھاؤ مگر ایک درخت کے قریب نہ جانا۔ پھر شیطان نے انہیں بہکا کر ممنوعہ شجر کا پھل کھانے پر آمادہ کیا اور اس طرح انہیں جنت سے نکلوا دیا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان سے خطاب کیا کہ اے اولادِ آدم "تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ

مِنْ عِبَادِنَا (سورۃ مریم) یہ جنت ہمارے بندوں کے لیے
اُن کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کی وراثت ہے۔ اگر اسے دوبارہ
حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔
خوشبو جنت کا ایک خاص تحفہ ہے جو جنتیوں کو میسر ہوگی۔ حدیث شریف
میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو خوشبو پیش کرے تو اس کو قبول کر لینا چاہیئے
خوشبو میں عطر بھی ہو سکتا ہے اور پھول، گلدستہ وغیرہ بھی آجاتا ہے۔ فرمایا اس
سے انکار نہ کیا کرو فَاِنَّهٗ خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ کیونکہ یہ جنت سے آئی
ہوئی ہے اور یہ تمہیں اپنے دائمی ٹھکانے کی یاد دلاتی ہے، لہٰذا اسے قبول کیا کرو

متقی اور مصلح

بہر حال جنت میں پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ بیان
فرمایا یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اے اولادِ آدم اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
جب تمہارے پاس رسول آئیں جو تمہی میں سے ہوں گے یَقُصُّوْنَ
عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ وہ بیان کریں گے تم پر میری آیتیں یعنی میرے احکام
دلائل، معجزات، اصول اور قوانین تمہارے سامنے پیش کریں گے۔ اس وقت
فَمَنِ اتَّقٰى جو شخص بچ گیا۔ جس نے کفر، شرک، نفاق، معاصی اور
گندے عقیدے سے اپنے آپ کو بچا لیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کامل متقی ہوگا
وہ صغیرہ گناہوں کے علاوہ مشتبہات سے بھی بچ جائے گا۔ اور اس ضمن
میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ متقی وہ ہے من اتقی الشبہات
فقد استبرأ لدینہ جو شبہات سے بچ گیا اور اس نے اپنے
دین کو بری کر لیا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اتقی کی پہلی منزل
یہ ہے من اتقی الشرک جو شرک سے بچ گیا۔ جو شرک میں ملوث
ہو گیا وہ متقی نہیں ہو سکتا۔ اتقی کے لیے کفر، شرک اور بدعقیدگی سے پاک
ہونا ضروری ہے۔ جس نے یہ چیزیں ترک نہ کیں وہ تو خود ناپاک ہوگا، اس
کا دل اور روح بھی پلید ہوگا۔

فرمایا جنت کی نعمتیں اس شخص کے لیے ہیں جو بچ گیا وَاَصْلَحَ اور اصلاح کر لی، اپنے آپ کو سنوار لیا، بُرے کاموں کو ترک کر کے نیکی کی طرف آگیا۔ اپنا اور مخلوق کا حق ادا کیا، اپنے خالق کا حق پہچانا، وہی مومن متقی اور مصلح ہو گا۔ اور جو اس معیار پہ پورا اترے گا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ اُن پہ کوئی خوف نہیں ہوگا وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے کہیں آنے والے زمانے میں کوئی ناگوار معاملہ پیش نہ آجائے۔ مگر کامل الایمان لوگوں کے متعلق فرمایا بڑی گھبراہٹ یعنی قیامت کے دن بھی اُن کے دل مطمئن ہوں گے اور فرشتے تسلی دیں گے کہ گھبراؤ نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے بہتری کریگا۔ اسی طرح غم کا تعلق ماضی کے امور سے ہوتا ہے۔ مجرمین کو احساس ہو جائیگا کہ انہوں نے دنیا کی زندگی میں وقت ضائع کر دیا، اپنے مال کو تباہ اور صحت کو برباد کیا، کفر، شرک اور بدعات میں ملوث رہے، اُن کے یہی اعمال انہیں غم میں مبتلا رکھیں گے مگر سچے مومن جنہوں نے ٹھیک کام انجام دیئے، انبیاء کی دعوت پر لبیک کہا، کفر و شرک سے بچتے رہے اور اپنی اصلاح کی، وہ نہ تو مستقبل کے فکر سے خوفزدہ ہوں گے اور نہ ماضی کے کارناموں پہ غمگین ہوں گے۔

بشریتِ رسل

اس آیت کریمہ میں مِنْكُمْ کا لفظ خاص طور پہ توجہ طلب ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے اولادِ آدم! جب تم ہی میں سے رسول آئیں، جو میری آیتیں بیان کریں گے، مقصد یہ ہے کہ میں جو رسول مبعوث کروں گا وہ تمہارے ہی خاندان کے لوگ ہونگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی قریش مکہ میں سے تھے۔ آپ کسی کے چچا تھے، کسی کے بھتیجا، کسی کے داماد تھے اور کسی کے خسر، کسی کے باپ تھے اور کسی کے بھائی، کوئی اجنبی نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ سے فیضان حاصل کرنے میں دقت پیش آتی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس بات کو بار بار دہرایا ہے کہ رسول تمہارے ہی جیسے انسان ہوتے ہیں، اور

انسانوں کی ہدایت کے لیے آتے ہیں۔ اللہ نے اس کی حکمت بھی بیان فرمائی ہے۔ کہ چونکہ زمین میں انسان آباد ہیں اس لیے وہ انسان ہی سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں اور اگر زمین پہ فرشتے آباد ہوتے تو اللہ تعالےٰ فرشتوں کو رسول بنا کر بھیج دیتا۔ خود حضور علیہ السلام کا اسوہ حسنہ قدم قدم پہ آپ کی بشریت کا اعلان کر رہا ہے۔ مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ہاتھوں سے گارا اٹھا کر لائے اور تعمیر میں حصہ لیا۔ آپ پر گرد و غبار بھی پڑا ہوتا تھا۔ خندق کھودی جا رہی تھی، تو آپ کدال لے کر باقی صحابہؓ کے ہمراہ پتھر توڑ رہے تھے۔ صحابہؓ نے بھوک کا شکوہ کیا اور اپنے پیٹوں پہ ایک ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا۔ حضور علیہ السلام نے پیٹ سے کپڑا ہٹایا تو آپ کے پیٹ پہ دو پتھر بندھے ہوئے تھے مقصد یہ کہ آپ نے اپنی بھرپور انسانی زندگی گزاری۔ آپ نماز، روزہ اور دیگر عبادات بھی بجا لاتے تھے، جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے، اہل و عیال کے ساتھ تمام معاملات کرتے تھے، معاشرتی امور میں پورا پورا حصہ لیتے تھے عدل و انصاف کو قائم کرتے تھے۔ غرضیکہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں آپ نے حصہ نہ لیا ہو۔ ظاہر ہے کہ انسانی امور کی انجام دہی کے لیے انسان ہونا ضروری ہے۔ اگر غیر جنس انسانوں میں رسول بن کر آتے تو وہ تو اسوۂ حسنہ ہی پیش نہیں کر سکتا جس کی لوگ اتباع کریں۔ مثال کے طور پر اگر جبرائیل یا کوئی دوسرا فرشتہ رسول بن کر آ جاتا ہے تو وہ لوگوں کے لیے کس طرح نمونہ بن سکتا تھا جب کہ نہ اسے کھانے پینے کی حاجت، نہ بیوی بچوں کی ضرورت، نہ تکلیف سے واسطہ اور نہ دیگر ضروریات زندگی کا احتیاج ایسی صورت میں انسان یہ عذر کر سکتے ہیں کہ مولا کریم تو نے ایسی ہستی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ جو ہمارے ساتھ مطابقت ہی نہیں رکھتا لہٰذا ہمارے لیے وہ نمونہ کیسے پیش کر سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع

انسان کی طرف جتنے بھی انبیاء اور رسل مبعوث فرمائے وہ سب کے سب انسان تھے۔ بعض لوگ نبی کو انسان یا بشر کہنے میں توہین سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کی اشرف المخلوقات انسان ہونا تو اعزاز کی بات ہے۔ بات اس وقت بگڑتی ہے جب ہر گناہگار آدمی نبی کو اپنے جیسا انسان سمجھتا ہے یہ تو مشرکوں کا شعار ہے، نبی تو تمام انسانوں میں اللہ کا منتخب بندہ ہوتا ہے اس کے مرتبے کو کون پہنچ سکتا ہے۔ پھر اللہ نے انبیاء کی بشریت کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ خود حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے کہلایا قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (سورۃ کہف) اے پیغمبر آپ کہہ دیں کہ میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے اور وحی کا نزول سب سے بڑا اعزاز ہے جو کسی انسان کو مل سکتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص نبی کا ہم مرتبہ نہیں کرتا بلکہ نوعیت کے لحاظ سے نبی بھی انسان ہوتا ہے۔ محدثین کرام نے کتب احادیث میں باب باندھ کر حضور علیہ السلام کے بشری تقاضوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ کا چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، ہنسنا رونا سب انسان کی طبعی ضروریات ہیں، جو حضور علیہ السلام میں بھی پائی جاتی تھیں۔

مکذبین اور متکبرین

متقین اور مصلحین کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، توحید و رسالت اور معاد کا انکار کیا، دنیا میں من مانی کرتے رہے وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اور تکبر کے مرتکب ہوئے۔ تکبر ہمیشہ مال و جاہ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں چند روزہ اقتدار کی وجہ سے لوگ مغرور ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہیں جائیں گے هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے کیونکہ

انہوں نے جہنم سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ آخرت کے دائمی عذاب سے بچاؤ کے لیے ایمان اور تقویٰ کی ضرورت تھی جس سے وہ محروم رہے لہٰذا انہیں ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہنا ہوگا۔

افترا علی اللہ

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسالت اور معاد کا اکٹھا ذکر کیا ہے جس شخص پر اللہ تعالیٰ مہربانی کرتا ہے اور اُسے تاج نبوت سے سرفراز کرتا ہے وہ اللہ کا سچا نبی ہوتا ہے اور جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے وہ مفتری اور کذاب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سچے نبی کی تکذیب کرتا ہے وہ بھی اللہ کے ہاں بہت بڑا مجرم ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اُس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، مخلوق میں سے کسی کو خدا کا بیٹا کہنا بلاشبہ افترا علی اللہ ہے۔ برہنہ طواف یا بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی حرمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بھی اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ شرک بذات خود بہت بڑا افترا ہے جس سے اللہ نے بیزاری کا حکم دیا ہے۔ اس کے علاوہ جھوٹے مدعیان نبوت جیسے مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی، غلام احمد قادیانی وغیرہ کذاب ہیں، ان سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے پہلے اس جھوٹے دعوے کا بھی تذکرہ ہو چکا ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ حالانکہ سلسلہ وحی ختم ہو چکا ہے اور اب یہ چیزیں شیطان ہی القا کرتا ہے۔ اس سے بڑا ظالم بھی کوئی نہیں۔ فرمایا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ جو اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرتا ہے۔ اس کے نازل کردہ دلائل معجزات، احکام اور قوانین کو سچا نہیں سمجھتا، وہ بھی بہت بڑا ظالم ہے۔ فرمایا اُولٰٓئِکَ یَنَالُھُمْ نَصِیْبُھُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ ایسے ہی مکذبین کو کتاب میں لکھا ہوا اُن کا حصہ مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں مہلت دیتا ہے اور لمبا اوقات

نافرمانوں سے کوئی نعمت واپس نہیں لیتا بلکہ ان کو دُنیا کا حصہ ملتا رہتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم نیکوں اور بدوں سب کو دیتے ہیں مگر دنیا کا مال وجاہ اور عیش وعشرت اللہ کے ہاں شرافت کا کوئی معیار نہیں محض دنیا حاصل کر کے کوئی شخص خدا تعالیٰ کی محبوبیت کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ دنیا میں تو بڑے بڑے ناہنجار لوگ بھی آرام و آسائش میں رہتے ہیں اللہ تعالےٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ ان کے لیے دنیا میں جو لکھا جا چکا ہے وہ انہیں ملتا رہیگا۔

اقرارِ کفر

فرمایا حَتّٰى اِذَا جَاۤءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ یہاں تک کہ جب ہمارے فرشتے اُن کی روح قبض کرنے کے لیے آتے ہیں۔ قَالُوْۤا تو اُن سے کہتے ہیں اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہاں ہیں وہ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے یعنی جن کی تم عبادت کرتے تھے۔ کسی کو پکارنا حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے ہی ہوتا ہے تَدْعُوْنَ پکار اور عبادت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اللہ نے بار بار فرمایا کہ اُس کے سوا کسی کو نہ پکارو بلکہ وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ بلکہ خالص اسی کو پکارو۔ کیونکہ غائبانہ طور پر مشکل کشائی اور فریاد رسی اُس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ فرشتے، نبی، ولی، مقربین سب اس کے محتاج ہیں۔ "ندارم بغیر از تو فریاد رس" اے مولا کریم! تیرے بغیر کوئی فریاد رس نہیں ہے کوئی ایسی ہستی نہیں جو تکلیف کو دُور کر دے یا مشکل کو حل کر دے یہ تیری ہی ذات کا خاصہ ہے مگر مشرکوں کا حال یہ ہے کہ کبھی قبروں پر سجدے کرتے ہیں، کبھی ملائکہ اور جنات کی دہائی دیتے ہیں، کوئی جبرائیل، اور میکائیل کو پکارتا ہے، کوئی اولیاء اللہ سے مدد مانگتا ہے۔ اور کوئی "یا علی مدد" کا نعرہ لگاتا ہے، یہ سب شرک ہے۔ جب مشرکین کی موت کا وقت آئے گا تو فرشتے پوچھیں گے کہاں گئے تمہارے وہ معبود جن کو تم مافوق الاسباب پکارا کرتے تھے۔ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا تو کہیں گے وہ تو ہم سے گم ہو

گئے، اب کہیں نظر نہیں آتے۔ جو ساری عمر بیوقوف بنا کر مال کھاتے رہے اور
مشکل وقت میں مشکل کشائی کا وعدہ کرتے رہے، آج کسی کام نہیں آئے۔
وَشَهِدُوا عَلَىٰٓ اَنْفُسِهِمْ اور خود اپنے خلاف گواہی دیں گے
اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے رہے۔
اب جب کہ جان نکل رہی ہے اور جزائے عمل کا وقت شروع ہونے والا ہے
تو اپنے کفر اور شرک کا اقرار کریں گے مگر اس وقت کا اقرار کچھ کام نہیں آئیگا۔
اور انہیں اپنے اعمال کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ اس سورۃ کی ابتدا میں بھی ایسا ہی
مضمون گذر چکا ہے کہ جب ہماری پکڑ آجائے گی تو پھر وہ اقرار کریں گے۔
"اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ" کہ بیشک ہم دنیا میں ظلم کرتے رہے۔ اور سب سے
بڑا ظلم شرک ہے جس کا وہ ارتکاب کرتے رہے۔ جب موت کے فرشتے
آجائیں گے تو پھر انہیں اقرار کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ :- فرمائے گا (اللہ تعالیٰ) اُن سے داخل ہو جاؤ دوزخ میں اُن اُمتوں میں شامل ہو کر جو تم سے پہلے گزری ہیں ، جنوں اور انسانوں میں سے ۔ جب بھی داخل ہو گی ایک اُمت تو دوسری پر لعنت کریگی ، یہاں تک کہ جب سارے اس میں جمع ہو جائیں گے تو پچھلے کہیں گے پہلوں سے ، اے ہمارے پروردگار ! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ، لہٰذا تو ان کو دوگنا عذاب دے دوزخ میں ۔ فرمائے گا (اللہ تعالیٰ) تم میں سے ہر ایک کے لیے دوگنا ہے ، لیکن تم نہیں جانتے (۳۸) اور کہیں گے پہلے پچھلوں سے ، پس نہ ہوئی تمہارے لیے ہمارے مقابلے میں کچھ بڑائی ۔ پس چکھو عذاب اس کے سبب جو تم کماتے تھے (۳۹)

ربط آیات

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے ضمن میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تمام بنی نوع انسان کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم اپنے جدِ امجد کے ٹھہرنے والی جنت میں دوبارہ داخلہ چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں جب تمہارے پاس اللہ کے رسول آئیں تو اُن کا اتباع کرنا اور اُن کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنا۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی تقویٰ اختیار کریگا۔ کفر اور شرک سے بچتا رہیگا، معاصی کے قریب نہیں جائیگا، نیکی اختیار کرے گا، تو ایسے لوگوں کے لیے نہ آئندہ کا کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ سابقہ اعمال پر غمگین ہوں گے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے تکذیب کی، اللہ کے نبیوں کی مخالفت کی، خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم نہ کیا بلکہ غرور و تکبر میں مبتلا ہوئے تو ایسے لوگ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے۔ جو شخص اللہ پر افترا و باندھتا ہے کفر، شرک اور رسومات باطلہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتا ہے، اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے ایسے لوگوں کو دنیا میں اُن کے مقدر کا حصہ ملتا رہیگا۔ اور پھر جب بوقت وفات اُن کے پاس فرشتے آئیں گے تو ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں اُن سے پوچھیں گے کہ وہ کہاں گئے جنہیں تم دنیا میں مافوق الاسباب مدد کے لیے پکارتے تھے، تو اُس وقت وہ کہیں گے کہ ہمارے مددگار وہ تو ہم سے کھو گئے۔ پھر وہ اقرار کریں گے کہ وہ دنیا میں کفر میں مبتلا رہے۔

جہنم میں داخلہ

یہ تو اُن کا دُنیا کا حال تھا، اب اللہ نے اُن کے ساتھ آخرت میں کیے جانے والے سلوک کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ تم بھی اُن امتوں میں شامل ہو کر دوزخ میں داخل ہو جاؤ جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گذری ہیں۔ تم نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی، توحید کو نہ مانا، اپنی اصلاح نہ کی، نبیوں کی نبوت سے انکار کیا، قیامت پر ایمان

نہ لاسکے، لہٰذا تم بھی سابقہ منکرین کے ساتھ دوزخ میں چلے جاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے جنات اور انسانوں دو گروہوں کو مکلف بنایا ہے یہ دونوں انواع احکامِ الٰہی کی پابند ہیں مگر نہ تو انسان اس معیار پہ پورے اترے اور نہ جنات، جن بھی انسانوں ہی کی طرح مخلوق ہے ان میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ انسان تو انسان کو نظر آتے ہیں مگر جنات نظر نہیں آتے، تاہم نیکی بدی کے کردار میں وہ انسانوں کی مانند ہی ہیں۔ سورۃ جن میں موجود ہے "وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ" جنوں نے خود اقرار کیا کہ ان میں فرمانبردار بھی ہیں اور نافرمان بھی۔ جس طرح انسانوں میں اچھے برے ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جنات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جنات چونکہ انسانوں کے تابع ہوتے ہیں اس لیے جتنے فرقے انسانوں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی جنوں میں بھی ہوتے ہیں سورۃ جن میں "كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ نیکی اور بدی کی جتنی باتیں اور رسومات انسانوں میں ہوتی ہیں، وہ جنوں میں بھی موجود ہوتی ہیں البتہ ان کی تخلیق کے مادہ میں فرق ہے۔ انسان میں خاک کا مادہ زیادہ ہے جبکہ جنات میں آگ کا عنصر زیادہ ہے۔ البتہ جنات کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ تو انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں مگر انسان انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ گذشتہ رکوع میں آچکا ہے "اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ" یعنی شیطان اور اس کا قبیلہ تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ بہرحال جنات میں بھی انسانوں کی طرح پارٹیاں اور گروہ ہوتے ہیں ان میں بھی شرکیہ رسومات اور بدعات پائی جاتی ہیں۔ جس طرح انسان نیک و بد ہیں اسی طرح جنات میں بھی دونوں گروہ پائے جاتے ہیں۔ انسان اور جن دونوں قانونِ الٰہی کے پابند ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو گروہ مکلف ہوگا اس کے لیے جزائے عمل بھی لازمی ہوگا۔ تو اللہ

سے نے فرمایا جس طرح انسان اپنے اچھے اور برے اعمال کی پاداش میں جنت یا دوزخ میں جائیں گے، اسی طرح جنات کو بھی محاسبے کے عمل سے گزار کر جنت یا دوزخ میں بھیجا جائے گا۔

ایک دوسرے کی ملامت

فرمایا کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ جب کوئی امت دوزخ میں داخل ہوگی لَّعَنَتْ اُخْتَهَا تو دوسری پر لعنت بھیجے گی۔ اُخت بہن کو کہتے ہیں مگر یہاں دوسرا ساتھی گروہ مراد ہے۔ دوزخ میں پہنچ کر مختلف طبقات کے لوگ ایک دوسرے کو طعن ملامت کریں گے اور اس برے ٹھکانے پر جانے کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا چنانچہ اگلے پچھلے جب سب کے سب جہنم میں پہنچ جائیں گے قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ تو پیچھے آنے والے پہلوں سے کہیں گے رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا اے ہمارے پروردگار! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ ہم انہی کے بتائے ہوئے گمراہی کے راستوں پہ چل کر عذاب کے اس مقام میں پہنچے فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ لہٰذا ان کو جہنم میں دگنا عذاب دے۔ یہ لوگ خود تو گمراہ تھے، انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا، لہٰذا یہ دوہری سزا کے مستحق ہیں۔ ان کو ان کی اپنی گمراہی کی سزا بھی دے اور ہمارے گناہوں کا وبال بھی انہی پہ ڈال۔ اس قسم کی درخواست ہر طبقہ دوسرے کے لیے کریگا، چنانچہ بڑے چھوٹوں پر اور چھوٹے بڑوں پر لعنت کریں گے، حاکم ماتحت کے لیے اور ماتحت حاکم کے لیے بددعا کریں گے لیڈر اپنے پیروکاروں کو مورد الزام ٹھہرائیں گے جب کہ پیروکار اپنے لیڈروں کو ذمہ دار قرار دیں گے۔ ضعیف لوگ طاقتوروں کی شکایت کریں گے جب کہ طاقتور کمزوروں پہ ذمہ داری ڈالیں گے، اور اس طرح سب ایک دوسرے کے لیے دوہرے عذاب کا مطالبہ کریں گے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ ہر ایک

کے لیے دگنا عذاب ہے وَلٰکِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ لیکن تم نہیں جانتے
مطلب یہ کہ ایک دوسرے کو مطعون کرنے والے تم سب کے سب گنہگار
ہو لہٰذا تم سب کو ڈبل سزا دی جائیگی۔

دوہری سزا کی توجیہہ

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ دوہری سزا کی توجیہہ اس طرح بیان کرتے
ہیں کہ پہلے لوگوں کو اس لیے ڈبل سزا ہوگی کہ ایک تو وہ خود گمراہ ہوئے اور
دوسرے انہوں نے پیچھے آنے والوں کو گمراہ کیا، لہٰذا پچھلوں کا وبال بھی پہلوں
پر پڑا اور وہ دوہرے عذاب کے مستحق ہوئے۔ اسی طرح بعد میں آنے والوں
کو بھی دو وجوہ سے دوہرا عذاب ہوگا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے
گمراہی کا راستہ اختیار کیا اور دوسری وجہ یہ کہ انہوں نے سابقہ امتوں کے
حالات سے عبرت حاصل نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں عبرت
پکڑنے کی بار بار نصیحت کی ہے۔ جیسے "فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ"
(الحشر) اے صاحب بصیرت لوگو! عبرت حاصل کرو۔ نیز فرمایا
"اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ" (آل عمران) اس
میں عقلمندوں کے لیے عبرت کا سامان ہے جب بھی کوئی قوم ہلاک ہوئی
وہ بعد میں آنیوالوں کے لیے باعث عبرت بنی مگر انہوں نے عبرت نہ پکڑی
لہٰذا بعد میں آنے والے بھی دوہرے عذاب کے مستحق ٹھہرے۔

موجد کا حصہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو کوئی ہدایت کا راستہ مقرر کرتا ہے اس
پر ہر عامل کے بدلے میں موجد کو بھی ایک ایک اجر ملتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص
غلط رسم ایجاد کرتا ہے اور پھر لوگ اس پر چل نکلتے ہیں تو ہر عمل کرنے والے
کے گناہ کا ایک حصہ رسم ایجاد کرنے والے کے نامۂ اعمال میں بھی درج ہوتا
رہتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اول من سن القتل جس
نے سب سے پہلے قتل کو رائج کیا یعنی آدم علیہ السلام کے جس بیٹے نے اولین
قتل کیا تھا اس کے نامۂ اعمال میں ہر مابعد قتل (ناحق) کا گناہ لکھا جاتا رہیگا۔

ذرا اندازہ لگائیے کہ قیامت تک ہونے والے کتنے قتلوں کا بوجھ اُس کے سر پہ ہوگا۔

اس اصول کے تحت نبی کے اعمالِ صالحہ امت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ہر اچھا طریقہ اور نیکی کا کام نبی خود جاری کرتا ہے اور امت کو کرنے کی ترغیب دیتا ہے لہذا امت کے لوگ جب تک وہ نیک اعمال انجام دیتے ہیں اس میں سے ایک ایک اجر نبی کو بھی ملتا رہتا ہے اور اس طرح نبی کا اعمال نامہ سب سے اعلیٰ و ارفع ہو جاتا ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس گناہوں کا سب سے زیادہ بوجھ شیطان پہ ہوگا کیونکہ ہر برائی کا موجد وہی ہے۔ دنیا میں جتنے گناہ سرزد ہوتے ہیں ہر سب کا ایک ایک وبال شیطان پہ پڑتا ہے اور اُس طرح قیامت کو اُس کی گردن پہ گناہوں کا سب سے زیادہ بوجھ ہوگا۔

عذاب کا مزا

جب اللہ تعالیٰ تمام منکرین کے لیے دوہرے عذاب کا اعلان فرما دیں گے۔ تو پھر وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ تو اُن میں سے پہلے لوگ پچھلوں سے کہیں گے فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ہم پہ تمہیں کیا فضیلت حاصل ہوئی ہمیں بھی دوہرا عذاب ہوگا۔ اور تمہیں بھی دوہرا ہوگا۔ تو پھر تمہارے عذاب میں تو کوئی تخفیف نہ ہوئی، تم نے ہماری شکایت کی تھی۔ مگر اُس کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہاں پہ لفظ فضل سے تخفیف مراد لی جائیگی۔

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ پس عذاب کا مزا چکھو جو کچھ تم کماتے رہے ہو۔ تم نے اپنی زندگی میں جو عقیدہ قائم کیا۔ اور پھر اس کے مطابق جو عمل انجام دیا اُس کا نتیجہ تمہارے لیے سزا کی صورت میں برآمد ہوا ہے، لہذا اس سزا کو اب بھگتو۔ یہ عام قانون بھی ہے جیسے سورۃ البقرۃ میں بیان کیا گیا ہے لَهَا

مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" کسی انسان نے جو اچھا عمل کیا ہے اُس کا اجر بھی اسی کو ملے گا اور جو برائی انجام دی ہے اُس کا وبال بھی اُسی پر پڑے گا۔ ہر شخص کو اپنے ہی اعمال کا بدلہ ملے گا، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ کیونکہ یہ بھی ایک واضح اصول ہے "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى" (الانعام) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ تو یہاں بھی یہی فرمایا کہ اپنی کارکردگی کے عذاب کا مزا چکھو۔ اللہ فرمائے گا۔ "ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ" یہ تیرے ہی ہاتھوں کا آگے بھیجا ہوا بدلہ ہے، اسے وصول کرو۔ اور پھر اللہ کا ستوق میں یہ بھی فیصلہ ہے۔ "وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" کہ میں اپنے بندوں پر ذرہ بھر زیادتی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ہر شخص کو اُس کے اعمال ہی کا بدلہ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، میں نے تمہیں دُنیا میں زندگی دی تھی، حواس خمسہ عطا کیے، عقل جیسا عظیم جوہر ودیعت کیا، کام کرنے کی مہلت دی، تمہاری ہدایت کے لیے انبیاء بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، مبلغین کے ذریعے پیغام پہنچایا مگر تم نے اس پورے سامانِ ہدایت سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، لہٰذا اب سزا کا مزہ چکھو۔ یہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾ لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤٢﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾

ترجمہ :- بیشک جن لوگوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا اُن سے ، نہیں کھولے جائیں گے اُن کے لیے آسمان کے دروازے اور نہ داخل ہوں گے وہ جنت میں یہاں تک کہ

واخل ہو جائے اونٹ سوئی کے ناکے میں۔ اور اسی طریقے سے ہم بدلہ دیتے ہیں مجرموں کو (۴۰) اُن کے لیے جہنم میں بچھونے ہوں گے اور اُوپر سے اوڑھنے کے لیے بھی اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ظلم کرنے والوں کو (۴۱) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال انجام دیئے، ہم نہیں تکلیف دیتے کسی نفس کو مگر اُس کی طاقت کے مطابق ایسے لوگ ہیں جنت والے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۴۲) اور نکال دیں گے ہم جو کچھ ان کے سینوں میں ہو گا کدورت سے، جاری ہوں گی اُن کے سامنے نہریں اور وہ کہیں گے الحمدللہ یعنی سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہماری رہنمائی کی اس مقام تک، اور نہیں تھے ہم ہدایت پانے والے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ کرتا البتہ تحقیق آئے ہیں ہمارے رب کے رسول ٹھیک بات لے کر۔ اور اُن کو پکارا جائے گا (اور کہا جائے گا) کہ یہ ہے وہ جنت جو تم کو وراثت میں دی گئی ہے اس کے بدلے میں جو کچھ تم کام کیا کرتے تھے (۴۳)

ربطِ آیات

عالمِ ارواح میں جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کی تمام روحوں سے خطاب کیا تھا تو اُس وقت انہیں صاف صاف بتلا دیا تھا کہ اگر تم اپنے جدِ امجد آدم علیہ السلام کے ٹھہرنے والی جنت میں دوبارہ جانے کے خواہشمند ہو تو اس کا طریق کار یہ ہے کہ جب دنیا میں تمہارے پاس اللہ کے رسول آئیں گے تو اُس وقت جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا یعنی کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی اور برائیوں سے بچ جائے گا اور نیک اعمال انجام دیگا، تو ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے بلکہ اپنے

باپ کی وراثت جنت کو دوبارہ حاصل کریں گے، اس کے برخلاف جو لوگ اللہ کی آیتوں کی تکذیب کریں گے اور غرور اور تکبر میں مبتلا ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔ جب ان کی موت کا وقت آئے گا۔ تو فرشتے انہیں ڈانٹ پلانے کے انداز میں پوچھیں گے کہ وہ کہاں گئے۔ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے، تو وہ جواب دیں گے کہ وہ تو ہم سے گم ہو گئے اور اقرار کریں گے کہ یقیناً وہ کفر کرنے والے تھے نتیجے کے طور پر اللہ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ان کو دوزخ میں داخل کر دو چنانچہ جنوں اور انسانوں میں سے گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والے گروہ کے ساتھ وہ بھی جہنم رسید ہو جائیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے پہلے اور پچھلے لوگوں کے مکالمہ کا ذکر بھی کیا ہے پچھلے لوگ پہلوں کے متعلق عرض کریں گے کہ مولا کریم! انہیں دوہری سزا دے کیونکہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ اللہ تعالیٰ تمام اگلے پچھلوں کے لیے ڈبل سزا کا حکم دیں گے۔ پہلوں کو اس لیے دگنی سزا کہ انہوں نے پچھلوں کو بھی گمراہ کیا۔ اور پچھلوں کو اس لیے کہ انہوں نے پہلے لوگوں سے عبرت حاصل نہ کی۔ اب آج کی آیات بھی اسی سلسلے کے ساتھ منسلک ہیں آج کے درس میں تکذیب کرنے والوں کے برے انجام اور ایمان لانے والوں کے خوشگوار حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مکذبین اور متکبرین کا انجام

ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں تکذیب کی تمام صورتیں شامل ہیں۔ منجملہ ان کے مشرکین اور دہریے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کو جھٹلاتے ہیں۔ مشرکین اللہ کی وحدانیت کے دلائل کو جھٹلاتے ہیں اور بعض لوگ انبیاء کی نبوت کے دلائل کو تسلیم نہیں کرتے۔ کچھ لوگ قیامت کے وقوع اور محاسبے کے عمل کا انکار کرتے ہیں وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا اور تکبر کرتے ہیں،

اسمیں توحید، رسالت اور معاد سے متعلق تمام تکذیبات شامل ہیں۔ فرمایا جو لوگ
ہماری آیات کو جھٹلاتے اور تکبر کرتے ہیں لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ
السَّمَاءِ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے
وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے حَتَّىٰ
يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ط یہاں تک کہ اونٹ سوئی
کے ناکے میں سے گزر جائے۔ ایسے لوگوں کا جنت میں داخلہ اتنا ہی مشکل ہے
جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آسمان کے دروازے نہ کھلنے کا مطلب
یہ ہے کہ مکذبین اور متکبرین کے اعمال نہ تو اوپر آسمان کی طرف جائیں گے اور نہ
قبولیت کا درجہ پا سکیں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں
گی۔ اس آیت کی تشریح میں وہ احادیث بھی موجود ہیں جن میں ارواح کا ذکر کیا
گیا ہے۔ جب کوئی مومن آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کی روح کو لے کر فرشتے
آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ فرشتے اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیتے
ہیں اور اسے مرحبا (خوش آمدید) کہتے ہیں۔ پھر اس روح کو آسمانوں سے گزار کر علیین
کے مقام پر لے جاتے ہیں۔ پھر اس کا رابطہ عالم برزخ میں قبر کے ساتھ بھی رہتا ہے
اور اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب کافر، مشرک یا
منافق کی روح کو لے کر فرشتے آسمانوں کی طرف جاتے ہیں۔ تو فرشتے اس کے
لیے آسمان کا دروازہ نہیں کھولتے اور حکم ہوتا ہے کہ اسے سجین میں لے جاؤ چنانچہ
اسے نہایت تذلیل کے ساتھ واپس کر دیا جاتا ہے آسمان کے دروازے نہ
کھلنے کا یہی مطلب ہے کہ ان کے لیے بخشش کے دروازے بند ہو جائیں
گے۔ اس قسم کی مثال سورۃ مائدہ میں بھی بیان ہو چکی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام
نے فرمایا، اے بنی اسرائیل میرے اور اپنے رب کی عبادت کرو إِنَّهُ مَنْ
يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ

انہ' بے تحقیق جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُس پر جنت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا ہے کہ مکذبین اور متکبرین کی بخشش کی کوئی صورت نہیں اُن کا آخری ٹھکانا جہنم ہی ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں محال امر کے لیے اونٹ اور سوئی کی مثال فرمائی گئی ہے ہاتھی کے بعد اونٹ سب سے بڑا جانور شمار ہوتا ہے مگر اونٹ چونکہ ہاتھی کی نسبت دنیا کے اکثر خطوں میں زیادہ پایا جاتا ہے اور لوگ اس سے مانوس ہیں، اس سے طرح طرح کے کام لیتے ہیں، اس لیے یہاں پر اونٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں سوئی کے ناکے کا تذکرہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کے طور پر کیا گیا ہے مقصد یہ ہے جس طرح ایک بڑی سے بڑی چیز چھوٹی سے چھوٹی چیز میں داخل نہیں ہو سکتی، اسی طرح اللہ کے نافرمانوں کی کامیابی محال ہے۔

سم سوئی کے ناکے کو بھی کہتے ہیں اور یہ لفظ زہر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور قاتل کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جس طرح سوئی کسی چیز میں آسانی سے گھس جاتی ہے اسی طرح زہر بھی انسانی ساختوں میں آسانی سے داخل ہو کر قلب پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہلاکت کا باعث بنتا ہے سوئی کا ناکہ بھی باریک ہوتا ہے اور زہر میں بھی باریک نسوں میں گھس کر اثر انداز ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لیے اسے سم کہتے ہیں بہر حال فرمایا کہ جس شخص کا خاتمہ کفر اور شرک پر ہوگا وہ اللہ کی رحمت کے مقام میں داخل نہیں ہو سکتا۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ فرمایا ہم مجرموں کو اسی طریقے سے جزا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجرمین کا انجام بیان فرمایا ہے۔ کہ اُن کے لیے رحمت کے دروازے نہیں کھلیں گے بلکہ اُن کا انجام بہت بُرا ہوگا۔

فرمایا لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ اُن کے لیے جہنم میں بچھونے ہوں گے مہد گہوارے کو کہتے ہیں جو بیٹھنے یا لیٹنے کی جگہ ہے

اور مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ اور اُوپر سے پردے ہوں گے غاشیہ پردے کو کہتے ہیں جو اوپر سے ڈھانپ لیتا ہے۔ یعنی اُن کا بچھونا جہنم اور اوپر پردے بھی ایسے ہی ہوں گے گویا اُن کا اوڑھنا اور بچھونا جہنم سے عبارت ہوگا۔ فرمایا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ہم ظلم کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ کفر اور شرک سب سے بڑے مظالم ہیں لہٰذا اِن کی سزا بھی بڑی سخت ہوگی۔

مومنوں کے لیے جنت

نافرمانوں کا حال بیان کرنے کے بعد اہل ایمان کے لیے انعام کا ذکر بھی کیا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور جو لوگ ایمان لائے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور توحید کو تسلیم کیا، معاد پر ایمان لائے، تمام دلائل کو قبول کیا اور کسی ثابت شدہ چیز کا انکار نہیں کیا، اپنے عقیدہ اور فکر کو پاک کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نیک اعمال بھی انجام دیے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کا اہتمام کیا، جہاد اور دیگر امورِ خیر میں حصہ لیا اور اُن کی بنیاد درست ہوگئی ہے فرمایا۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ہم کسی نفس کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ ہم کسی شخص کو تکلیف مالایطاق میں مبتلا نہیں کرتے۔ انسانوں پر کوئی ایسے احکام نازل نہیں کرتے جو اُن کی استطاعت سے باہر ہوں بلکہ ہم توسیدھے سادے ایمان اور عمل صالح کا حکم دیتے ہیں اور پھر جو لوگ ان احکام کو تسلیم کر کے اُن پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں، فرمایا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یہی لوگ جنت والے ہیں۔ وہ اپنے جدِ امجد کی وراثت جنت کے حقدار ٹھہریں گے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور کبھی وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے اُن کے ایمان اور اعمال صالحہ کی یہی جزا ہوگی۔

کدورت سے صفائی

فرمایا ہم اہل جنت پر ایک خاص انعام یہ کریں گے وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ہم اُن کے سینوں سے کدورت کو نکال لیں گے۔ یہ

لفظ غِل، غُل اور غَل تینوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ غِل بغض، عناد، نفرت
کدورت وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ غَل جھوٹ اور دھوکے کے لیے استعمال
ہوتا ہے۔ جبکہ غُل طوق کو کہا جاتا ہے جس کی جمع اغلال ہے۔ مطلب
یہ ہے کہ کسی جنتی کے دل میں بغض و نفرت کے جذبات نہیں ہوں گے
تمام جنتی پاکیزہ اخلاق والے ہوں گے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ
تمام جنتی كَقَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ ایک آدمی کے دل کی مانند ہوں گے۔
لَا تَبَاغُضَ بَيْنَهُمْ ان کے درمیان کوئی بغض، نفرت یا کدورت
نہیں ہوگی۔ جس طرح ایک دل میں ایک ہی بات سما سکتی ہے۔ اسی طرح
سارے کے سارے جنتیوں کے قلوب میں ایک ہی طرح کی اچھائی ہوگی
کسی کے دل میں عداوت و نفرت کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور اگر اس
دنیا میں کسی کے دل میں کسی دوسرے بھائی کے خلاف بغض و عناد کا کوئی مادہ
موجود تھا تو جنت میں بھیجنے سے پہلے ہم اسے نکال لیں گے۔ کدورت طبعی
بھی ہوتی ہے اور اخلاقی بھی۔ طبعی کدورت نیک آدمیوں میں بھی ہو سکتی ہے
حضرت علیؓ کا قول ہے کہ دنیا کی زندگی میں ہمارا حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ،
حضرت زبیرؓ سے اختلاف رائے بھی رہا ہے مگر وہ بھی صاحب ایمان تھے
حضرت علیؓ سمیت سب صحابہ قطعی طور پر جنتی ہیں اور یہ بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
سے ثابت ہو چکی ہے حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہماری آپس کی شکر رنجیاں بھی اسی
زمرے میں آئیں گی اور ہم ہر قسم کی کدورت سے پاک صاف ہو کر جنت میں جائیں
گے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جب جنتی پل صراط سے گزریں گے تو اس
کے ایک حصے سے گزرتے ہوئے اہل ایمان کی تمام کدورتیں، شکر رنجیاں یا
لین دین وہیں ختم ہو جائیں گے اور وہ سب غل سے پاک ہو کر جنت میں جائیں گے۔

ہدایت یافتگی پر اظہار تشکر

فرمایا ایسے لوگ جنت میں پہنچیں گے تو تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ
ان کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی یعنی ان کی کوٹھیوں، محلات اور باغات کے درمیان

نہریں رواں دواں ہوں گی جو اُن کے لیے عجیب نشاط و سرور کا باعث ہوں گی۔
اور پھر اظہار تشکر کے طور پر وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ط
وہ یوں کہیں گے اُس خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے یہاں تک ہماری
راہنمائی فرمائی اور ہمیں اس مقدس مقام تک پہنچایا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ
لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ اگر اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ہمیں ہدایت نہ دیتا تو
ہماری کیا طاقت تھی کہ ہم ہدایت پا سکتے۔" گویا جنتی اُس ہدایت کو اللہ کی طرف
منسوب کریں گے جسے پا کر وہ اُس کی رأفت و رحمت کے مقام تک پہنچے۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان بھی ہے کہ جنت میں داخلے کا حقیقی سبب
اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ مختلف امور کے ظاہری اسباب بھی ہوتے ہیں۔
اور حقیقی بھی۔ جنت میں پہنچنے کے لیے اعمال صالحہ ظاہری سبب ہے جب کہ
اللہ کی رحمت اس کا حقیقی سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ایمان اور اعمال صالحہ کی
توفیق دیتا ہے، برائیوں سے بچنے کی توفیق دیتا ہے اگر اس کی توفیق شامل حال
نہ ہو، تو انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام نے یہی کہا تھا وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ
اِلَّا بِاللّٰهِ (سورۃ ہود) میری توفیق اللہ تعالیٰ کی مدد ہی کی مرہون منت ہے۔ تمام انبیاء
کی یہی تعلیم ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ توفیق نہ دے کوئی کام انجام نہیں پا سکتا
اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا "وَاصْبِرْ وَمَا
صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ" (النحل) آپ صبر کریں مگر صبر کی توفیق بھی اللہ
ہی دے گا۔ مقصد یہ کہ جنت میں جانے کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی مہربانی
ہے۔ اعمال اگرچہ ظاہر اسباب ہیں مگر ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا پہلے
گزر چکا ہے "وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا" (احقاف) عمل کے
مطابق ہر ایک کے درجات ہوں گے، جتنے کسی کے اچھے اعمال ہوں گے
اتنے ہی درجات بلند ہوں گے۔
حدیث شریف میں بادل گرجنے اور چمکنے کی حقیقت بیان کی گئی ہے

سائنسدان اس کا ظاہری سبب تو یہ بیان کرتے ہیں کہ پانی سے بوجھل بادل جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو اس سے بجلی اور کڑک پیدا ہوتی ہے۔ تاہم حدیث شریف کے مطابق اس کا حقیقی اور باطنی سبب یہ ہے کہ اللہ کا فرشتہ جب بادلوں کو کوڑا مار کر ہانکتا ہے تو اس سے چمک اور گرج پیدا ہوتی ہے مقصد یہ کہ دوہرے اسباب میں سے ظاہری اسباب تو نظر آتے ہیں، مگر باطنی اور حقیقی اسباب نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ظہر کی نماز کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ گرمی کے موسم میں یہ نماز ذرا تاخیر سے پڑھو فَاِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ (صحیحین) کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی تپش سے ہے۔ یہاں بھی ظاہری سبب تو سورج ہے مگر اس کا باطنی سبب جہنم ہے۔

بہر حال اہل ایمان اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں گے جس نے انہیں اس کے مقام رحمت تک پہنچایا اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ انہیں ہدایت کا راستہ اللہ ہی کی توفیق سے میسر آیا۔ لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق مانگنی چاہیئے۔ كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ بنی نوع انسان میں سے ہر آدمی بھٹکا ہوا ہے مگر جسے اللہ تعالیٰ ہدایت عطا کر دے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہ کر ہر نماز میں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق اللہ ہی سے مانگی جاتی ہے۔

جنت کی وراثت

جب جنتی اپنے مقام پر پہنچ جائیں گے تو پھر وہ اس سبب کا ذکر کریں گے جس کی بنا پر وہ اس اعلیٰ مقام میں پہنچے۔ کہیں گے لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ البتہ تحقیق اللہ کے رسول ٹھیک بات لے کر آئے ہم نے ان کی بات کو تسلیم کیا، ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، اللہ تعالیٰ کی وحدت پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے اور اس مقام تک پہنچے جنتی کہیں گے کہ اللہ کے رسول بالکل سچ کہتے تھے۔ اور پھر

وَنُوْدُوْا اُن کو پکارا جائے گا، اے ایمان والو! مگر پکارنے والا کون ہوگا، حدیث شریف میں فرشتے کا ذکر آتا ہے، وہ کہے گا، اے اہل جنت!
اَنْ تِلْکُمُ الْجَنَّۃُ اُوْرِثْتُمُوْھَا یہ ہے تمہاری جنت جو تمہیں وراثت میں دی گئی ہے۔ اس چیز کے بدلے میں بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ تم نے دنیا میں فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ کے مصداق تقویٰ اختیار کیا اور اصلاح کی۔ کفر، شرک، نفاق اور برائی سے بچتے رہے، اپنے اعمال انجام دیئے، تم کامیاب ہو گئے ہو، لہٰذا یہ جنت تمہیں عطا کی گئی ہے۔ بعض مفسرین وراثت کا ایک دوسرا معنیٰ بھی بیان کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ہر شخص کے دو ٹھکانے ہیں ایک جنت میں اور ایک دوزخ میں۔ عالم برزخ میں یہ دونوں ٹھکانے انسان کو دکھا دیئے جاتے ہیں۔ پھر اگر وہ صاحب ایمان ہے تو اُسے جنت والا ٹھکانا دے دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر تم ایمان نہ لاتے تو تمہیں دوزخ والا ٹھکانا ملتا۔ اسی طرح کافر و مشرک کو دوزخ میں اس کے ٹھکانے پر پہنچایا جاتا ہے۔ اور اُسے بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتا تو اُسے جنت والا فلاں ٹھکانا ملتا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مومن کو جنت میں اُس کا اپنا ٹھکانا بھی مل جاتا ہے ——— اور کافر کا وہ ٹھکانا بھی حاصل ہو جاتا ہے جو اُسے ایمان لانے کی صورت میں ملتا۔ اسی طرح کافر کو دوزخ میں اُس کا اپنا مقام بھی حاصل ہو جاتا ہے اور اُس مومن کا مقام بھی جو ایمان نہ لانے کی صورت میں اُس کے حصے میں آتا۔ اس طرح گویا ایمانداروں کو کافروں کی اور کافروں کو اہل ایمان کی وراثت مل جائے گی۔

پکارنے والا خود اللہ تعالیٰ کی ذات بھی ہو سکتی ہے۔ جو مومنوں کو جنت کی وراثت کی خوشخبری سنائے گی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقام جنت میں پہنچنے کا حقیقی سبب اسکی مہربانی شفقت اور رحمت ہوگی اور فلاح کا حقیقی مدار اسی پر ہے۔

وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ أَصْحَٰبَ ٱلنَّارِ أَن قَدْ
وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدتُّم مَّا
وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۖ قَالُوا۟ نَعَمْ ۚ فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ
بَيْنَهُمْ أَن لَّعْنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٤٤﴾ ٱلَّذِينَ
يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا ج
وَهُم بِٱلْءَاخِرَةِ كَٰفِرُونَ ﴿٤٥﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ
وَعَلَى ٱلْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّۢا بِسِيمَىٰهُمْ ۚ
وَنَادَوْا۟ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ أَن سَلَٰمٌ عَلَيْكُمْ ۚ
لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٤٦﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ
أَبْصَٰرُهُمْ تِلْقَآءَ أَصْحَٰبِ ٱلنَّارِ قَالُوا۟ رَبَّنَا
لَا تَجْعَلْنَا مَعَ ٱلْقَوْمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٤٧﴾

ترجمہ:- اور پکاریں گے جنت والے دوزخ والوں کو (اور
کہیں گے) کہ بیشک ہم نے پایا اُس چیز کو سچا جو وعدہ کیا
ہمارے رب نے ہم سے۔ پس کیا پایا تم نے اُس چیز
کو سچا جو وعدہ کیا تھا تمہارے پروردگار نے تم سے۔ وہ
کہیں گے، ہاں۔ پس اعلان کرے گا ایک اعلان کرنے والا
اُن کے درمیان کہ اللہ کی لعنت ہو ظلم کرنے والوں

پر (۴۴) وہ جو روکتے تھے اللہ کے راستے سے اور
تلاش کرتے تھے اس میں کجی اور وہ آخرت کے منکر
تھے (۴۵) اور ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہوگا ، اور
اعراف کے اوپر کچھ مرد ہوں گے جو پہچانیں گے ہر ایک
کو ان کی نشانیوں سے اور پکاریں گے وہ جنت والوں کو
کہ سلامتی ہو تم پر ، وہ ابھی داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور
وہ امید رکھتے ہوں گے (۴۶) اور جب پھیری جائیں گی ان
کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف تو کہیں گے ، اے پروردگار!
نہ ٹھہرا ہم کو ان لوگوں کے ساتھ جو ظلم کرنے والے ہیں (۴۷)

ربط آیات

یہ آیات بھی گذشتہ درس والی آیات کے ساتھ مربوط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مکذبین اور متکبرین کا بُرا انجام بیان فرمایا۔ پھر فرمایا کہ کفر کرنے والوں کا جنت میں داخلہ اس طرح محال ہے جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا۔ ان کے لیے آسمان اور رحمت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اور مجرمین کا اوڑھنا اور بچھونا جہنم کی آگ ہوگی۔ اس کے برخلاف اہل ایمان اور نیک اعمال کرنے والوں کا ٹھکانا جنت ہوگا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ اور اگر دنیا کی زندگی میں ان کے دلوں میں کوئی کدورت یا شکر رنجی تھی تو وہ سب نکال لی جائیگی اور وہ بالکل پاک صاف ہو کر جنت میں جائیں گے۔ پھر وہاں پر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے کہ اسی کی مہربانی سے وہ رحمت کے مقام تک پہنچے۔ وہ یہ بھی کہیں گے کہ ہمارے رب کے رسولوں نے بالکل سچی بات کی تھی جس کا نتیجہ سامنے آگیا ہے پھر ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ تمہیں یہ جنت وراثت میں دی گئی ہے ان اعمال کی قدردانی کے طور پر جو تم انجام دیتے تھے۔

جنتیوں اور دوزخیوں کی آپس میں بات چیت کا ذکر قرآن پاک کی مختلف سورتوں

میں موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، چنانچہ آج کی آیات میں بھی اسی قسم کے ایک مکالمہ کا ذکر ہے۔ سورۃ صٰفٰت میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ آتا ہے کہ جنت والا ایک شخص اپنے ایک دوست سے ملاقات کا خواہشمند ہوگا۔ جب اُسے جنت میں نہ پائیگا تو جہنم میں تلاش کریگا۔ فَاطَّلَعَ فَرَاٰہُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ وہ دوزخ میں جھانک کر دیکھے گا تو اُسے جہنم کے درمیان میں پڑا ہوا پائے گا۔ جنت ساتوں آسمانوں سے اُوپر اور جہنم ساتوں زمینوں سے نیچے ہے، کروڑوں میل کے فاصلے کے باوجود وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور ان میں مکالمہ ہوگا۔ جنت والا کہے گا تَاللّٰہِ اِنْ کِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ۝ خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دیتا۔ اگر میں تیری باتوں میں آ کر معاد کا انکار کر دیتا تو آج میں بھی تیرے ساتھ ہی ہوتا، مگر خدا تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ میں تمہاری باتوں سے متاثر نہ ہوا اور اللہ نے مجھے اپنی رحمت کے مقام میں پہنچا دیا۔ بہرحال اسی طرح کا ایک مکالمہ ان آیات میں بھی آیا ہے۔

حق تکرار رسد

ارشاد ہوتا ہے وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ اَصْحٰبَ النَّارِ اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا ہم نے پالیا اس چیز کو جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا بالکل سچ۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ تھا کہ اگر تم ایمان لاؤ گے، تقویٰ کی راہ اختیار کرو گے، اور نیکیاں کماؤ گے تو میں تمہیں جنت میں پہنچا دوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اپنی رحمت کے مقام جنت میں پہنچا دیا۔ فَہَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمْ حَقًّا اب یہ بتاؤ کہ تمہارے رب نے تمہارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، کیا تم نے بھی اُسے سچ پایا ہے۔ تمہارے ساتھ اس کا وعدہ یہ تھا کہ اگر کفر اور شرک اختیار کرو گے، اللہ کی آیات کی تکذیب کرو گے۔ تو تمہیں جہنم میں پہنچایا جائے گا جو کہ سزا کا مقام ہے۔ بھلا بتاؤ تو سہی کیا وہ وعدہ پورا ہوگیا۔ قَالُوْا نَعَمْ وہ جواب دیں گے، ہاں۔ وہ وعدہ بھی سچا ہوگیا۔

اور اس کے مطابق ہم دوزخ جیسے المناک مقام میں پہنچ گئے ہیں۔

اس قسم کا مکالمہ صحیحین کی حدیث میں بھی آتا ہے۔ جنگ بدر میں جب بڑے بڑے سردار کافر مارے گئے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر اس کنویں میں ڈال دو۔ مئی جیسا شدید گرمی کا مہینہ تھا، ایک لاش ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی، باقیوں کو گھسیٹ کر کنویں میں گرا دیا گیا۔ اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کنویں پر کھڑے ہو کر اُن آئمہ کفر سے اسی طرح خطاب کیا تھا جس طرح اس آیت کریمہ میں ہے کہ ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ سچا پایا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا "کیا تم نے بھی اپنے رب کا وعدہ سچا پایا ہے؟ اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَا تُكَلِّمُ مِنْ اَجْسَادٍ لَّا اَرْوَاحَ لَهَا آپ ایسے اجسام سے کلام فرماتے ہیں جن میں روحیں موجود نہیں ہیں یہ تو مردار ہیں اور کفر کی حالت میں مرے ہیں، آپ ان سے کیسے خطاب فرماتے ہیں۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ مِنْهُمْ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، میں جو باتیں کر رہا ہوں تم ان کو اُن سے زیادہ نہیں سنتے وَلٰكِنَّهُمْ لَا یُجِیْبُوْنَ مگر یہ جواب نہیں دے سکتے۔" حضرت قتادہؓ اس کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کفار کو زندہ کیا اور انہیں نبی علیہ السلام کی بات سنوائی تاکہ لوگوں کو عبرت ہو کہ نبی کے نافرمانوں بڑے بڑے جابروں کا کیا حشر ہوا۔

ظالموں پہ لعنت

بہرحال جنت والے دوزخیوں سے پوچھیں گے کیا تمہارے رب نے وعدہ سچا کر دیا تو وہ ہاں میں جواب دیں گے کہ بالکل ایسا ہی ہوا۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ پھر اُن کے درمیان ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا۔ یعنی اعلان کرے گا۔ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ کہ ظالموں پر

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جن لوگوں نے کفر اور شرک کیا، اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا
خدا کی توحید کا انکار کیا، معاد پر یقین نہ لائے، وہ ظالم ہیں، ضد اور عناد رکھنے والے
معاند کافر ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت ہو۔

فَاَذَّنَ کا لفظی معنیٰ ہے اذان دی اور عربی میں یہ لفظ بلند آواز سے عام
اعلان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نماز کے لیے جو اذان دی جاتی ہے
اس سے بھی نماز کا اعلان ہی مراد ہوتا ہے۔ تاہم یہ شرعی اذان مخصوص اعلان ہے۔

اللہ کے راستے میں رکاوٹ

فرمایا ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ
یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی اللہ
کے راستے سے روکتے ہیں۔ ہر نبی کے دور میں معاند کافروں کا یہی شیوہ
رہا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ملتا ہے کہ کیسے
مخالفین لوگوں کو نبی کی بات سننے سے روکتے تھے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک
کیا گیا۔ اگر باہر سے کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آتا تو کفار کی کوشش
ہوتی تھی کہ وہ آپ سے ملنے نہ پائے۔ آپ کے بارے میں غلط پراپیگنڈا کر کے لوگوں
کو باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ کبھی دیوانہ کہتے اور کبھی شاعر کہتے۔ بعض
کو طرح طرح کے لالچ دیکر بھی آپ کے قریب جانے سے روکتے تھے اور
بعض پر تشدد کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ احادیث میں دو صحابیوں کا
ذکر آتا ہے۔ جو مکی زندگی میں حضور علیہ السلام سے ملنے کے لیے آئے، اور
کفار کے تشدد کا نشانہ بنے۔ ان میں سے ایک ابوذر غفاریؓ تھے، جو
خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سن رکھا تھا کہ مکے کے سردار باہر
سے آنے والوں کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے سے روکتے
ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب میں مکے پہنچا تو حضور علیہ السلام کا پتہ دریافت کرنے کے
لیے میں نے ایک کمزور سے آدمی کو منتخب کیا۔ خیال تھا کہ یہ آسانی سے
پتہ بتا دیگا اور کوئی چون وچرا نہیں کرے گا۔ مگر جونہی میں نے حضور علیہ السلام کا نام

لیا اُس آدمی نے فوراً شور مچا دیا، پکڑ لو یہ صابی ہے اور حضور کو ملنے کے
لیے آیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے حرم کے قریب
مجھے اتنا مارا کہ میں لہولہان ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ مطلب یہ کہ مشرکین اللہ
کے راستے سے روکنے کے لیے غلط پراپیگنڈا کے علاوہ طرح طرح کی اذیت
بھی دیتے تھے۔

اسلام کے خلاف پراپیگنڈا

مخالفین اسلام نے اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کو مؤثر ہتھیار کے طور پر
استعمال کیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی اتنی عیب جوئی کی جائے
کہ اس کے قریب کوئی نہ آئے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے ہمیشہ یہی ہتھیار
استعمال کیا ہے۔ یہودی تو اس معاملے میں بہت آگے ہیں تاہم عیسائی بھی ان
سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے لوگوں کو مفت تعلیم اور ملازمت کا لالچ دیا
ہے۔ ہسپتال قائم کیے ہیں حتیٰ کہ عورتوں کے ذریعے بھی اپنے نظریات کی
اشاعت کرتے ہیں جو کہ درحقیقت اسلام کے خلاف سازش ہے۔ امریکہ
برطانیہ، فرانس اور جرمنی اسلام دشمن سرگرمیوں پر بے انتہا دولت خرچ کر رہے
ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مشن بھیجتے ہیں جو انسانی ہمدردی کی آڑ میں مسلمانوں
کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور اغیار کو اسلام کے قریب آنے سے روکتے
ہیں۔ اشتراکیت بھی یہود و نصاریٰ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ خفیہ سازش
نہیں کرتے بلکہ دین دشمنی میں بالکل واضح ہیں۔ ان کے منشور میں یہ بات درج
ہے کہ کوئی شخص کسی مذہب کے حق میں کسی مسجد، چرچ، اور عبادت خانے
میں کوئی بات نہیں کر سکتا۔ البتہ مذہب کے خلاف جو چاہے اور جہاں چاہے
کرتا پھرے، اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس جانبداری کا حقیقی نقصان
تو اسلام ہی کو پہنچتا ہے کیونکہ یہی سچا دین ہے جس کے راستے میں رکاوٹیں
کھڑی کی جاتی ہیں۔ اسلام کے علاوہ عیسائیت ہو یا یہودیت، ہندوازم یا
مجوسیت سب باطل ہیں۔ ان کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر یہ سب سے بڑی

رکاوٹ اسلام کے راستے میں ہے۔

عیب جوئی کی تلاش

فرمایا یہ لوگ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ اسلام کی ایسی عیب جوئی کرتے ہیں کہ کوئی شخص اس کے قریب نہ آئے۔ غیر مسلم تو ہیں اسلام کے حدود کو اکثر اپنے پراپیگنڈے کا ذریعہ بناتی ہیں، کہتے ہیں کہ اسلام نے وحشیانہ سزائیں مقرر کر رکھی ہیں۔ قطع ید اور رجم کو غیر انسانی سزائیں قرار دیتے ہیں۔ یورپی ممالک میں اسلامی سزاؤں کے خلاف بڑا زہر اگلا جاتا ہے تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں۔ اب تو اپنے بھی حدود کے خلاف باتیں کرنے لگے ہیں۔ نام نہاد بڑے لوگ اسلامی حدود کو وحشیانہ سزائیں کہنے لگے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ سزائیں غیر مہذب زمانے میں رائج ہوئی تھیں، اب تو دنیا متمدن ہو چکی ہے، اب ان سزاؤں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی طرح تعدد ازدواج پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ تو عیاشی کا ذریعہ ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص بیک وقت دس عورتوں سے ناجائز تعلقات استوار کرے تو گوارا کر لیتے ہیں مگر دوسری بیوی سے نکاح کر لینے کے خلاف زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں۔ یہ سب اسلام میں عیب جوئی کی تلاش ہے جس کے ذریعے اسے ناکام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آخرت کا انکار

فرمایا اللہ کے راستے سے روکنے اور دین میں کجی تلاش کرنے والوں کی ایک خصلت یہ بھی ہے وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كٰفِرُوْنَ اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں۔ وہ اس چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ مرنے کے بعد پھر اٹھنا ہے حساب کتاب کی منزل آتی ہے اور انہیں جزا یا سزا سے دوچار ہونا ہے۔ جدید تمدن کے لوگ اب تو اس قدر مصروف ہو چکے ہیں کہ انہیں آخرت کی فکر کا موقع ہی نہیں ملتا چوبیس گھنٹے لہو و لعب میں مشغول ہیں۔ آدھی آدھی رات تک ریڈیو اور ٹیلیویژن پروگرام دیکھتے ہیں یا پھر ننگی آدمیہ فلمیں چلتی ہیں، ہر گھر سینما گھر بن چکا ہے جہاں ناچ گانے

اور کھیل تماشے کی فراوانی ہے، بھلا ایسے میں آخرت کی طرف کون توجہ دیگا۔؟ اب تو عرب بھی اس تماشے میں شامل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ وہاں سینما گھر تو نہیں ہیں مگر مال و دولت کی فراوانی نے ہر گھر کو عیاشی کا اڈا بنا دیا ہے دنیا بھر کے فحش پروگرام ان کے گھروں میں دیکھے جاتے ہیں اب تمام ملکوں میں کھیلوں کی وزارتیں بھی قائم ہیں۔ کھیلوں کی ٹیمیں غیر ممالک میں بھیجی جاتی ہیں۔ جنہیں بڑے بڑے الاؤنس دیے جاتے ہیں۔ ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، ٹینس، کشتی رانی کے مقابلوں پر کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ان مقابلوں کو دیکھنے کے لیے لوگ ہفتہ بھر ٹیلیویژن کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ملک کے اندر قوم کو کھیل کود میں الجھا کر بیکار کر دیا جاتا ہے اور باہر جانے والوں پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا ہے جو کہ قوم و ملک کا دوہرا نقصان ہے ان حالات میں اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے اور آخرت کو یاد کرنے کا موقع کیسے مل سکتا ہے؟ اور وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا کی نوبت کب آئیگی۔ اگر باقی مصروفیات سے فراغت ہوگی تو کوئی شخص اللہ تعالے کی طرف رجوع کریگا۔ اس کی عبادت کریگا اور تنہائی میں اس کا ذکر کریگا۔

اعراف کیا ہے

جنت اور دوزخ کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ان دونوں کے درمیان حجاب ہوگا۔ سورۃ حدید میں اسے ایک بڑی فصیل سے تعبیر کیا گیا۔ جو منافقین اور مومنین کے درمیان حائل ہوگی۔ اس فصیل کی ایک طرف خدا تعالیٰ کی رحمت ہوگی اور دوسری طرف عذاب ہوگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حجاب بھی وہی چیز یعنی ایک بڑی فصیل ہے جو سورۃ حدید میں بیان ہوئی ہے وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ اور اعراف پر کچھ لوگ ہوں گے۔ اعراف اونچے مقام، پہاڑ یا اونچی دیوار کو کہتے ہیں۔ اور حجاب بھی اسی کا دوسرا نام ہے۔ ایک طرف جنت کا نظارہ ہوگا اور دوسری طرف جہنم کا۔ جیسے عرف اور معروف نیکی کو کہا جاتا ہے

اور نیکی میں بھی اونچائی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ عرف خوشبو کو بھی کہتے ہیں جس میں بڑی مہک پائی جاتی ہے۔ گھوڑے کی گردن پر جو بال ہوتے ہیں ان کو بھی اعراف کہتے ہیں۔ بہرحال یہاں پہ اُس اونچے مقام کا نام اعراف ہے جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہوگا۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اعراف کب تک قائم رہیگا۔ تاہم قیامت والے دن حساب کتاب کی منزل کے بعد کچھ لوگ جنت میں جائیں گے اور کچھ لوگ جہنم میں جائیں گے۔ مگر بعض لوگوں کو اعراف کے اُوپر ٹھہرایا جائے گا۔

اعراف کے مکین

اعراف والے لوگوں کے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ اونچے درجے کے لوگ ہوں گے جن کو جنت اور دوزخ دونوں طرف کے حالات کے مشاہدہ کے لیے ٹھہرایا جائیگا۔ مگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب اعراف وہ لوگ ہونگے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہونگی۔ کچھ عرصہ تک وہ اس مقام میں ٹھہریں گے اور آخر میں خدا تعالیٰ کی رحمت غالب آئیگی اور اُن کو جنت میں جانے کی اجازت مل جائیگی۔ تاہم وہ اہلِ ایمان ہی ہوں گے کافر یا مشرک وغیرہ نہیں ہوں گے بعض کہتے ہیں کہ مشرکین کی چھوٹی اولاد کو اعراف میں رکھا جائے گا۔ بعض یہ بھی فرماتے ہیں کہ اعراف کے مکین وہ شہدا ہوں گے جو دنیا میں اپنے والدین کے نافرمان ہوں گے۔ بعض فرماتے ہیں کہ صاحب اعراف لوگ فترۃ والے لوگ ہوں گے یعنی ایسے لوگ جو حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کے درمیانی دور میں دنیا میں آئے مگر اُن کے پاس کوئی نبی نہیں آیا اور نہ انہیں ہدایت نصیب ہوئی۔ بایں ہمہ انہوں نے شرک بھی نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو اعراف میں کچھ عرصہ رکھا جائے گا اور پھر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں

اس معاملہ میں تمام مفسرین سے مختلف انداز اختیار کیا ہے فرماتے ہیں اعراف کے مقام پہ دو قسم کے لوگ ہونگے پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو عقل سلیم رکھتے ہیں ان کے قوی بالکل درست ہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر ان تک اسلام کی دعوت صحیح طریقے پر نہیں پہنچی اور ان پر حجت تمام نہیں ہوئی۔ مثلاً کسی مقام تک اسلام کا کوئی مبلغ پہنچا ہی نہیں۔ یا اگر پہنچا ہے تو زبان کے اختلاف کی وجہ سے وہ اسلام کی دعوت صحیح طریقے پر نہیں پہنچا سکا اور ان لوگوں نے کفر یا شرک بھی نہیں کیا۔ نہ ہی مکمل طور پر ایمان لائے ہیں۔ تو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اہل اعراف ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ عباسیوں کے دور کے بعد دنیا میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جن تک اسلام کی دعوت صحیح طریقے سے نہیں پہنچی اس دور کے بعد دنیا میں مسلمانوں میں ملوکیت کا دور دورہ رہا ہے۔ صفین کے واقعہ سے پہلے تو ہر مسلمان تبلیغ دین کو اپنا اولین فریضہ سمجھتا تھا اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ مگر اس واقعہ کے بعد مسلمانوں میں آرام طلبی، تعیش اور دنیا داری آگئی ہے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے تبلیغ دین جیسا اہم فریضہ فراموش کر دیا ہے اور دنیا کے بہت سے لوگوں تک دین کا پیغام اس طریقے سے نہیں پہنچ سکا کہ ان پر حجت قائم ہو جائے۔ ایسے لوگ اگر کفر شرک میں مبتلا نہیں ہے تو وہ اصحاب اعراف میں شمار ہوں گے۔

تبلیغ دین کی ضرورت

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان من حیث الجماعت تبلیغ کا فریضہ بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ اس کام کے لیے نہ وقت دیا جا رہا ہے اور نہ مال صرف کیا جا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم تبلیغی جماعت پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں کہ ان بندگان خدا کی بدولت تبلیغ دین کا حق ادا ہو رہا ہے۔ اور دنیا

میں دین کا چرچا ہو جائے گا۔ یہ جذبہ واقعی قابلِ قدر ہے جس کی وجہ سے اپنی اصلاح بھی ہوتی ہے اور دوسروں کی بھی مگر سوال تو یہ ہے کہ اصل ضرورت کا یہ کتنے فیصدی کام ہو رہا ہے اگر حساب لگایا جائے تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے پاس مال کی کمی نہیں مگر یہ تو اپنے آرام و آسائش کے لیے صرف ہو رہا ہے۔ اس میں سے جہاد، اقامتِ دین، اور تبلیغ فی سبیل اللہ پر کتنا روپیہ خرچ ہو رہا ہے اب تو لوگ زکوٰۃ کو بھی وبالِ جان سمجھنے لگے ہیں حالانکہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ غربا، اور مساکین کی اعانت کے علاوہ غیر اقوام میں مواخات کے لیے بھی روپیے کی ضرورت ہے۔ یہ عیسائی مشنریاں مواخات قائم کر کے ہی کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مسلمان لڑکی مہلک مرض میں مبتلا ہو گئی مسلمانوں نے تو اس کی پرواہ نہ کی مگر وہ کسی طرح ٹیکسلا کے مشنری ہسپتال میں پہنچ گئی، بیچاری معذور تھی، ہسپتال کی نرسوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس کا علاج کیا، تعلیم دی اور پھر اس پر عیسائیت پیش کی جسے اُس نے قبول کر لیا اور اب وہ مسلمان لڑکی عیسائی مبلغ بنی ہوئی ہے۔ یہ کام تو مسلمانوں کا تھا جو غیر مسلم اقوام نے سنبھال لیا ہے۔ مسلمانوں کے پاس مال کی کمی نہیں۔ بڑی بڑی عمارات بن رہی ہیں۔ کارخانے لگ رہے ہیں الشرق و المغرب میں تجارت ہے، بنک بھرے ہوئے ہیں مگر اس دولت کا ایک فیصدی بھی تبلیغِ دین کے لیے صرف نہیں ہو رہا۔ اگر مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس طرف توجہ دینا ہوگی۔

بہرحال شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ صاحبِ اعراف ایک تو وہ لوگ ہیں جنہیں اسلام کا پیغام کما حقہٗ نہیں پہنچا اور انہوں نے کفر اور شرک کا ارتکاب بھی نہیں کیا اور دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو ناقص العقل ہیں۔ پاگل ہیں یا نیم پاگل ہیں۔ چھوٹے بچے ہیں جو ابھی مکلف نہیں ہونے

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ کسانوں کی اکثریت بھی اسی فہرست میں آتی ہے
ان کو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ نیکی کی بات اخذ کریں، اُسے سمجھیں اور پھر
اُس پر عمل کر سکیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ غلام بھی اسی زمرہ میں شامل
ہیں جو اپنے آقاؤں کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ ان سے صرف
یہی مطلوب ہے کہ وہ اہلِ ایمان کے ساتھ مشابہت پیدا کریں اُن جیسے
امور حتی الامکان انجام دیتے رہیں۔ اُن کی عقل و فہم کے مطابق اتنا عمل بھی
کافی ہے۔

جنتیوں کو سلام

فرمایا اعراف پر کچھ مرد ہوں گے يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ
جو ہر ایک کو پہچانیں گے یعنی جنتیوں اور دوزخیوں کو اُن کی نشانیوں سے
پہچان لیں گے کہ یہ جنتی جا رہے ہیں اور یہ دوزخی ہیں وَنَادَوْا أَصْحَابَ
الْجَنَّةِ تو وہ اہل جنت کو پکاریں گے أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ کہ تم پر
سلامتی ہو۔ اصحابِ اعراف لوگ اہل جنت کے لیے تو سلامتی کی دعا
کریں گے مگر اُن کی اپنی حالت یہ ہوگی لَمْ يَدْخُلُوهَا کہ وہ خود تو ابھی
جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے۔ ابھی مقامِ اعراف پر ہی رُکے
ہوئے ہوں گے وَهُمْ يَطْمَعُونَ البتہ وہ جنت میں جانے کے
خواہشمند ضرور ہوں گے۔ ابھی تک انہیں جنت میں جانیوالی صلاحیت نہیں ہوگی
پھر جب اُن کی بہیمیت مغلوب ہو کر ملکیت ظاہر ہو جائے گی اور اُن میں
عالمِ مقدس کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جائیگی تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت
سے جنت میں داخلے کی اجازت دے دیں گے۔

دوزخیوں سے پناہ

فرمایا اہل اعراف جنتیوں کو تو سلام کریں گے وَإِذَا صُرِفَتْ
أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ اور جب اُن کی نگاہیں اہل دوزخ
کی طرف پھیری جائینگی یعنی جب وہ دوزخیوں کو دیکھیں گے قَالُوا رَبَّنَا
لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ تو کہیں گے۔ اے ہمارے پروردگار

ہمیں ظالموں کے گروہ میں شامل نہ کر. کفر اور شرک سب سے بڑے مظالم ہیں جنکا انہوں نے ارتکاب کیا. یہ لوگ ضد اور عناد پہ قائم رہے. اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسولوں کی رسالت کو جھٹلایا. انہوں نے آسمانی کتابوں کی تکذیب کی اور معاد سے انکار کیا. یہ بڑے ظالم لوگ ہیں اور جہنم کی طرف جا رہے ہیں، مولا کریم! ہمیں اِن کی معیت سے محفوظ رکھنا. اگلی آیات میں اہل اعراف کا مزید ذکر بھی آرہا ہے.

وَنَادٰٓى اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا يَّعۡرِفُوۡنَهُمۡ بِسِيۡمٰٮهُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡكُمۡ جَمۡعُكُمۡ وَمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَۤاءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ‌ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡكُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰٓى اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ‌ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا دِيۡنَهُمۡ لَهۡوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا‌ ۚ فَالۡيَوۡمَ نَنۡسٰٮهُمۡ كَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ يَوۡمِهِمۡ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۵۱﴾

ترجمہ :- اور پکاریں گے اعراف والے لوگ اُن کو جن کو پہچانیں گے اُن کی نشانیوں سے اور کہیں گے نہ بچایا تم کو تمہاری جماعتوں نے اور جو کچھ تم تکبر کرتے تھے ﴿۴۸﴾ کیا یہ وہ لوگ ہیں کہ تم قسمیں اٹھاتے تھے کہ اِن کو اللہ تعالیٰ رحمت نہیں پہنچائے گا (اِن سے تو کہا گیا ہے) داخل ہو جاؤ جنت میں ، نہ تم پر

خوف ہو گا اور نہ غمگین ہو نگے (۴۹) اور پکاریں گے دوزخ والے جنت والوں کو کہ بہا دو ہمارے اُوپر تھوڑا سا پانی یا جو کچھ اللہ نے تمہیں روزی دی ہے اس میں سے تو کہیں گے (جنت والے) بیشک اللہ نے اِن دونوں چیزوں کو حرام کر دیا ہے کفر کرنے والوں پر (۵۰) جنہوں نے ٹھہرایا اپنے دین کو کھیل اور تماشہ اور دھوکہ دیا اُن کو دنیا کی زندگی نے۔ پس آج ہم اِن کو فراموش کر دیں گے جیساکہ انہوں نے فراموش کیا اس دن کی ملاقات کو اور جیساکہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے (۵۱)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی کامیابی کا ذکر کیا اُن کا جنت کی نعمتوں سے متمتع ہونا اور خدا کی مہربانی کے مقام میں داخل ہونے کا بیان ہوا۔ پھر اللہ نے جنت اور دوزخ والوں کے مکالمے کا ذکر کیا کہ جنت والے دوزخیوں سے کہیں گے کہ اللہ نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا ہم نے تو اس کو برحق پایا۔ اب بتاؤ تمہارے ساتھ اللہ نے جو وعدہ کیا تھا کہ تمہیں دوزخ میں داخل کریگا، کیا تم نے بھی اُس وعدے کو سچا پایا، دوزخ والے کہیں گے کہ ہاں ہم نے اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا۔ پھر درمیان میں ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ خدا تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہو ظلم کرنے والوں پر، وہ جو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں، تاکہ لوگ اس راستے پر گامزن نہ ہوسکیں۔ اور وہ آخرت پر بھی یقین نہیں رکھتے۔

اُدھر جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار (حجاب) ہوگی۔ اس اُونچے مقام پر کچھ لوگ بیٹھے ہوں گے جو ہر ایک کو اُس کی نشانیوں سے پہچانیں گے وہ جنت والوں کو سلام کریں گے اور جب اُن کی نگاہیں اہل دوزخ کی طرف اٹھیں گی تو وہ خدا تعالے سے التجا کریں گے کہ اے اللہ! ہمیں دوزخ والوں کے ساتھ نہ ٹھہرانا یہ اصحاب

اعراف ہوں گے جن کے متعلق کل عرض کر دیا تھا۔ اب آج کے درس میں بھی اصحاب اعراف کا اہل دوزخ سے گفتگو کرنے کا بیان ہے۔

اہل اعراف کا خطاب اہل دوزخ سے

ارشاد ہوتا ہے وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا اور پکاریں گے اعراف والے کچھ مردوں کو يَعْرِفُونَهُم بِسِيمَاهُمْ جن کو وہ پہچانیں گے ان کی نشانیوں سے۔ گذشتہ درس میں اہل اعراف کا جنتیوں سے خطاب تھا کہ انہیں پکار کر سلام کریں گے۔ اور اس آیت میں اہل اعراف کا اہل دوزخ سے خطاب ہے کہ انہیں پہچان کر ان سے گفتگو کریں گے۔

اعراف کے متعلق کل بھی عرض کیا تھا کہ یہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک اونچا مقام ہوگا۔ جنتیوں اور دوزخیوں کے علاوہ کچھ لوگ اس مقام پر بھی ٹھہرائے جائیں گے۔ یہاں ان کا قیام مستقل نہیں ہوگا بلکہ وہ بھی بالآخر جنت میں ہی جائیں گے تاہم ایسا کرنے میں کافی عرصہ لگے گا۔ ان لوگوں میں وہ صلاحیت مکمل نہیں ہوگی جو جنت سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے آہستہ آہستہ جب وہ مطلوبہ استعداد حاصل کر لیں گے تو ان کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ گذشتہ درس میں یہ بیان آچکا ہے لَمْ يَدْخُلُوهَا وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے وَهُمْ يَطْمَعُونَ مگر وہ وہاں جانے کی خواہش رکھتے ہوں گے۔ مقام اعراف کے متعلق سعدی صاحب نے گلستان میں ایک مثال بیان کی ہے کہ اعراف ایسی جگہ ہوگی کہ اہل دوزخ اسی جگہ کو جنت سمجھیں گے کیونکہ وہ سخت عذاب کے مقام سے ایسی جگہ آجائیں گے جہاں اگرچہ آرام نہیں ہوگا تو تکلیف بھی کوئی نہیں ہوگی مگر ان کا اعراف میں پہنچنا بھی ممکن نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر جنت کی حوروں کو اعراف کے مقام پر پہنچا دیا جائے تو ان کے لیے وہ دوزخ کے برابر ہوگا۔ وجہ ظاہر ہے کہ کہاں جنت کی راحتیں اور کہاں اعراف جیسا معمولی مقام۔

باقی رہی یہ بات کہ اہل اعراف کس قسم کی نشانیوں سے اہل جنت اور

اہلِ دوزخ کو پہچانیں گے تو اس کا ذکر قرآن پاک میں مختلف مقامات پر
موجود ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے "یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ
وُجُوْهٌ" اُس دن بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے
کامیاب لوگ "تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ" (المطففین)
اپنے نورانی چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کہ میری
امت کے لوگ وضو کے اعضا کی چمک سے پہچانے جائیں گے۔ اہلِ ایمان
نماز کے لیے وضو کے دوران جن اعضا کو دھوتے تھے یا مسح کرتے تھے،
وہ قیامت کے دن چمکتے ہوں گے اور یہ صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی
امت کو ہی شرف حاصل ہوگا، باقی امتوں کے لیے یہ نشانی نہیں ہوگی۔ ویسے
چہروں کا مطلق روشن ہونا ایمان والوں کی نشانی ہوگی۔ اس کے برخلاف
کافروں، مشرکوں اور منافقوں کے چہرے سیاہ ہوں گے "تَرْهَقُهَا
قَتَرَةٌ" (سورۃ عبس) ان پر گرد و غبار چڑھا ہوا ہوگا۔ پتہ چلے گا کہ انہوں
نے بڑے کام انجام دیے۔ اُن کے گندے فکر کی سیاہی اُن کے چہروں
سے نمایاں ہوگی۔ تو ان نشانیوں سے اہلِ اعراف جنتی اور دوزخی لوگوں کو
پہچان سکیں گے۔ اور قَالُوْا اعراف والے دوزخیوں سے کہیں گے۔
"مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ" تمہارا گروہ کچھ کام نہ آیا۔ تم نے بڑی
بڑی پارٹیاں بنا رکھی تھیں، کسی کو نقصان پہنچانا ہو، دنگا فساد کرنا ہو، تمہارے ورکر
ہر وقت حاضر رہتے تھے اور اپنی حفاظت کے لیے تم نے باڈی گارڈ رکھے
ہوئے تھے، مگر یہ تمام وسائل آج تمہارے کچھ کام نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے
فرمایا ہے "يَاْتِيْنَا فَرْدًا" (سورۃ مریم) ہر شخص کو ہمارے روبرو اکیلا ہی
آنا ہے محاسبے کی منزل کے بعد پھر دوزخ میں بھی اکیلے ہی جانا ہوگا۔ اس
دنیا میں قائم کردہ تمام انتظامات بے سود ثابت ہوں گے۔

بہرحال اعراف والے دوزخ والوں سے کہیں گے کہ ایک تو

تمہاری پارٹی کچھ مفید نہ ہوئی وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ اور جو کچھ تم تکبر کرتے تھے آج وہ بھی کام نہ آیا۔ اہل اعراف پوچھیں گے آج تمہارا غرور تکبر کہاں گیا تم بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے شیخیاں بگھارتے تھے، وہ سب ختم ہو گئے تکبر اقتدار اور مال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دنیا میں تمہارے پاس حکومت تھی، اقتدار تھا، اس کے علاوہ بے انتہا مال تھا جس کے متعلق تم سمجھتے تھے يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ (سورۃ ھمزہ) کہ یہ تمہیں بچائے گا ہر دولت مند بخیل یہی سمجھتا ہے کہ مشکل وقت میں اس کا مال اس کے کام آئے گا مگر بتاؤ آج تمہارا مال کہاں گیا۔ جب اللہ تعالیٰ پکڑنے پہ آتا ہے تو پھر کوئی نہیں بچا سکتا۔ تو اہل اعراف کہیں گے اے بدقسمت لوگو! آج تمہارا نہ جتھا کام آیا اور نہ مال مفید ہوا جس کی وجہ سے تم تکبر کیا کرتے تھے۔

دوزخیوں کی غلط فہمی

اہل دوزخ سے خطاب کے دوران اہل اعراف جنتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ کیا یہ وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھاتے تھے لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ کہ ان کو اللہ تعالیٰ رحمت نہیں پہنچائے گا۔ تم ان لوگوں کو اپنی نظروں میں حقیر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کو کون پوچھے گا، ان کو بھلائی کہاں سے ملے گی، یہ عزت کے مقام میں کیسے پہنچ سکتے ہیں مگر آج تو ان کو یہ حکم ہوا ہے اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ جنت میں داخل ہو جاؤ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ تمہیں اب کوئی خوف نہیں ہو گا اور نہ تم غمگین ہو گے اس کے برخلاف جو لوگ تمہیں حقیر سمجھتے تھے وہ خود دوزخ میں جل رہے ہیں مگر تم بلا خوف و خطر جنت میں چلے جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ جنت اور دوزخ والے ایک دوسرے کو دیکھ کر پہچان سکیں گے، وہ آپس میں بات چیت بھی کریں گے۔ ہر شخص اپنے عزیزوں اور قرابت داروں کو بھی پہچانتے گا۔

ایک دوسرے سے ملاقات کرنا چاہیں گے تو کرادی جائے گی اور وہ ایک دوسرے کی بات سن سکیں گے۔

دوزخیوں کی فرمائش

اہل اعراف سے مکالمے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَنَادٰۤی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ دوزخ والے جنت والوں سے پکار کر کہیں گے اَنْ اَفِیْضُوْا عَلَیْنَا مِنَ الْمَآءِ خدا کے لیے ہمارے اوپر تھوڑا سا پانی بہا دو۔ تمہارے پاس باغات ہیں، نہریں ہیں اور آسائش کی ہر چیز میسر ہے مگر ہم یہاں سخت پیاس میں تڑپ رہے ہیں۔ لہٰذا مہربانی کر کے ہمیں تھوڑا سا پانی دے دو اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ یا اس روزی میں سے کچھ دے دو جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہے۔ ہم اس وقت بہت تکلیف میں ہیں سخت بھوک اور پیاس میں مبتلا ہیں۔ حلق خشک ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ہمیں بھی کچھ دے دو۔ ایسے لوگوں کی حالت تو اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ عذاب میں جل رہے ہوں گے۔ جب وہ پیاس سے بیتاب ہو جائیں گے تو وہ پانی کی طرف اس طرح دوڑتے ہوئے جائیں گے جس طرح پیاسے اونٹ پانی پر جاتے ہیں مگر وہاں "لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ" (یونس) ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔ اگر ایک گھونٹ بھی حلق سے نیچے اتاریں گے تو وہ آنتوں کو کاٹ کر پھینک دے گا اور کھانے کے لیے "اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ" (الدخان) جہنم کا تھوہر ہوگا جو اس قدر کڑوا اور بدبودار ہوگا کہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

بہرحال دوزخیوں کی فرمائش کے جواب میں قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ جنت والے کہیں گے، بیشک دونوں چیزیں یعنی کھانا پینا اللہ تعالیٰ نے کافروں پر حرام کر دیا ہے۔ لہٰذا جنت کی یہ نعمتیں تمہیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تمہیں نہ تو پانی کا ایک قطرہ مل سکتا ہے اور

نہ کھانے کے لیے ایک دانہ میسّر آسکتا ہے۔ تمہیں دوزخ کا کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا اور کڑوا ترین کڑوا تھوہر کھانا ہوگا۔ فرمایا یہ وہ کافر ہیں اَلَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا تھا دینِ برحق اور دینداروں کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ قرآن پاک میں کئی مثالیں موجود ہیں جیسے اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (المطففین) ایمان والوں کے پاس سے گزرتے تھے تو اُن کا مذاق اڑاتے تھے۔ اشارے کرتے تھے، دیکھو یہ جنت کے والی اور حوروں کے خاوند جا رہے ہیں جن کے پاس نہ پہننے کو کپڑا اور نہ کھانے کو روٹی، نہ مکان اور نہ سواری، یہ اپنے آپ کو جنت کے وارث کہتے ہیں۔ اس قسم کا استہزاء کرتے تھے اور طعنے دیتے تھے۔ اس قسم کا ذکر سورۃ توبہ میں منافقین کے متعلق بھی آتا ہے اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ۔ "ترجمہ: کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہو۔" اللہ نے منافقین کی بھی مذمت بیان فرمائی ہے جو کہ کافروں کی طرح دینِ حق اور انبیاء کا مذاق اڑاتے تھے یہاں بھی فرمایا کہ وہ کافر لوگ ایسے تھے جنہوں نے دین کو کھیل تماشا بنا لیا تھا۔

دنیوی زندگی کا دھوکا

اس کے علاوہ اُن کی بدنصیبی یہ بھی تھی وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کہ دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے دنیا کے آرام و آسائش کو ہی اول و آخر سمجھ لیا تھا اور کہتے تھے کہ یہ ہم سے کبھی جدا نہیں ہوں گی۔ برخلاف اس کے ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کی یہ دعا[1] منقول ہے اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا اے اللہ دنیا ہی کو ہمارا منتہائے مقصود نہ بنائیے کہ ہم اس میں مشغول ہو کر آخرت کو بھول جائیں۔ انسانی زندگی کیا ہے کھانا پینا، لباس، مکان، زن و زر، کاروبار یا اقتدار یہی چیزیں انسان کو آخرت سے غافل کرنے والی ہیں جو شخص ان چیزوں میں الجھ کر رہ گیا، وہ دھوکا کھا گیا۔ فرمایا جن بے نصیبوں

[1] ترمذی صفحہ ۵۰ (فیاض)

نے دین کو کھیل تماشہ بنا لیا۔ اور دُنیا کی زندگی میں پھنس کر رہ گئے ؛ انہیں جنت کی کوئی نعمت میسّر نہیں آسکے گی۔

اللہ کی طرف سے بے اعتنائی

اور پھر سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے فَالْيَوْمَ نَنسٰهُمْ آج کے دن ہم انہیں فراموش کر دیں گے ، بالکل نظر انداز کر دیں گے كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا جس طرح انہوں نے اس قیامت کے دن کو فراموش کر دیا تھا۔ کہتے تھے ، کوئی حساب کتاب نہیں ، نہ کوئی جنت دوزخ ہے اور نہ کسی نے مر کر دوبارہ جی اٹھنا ہے انہیں اس بات کا تصور ہی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ پیش آنے والا ہے ۔ تو جس طرح انہوں نے آج کے دن کو بھلا دیا ، اس طرح ہم بھی انہیں فراموش کر دیں گے۔

نسیان کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر تو نہیں کیا جا سکتا کہ نعوذ باللہ وہ بھی کسی بات کو بھول جائے گا مگر مطلب یہ ہے کہ ایسے منکرین کے ساتھ وہ سلوک کیا جائیگا جو کسی فراموش شدہ آدمی کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔ بعض اوقات بڑے بڑے واقعات ، حادثات اور تقریبات میں بعض لوگ یاد ہی نہیں آتے ۔ بعد میں یاد آتا ہے کہ فلاں شخص رہ گیا ، اُس کی اطلاع نہیں دی جا سکی ۔ اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن ہم ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دُور کر دیں گے ۔

فرمایا ہم انہیں جنت کی نعمتوں سے اس لیے بھی محروم کر دیں گے وَمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے ہمارے احکام کی تکذیب کرتے تھے ، نبی کے فرمان کو جھٹلاتے تھے توحید و رسالت پر ایمان نہیں لاتے تھے ۔ قیامت کے دلائل کو تسلیم نہیں کرتے تھے ہم نے دلائل دیئے طرح طرح کی مثالیں پیش کیں مگر انہوں نے کسی بات کو نہ مانا ۔ لہٰذا آج یہ اسی سلوک کے مستحق ہیں کہ ان کے لیے جنت کی نعمتیں ممنوع ہیں ۔

درس پانزدہم ۱۵ — آیت ۵۲ تا ۵۳

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٥٣﴾

ترجمہ :- اور البتہ ہم لائے ہیں ان کے پاس ایک کتاب جس کو ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے علم کے ساتھ۔ وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں (۵۲) (یہ منکرین) نہیں انتظار کرتے مگر اس کے مصداق ظاہر ہونے کا۔ جس دن اس کا مصداق آجائے گا تو کہیں گے وہ لوگ جنھوں نے اس کو فراموش کیا تھا اس سے پہلے، بیشک لائے تھے ہمارے رب کے رسول سچی بات کیا اب کوئی ہماری سفارش کرنے والے ہیں جو سفارش کریں ہمارے لیے یا ہم کو لوٹا دیا جائے (دنیا کی طرف) پھر ہم عمل کریں اس کے سوا جو ہم عمل کیا کرتے تھے۔ بیشک ان لوگوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا اور گم ہو جائیں گی ان سے وہ باتیں جو وہ افترا کیا کرتے تھے (۵۳)

ربطِ آیات

اصحابِ اعراف کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جہنم والوں کا ذکر کیا کہ وہ جنتیوں کو دیکھ کر ان سے التجا کریں گے کہ تھوڑا سا پانی ہم پر بھی بہا دو یا جو کچھ اللہ نے تمہیں روزی عطا کی ہے اس میں سے کچھ ہمیں بھی دے دو کیونکہ ہم سخت پریشان حال اور تکلیف میں ہیں، مگر اہلِ ایمان جواب دیں گے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ نے اہلِ دوزخ پر حرام کر دی ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنایا، اور دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈالا، پس آج کے دن اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے دور رکھیں گے اور ان سے وہی سلوک کریں گے جو فراموش شدہ آدمیوں سے کیا جاتا ہے انہوں نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا۔ اس پر ایمان نہ لائے، آیاتِ الٰہی کا انکار کر دیا، لہٰذا آج ان کے ساتھ بھی اسی طرح کا سلوک ہو گا۔

مفصل کتاب

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حجت کے لیے فرمایا وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ البتہ تحقیق ہم لائے ہیں ان کے پاس کتاب فَصَّلْنٰهُ ہم نے اس میں تفصیل بیان کی ہے۔ یعنی ایسی مفصل کتاب ہے جس میں عقائد حقہ کی تفصیل اور افکارِ باطلہ کی تردید ہے۔ اس میں احکامِ الٰہی کے وہ تمام بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں جن کی انسانوں کو ضرورت رہتی ہے۔ اور تفصیل کی صورت یہ ہے کہ بعض اوقات اسی کتاب میں کوئی چیز ایک مقام پر اجمالی طور پر بیان ہوئی ہے تو دوسری جگہ پر تفصیل کے ساتھ بیان کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کی لمبی سورتوں میں تفصیلی احکامات ہیں، ان میں مسائل بھی بیان ہوئے ہیں اور دلائل بھی۔ ان میں نظیریں اور مثالیں بھی بیان ہوئی ہیں لمبی سورتوں کے بعد درمیانی سورتیں اور پھر چھوٹی سورتیں ہیں۔ لمبی سورتوں میں تفصیل ہے تو چھوٹی سورتوں میں خلاصے بیان ہوتے ہیں۔ گویا اکثر احکام کی تفصیل خود قرآن میں موجود ہے۔

تفصیل کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم علیہ السلام

سے کے ذمہ یہ چیز لگائی ہے لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (النحل) کہ جو وحی نازل کی گئی ہے آپ اس کو کھول کر بیان کر دیں تاکہ کسی کو اشتباہ نہ رہے۔ اس کی خوب وضاحت کر دیں۔ اگر نبی کی زبان سے بھی وضاحت نہ ملے تو پھر قرآن پاک میں غور کرو۔ اس میں کوئی نہ کوئی اصول ضرور دیا گیا ہوگا جس کی روشنی میں مسئلہ حل کیا جا سکتا ہو۔ مثلاً سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا زمین کی تمام چیزیں اللہ نے تمہارے فائدے کے لیے پیدا کی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر پیداوار سے استفادہ حاصل کر سکتا ہے سوائے اس چیز کے کہ جس کی حرمت ثابت ہو جائے یا وہ کسی دوسرے کی ملکیت ہو۔ یہ ایک اصول ہے جس کے تحت کسی چیز پر حلت و حرمت کا حکم لگایا جا سکتا ہے ایسے ہی اصولوں کی روشنی میں مجتہدین بعض مسائل کا حل اجتہاد کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ سورۃ نساء میں بھی ایسے صاحبان علم کے متعلق فرمایا یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ یہ لوگ قرآن پاک سے استنباط کر کے حل پیش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی صلاحیت عطا کی ہے کہ گہرائی سے چیزیں نکال لیتے ہیں۔ ان میں مجتہدین اربعہ اور دیگر مجتہدین شامل ہیں۔ گویا قرآن پاک کے احکام کی تفصیل کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے کہ مجتہدین کرام اس کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ابتدائی طالبعلموں کو سمجھاتے ہیں کہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے اس کے پانچ علوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ فرماتے ہیں پہلا علم تذکیر بآلاء اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے جو نعمتیں پیدا فرمائی ہیں اور جو احسان جتلایا ہے یہ انسان کے لیے باعث نصیحت ہے۔ انسان ان نعمتوں میں غور و فکر کرے اور ان سے استفادہ حاصل کر کے نصیحت پکڑ سکتا ہے۔ قرآن پاک کا دوسرا علم تذکیر بایام اللہ

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سابقہ قوموں کے حالات اور واقعات بیان کیے ہیں اور پھر مجرمین کو سزائیں دی گئی ہیں مطیعین کو جو انعام دیے گئے ہیں، اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ واقعات بھی انسان کے لیے باعث عبرت اور باعث نصیحت ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کا تیسرا علم تذکیر بموت و مابعد الموت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد پیش آنے والے حالات کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ان کو جان کر انسان اپنی آخرت کی زندگی کی فکر کرتا ہے۔ چوتھے نمبر پر علم احکام ہے اس حصہ میں اللہ نے حلت و حرمت، جائز و ناجائز اور تمام اوامر و نواہی کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو کہ اس دنیا کی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں اور انہی علوم پر آخرت کی زندگی کا انحصار ہے۔ اور پانچویں نمبر پر علم مخاصمت یا علم مباحثہ ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ ادیان کی تردید فرمائی ہے اس حصہ قرآن میں دلائل اور شواہد ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے عقائد باطلہ، مشرکین کفار اور منافقین کے غلط عقائد کو آشکارا کیا ہے۔ اُن کے تعصب، اور ہٹ دھرمی کا پردہ چاک کیا ہے۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مفصل کتاب قرآن پاک میں تمام علوم کو جمع کر کے بنی نوع انسان کی راہنمائی کے لیے حجت تمام کر دی ہے اس مفصل کتاب کی آمد کے بعد کسی انسان کے لیے کوئی بہانہ باقی نہیں رہ جاتا جس کے ذریعے وہ اللہ کی بارگاہ میں عذر پیش کر سکے کہ اُسے احکام الٰہی کی خبر نہیں ہو سکی یا وہ اُسے سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم اُن کے پاس ایک کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے عَلٰی عِلْمٍ یعنی علم کے ساتھ۔ قرآن پاک کی تمام تفصیلات علم پر مبنی ہیں اور کوئی چیز خلاف واقع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم کل ہے، اُس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں لہٰذا اس کے بیان کرنے میں کوئی غلطی بھی نہیں ہو سکتی مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حلال، حرام محکم، متشابہ، تبشیر، تنذیر، قصص،

حلت و حرمت کا بیان

غزوات۔ اور تمثیل وغیرہ تمام چیزیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ جو چیزیں انسانی جسم و روح کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں انہیں حلال قرار دیا گیا ہے اور جن چیزوں میں انسانی جسم و روح کے لیے قباحت ہے، اُن کو حرام قرار دیا ہے بعض چیزوں کی خرابی تو واضح ہوتی ہے مگر بعض کی قباحت پوشیدہ ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور اس پر حرمت کا حکم لگاتا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہی عن دواء الخبیث یعنی خبیث دوائی کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ خبیث کے لیے ناپاک ہونا ضروری نہیں مگر یہ مہلک ضرور ہوتی ہے جیسے سنکھیا ہے۔ اگر کچا سنکھیا تھوڑی مقدار میں بھی استعمال کیا جائے تو جان لیوا ثابت ہوتا ہے اس لیے اس سے منع کر دیا گیا۔ البتہ اگر کسی مستند معالج کی زیر نگرانی ٹھیک اور مدبر کر لیا جائے یعنی اس کا کشتہ تیار کر لیا جائے تو معالج کی تجویز کردہ مقدار دوائی کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے اگر اس کو کچا استعمال کیا جائے گا یا مقدار سے زیادہ استعمال کیا جائے تو یہ معدے اور جگر کو پھاڑ کر رکھ دیگا جس سے انسانی جسم کے نازک حصوں سے خون جاری ہو کر آدمی کو ہلاک کر دیگا۔ اس طرح نذر لغیر اللہ انسان کی روح میں نجاست پیدا کرتی ہے۔ اللہ نے اس کو بھی حرام قرار دیا۔ بہتا ہُوا خون بھی حرام ہے۔ اس میں مضر صحت جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مردار بھی انسانی صحت کے لیے سخت مضر اور حرام ہے۔

متشابہات کا بیان

قرآنِ پاک میں محکم اور متشابہ دونوں اقسام کی آیات موجود ہیں سورۃ آل عمران کی ابتداء میں آتا ہے، وہی اللہ کی ذات ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ اس میں محکم آیات ہیں وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ اور بعض دوسری متشابہ ہیں۔ محکم آیتوں کے معانی تو واضح ہیں البتہ متشابہ آیات کی حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے جیسے حروف مقطعات الٓمٓ۔ الٓرٰ۔ حٰمٓ وغیرہ ہیں یا جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات

کے متعلق آتا ہے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی" (طٰہٰ) اللہ تعالیٰ
عرش پر مستوی ہے۔ اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو کہ انسانی عقل میں
آنے والی چیز نہیں ہے۔ سورۃ فتح میں "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ" اللہ
کا ہاتھ کیسا ہے۔ دوسری جگہ پنڈلی کا ذکر بھی آتا ہے۔ ان چیزوں کی کیفیت
کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ متشابہات ہیں اور ان پر ایمان لے آنا ہی
کافی ہے اگر اس میں کرید کی جائے کہ اللہ کا ہاتھ یا چہرہ کیسا ہے، اُسے
جاننے کی کوشش کی جائے گی تو انسان کافر ہو جائے گا۔ ایمان یہی ہونا چاہئے
کہ یہ چیزیں ویسے ہی ہیں جیسی اس کی شان کے لائق ہیں۔ قرآن پاک میں کہیں
اہل ایمان کے لیے بشارت ہے اور کہیں منکرین کے لیے انذار ہے
کہیں قصص بیان کر کے فرمایا ہے "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی
الْاَبْصَارِ" (آل عمران) ان میں اہل عقل و خرد کے لیے عبرت کا سامان
ہے۔ کہیں وعظ و تذکیر ہے، کبھی انبیاء کی زبان سے اور کبھی اولیاء کی زبان
سے کبھی مومنین اور کبھی ملائکہ کی زبان سے عبرت اور نصیحت کی باتیں بیان
کی گئی ہیں قرآن پاک میں بہت سی تمثیلات بھی بیان کی گئی ہیں شیخ ابو بکر بن عربیؒ
فرماتے ہیں کہ ایک ایک لمبی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے ہزار مثالیں، ہزار اوامر
اور ہزار نواہی بیان فرمائے ہیں۔ بعض اوقات بعض امور مثال کے بغیر
واضح نہیں ہوتے لہذا اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بے شمار مثالیں
بھی بیان فرمائی ہیں۔

ہدایت اور رحمت

فرمایا جو مفصل کتاب ہم علم کے ساتھ لائے ہیں، اس میں ھُدًی
ہدایت ہے یعنی یہ انسان کی کما حقہٗ راہنمائی کرتی ہے۔ کوئی بھی مشکل درپیش ہو
اگر انسان قرآن پاک کی طرف رجوع کرے گا تو لازماً راہنمائی حاصل کرے گا
پھر یہ بھی ہے کہ جتنا زیادہ رجوع کرے گا، اتنا زیادہ مستفید ہوگا۔ مفسر قرآن
امام رازیؒ نے امام شافعیؒ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ امام صاحبؒ کو ایک

مسئلہ کا حل مطلوب تھا۔ آپ بار بار قرآن کی ورق گردانی کرتے تھے حتیٰ کہ آپ نے تین سو مرتبہ قرآن پاک کو اول تا آخر تلاوت کیا۔ پھر ایک مقام پہ آ کر نگاہ ٹک گئی اور آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ امام شافعیؒ دوسری صدی کے مجتہد امام، محدث، نیک اور صالح انسان تھے۔ آپ نے ایک مسئلہ کے لیے اتنی محنت کی، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ من اذکیاء امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضور علیہ السلام کی امت کے ذہین ترین لوگوں میں سے تھے۔ امام صاحبؒ کا اپنا بیان ہے کہ زمانہ طالبعلمی میں متواتر سولہ سال تک انہوں نے رات بھر ایک گلاس پانی بھی نہ پیا کہ کہیں مطالعہ میں خلل نہ آ جائے۔ اس زمانے میں ہماری محنتیں ان لوگوں کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ آج تو مسٹر پرویز جیسے انگریزی دان تھوڑی بہت عربی پڑھ کر مجتہد بن جاتے ہیں اور پھر قرآنی آیات کا نعوذ باللہ جھٹکا کرنے لگتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کا حال امام شافعیؒ سے بھی بارہ حیرت انگیز ہے۔ امام مالکؒ، امام احمدؒ جیسے لوگوں کو اللہ نے کیسی صلاحیتیں بخشی تھیں آج لوگ ان کا اتباع کرتے ہیں اور ان کے فتوے پہ چلتے ہیں۔ ان حضرات کے بہت پہ بہت احسانات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ انہوں نے قرآن و سنت کی بہت اچھے طریقے سے وضاحت فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک مجسم ہدایت ہے۔ جب بھی کوئی اس سے استفادہ حاصل کرنا چاہے گا، اس کو مفید پائے گا۔

فرمایا یہ قرآن پاک ہدایت بھی ہے وَرَحْمَةً اور رحمت بھی جو شخص قرآنی اصولوں پر عمل پیرا ہو گا تو اللہ کی رحمت اور مہربانی اس کی طرف متوجہ ہو گی۔ یہ رحمت دنیا میں بھی حاصل ہو گی اور آخرت میں بھی مگر یہ ان لوگوں کے لیے ہے لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ جو اس پہ ایمان لاتے ہیں۔ ایمان کے بغیر قرآن کریم سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

بلکہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ظالموں کیلئے قرآن کریم ان کے خسارے میں اضافہ کرتا ہے اسی سورۃ میں یہ بھی ہے وَمَا یَزِیْدُھُمْ اِلَّا نُفُوْرًا یہ کتاب ایمان سے محروم لوگوں کے لیے مزید نفرت کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح عنادیوں کے لیے مزید وبال ہے اور بعض کے اندھے پن میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ کہ یہ کتاب الٰہی اہل ایمان کے لیے منبع ہدایت اور رحمت ہے۔

مصداق کا انتظار

فرمایا جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں لاتے وہ کس چیز کے منتظر ہیں۔ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ یہ منکرین اس کتاب کے اظہارِ مصداق کا انتظار کرتے ہیں؟ مگر انہیں خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جس دن اس کتاب کی حقیقت تاویل اور مصداق ظاہر ہو گا اس دن افسوس کرنا کچھ کام نہ آئے گا اس کا مصداق تو یہ ہے کہ قیامت واقع ہو جائے اور مکذبین پر عذاب ٹوٹ پڑے۔ تو کیا یہ لوگ قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ برپا ہو گی تو قرآن پر ایمان لائیں گے؟ مگر یاد رکھو یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ جس دن اس کا مصداق ظاہر ہو جائے گا۔ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ تو جو لوگ اس سے پہلے اسے فراموش کر چکے ہوں گے، وہ اس وقت کہیں گے قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ تحقیق ہمارے رب کے رسول سچی بات لائے تھے۔ اس وقت رسولوں اور کتابوں کا اقرار کریں گے مگر وہ اقرار مفید نہیں ہو گا۔ پھر مایوس ہو کر شفاعت کے طالب ہوں گے اور کہیں گے فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَیَشْفَعُوْا لَنَآ کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے جو ہماری سفارش کرے تاکہ ہم کسی طرح بچ جائیں۔ جب کوئی سفارشی بھی میسر نہ ہو گی تو تمنا کریں گے اَوْ نُرَدُّ یا ہمیں دنیا میں واپس پلٹا دیا جائے فَنَعْمَلَ غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ تو وہ کام نہیں کریں گے جو پہلے کیا کرتے تھے یعنی اگر مہلت دے دی جائے تو اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لے آئیں گے، نیکی کے کام کریں گے اور کفر اور شرک سے بیزار ہوں غیر اللہ کی پرستش

نہیں کریں گے ، اہل ایمان سے تمسخر نہیں کریں گے مگر قرآن پاک نے صاف انکار کر دیا کہ نہ تو انہیں دنیا میں دوبارہ بھیجا جائے گا اور نہ ان کو کوئی سفارش مفید ہوگی۔ انبیاء ، ملائکہ ، شہداء ، مومنین کوئی مشرک کے حق میں سفارش نہیں کریگا اور نہ وہ قبول ہوگی۔ سورۃ البقرہ میں ہے وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ "کسی کی سفارش مفید نہیں ہوگی ۔ دوبارہ دنیا میں آنے کی قرآن نے بار بار نفی کی ہے۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے "اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ" کتنے لوگوں کو ہم نے ہلاک کر دیا مگر ان میں سے کوئی بھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔ دنیا کی زندگی ایک دفعہ ہی ملتی ہے اور آزمائش بھی ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے ۔ انسان پاس ہوگیا یا فیل ، دوبارہ موقع ملنے کا کوئی قانون نہیں ہے بہرحال فرمایا کہ جب تمام پردے اٹھ جائیں گے تو پھر منکرین سفارش تلاش کریں گے یا دنیا میں واپس جانے کی خواہش کا اظہار کریں گے مگر ان کی کوئی تمنا پوری نہ ہو سکے گی اور وہ عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

خسارے کا سودا

ایسے بے نصیب لوگوں کے متعلق فرمایا قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بیشک انہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے جسم ، جان ، روح عقل ، شعور ، قویٰ عطا کیے تھے ۔ راہنمائی کے لیے انبیاء اور کتابیں بھیجی تھیں اور اس کے بعد فرمایا تھا فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف) اپنے ارادے سے جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے ، یہ اُس کی اپنی مرضی ہے کہ وہ کس قسم کا سودا کرنا چاہتا ہے ایسے لوگوں کے متعلق جنہوں نے ایمان قبول نہ کیا ، سورۃ البقرہ میں موجود ہے فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ ان کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا اور زندگی کی قیمتی متاع کو خسارے کے سودے میں ضائع کر دیا حضور علیہ السلام نے اس تجارت کی وضاحت یوں فرمائی ہے ۔ صحیحین کی حدیث میں

آیا ہے کل الناس یغدوا فبائع نفسہ فموبقہا او معتقہا ہر شخص ہر روز اپنے نفس کو بیچتا ہے پھر یا تو اُسے جہنم کی آگ سے آزاد کرا لیتا ہے، نیکی کے کام کرتا ہے، ایمان لاتا ہے اور یا پھر کفر اور شرک میں مبتلا ہو کر اپنے نفس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ ایسی تجارت ہے جو ہر انسان ہر روز کرتا ہے۔ اور پھر جیسی تجارت کرتا ہے اس کے مطابق نفع یا نقصان کا حقدار بنتا ہے۔ سعدی صاحبؒ نے بھی کہا ہے کہ انسان کی زندگی برف کی ڈلی کی مانند ہے ؎

عمر برف است و آفتاب تموز
اندکے ماند و خواجہ غرہ ہنوز

جو کہ مسلسل پگھل رہی ہے مگر صاحب کو پتہ ہی نہیں چل رہا ہے جب برف کی ڈلی دھوپ میں پڑی ہو تو وہ کتنی دیر تک قائم رہ سکے گی؟ انسان کی زندگی کا بھی یہی حال ہے مگر وہ دھوکے میں پڑا ہوا ہے۔ اگر اُس نے متاعِ زندگی سے کوئی اچھی تجارت کر لی، کوئی نیکی کما لی، ایمان کی دولت حاصل کر لی تو خسارے سے بچ جائیگا، ورنہ مارا جائیگا۔ سورۃ عصر میں واضح طور پر موجود ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ انسان سراسر گھاٹے میں ہے سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے، اعمال صالحہ انجام دیئے، حق کی وصیت کی اور صبر کی وصیت کی۔ ان چار گروہوں کے علاوہ باقی سب نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا۔ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ اور گم ہو گئیں اُن سے وہ باتیں جو وہ افترا کیا کرتے تھے۔ بڑی ڈھینگیں مارتے تھے، غرور و تکبر کرتے تھے، سب ختم ہو جائیں گے، کوئی چیز باقی نہیں رہیگی اور انہیں اپنے کئے کی سزا مل کر رہیگی۔

لہ مسلم صـ ۱۱۸ ج ۱ (ایاض)

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَٰتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَٰلَمِينَ ﴿٥٤﴾

ترجمہ :- بیشک تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں - پھر وہ مستوی ہوا عرش پر - وہ ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن پر طلب کرتا ہے وہ اس کو تیزی سے دوڑتا ہوا اور سورج اور چاند اور ستارے مسخر ہیں اُس کے حکم کے ساتھ - سنو! اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم دینا بڑی برکت والی ہے وہ ذات اللہ تعالیٰ کی جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ﴿۵۴﴾

ربط آیات

گزشتہ آیات میں اصحاب اعراف کے تذکرے کے بعد اہل جہنم کا ذکر ہوا۔ اُن کے بُرے انجام کو بیان کیا گیا۔ پھر اُن کی خواہش کا ذکر ہوا کہ ان کے لیے کوئی سفارش ہو یا انہیں دنیا میں واپس لوٹا دیا جائے۔ جہاں پر وہ اچھے کام انجام دیں۔ وہ اُس وقت اپنی کوتاہی کا اعتراف کریں گے مگر اس وقت کا اقرار کچھ مفید نہیں ہوگا۔ دنیا کی زندگی میں انہوں نے وقت کو ضائع کر دیا اور اپنی جانوں

کو نقصان میں ڈالا۔ غرضیکہ پہلے اللہ تعالیٰ نے اچھے لوگوں کا انجام بھی بیان کیا اور پھر توحید، رسالت اور معاد کے منکرین کا حال بھی بیان کیا۔ اب آج کے درس میں اللہ نے ابتدائی تخلیق کا ذکر کیا ہے پہلے ساری کائنات کی تخلیق کا ذکر ہے اور اس کے بعد نوع انسانی کی تخلیق کا۔ قرآن پاک کا ایک یہ اسلوب بیان ہے کہ مختلف چیزوں کو مختلف انداز سے بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً ترغیب کے ساتھ ترہیب کا ذکر ہوتا ہے، اسی طرح یہاں پہ انجام کے ساتھ اب آغاز کا ذکر ہو رہا ہے۔ تخلیق کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت تامہ، اس کی قضا و قدر اور اس کے فیصلے کا ذکر کیا جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی توحید کا مسئلہ سمجھایا جاتا ہے۔ توحید کا بیان، شرک کی تردید، کفر کی مذمت، رسالت اور معاد کا ذکر، قضا و قدر کی تفصیلات اور کتاب الٰہی کی صداقت و حقانیت قرآن کریم کے اہم ترین مضامین میں سے ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہاں پہ آغاز کا ذکر کیا ہے جب آغاز ہوگا تو انجام کی بھی فکر ہوگی اور اس طرح وقوع قیامت اور قضا و قدر کی تفصیلات سے بھی آگاہی ہوگی۔

تخلیق کائنات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ اِنَّ رَبَّكُمُ بیشک تمہارا پروردگار۔ تخلیق کائنات کے سلسلے میں یہاں پہ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ عام لوگوں کا فہم صفت ربوبیت کو آسانی سے سمجھ جاتا ہے، اس لیے جب الوہیت کا مسئلہ بیان کرنا مطلوب ہوتا تو اس کی ابتداء صفت ربوبیت سے ہی کی جاتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام کا تذکرہ خاص لوگوں کے لیے کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اُسے سمجھنے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہرحال فرمایا بیشک تمہارا پروردگار اَللّٰهُ الَّذِیْ وہ اللہ ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ چھ دن میں۔ مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ چھ دن سے مراد یہ چوبیس گھنٹے کی رات دن کے ایام

مراد نہیں ہیں۔ بلکہ ان ایام سے دن کی وہ مقدار مراد ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ" (السجدۃ) تیرے پروردگار کے نزدیک ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے چھ دن سے مراد ایک ایک ہزار سال کے چھ دور یا چھ وقفے یا چھ (PERIOD) ہوگا یعنی تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا فرمایا۔

عجلت یا تدریج

حضرت سعید ابن جبیرؒ مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد تھے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو ایک لمحے میں بھی پیدا کرنے پر قادر ہے جیسا کہ قرآن میں مختلف مقامات پر "کُنْ فَیَکُوْنُ" کے الفاظ آتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہوجاؤ تو وہ فوراً ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ چاہتا تو پوری کائنات کو بھی پلک جھپکنے میں پیدا کرسکتا تھا، وہ قادر مطلق ہے۔ اس کی ایک صفت قدیر ہے۔ وہ اپنی قدرت کاملہ سے ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت حکمت بھی ہے اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے مگر انسان اسے نہیں سمجھ سکتے۔ تو حضرت سعید ابن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ کائنات کو چھ دن میں پیدا کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ تعلیم دینا چاہتا ہے کہ جلد بازی نہیں کرنی چاہیے بلکہ تمام کام آہستہ آہستہ سکون کے ساتھ بتدریج انجام دینے چاہئیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے التؤدہ مِنَ الرَّحْمٰنِ وَالْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطٰنِ یعنی آہستگی رحمان کی طرف سے اور عجلت شیطان کی طرف سے ہے۔ انسان جو کام جلد بازی میں کریگا اس میں خرابی واقع ہوگی لہٰذا تمام کام سوچ سمجھ کر نہایت اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ کرنے چاہئیں۔ شیخ سعدیؒ بھی لکھتے ہیں کہ "تعجیل کار شیاطین بود" یعنی جلد بازی شیطانی کاموں میں سے ہے غرضیکہ کائنات کو چھ یوم میں پیدا کرکے اللہ تعالیٰ نے ہر کام کو تسلی کے ساتھ

استحکام دینے کی تعلیم دی ہے۔

استویٰ علی العرش

ابتدائے تخلیق کے ضمن میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات سے پہلے پانی کو پیدا کیا۔ سورۃ ہود میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا "وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ" اور اس کا عرش اس وقت پانی پر تھا۔ پانی کی طرح عرش بھی اللہ کی مخلوق ہے، اس کی صفت نہیں۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی تجلیات اس کی صفات ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ تمہارا رب وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔ مفسرین کرام عرش پر مستوی ہونے کے دو معنی بیان کرتے ہیں ایک تو مجازی معنی ہے جو متکلمین بیان کرتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ ہی کی بادشاہی ہے۔ عرش پر بیٹھنا صاحب اقتدار ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ جیسے شاعر کہتا ہے۔

استوٰی بشر علی العراق
من غیر سیف و دم مھراق

بشر تخت پر بیٹھ گیا یعنی اس کو اقتدار مل گیا مگر نہ تلوار چلی اور نہ خون بہا۔ بہرحال استوٰی علی العرش کے مجازی معنی یہ ہیں کہ تخت پر بیٹھ گیا، اختیارات مل گئے یا بادشاہ وغیرہ بن گیا۔

استوٰی کو حقیقی معنی پر بھی محمول کر سکتے ہیں جیسا کہ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام ابن عیینہؒ، امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ سلف کا مسلک ہے۔ امام مالک کا قول ہے استوٰی معلوم والکیف غیر معقول یعنی استوٰی کا معنی تو معلوم ہے مگر اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی۔ بعض فرماتے ہیں والکیف مجھول یعنی اس کی کیفیت سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کا استوٰی بھی اسی طرح سمجھا جائے جس طرح کوئی انسان کرسی یا

چارپائی پر بیٹھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا جسم ثابت ہوگا حالانکہ وہ جسمانیت اور مادیت سے پاک ہے وہ مکانیت سے بھی مبرا ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وہ بے مثال ہے اُس کی مثال کسی چیز سے نہیں دی جا سکتی اور نہ ہم اس کے استویٰ کی حالت کو سمجھ سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں وَالْاِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ اُس کے استویٰ پر ایمان لانا ضروری ہے وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ مگر اس کی کیفیت کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ چنانچہ تمام آئمہ کرام کا یہی عقیدہ ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ کہ خدا مستوی العرش ہے جیسا کہ اُس کی شان کے لائق ہے باقی اس کی کیفیت کو خدا کے سپرد کر دو۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ جسم اور مکان سے پاک ہے۔ اسی طرح وہ جہت سے بھی پاک ہے۔ اگر اُس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں یا اوپر نیچے جہت تسلیم کی جائے تو خدا تعالیٰ کی مادیت تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا اور انسان کافر اور مشرک بن جائے گا۔ خدا تعالیٰ اِن تمام چیزوں سے منزہ ہے اللہ تعالیٰ کی دائیں بائیں جہت بالکل نہیں کلتا يدی الرحمٰن يمين اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ اُس کا بایاں ہاتھ نہیں ہے۔ بائیں ہاتھ سے عموماً حقیر کام کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا خدا تعالےٰ کے لیے بائیں ہاتھ کا تصور اس کے لائق نہیں ہے۔ اُس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے یہ بات زیادہ آسان طریقے سے سمجھائی ہے وہ استویٰ علی العرش کا ترجمہ یوں کرتے ہیں "اللہ تعالےٰ عرش پر تجلی ڈالتا ہے"۔ اُس کی تجلی خصوصاً تجلی اعظم ہر وقت عرش الٰہی پر پڑتی رہتی ہے جس سے سارا عرش رنگین ہو جاتا ہے۔ اس کے اثرات تمام کائنات پر پھیلتے ہیں اور پھر واپس پلٹتے ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے اس کی ابتدا کب ہوئی، یہ انسان کے علم سے باہر ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے، وہ سب کائنات سے جدا ہے۔ وہ غیب الغیب ہے، وہاں کسی

کا ادراک کامل نہیں کر سکتے ۔

تجلیات کی بہت سی قسمیں ہیں مگر تجلی اعظم ہر وقت عرش الٰہی پر پڑتی ہے ۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی مومنین کو جو رؤیت ہو گی وہ تجلی اعظم ہی کی رؤیت ہوگی امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ وہ تجلی اس وقت بھی کائنات کے وسط ، عالم مثال اور حظیرۃ القدس میں پڑ رہی ہے ، تاہم جب لوگ آخرت میں جائیں گے تو اس کے قریب تر ہو جائیں گے اور اسے نمایاں طریقے سے محسوس کریں گے فرماتے ہیں جس طرح کوئی شخص چودھویں رات کے چاند کو شک و شبہ کے بغیر دیکھتا ہے یا دوپہر کے وقت سورج کو دیکھتا ہے اسی طرح وہ آخرت میں تجلی اعظم کو دیکھ سکے گا ۔

شب و روز کی دوڑ

فرمایا ، پھر وہ عرش پر مستوی ہوا یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ وہ اوڑھا دیتا ہے رات کو دن پر یعنی دن پر رات کی چادر ڈال کر اُسے چھپا دیتا ہے ۔ پہلے دن ہوتا ہے پھر رات آجاتی ہے ۔ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وہ طلب کرتا ہے اس کو تیزی سے دوڑتا ہوا یعنی جس طرح رات دن پر چھا جاتی ہے اسی طرح پھر دن رات پر مسلط ہو جاتا ہے اور اسی طرح شب و روز کی دوڑ جاری رہتی ہے جو کہ ہر ایک کے مشاہدہ میں ہے نابغہ زبیانی شاعر بادشاہ کے زیر عتاب آگیا تو کہنے لگا ؎

فَاِنَّكَ كَالَّيْلِ الَّذِيْ هُوَ مُدْرِكِيْ
وَاِنْ خِلْتُ اَنَّ الْمُنْتَاٰى عَنْكَ وَاسِعٌ

تم تو رات کی مانند ہو جو دور کی مسافت سے آکر بھی پکڑ لیتی ہے اور چھا جاتی ہے اسی طرح میں تم سے بھاگ نہیں سکتا کیونکہ میں جہاں بھی جاؤں تم مجھے پکڑ لو گے ۔ اسی طرح رات اور دن ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں اور مقررہ وقت پر ایک دوسرے پر حاوی ہو جاتے ہیں ۔ شب و روز کے اس تغیر و تبدل میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی حکمت

رکھی ہے، دن کے وقت تمام جاندار کام کاج کرتے ہیں، اپنی روزی تلاش کرتے ہیں، پھر رات کے وقت آرام کرتے ہیں تو ان کے قوی اگلے دن کی عبادت اور محنت کیلئے بحال ہو جاتے ہیں۔ رات اور دن کا برابری کی بنیاد پر تذکرہ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ رات کو کام اور دن کو آرام بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آجکل صنعتی دور میں بعض کارخانے چوبیس گھنٹے چلتے ہیں بعض لوگ دن کی شفٹ میں کام کرتے ہیں اور رات کو آرام کرتے ہیں۔ اور بعض رات کو ڈیوٹی دیتے ہیں اور دن کے وقت آرام کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے دن رات کا یہ چکر کمال حکمت کے ساتھ وضع فرمایا ہے۔

سورج چاند اور ستارے

آسمان و زمین کی تخلیق، استویٰ علی العرش اور رات دن کے تغیر و تبدل کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے سیاروں اور ستاروں کی تخلیق کا ذکر بھی فرمایا ہے ارشاد ہے وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اللہ نے سورج اور چاند کو پیدا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس کے نشانات قدرت اور توحید کے دلائل میں سے ہیں۔ وَالنُّجُوْمَ اور ستاروں کو بھی کمالِ قدرت سے پیدا کیا۔ اللہ نے تمام سیاروں اور ستاروں میں الگ الگ خاصیت رکھی ہے۔ سورج میں تیز روشنی اور حرارت پیدا کی ہے جس سے پوری کائنات متاثر ہوتی ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ چاند کی اپنی شان ہے، وہ مدہم اور خوشنما روشنی مہیا کرتا ہے، سبع سیارات کے باقی پانچ ارکان میں سے زحل کی روشنی نیلگوں ہوتی ہے مشتری کی روشنی خاکستری مائل ہے، مریخ آگ کے شعلے کی طرح سرخ ہے۔ عطارد کی روشنی زردی مائل ہے اور زہرا میں خاص قسم کی تیز چمک ہے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا جدا جدا رنگ اور الگ الگ خاصیت رکھی ہے۔ زمین کی طرح باقی سیارے بھی مختلف مادوں سے بنے ہیں۔ امریکی خلاباز چاند کی سطح سے جو مٹی لائے تھے اس پہ تجربات کیے گئے، اس میں بھی زمین والی نشو و نما کی خاصیت پائی

جاتی ہے، تاہم زمین کے عناصر چاند کی نسبت زیادہ کثیف ہیں اور فلکیات کے عناصر لطیف ہیں۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ مختلف سیاروں کی ساخت میں تھوڑا بہت فرق ہے، اسی لیے ان کے رنگوں میں بھی فرق ہے اور روشنی بھی مختلف ہے۔ اللہ نے ہر سیارے کے مادے کو مختلف عناصر سے پیدا فرمایا ہے اخبارات میں یہ خبر بھی آچکی ہے کہ اولین امریکی خلا باز مسلمان ہو چکا ہے اس نے چاند پر کوئی عجیب آواز سنی۔ پھر واپس آکر اس نے وہی آواز اذان کی صورت میں سنی تو اسے اسلام کی حقانیت پہ یقین آگیا۔ اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس نے چاند پہ اپنی کسی مخلوق کی اذان کی آواز اس خلا باز کو سنا دی۔

چھوٹے چھوٹے لاکھوں اور کروڑوں ستاروں کے علاوہ سات بڑے سیارے ہیں، جن کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ یہ نظام شمسی کے رکن سیارے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت کے ساتھ انہیں خلا میں پھیلا دیا ہے اور ہر ایک کی اپنے محور اور اپنے اپنے مدار میں چال مقرر کر دی ہے جس کی وجہ سے یہ اپنے اپنے راستے پر چل رہے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا جانے کی نوبت نہیں آتی۔ سبع سیارات میں چاند اور سورج کی چال تو ایک جیسی ہے البتہ باقی پانچ سیارے (خمسہ متحیرہ) کبھی سیدھے چلتے ہیں، کبھی دائیں بائیں اور کبھی غائب ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سال مارچ میں یہ واقعہ ہوا کہ ساتوں سیارے ایک سیدھ میں آگئے۔ نجومیوں کے ہاں یہ بڑا حادثہ ہوتا ہے جو سینکڑوں ہزاروں سال میں پیش آتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں بڑے بڑے تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ بہرحال سورج اور چاند کی رفتار میں مماثلت پائی جاتی ہے اور یہ پورا سال بارہ برجوں میں گردش کرتے ہیں۔ ان کا ہر ماہ کا سفر مختلف برج میں ہوتا ہے چنانچہ موسموں کا تغیر و تبدل بھی اسی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ سب کے سب

سیارے مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس طرح چلاتا ہے اسی طرح چلتے ہیں، اس کے حکم کے پابند ہیں۔ اللہ نے جس مدار میں ان کو چلایا ہے اور جو ڈیوٹی لگائی ہے اس کو انجام دے رہے ہیں۔ نظامِ شمسی کے متعلق قرآن پاک نے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب یہ پورا نظام تبدیل کر دیا جائے گا۔ تمام کائنات درہم برہم ہو جائے گی اور پھر اس کی جگہ دوسرا نظام لایا جائے گا قرآن پاک کی اصطلاح میں یہ واقعہ قیامت کے نام سے موسوم ہے اس نظامِ شمسی کے علاوہ بعض دیگر نظام بھی کائنات میں جاری ہیں جن میں سب سے بڑا نظام حظیرۃ القدس کا نظام ہے جو ابھی تک ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ جب نظامِ شمسی ختم ہو جائے گا تو حظیرۃ القدس کا نظام ظاہر ہو جائیگا۔ بہرحال یہ تمام نظام اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں "مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ" کا یہی مطلب ہے۔

عالمِ خلق اور امر

فرمایا اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ سن لو! پیدا کرنا اور حکم دینا اسی اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ "اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ" ہر شے کا پیدا کرنے والا وہی ہے "خَلّٰقُ الْعَلِیْمُ" بھی وہی ہے۔ تخلیق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی چار صفات کام کرتی ہیں۔ پہلی صفت ابداع ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو نیست سے ہست کرتا ہے۔ پھر دوسری صفت تخلیق ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کو دوسری چیز کے مادے سے بناتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق کیا گیا۔ سورۃ آل عمران میں موجود ہے "خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ" اور پھر آگے اللہ نے توالد اور تناسل کے ذریعے نسلِ انسانی کو پھیلایا۔ سورۃ السجدہ میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق مٹی سے کی "ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ" پھر اس کی نسل حقیر پانی سے چلائی اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت تدبیر کام کرتی ہے یعنی آگے پیچھے یا تغیر و تبدل کرنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کا

کام ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کے قلب میں ترقی بھی پھینکتا ہے جو کہ اس
کی چوتھی صفت ہے۔ یہ چاروں صفات تخلیق کے سلسلے میں یکے بعد دیگرے
اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

صفت خلق کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر امر کا ذکر بھی کیا ہے۔
کہتے ہیں کہ عرش سے اوپر عالم امر ہے جس کی کیفیت کو کوئی مخلوق نہیں جان
سکتی۔ اس سے نیچے عالم خلق ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق فرمایا ہے کہ
خلق بھی اسی کا ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔ گویا پیدا کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا کام ہے
اور حکم دینا بھی اسی کو سزاوار ہے۔ مولانا شیخ الہندؒ اس حصہ آیت کا ترجمہ کرتے
ہیں بدستور اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا۔ تخلیق بھی اسی کے قبضۂ قدرت
میں ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے۔ لہذا عبادت بھی صرف اسی کی کرنی چاہیئے
چنانچہ اگلی آیات میں الوہیت کا مسئلہ بھی بیان ہوگا کہ جو خالق، رب اور
صاحب امر ہے اس کی عبادت بھی اسی کی کرو۔ غیر اللہ کی عبادت کرکے کیوں
شرک میں مبتلا ہوتے ہو۔ وہ خالق ہے ہم مخلوق ہیں۔ وہ آمر ہے ہم مامور
ہیں وہ رب ہے ہم مربوب ہیں۔ وہ مالک ہے، ہم مملوک ہیں۔ جب
خالقیت اور ربوبیت کی پہچان ہو جائیگی تو پھر الوہیت کی پہچان بھی آ جائیگی۔

بابرکت ذات

فرمایا تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ تمام جہانوں کا پروردگار اللہ تعالیٰ
بڑا بابرکت ہے۔ وہ برکتیں عطا کرنے والا ہے۔ برکت ایسی زیادتی اور نشوونما
کو کہتے ہیں جس میں تقدس اور پاکیزگی پائی جائے۔ برکت دینے والی ذات
بھی فقط ذات خداوندی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا "وَجَعَلَنِیْ
مُبٰرَكًا" (سورۃ مریم) اللہ ہی نے مجھے بابرکت بنایا۔ میرے ہاتھ سے
معجزات ظاہر ہوئے اور حیرت انگیز چیزیں پیش آئیں۔ سورۃ ملک
کی ابتداء میں ہے "تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ" بڑی بابرکت
ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں اختیار ہے "تَبٰرَكَ الَّذِيْ

نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ" (الفرقان) برکتوں والی ہے وہ ذات جس نے قرآن جیسی عظیم کتاب نازل فرما کر بنی نوع انسان پر احسان فرمایا۔ خدا تعالٰے نے قرآن پاک کی صورت میں اپنا کلام اور صفت نازل فرمائی اور انسان کو اعزاز بخشا مگر انسان بڑا ہی ناشکر گذار اور ناقدر دان ہے۔ یہ صفت الٰہی کی قدر نہیں کرتا۔ اللہ تعالٰے تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ وہ ہر ایک کی تربیت کرنے والا ہے۔

پہلے اختتام کا بیان تھا۔ اب اس آیت میں آغاز کا ذکر ہوا۔ ابتدائے تخلیق میں اللہ تعالٰے کی صفت خالقیت، اُس کے تصرف اور صفت امر کا تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس کے ذریعے خدا تعالیٰ کی الوہیت اور معبودیت کو پہچان سکتا ہے۔ اس کی تشریح اگلی آیات میں آئیگی۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ:- پکارو اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے بیشک وہ نہیں پسند کرتا تعدی کرنے والوں کو ﴿۵۵﴾ اور نہ فساد کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور اُسی کو پکارو اس سے ڈرتے ہوئے اور اسی سے اُمید رکھتے ہوئے۔ بیشک اللہ کی رحمت قریب ہے نیکی کرنے والوں کے ﴿۵۶﴾

ربطِ آیات

اصحابِ اعراف کے ذکر کے بعد اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام بیان ہوا پھر قدرتِ تامہ کے دلائل ذکر کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے تخلیقِ کائنات، دن رات کے تغیر و تبدل اور سماوی کُرات کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مقررہ رفتار سے اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں۔ تمام سیارے اور ستارے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مسخر ہیں اور اُس کی قدرتِ تامہ کے دلائل ہیں۔ پیدا کرنا بھی اُسی کا کام ہے اور حکم دینا بھی اُسی کی شان ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات بڑی بابرکت ہے اور وہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اب آج کے درس کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُس کو پکارنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ اور دوسری آیت میں نیکی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اپنی حوائج اور مشکلات میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارنا چاہیے اور اُسی کے سامنے عاجزی اور

انکساری کا اظہار کرنا چاہیئے کیونکہ خلق اور امر اُسی کا ہے اگر اس کے علاوہ کسی دوسرے کو پکارے گا تو شرک میں ملوث ہو جائے گا۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کے سوا مخلوق میں سے کوئی بھی مشکل کشائی اور حاجت روائی کا اختیار نہیں رکھتا، لہٰذا اس آیت میں دُعا اور مناجات کا طریقہ سکھلایا گیا ہے۔

دُعا کا طریقہ

ارشاد ہوتا ہے۔ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ پکارو اپنے پروردگار کو تَضَرُّعًا گڑگڑا کر ضراعت کا معنی عاجزی کرنا اور گڑگڑانا ہے۔ دُعا کا پہلا ادب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حضور نہایت عجز و انکساری اور خشوع و خضوع کے ساتھ دستِ سوال دراز کرے۔ ضراعت کا معنی میلان بھی ہوتا ہے اور ضرع ان تھنوں کو کہتے ہیں جن کا دودھ دوہنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو دُعا کرنے کا ایک ادب اور طریقہ تو یہ ہے کہ انسان نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کرے اور دوسرا وَّخُفْیَۃً چپکے چپکے، پوشیدہ طور پر شہرت اور ریاکاری سے بچتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے، اس کی مناجات کرے اور اُس سے سوال کرے، اپنی حاجات طلب کرے۔

مناجات اور دعا عبادت ہے اور ذکر مطلقاً عبادت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ یعنی عبادت کا مغز اور گودا دعا ہے یعنی دُعا عین عبادت ہے اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے "وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ۚ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دٰخِرِیْنَ" (المؤمن) مجھ سے دُعا کیا کرو، میں قبول کروں گا۔ جو خدا تعالےٰ کے سامنے دُعا کرنے سے تکبر کرتے ہیں، اللہ ان کو ذلیل کر کے جہنم میں داخل کریگا۔ گویا اللہ تعالیٰ کو پکارنا، اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا عین عبادت ہے بلکہ عبادت کا اہم حصہ ہے۔ بہرحال یہاں پر دُعا کے دو آداب کا ذکر کیا گیا ہے، ایک عجز و انکساری اور دوسرا خفیہ طور پر

چپکے، چپکے۔

ذکر بالجہر و بالسّر

دعا اور ذکر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ چپکے چپکے اور پوشیدہ طور پہ ہونا چاہیئے۔ قرآن و سنت میں اس کی صراحت موجود ہے اور علما کا اس پہ اتفاق ہے۔ البتہ بعض مخصوص حالات اور شریعت کے مقررہ مواقع پہ ذکر بالجہر بھی روا ہے۔ مثلاً اذان اور اقامت بلند آواز سے کہنے کا حکم ہے ایام تشریق کی تکبیرات بھی بلند آواز سے پکاری جاتی ہیں۔ حج اور عمرہ کا تلبیہ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ بلند آواز سے پکارا جاتا ہے۔ امام تین نمازوں میں قرأت بلند آواز سے کرتا ہے اور پھر ایک رکن نماز سے دوسرے کی طرف منتقلی کے لیے بلند آواز سے تکبیر کہتا ہے۔ اگر امام سے سہو ہو جائے تو مقتدی بلند آواز سے سبحان اللہ کہہ کر امام کی توجہ دلاتا ہے۔ غرضیکہ ان خاص مواقع کے علاوہ عام حالات میں ذکر بالسّر ہی افضل ہے۔

مخفی ذکر کی فضیلت

مخفی ذکر کی فضیلت کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ خیر الذکر الخفیّ وخیر الرزق ما یکفی بہتر ذکر وہ ہے جو پوشیدہ ہو اور بہتر روزی وہ ہے جو انسان کے لیے کفائت کر جائے۔ بعض اوقات رزق کی فراوانی انسان کو غفلت میں ڈال دیتی ہے۔ ما قلّ وکفی خیر مما کثر والھی تھوڑا اور کفائت کرنے والا بہتر ہے اس سے جو زیادہ ہو مگر غفلت میں مبتلا کرنے والا ہو۔

مفسر قرآن امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ اُدْعُوْا امر کا صیغہ ہے یعنی پکارو اپنے رب کو خُفْیَۃً آہستہ سے، مخفی طور پہ۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ مریم میں اپنے عبد صالح زکریا علیہ السلام کی اس طرح تعریف فرمائی ہے "اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا" جب اس نے اپنے پروردگار کو چپکے چپکے سے پکارا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا کا افضل طریقہ مخفی طور پہ پکارنا ہے۔ اسی لیے امام ابوحنیفہ کے مسلک کے مطابق امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں التامین ھو الدعاء

یعنی سورۃ فاتحہ کے بعد جو آمین کہی جاتی ہے یہ بھی دعا ہے اور دعا کا قانون
یہ ہے کہ آہستہ کہنا افضل ہے لہٰذا نماز میں آمین بھی آہستہ ہی کہنی چاہیئے کہ
یہی افضل ہے۔ امام شافعیؒ آمین بلند آواز سے کہنے کے حق میں ہیں مگر
اُن کے مقلد صاحب تفسیر کبیر امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ آمین آہستہ کہنا زیادہ افضل ہے۔

اختلافِ آئمہ

ایسے مسائل میں اماموں کا جو اختلاف ہوتا ہے وہ جواز یا عدم جواز کا نہیں
ہوتا بلکہ افضلیت اور غیر افضلیت کی بات ہوتی ہے۔ مگر لوگ ایسے فروعی
اختلافات کو طول دے کر خواہ مخواہ نفرت کا بیج بوتے ہیں۔ آمین کا مسئلہ
انہی فروعی مسائل میں سے ہے۔ امام شافعیؒ آمین بالجہر کو افضل کہتے ہیں۔
جب کہ امام ابوحنیفہؒ آمین بالسر کو افضل سمجھتے ہیں۔ دوسرے مقام پر یہ بھی
آتا ہے۔ "وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ" (الاعراف) اپنے رب کو اپنے
جی میں یاد کرو۔ آگے "وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ" کے الفاظ بھی آتے ہیں
یعنی بلند آواز سے یاد نہ کریں۔ مقصد یہ ہے کہ آہستہ ذکر زیادہ افضل ہے۔ اگر وجوب
ثابت نہ بھی ہو تو استحباب کے درجے پر تو بہر حال ہے۔ اسی طرح رفع یدین کا مسئلہ
ہے۔ بعض آئمہ کہتے ہیں کہ کرنا افضل ہے اور امام ابوحنیفہؒ نہ کرنے کو ترجیح
دیتے ہیں۔ مسئلہ صرف اولیٰ اور غیر اولیٰ کا ہے لہٰذا ایسے مسائل میں الجھنا مناسب
نہیں۔ ذکر بالجہر اور بالسر میں بھی یہی بات پیش نظر رکھنی چاہیئے۔

ذکر بالجہر کی ممانعت

صحیح احادیث میں آتا ہے کہ بعض مواقع پر جب صحابہ کرام نے بلند آواز
سے ذکر کیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اربعوا علی انفسکم لا تدعون
اَصَمًّا ولا غائبًا اپنے نفسوں پر نرمی کرو۔ تم کسی ایسی ہستی کو تو نہیں پکارتے
ہو جو معاذ اللہ بہری یا غائب ہو، بلکہ تم تو سمیع اور قریب ہستی کو پکار رہے
ہو جو ہر بات کو سنتی ہے۔ آپ نے ایک صحابی سے یہ بھی فرمایا کہ
خدا تعالیٰ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے جس کو تم
پکارتے ہو۔ لہٰذا اُسے بلند آواز سے پکارنے کی ضرورت نہیں ہے

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ شریعت کے مذکورہ مقامات کے علاوہ بلند آواز سے ذکر کرنا مکروہ ہے، خاص طور پر جب کہ دوسرے لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔ قاضی صاحب نے ذکر کے تین مراتب بیان کیے ہیں جن میں سے پہلا مرتبہ ذکر بالجہر کی کراہت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص بلند آواز سے ذکر کر رہا ہے تو دوسرے کی نماز یا تلاوت میں خلل واقع ہوتا ہے۔ جس بیمار کو آرام کی ضرورت ہے، وہ ذکر بالجہر کی وجہ سے مکمل آرام نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے اُسے تکلیف ہوتی ہے۔ مسند احمد میں تو یہ روایت بھی ہے لا یجھر بعضکم علی بعض تم میں سے بعض دوسروں کے سامنے بلند آواز سے قرآن پاک کی تلاوت بھی نہ کریں تاکہ کسی کے لیے تکلیف کا باعث نہ ہو۔

امام ابن ہمامؒ آٹھویں، نویں صدی میں مصر میں بہت بڑے فقیہ ہوئے ہیں۔ آپ نے ہدایہ کی شرح بھی لکھی ہے۔ بحر الرائق والے ابن نجیمؒ بھی بڑے فقیہ گزرے ہیں، آپ کی کتاب پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شیخ ابراہیم حلبیؒ جنہوں نے منیۃ المصلی کی شرح لکھی ہے۔ وہ بھی بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے۔ ان سب حضرات نے امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے کیونکہ یہ لوگوں کے لیے ایذا رسانی کا باعث ہوتا ہے۔ فتح القدیر میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد میں بلند آواز سے ذکر کریگا تو اس میں دو بدعتیں پائی جائیں گی۔ ایک تو یہ آداب مسجد کے خلاف ہے اور دوسرے لوگوں کے لیے ایذاء کا باعث ہے۔

ہمارے ملک میں تو خاص طور پر ذکر بالجہر کے ذریعے بڑا ظلم اور تعدی ہوتی ہے۔ نہ مسجد میں دوسرے نمازیوں کا خیال آتا ہے، نہ محلے کے بیماروں کی پرواہ کی جاتی ہے۔ گھر میں کوئی عورت نماز پڑھنا چاہتی ہے، ذکر کرنا چاہتی ہے تلاوت کا شوق رکھتی ہے، مگر بعض حضرات لاؤڈ سپیکر کھول کر وقت بے وقت

صلوٰۃ وسلام یا نعت خوانی شروع کر دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس کی وجہ سے کتنے لوگوں کو پریشانی لاحق ہو رہی ہے۔ فقہا و محدثین کے فتوے موجود ہیں مگر کون مانتا ہے۔ اُن کے سامنے تو ایک ہی فلسفہ ہے کہ اس کی آواز دوسری سے بلند ہو جائے۔ اب تو بعض مسجدوں میں نماز کی قرأت بھی بلند آواز میں لاؤڈ سپیکر پہ ہونے لگی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اردگرد کی مسجدوں میں نمازیوں کی نمازیں خراب ہوتی ہیں۔ عبادت میں خلل واقع ہوتا ہے۔ یہ نیکی نہیں بلکہ بدعت اور گناہ ہے۔ اس معاملے میں حکومت بھی بے بس ہے، وہ تو اکثریت کو دیکھتی ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں، انہیں جائز ناجائز سے کوئی سروکار نہیں۔ اب شیعوں نے زکوٰۃ جمع کرانے سے انکار کر دیا کہ ہمارا مسلک اجازت نہیں دیتا تو حکومت نے انہیں مستثنیٰ قرار دیدیا۔ اُن کی دیکھا دیکھی سُنی بھی شیعہ بن گئے کہ چلو زکوٰۃ اور عشر سے تو بچ جائیں گے۔ غلط کام کا نتیجہ ہمیشہ غلط ہی نکلتا ہے۔ ذکر تو آہستہ کرنا افضل ہے۔ مگر جب لوگوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا تو پھر اس میں قباحتیں بھی پیدا ہونے لگیں۔

زبان اور روح سے ذکر

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ ذکر کا دوسرا مرتبہ لسانی یعنی زبانی ذکر ہے۔ اس میں افضل بات یہی ہے کہ ذکر آہستہ کرے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[1] لا یزال لسانك رطبًا من ذکر اللہ (ترمذی، ابن ماجہ) تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے ہمیشہ تر رہنی چاہیئے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کونسا عمل زیادہ افضل ہے فرمایا ان تفارق الدنیا ولسانك رطب من ذکر اللہ تم دنیا سے اس حالت میں رخصت ہو کہ تمہاری زبان ذکر الٰہی سے تر ہو۔ قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ذکر کا تیسرا مرتبہ روح اور نفس کے ساتھ ذکر کرنا ہے اور یہ بالکل ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ مسند ابو یعلیٰ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ مخفی ذکر جہر ذکر سے ستر مرتبہ زیادہ افضل ہے۔ فرمایا قیامت والے دن ایک شخص کا حساب کتاب پیش ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اعمال لکھنے والے اور نگرانی کرنے والے

[1] ترمذی ص۴۸۶ (فیاض)

فرشتوں سے فرمائیں گے کہ اس شخص کا اگر اور کوئی عمل ہے تو لے آؤ۔ فرشتے عرض کریں گے۔ باری تعالیٰ! اس کا کوئی عمل باقی نہیں رہا۔ ہم نے تمام عمل جو لکھے تھے پیش کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیگا، اے فرشتو! اس شخص کا ایک ایسا عمل بھی ہے جسے تم نہیں جانتے اُسے میں جانتا ہوں۔ یہ اس کا قلب و روح کے ساتھ ذکر ہے جو تم نے نہیں لکھا مگر میرے علم میں ہے۔

تجاوز کی ناپسندیدگی

فرمایا اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ بیشک اللہ تعالیٰ تعدی و تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ ذکر کرتے وقت چیخنا چلانا اور شور کرنا ہرگز پسندیدہ نہیں۔ اسی طرح اپنی دعا میں کسی غلط اور ناجائز چیز کا طلب کرنا بھی روا نہیں کیونکہ یہ بھی تعدی میں داخل ہے۔ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے سُنا کہ اُن کا بیٹا یوں دُعا کر رہا ہے اللھم انی اسئلك القصر الابیض عن یمین الجنۃ اے اللہ! میں جنت میں دائیں طرف سفید محل کا سوال کرتا ہوں یہ سُن کر آپ نے فرمایا، بیٹے! ایسا مت کہو بلکہ سَلِ اللہ الجنۃ اللہ تعالیٰ سے صرف جنت کا سوال کرو۔ وَتعوذ بہ من النار اور اس کی ذات کے ساتھ جہنم سے پناہ مانگو۔ فرمایا یہ دُعا بھی کرو اسئلك الجنۃ وما قرب الیھا من القول والعمل اے اللہ! میں تجھ سے جنت طلب کرتا ہوں اور ایسی بات اور ایسا عمل طلب کرتا ہوں جو جنت کے قریب کر دے۔

نیز یہ بھی انی اعوذ بك من النار وما قرب الیھا من القول والعمل اور میں دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں اور اس بات اور عمل سے بھی جو جہنم کے قریب کر دے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

سے یہ دعا سیکھی تھی لہذا کہا اے بیٹے تیرے لیے اتنی دعا ہی کافی ہے۔ اپنی دعا میں قصرِ ابیض (WHITE HOUSE) کا پہلے تعین کرو۔ پھر آپ نے یہی آیت پڑھی اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ یعنی اللہ تعالیٰ تعدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فساد فی الارض

آگے ارشاد ہوتا ہے وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا زمین میں اصلاح کے بعد فساد کرو۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہاں پر فساد سے مراد کفر، شرک اور بدعات ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ کر فساد کا باعث نہ ہو۔ فساد اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب قانون شکنی کی جائے۔ جب تک قوانینِ الٰہیہ پر عمل ہوتا ہے انسانوں کو امن اور چین نصیب ہوتا ہے۔ ایمان ہوگا تو سکون ہوگا اور جب شرک ہوگا تو بدامنی اور شر و فساد پیدا ہوگا۔ اسی لیے فرمایا زمین میں اصلاح کے بعد فساد مت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق بھی اسی قسم کی بات کی ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، حالانکہ وہ کفر و شرک اور نفاق کا ارتکاب کر کے فساد فی الارض کا بیج بوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف جھگڑا، فساد، سازش ایمان اور اخلاص کے منافی ہیں۔ بدعات اور خلافِ سنت امور بھی فساد کا باعث بنتے ہیں، اسی لیے فرمایا کہ زمین میں فساد مت کرو۔

خوف و امید

اس کے بعد فرمایا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اللہ تعالیٰ کو خوف اور امید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پکارو۔ اللہ تعالیٰ خلق اور امر کا مالک ہے، وہ کسی مجرم کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ لہذا اس کا خوف ہمیشہ دل میں جاگزیں رہنا چاہیئے۔ ہر شخص کے دل میں یہ بات اچھی طرح نقش ہونی چاہیئے کہ جب وہ کوئی کوتاہی کرے گا پکڑا جائے گا۔ یہی خوف ہے۔ اور

اس سے گناہوں کی بخشش اور معافی کی امید بھی رکھنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ غلطی کر کے جب اس کے دروازے پر دستک دے تو پورے یقین اور امید کے ساتھ کہ وہ اپنے بندوں پر نہایت ہی رحیم و کریم ہے وہ کسی پر زیادتی نہیں کرتا اور جب اس کا کوئی بندہ خلوص نیت کے ساتھ اس کے دروازے پر آجاتا ہے تو پھر وہ اس کو خالی نہیں بھیجتا، بلکہ اس کی جھولی اور دامن کو مراد سے بھر دیتا ہے خوف کے ساتھ ساتھ یہ امید بھی اس کے ساتھ وابستہ ہونی چاہیئے۔ الایمان بین الخوف والرجا ایمان تو وہی ہے جو خوف اور امید کے درمیان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے "يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا" (الانبیاء) کہ وہ ہمیں پکارتے ہیں ہماری نعمتوں کی طرف رغبت کرتے ہوئے اور ہماری گرفت سے ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہی حکم دیا ہے کہ ہمارے انعام کی خواہش رکھتے ہوئے اور ہماری گرفت سے ڈرتے ہوئے ہمیں پکارو۔ یہی ایمان کا تقاضا ہے۔

فرمایا یاد رکھو! اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ اللہ تعالیٰ کی مہربانی نیکی کرنے والوں کے قریب ہوتی ہے۔ جو بھی ایمان لا کر اعمال صالحہ انجام دیگا۔ اعلیٰ درجے کی نیکی کریگا قوانین الٰہیہ کا خیال رکھے گا۔ سنت کے مطابق چلنے کی کوشش کرے گا، بدعات سے بچے گا شرکیہ افعال سے اجتناب کریگا، وہ محسن ہوگا۔ اور جو نیکی والا ہوگا وہ اللہ کی رحمت کے قریب ہوگا۔ ہر موقع پر خدا تعالیٰ کی مہربانی اس کے شامل حال ہوگی۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ :- اور وہ وہی ذات ہے جو چلاتا ہے ہواؤں کو خوشخبری دینے والی اس کی بارانِ رحمت سے پہلے ، یہاں تک کہ جب وہ اٹھاتی ہیں بوجھل بادلوں کو تو ہم چلاتے ہیں اُس کو مردہ شہر (خشک بستی) کی طرف ۔ پس ہم اتارتے ہیں اس سے پانی ۔ پھر ہم نکالتے ہیں اس (پانی) کے ساتھ ہر قسم کے پھل ۔ اسی طرح ہم زندہ کریں گے مُردوں کو تاکہ تم نصیحت پکڑو ﴿۵۷﴾ اور جو شہر پاکیزہ ہوتا ہے نکلتے ہیں اس کے پودے اپنے رب کے حکم سے اور جو خراب ہوتا ہے نہیں نکلتے اس کے پودے مگر ناقص ۔ اسی طریقے سے ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیتوں کو اُن لوگوں کے لیے جو شکر ادا کرتے ہیں ﴿۵۸﴾

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے اصحاب اعراف کا ذکر کرنے کے بعد نیک و بد لوگوں کا انجام بیان فرمایا۔ پھر تخلیق کائنات کا ذکر فرمایا "اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ" اس کے ساتھ عرش الٰہی کا ذکر ہوا۔ نشانات قدرت میں سے سورج، چاند اور ستاروں کی مقررہ مدار میں گردش کے ساتھ یہ بھی واضح فرمایا کہ خلق اور امر یعنی پیدا کرنا اور حکم دینا اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے حکم کے ساتھ اس کی دعا اور مناجات کا طریقہ بھی بتلایا کہ اس کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک گڑگڑانا اور دوسری پوشیدہ طریقے سے دعا کرنا۔ اس کے بعد زمین میں فساد کرنے سے منع فرمایا۔ ظاہر ہے کہ کفر، شرک اور معاصی فساد کی جڑ بنیاد ہیں۔ جن کی وجہ سے نوع انسانی میں فساد برپا ہوتا ہے، اور امن و سکون تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں بے چینی کی وجہ یہی برے افعال ہیں، اور ہر طرف "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" کا منظر پیش ہو رہا ہے۔ امن و امان ختم ہو چکا ہے۔ قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے، فرقہ بندی زوروں پر ہے۔ ہر شخص سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر اس کی مشکلات میں اضافہ ہی ہو رہا ہے، ہر طرف سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے، ہر شریف آدمی کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام حوائج و مشکلات میں اسے ہی پکارنے کا حکم دیا کیونکہ مشکل کشا اور حاجت روا صرف وہی ہے۔ خوف و امید کے ساتھ اس کے سامنے دست سوال دراز کرنا چاہیئے یعنی ہمیشہ اس کی گرفت سے خوفزدہ رہے اور اس کی رحمت سے کبھی مایوس بھی نہ ہو کیونکہ مایوس ہونا کافروں کا شعار ہے۔

ہوائیں اور بارش

تخلیق کائنات کے سلسلے میں عالم بالا کے دلائل ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین سے متعلق دلائل قدرت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے دو نشانیوں یعنی قیامت اور وحی الٰہی کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ "وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ" اللہ تعالیٰ وہی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے

بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ جو کہ بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہیں بارش
سے پہلے عام طور پر خوشگوار ہوائیں چلتی ہیں جو کہ بارش کی آمد کی خوشخبری دیتی ہیں مگر ان ہواؤں
کو کون چلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان ہواؤں کو چلانے والا بھی میں ہی ہوں۔ یہ
ہوائیں خود بخود نہیں چلتیں۔ سائنس دانوں اور محکمہ موسمیات والوں کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ
مون سون ہوائیں بارش لاتی ہیں مگر سوال تو یہ ہے کہ ان ہواؤں کو مختلف خطوں تک
کون پہنچاتا ہے۔ وہ ہواؤں کا رُخ تو بتا سکتے ہیں کہ کس طرف جا رہی ہیں مگر اس طرف
انہیں کون لیے جا رہا ہے اور انہیں فضا میں کون اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے، یہ باتیں
اُن کی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ اپنی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ
کے ساتھ ہواؤں کو اپنی مرضی کے رُخ پر چلاتا ہے۔ جب کوئی خطہ ارضی سخت پیاسا
ہوتا ہے تو اللہ کے حکم سے ہوائیں چلتی ہیں۔ اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے
کہ جب ہوا زور سے چلے یا آندھی آئے تو اسے بُرا بھلا مت کہو لا تسبوا الریح
یہ تو اللہ کے حکم سے چلتی ہیں۔ ان کا کیا قصور ہے۔ فرمایا جب تیز ہوائیں چلیں تو
یوں کہا کرو۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِهَا وَخَيْرِ مَا اُرْسِلَ
وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا اُرْسِلَ لَهٗ اے اللہ! میں تجھ سے سوال
کرتا ہوں ان ہواؤں سے بہتری کا اور جس مقصد کی بہتری کے لیے ان کو چلایا گیا
ہے اور میں پناہ مانگتا ہوں ان کے شر سے اور اُس شر سے جس کے لیے انہیں چلایا
گیا ہے۔ ہواؤں کا چلنا اور بارش کا آنا خیر و شر دونوں مقاصد کے لیے ہو سکتا ہے۔
بعض اوقات بارش تباہی کا باعث بن جاتی ہے جیسا کہ آجکل کی بارشوں سے فصلوں
کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ گندم کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا ہے حکومت تو طرح طرح کی
تسلیاں دے رہی ہے کہ کچھ نہیں ہوا مگر حقیقت یہی ہے کہ فصل پک جانے کے
بعد اگر بارش ہو جائے تو فصل ضائع ہو جاتی ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش
ہوتی ہے۔ اُس کا اعلان ہے۔ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء)
ہم خیر اور شر دونوں طریقوں سے آزماتے ہیں۔ لوگ تو بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں

خود کفالت کی سکیمیں بناتے ہیں اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ
ہماری فلاں حکمت عملی سے ہوا ہے، حالانکہ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اور
مہربانی شامل حال ہو تو انہیں اُس کا شکر ادا کرنا چاہیئے، نہ کہ غرور و تکبر کرنا۔ اللہ تعالےٰ
بسا اوقات اس درجے ناراض ہو جاتا ہے کہ اُس کے بندے اُس کے سامنے
عاجزی کا اظہار نہیں کرتے، اس کی رحمت کی اُمید نہیں رکھتے اور اس کی نعمتوں
کا شکر ادا نہیں کرتے۔ اس کی بجائے وہ سائنس اور ٹیکنالوجی اور اپنے کمال پہ بھروسہ
کرتے ہیں اور مادی وسائل کو ہی اوّل و آخر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
اللہ تعالیٰ کی ناراضگی آتی ہے اور پھر وہ نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

بارش باعث رحمت یا زحمت

فرمایا بسا اوقات ہوائیں باران رحمت کی نوید لاتی ہیں مگر بعض اوقات یہی
بارش عذاب کا پیغام بھی لاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بادل
اٹھتے تو حضور علیہ السلام پریشانی کے عالم میں کبھی اندر جاتے کبھی باہر آتے۔ ایک
موقع پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے عرض کیا حضور! بادلوں کو دیکھ کر
لوگ خوش ہوتے ہیں کیونکہ عام طور پر یہ رحمت کی نوید لاتے ہیں مگر آپ اکثر
پریشان ہو جاتے ہیں۔ فرمایا، مجھے ڈر ہے کہ یہ بادل ویسے نہ ہوں جو قوم عاد پہ اٹھے
تھے اُس قوم میں پہلے تین سال تک بالکل بارش نہ ہوئی، قحط پڑ گیا، گرمی کی وجہ
سے مخلوق خدا تڑپ اٹھی، پھر یکایک بادل اٹھے، لوگ خوش ہوئے اور بول اٹھے
"ھٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا" (احقاف) یہ بادل بارش برسائیں گے۔ تمام
لوگ بادلوں کے نیچے جمع ہو کر باران رحمت کا انتظار کرنے لگے مگر اُن بادلوں
میں قوم کی ہلاکت کا سامان تھا، اچانک اوپر سے آگ برسی اور قوم کو ہلاک کر دیا۔ غرضیکہ
بادلوں میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہو سکتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کرنی
چاہیئے اور شر سے پناہ مانگنی چاہیئے۔

بارش اور کھیتی

فرمایا اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو باران رحمت کی خوشخبری کے طور پہ بادل
کو چلاتا ہے۔ حَتّٰٓی اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا یہاں تک کہ جب یہ ہوائیں

بوجھل بادلوں کو اٹھاتی ہیں۔ بادل پانی کی نمی کی وجہ سے سخت بوجھل ہوتے ہیں جنہیں ہوائیں اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتی ہیں۔ پھر جہاں بارش برسانا مقصود ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ ہم انہیں مردہ شہر یعنی خشک زمین کی طرف چلاتے ہیں فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ پھر ہم اس کے ذریعے پانی نازل کرتے ہیں۔ جب کوئی خطہ ارضی خشک ہو جاتا ہے۔ انسان اور جانور، پانی کو ترسنے لگتے ہیں تو ہم ہواؤں کو اس طرف چلا دیتے ہیں جو بادلوں کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور مردہ زمین کے سیرابی کا انتظام کرتی ہیں۔ اور پھر جس قدر بارش برسانا ہماری حکمت کے مطابق ہوتا ہے، اتنا برسا دیتے ہیں۔ اگر رحمت مقصود ہو تو ضرورت کے مطابق "وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ" (المؤمنون) ہم آسمان سے پانی نازل کرتے ہیں۔ فَاَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ط پھر ہم اس پانی کے ذریعے ہر قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں۔ سورۃ النبار میں آتا ہے کہ ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں "لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا" اور پھر اس کے ذریعے غلہ، سبزیاں اور گھنے باغات پیدا کرتے ہیں۔

پانی ذریعہ حیات نباتات

"وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" ہم نے ہر چیز کو پانی کے ذریعے حیات بخشی (سورۃ انبیاء) ہر چیز کا انحصار پانی پر ہے حتیٰ کہ تمام جاندار کی زندگی پانی سے وابستہ ہے۔ انسان کی تخلیق بھی قطرۂ آب سے ہوئی۔ یہی حال جانوروں، درندوں، پرندوں اور حشرات الارض کا ہے۔ جس طرح جاندار کی تخلیق پانی سے ہوتی ہے اسی طرح جسم کے اعضا کو قائم رکھنے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی جسم میں خون کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس میں اسی٨٠ فیصدی پانی ہے۔ اسی طرح غذائی مواد میں بھی اسی٨٠ فیصدی پانی اور باقی بیس٢٠ فیصدی دیگر اجزاء ہیں۔ جو عناصر خارجی دنیا میں پائے جاتے ہیں، وہی عناصر انسانی جسم میں بھی موجود ہیں۔ چونکہ انسان کی ابتدائی تخلیق تمام سطح ارضی کی مٹی سے ہوئی تھی۔ اس لیے زمین میں پائی جانے والی تمام معدنیات انسانی

جسم میں بھی پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ فولاد، سونا، چاندی، ریت، نمک وغیرہ خاص مقدار میں موجود ہیں۔ یہ تمام چیزیں خون میں ملی ہوئی ہیں۔ جب خون انسانی جسم میں حرکت کرتے ہوئے ہر عضو سے گزرتا ہے تو متعلقہ عضو خون سے اپنی مطلوبہ غذا حاصل کرتا ہے اور باقی چیزوں کو دوسری ساختوں کے لیے چھوڑ دیتا ہے اسی طرح ہر عضو خون سے اپنا حصہ حاصل کر کے نشو و نما پاتا رہتا ہے۔ فضلات کے نکاس کے لیے دوسری نالیاں اور راستے مقرر ہیں جن کے ذریعے وہ باہر نکل جاتے ہیں۔ خون پھیپھڑے میں آ کر صاف ہوتا ہے۔ اس میں آکسیجن شامل ہو جاتی ہے اور پھر یہ قلب میں پہنچ کر گردش میں شامل ہو جاتا ہے تو بہر حال خون میں اسی فیصدی پانی ہے جس پر ہر جاندار کی زندگی کا انحصار ہے۔

پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جب حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ افضل صدقہ کونسا ہے تو آپ نے اس میں پانی کو بھی شامل فرمایا پانی کی قدر ان لوگوں کو ہوتی ہے جہاں اس کی قلت واقع ہوتی ہے ریاض وغیرہ (سعودی عرب) میں پانی کی قدر و قیمت کا یہ حال ہے کہ پانی بعض پانی کی بوتل پر حکومت کو دو ریال خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ وہاں پر پانی ۱۲۰ میٹر کی گہرائی سے نکالا جاتا ہے، پھر بڑی بڑی مشینوں کے ذریعے اسے صاف کر کے استعمال کے قابل بنایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پانی کی قدر نہیں کیونکہ یہ ۲۰، ۲۵ فٹ کی گہرائی سے بآسانی دستیاب ہے۔ دریاؤں اور نہروں میں پانی دستیاب ہے۔ اس لیے یہاں پہ بہت سا پانی ضائع بھی کر دیا جاتا ہے۔ شریعت نے اسراف فی الماء کو ناجائز قرار دیا ہے۔ فرمایا غسل اور وضو کے لیے ضرورت سے زیادہ پانی استعمال نہ کرو حتیٰ کہ اگر نہر پہ بیٹھ کر وضو کرو تو بھی اسراف سے پرہیز کرو۔ بہرحال فرمایا کہ ہم بادلوں کو خشک زمین کی طرف چلا کر اس سے پانی برساتے ہیں اور پھر اس پانی کے ذریعے زمین سے ہر قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں۔

مردوں کی دوبارہ زندگی

فرمایا جس طرح ہم زمین سے پھل نکالتے ہیں كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى

اسی طرح ہم مُردوں کو بھی نکالیں گے جس طرح بارش برسا کر زمین سے سبزیاں پیدا کیں اسی طرح قیامت کو خدا تعالیٰ ایک خاص قسم کی بارش برسا کر مُردوں کو قبروں سے نکالیں گے۔ سورۃ عبس میں آتا ہے کہ ہم نے انسان کو قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ پھر اس کا اندازہ مقرر کیا اور اس کے لیے راستہ آسان کر دیا "ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ" پھر اس کو موت دی پھر قبر میں پہنچایا "ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ" پھر جب وہ چاہے گا اُسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھا دے گا۔ سورۃ الانفطار میں ہے "وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ" جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی اور اللہ کے حکم سے مُردے زندہ ہو کر قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ تو بہر حال اللہ تعالیٰ نے بارش اور سبزہ اُگانے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی طرح ہم مُردوں کو بھی نکالیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہے کہ جو خداوند تعالیٰ زمین سے پھل پھول نکال سکتا ہے وہ ایک حکم کے ذریعے مُردوں کو بھی زندہ کر دے گا اور پھر حساب کتاب کی منزل آئے گی اور ہر شخص کو اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا جس کے مطابق جزا اور سزا کا فیصلہ ہو گا۔ فرمایا یہ مثالیں اور دلائل اس لیے بیان کیے جاتے ہیں "لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ" تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ اگر ان دلائل قدرت پر غور کرو گے تو تمہیں معاد پر بھی یقین آجائے گا اور پھر اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھی بجا لاؤ گے۔

وحی الٰہی کی ضرورت و اہمیت

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی ظاہری حیات کے لیے پانی نازل فرمایا ہے اسی طرح اس کی باطنی حیات کے لیے وحی الٰہی کو نازل فرمایا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت مجھے دے کر بھیجا ہے اس کی مثال بالکل بارش جیسی ہے۔ جب بارش سخت حصہ زمین یا ٹیلوں پر ہوتی ہے تو وہ بہ جاتی ہے، وہ خطۂ ارضی بارش سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ بعض مقامات پر گڑھے اور تالاب ہوتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو پانی ان نشیبی مقامات پر جمع ہو جاتا ہے جس سے انسان اور جانور فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ اس پانی سے لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، خود بھی استعمال کرتے

ہیں اور جانوروں کو بھی پلاتے ہیں۔ تیسری قسم کی زمین نرم، ہموار اور قابلِ کاشت ہوتی ہے۔ جب بارش ہوتی ہے۔ تو وہ پانی جذب کر لیتی ہے۔ پھر اس میں سبزیاں، پودے اور طرح طرح کا غلہ اناج پیدا ہوتا ہے۔ یہ بہترین قسم کی زمین ہوتی ہے جو بارش سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ پتھر کی طرح سخت دل ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی اور ہدایت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی بارش ہوتی ہے مگر اُن کے اُوپر سے گزر جاتی ہے بعض لوگ نشیبی زمین کی طرح ہدایت اور وحی الٰہی سے خود تو مستفید نہیں ہوتے۔ مگر دوسروں کے لیے بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ اور وہ اس سے دوسروں کو مستفید کرتے ہیں، اس میں تحریر و تقریر کے تمام ذرائع شامل ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو نرم اور ہموار زمین کی طرح ہیں۔ وہ وحی الٰہی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس طرح زمین اپنے اندر پانی جذب کر کے پھل اور غلہ پیدا کرتی ہے، اسی طرح نیک لوگ وحی الٰہی سے مستفید ہو کر اپنے لیے ذخیرہ آخرت قائم کر لیتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ہدایت ربانی کو زمین سے اس طرح تشبیہ دی

اچھی اور ناقص زمین کی مثال

یہی بات کو اللہ تعالیٰ نے اس انداز سے بھی بیان فرمایا ہے وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ پاکیزہ شہر یعنی اچھی بستی جس کی زمین زرخیز ہو۔ وہاں کے پودے اپنے رب کے حکم سے نکلتے ہیں۔ سبزیاں اُگتی ہیں پھل پیدا ہوتے ہیں اور اناج پیدا ہوتا ہے۔ زمین اچھی ہے تو اُس کی پیداوار بھی اچھی ہوگی۔ البتہ وَالَّذِي خَبُثَ جو ناقص اور نکمی زمین ہوتی ہے لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا اُس سے ناقص پودے ہی نکلتے ہیں۔ نکداً ناقص نکمی اور فضول چیز کو کہتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر گھاس پھونس، کانٹوں اور جھڑی بوٹیوں کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا کیونکہ زمین کی خاصیت اچھی نہیں ہوتی۔ آگے سورۃ رعد میں

آرہا ہے "وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ" زمین کے مختلف خطے ہیں۔ کوئی خشک ہیں کوئی ریتیلے، کوئی سخت، کوئی کلر والے اور کوئی بالکل نکمے فرمایا ایسے خطوں میں ناقص چیز ہی پیدا ہوگی، کسی کام کی چیز کی توقع نہیں ہو سکتی۔ انسان کی استعداد کا بھی یہی حال ہے جس کی استعداد اچھی ہوتی ہے وہ ہدایت سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے اور جس کی استعداد خراب ہو، وہ وحی الٰہی سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ باران ہدایت میں تو شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں وہ بالکل برحق ہے مگر انسان کی اپنی صلاحیت ہی خراب ہے۔ جو ہدایت کو قبول نہیں کر سکتی اور نیکی سے محروم رہتی ہے

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہر انسان فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے مگر انسان خود اپنی استعداد اور صلاحیت کو خراب کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے اُن پر ہدایت اثر انداز نہیں ہوتی فرمایا "كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ" اسی طرح ہم اپنے دلائل و شواہد کو مختلف انداز سے پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں "لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ" اُن لوگوں کے لیے جو شکر ادا کرتے ہیں۔ بادل اور بارش اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ لیکن اگر کبھی جب لوگ اُس مالک الملک کا شکریہ ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ اس رحمت کو زحمت میں بدل دیتا ہے بعض اوقات اللہ تعالیٰ بادل اور ہواؤں کو سزا کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ لہٰذا ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اُس کا فرمان ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں مزید دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو پھر میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

ترجمہ :- البتہ تحقیق ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو (رسول بنا کر) اُن کی قوم کی طرف پس کہا انہوں نے لے میری قوم ! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی ، نہیں ہے تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود . بیشک میں خوف کھاتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ﴿۵۹﴾ اُن کی قوم میں سے سرداروں نے کہا ، بے شک ہم دیکھتے ہیں تم کو کھلی گمراہی میں ﴿۶۰﴾ کہا انہوں نے لے میری قوم ! نہیں ہے مجھ میں کسی قسم کی گمراہی بلکہ میں تو بھیجا ہوا (رسول) ہوں رب العلمین کی طرف سے ﴿۶۱﴾ میں پہنچاتا ہوں تم تک اپنے رب کے پیغام اور میں تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں . اور جانتا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے ﴿۶۲﴾

انبیاء کے واقعات

گذشتہ سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی کا ذکر فرمایا تھا اور اس سورۃ کی ابتدا میں تخلیق آدم علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے معیشت اور ہدایت کے سامان پیدا کیے۔ آدم علیہ السلام کے ساتھ شیطان کی عداوت کا تذکرہ بھی ہوا اور اس کے بعد نیکی اور برائی کرنے والوں کے انجام کو بیان فرمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی کی حیثیت بھی بیان فرمائی۔ اب یہاں سے حضرت نوح علیہ السلام اور کئی دیگر انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کی زندگی کے اہم واقعات بیان فرمائے ہیں اور ان کے طریقہ تبلیغ پر روشنی ڈالی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی کس طرح راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ ان واقعات سے جہاں ایک طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے متبعین کو تسلی دلانا مقصود ہے وہاں دوسری طرف آپ کی امت کو جرأت دلانا بھی مطلوب ہے کہ وہ بلا خوف و خطر اللہ کے بیجے دین کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ اس مضمون کے آخری حصے میں تبلیغ کے عالمی پروگرام، اشاعت اسلام اور حضور علیہ السلام کے اتباع کے سلسلے میں خصوصی بیان ہے۔ بہر حال یہاں پر انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور ان کی سوانح حیات کے ضمن میں بہت سی باتیں آگئی ہیں۔ تبلیغ کے سلسلے میں بعض بنیادی اصولوں اور ترجیحات کا ذکر بھی آیا ہے۔ چونکہ دین کی بنیاد توحید ہے، لہذا ایمان کے بعد سب سے پہلے توحید کو ماننا ضروری ہے۔ اس کے بعد معاد اور پھر انبیاء کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اس کے بغیر کوئی انسان فلاح نہیں پاسکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی پر یقین لانا بھی ضروری ہے کیونکہ ہدایت کا اولین ذریعہ وحی ہے۔ غرضیکہ یہ تمام باتیں اللہ نے انبیاء کے واقعات میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمادی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر بھی قرآن پاک کی بہت سی سورتوں میں آتا ہے۔ قرآن پاک میں ایک مستقل سورۃ حضرت نوح علیہ السلام

کے نام پر ہے۔ اس سورۃ میں صرف آپ کا، آپ کی قوم کا اور طریقہ تبلیغ کا
ذکر ہے۔ بعض دیگر سورتوں میں بھی اللہ نے نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے۔
حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلی اہم شخصیت حضرت نوح علیہ السلام کی ہے
چنانچہ صحیحین کی حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز لوگ مختلف انبیاء
کے پاس جائیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس سفارش کریں تاکہ حساب کتاب
شروع ہو کیونکہ لوگ سخت تکلیف میں ہوں گے۔ اس سلسلے میں لوگ حضرت
نوح علیہ السلام کے پاس بھی جائیں گے اور عرض کریں گے اِنَّكَ اَوَّلُ الرُّسُلِ
اِلَى اَهْلِ الْاَرْضِ اے نوح (علیہ السلام)! آپ اہل زمین کی طرف اللہ کے
سب سے پہلے رسول ہیں۔ آدم علیہ السلام اور آپ کے درمیان انبیاء تو اور بھی ہیں۔
جیسے شیث علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام وغیرہ مگر ان کے ادوار میں حضرت نوح علیہ السلام
جیسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ نوح علیہ السلام اللہ کے پہلے رسول ہیں جن کی قوم کو ہلاک کیا گیا،
غرضیکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام اہم ترین شخصیت ہیں،
جن کا ذکر یہاں بھی آرہا ہے۔

تفسیری روایات کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کا سلسلہ نسب اس طرح ہے
نوح بن لمک بن متوشلح بن اخنوخ بن یرد بن مہلیل بن قینان بن انوش بن شیث بن
آدم علیہ السلام۔ اخنوخ کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ وہی ہیں جن کو ادریس
کہا جاتا ہے یا کوئی اور کیونکہ ادریس علیہ السلام کا دور حضرت آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام
کے درمیان آتا ہے۔ دونوں طرح کی روایات ملتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ادریس علیہ السلام
حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے تھے اور سب سے پہلے قلم سے لکھنے
کا سلسلہ انہوں نے شروع کیا۔ تفسیر مدارک میں یہ بھی آتا ہے کہ کپڑا سینے کی سوئی اور
مشین وغیرہ بھی آپ ہی نے ایجاد کی۔ آپ پر کچھ صحیفے بھی نازل ہوئے جن میں
دنیا کی تعمیر و ترقی کے لیے اسباب معیشت کا ذکر تھا۔ اسی طرح شیث علیہ السلام کے
متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا وہ اللہ کے نبی تھے یا نہیں مستدرک حاکم

میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن، دس صدیاں یا دس نسلیں گزری ہیں اور آپ دسویں نسل میں سے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے نام کے متعلق بھی مختلف روایات ملتی ہیں بعض فرماتے ہیں کہ آپ کا نام سکن تھا یعنی آدم علیہ السلام کے بعد لوگوں کو جس شخصیت کے پاس سکون میسر آیا تھا، وہ نوح علیہ السلام تھے۔ بعض نے آپ کا نام شاکر یا شکر بھی بتایا ہے کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ شکر ادا کرنے والے تھے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں آپ کے متعلق آتا ہے اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا آپ اللہ کے بڑے شکر گزار بندے تھے انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں مگر ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے مستدرک کے حوالے سے اپنی تفسیر اتقان میں آپ کا نام عبدالغفار اور لقب نوح لکھا ہے نوحہ رونے کو کہتے ہیں۔ چونکہ آپ قوم کی حالت پر بہت زیادہ روتے تھے اس لیے آپ کا لقب نوح مشہور ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ آپ خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کے خوف سے بہت رویا کرتے تھے، اس لیے نوح مشہور ہوئے بعض کہتے ہیں کہ آپ نے ایک بدصورت کتے کو دیکھا جو بیمار بھی تھا تو آپ نے فرمایا اے بدشکل کتے اللہ تعالیٰ نے کتے کو زبان عطا کی اور اس نے عرض کیا، اے نوح (علیہ السلام) کیا آپ مجھ پر عیب جوئی کرتے ہیں یا میرے پیدا کرنے والے پر۔ کتے کی اس بات سے آپ اس قدر متاثر ہوئے کہ بیہوش ہو گئے اور اس خطا پر مدت تک روتے رہے کہ میں نے اللہ کی تخلیق میں عیب جوئی کی ہے، کہیں اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ بعض نے آپ کے لقب نوح کی یہی وجہ بیان کی ہے۔

سوانح حیات

نزولِ وحی کے وقت حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کے متعلق بہت سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی عمر اس وقت ۴۰ سال تھی

بعض روایات میں ۴۰۰ سال کا ذکر بھی آتا ہے مگر راجح بات یہ ہے کہ جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو اللہ نے آپ پر وحی نازل فرمائی ۔ اور آپ کو نبوت عطا ہوئی ۔ قرآن پاک میں موجود ہے ۔ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (عنکبوت) آپ اپنی قوم میں پچاس کم ہزار یعنی ۹۵۰ سال ٹھہرے اور تبلیغ کرتے رہے ۔ پھر اس کے بعد طوفان آیا انہوں نے اللہ تعالےٰ کے سامنے قوم کے لیے بددعا کی تھی لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (سورۃ نوح) اے اللہ زمین پر کسی کافر کو زندہ باقی نہ چھوڑ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہے ۔ آپ نے قوم کے ہاتھوں بڑی تکالیف برداشت کی تھیں اور وحی الٰہی نے سورۃ ہود میں اشارہ کر دیا تھا کہ آپ تیری قوم میں کوئی شخص ایمان لانے والا نہیں ہے لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ جو ایمان لا چکے ہیں ۔ بس اتنے ہی رہیں گے ۔ آپ مایوس نہ ہوں اور اپنا کام کرتے جائیں ۔ پھر بددعا کی پاداش میں جب طوفان آیا تو قرآن اور تورات کے مطابق سارے کے سارے کافر ہلاک ہو گئے حتیٰ کہ نوح علیہ السلام کی کافر بیوی اور نافرمان بیٹا کنعان بھی طوفان میں بہ گئے ۔ صرف وہی لوگ بچے جو کشتی میں سوار ہو گئے

اس بارے میں اختلاف ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کتنا عرصہ زمین پر موجود رہے ۔ تاہم راجح بات یہ ہے کہ طوفان کے بعد آپ ساٹھ سال تک زندہ رہے ۔ ساتویں صدی ہجری کے شارح حدیث امام نوویؒ نے اپنی کتاب تہذیب میں لکھا ہے کہ نوح علیہ السلام اطول الانبیاء عمرًا تمام انبیاء میں طویل العمر تھے ۔ بعض روایات میں آپ کی عمر تیرہ اور چودہ سو سال بھی بتائی گئی ہے مگر سب سے کم عمر ایک ہزار پچاس ۱۰۵۰ سال منقول ہے ۔ اس کے برخلاف آدم علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال تھی ۔ اس میں سے بھی چالیس سال کم ہیں جو انہوں نے اپنے بیٹے داؤد علیہ السلام کو دے دیے تھے اور اس کا ذکر مسند احمد اور دیگر کتب میں موجود ہے ۔

درسِ توحید

بہر حال ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کا ذکر اس طرح کیا ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ البتہ تحقیق ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو اُن کی قوم کی طرف رسول بنا کر فَقَالَ اور انہوں نے اپنی قوم سے یوں خطاب کیا یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ تمام انبیاء کی ابتدائی تعلیم یہی رہی ہے۔ سب نے اپنی اپنی قوم کو درسِ توحید دیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے اتباع میں اللہ کے جتنے نیک بندے ہوئے ہیں، اولیائے کرام، بزرگانِ دین، مرشدانِ برحق سارے کے سارے پہلا سبق توحید کا دیتے رہے ہیں۔ سلسلۂ بیعت کے تمام بزرگ بھی لوگوں کی تربیت اسی کلمۂ توحید سے کرتے ہیں چنانچہ نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو سب سے پہلا درس یہی دیا کہ اللہ کی عبادت کرو مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی معبودِ برحق ہے۔ اور اگر تم نے میری بات کو تسلیم نہ کیا اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور اس کے بجائے دوسروں کی پرستش کرنے لگے تو اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ بیشک میں ڈرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے۔ بنیادی طور پر بڑا دن قیامت کا دن ہے یہ طویل بھی ہوگا۔ درمیانے اور مشکلات کے اعتبار سے بھی بڑا دن ہوگا۔ نوح علیہ السلام نے کہا کہ ـــ ـــ ـــ مجھے ڈر ہے کہ تم اس بڑے دن کے عذاب میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔ اس کو یوم الآخر یعنی دنیا کا آخری دن (LAST DAY) کہا گیا ہے اس کے بعد یہ نظام ختم ہو جائے گا اور دوسرا نظام شروع ہوگا، اسے عظیم دن کہا گیا ہے

امراء کی مخالفت

جب نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ آپ کی قوم کے سردار کہنے لگے اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ہم تو تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں۔ تو تو بہکی بہکی باتیں کرتا ہے اور اپنے آباؤ اجداد کے دین کو مٹانا چاہتا ہے۔ تاریخ انبیاء و شاہد ہے کہ حق کی مخالفت میں ہمیشہ بڑے لوگ ہی پیش پیش رہے ہیں۔ ہر نبی کے اولین پیروکار غریب لوگ ہوتے ہیں اور

صاحب حیثیت لوگ ہمیشہ مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اگر وہ نبی کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو اُن کی اپنی چودھراہٹ پر ضرب پڑتی ہے، اُن کی سیادت ختم ہوتی ہے۔ ابوسفیانؓ بیس سال تک اسلام کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ پھر تھک ہار کر دین میں آیا۔ آج بھی حق کی مخالفت کرنے والے امیر امراء ہی ہیں۔ غریب اور متوسط طبقے کے لوگ تو پھر بھی مان لیتے ہیں مگر مالدار خصوصاً نوکر شاہی کے کارندے حق سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ بڑے لوگوں کی موجودگی میں دین کو تقویت حاصل ہو جائے گی وہ بیوقوف ہے جب تک یہ لوگ موجود ہیں، دین کو غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا مارشل لاء کے تحت شرعی عدالتیں قائم ہیں مگر آج تک کوئی فیصلہ شریعت کے مطابق نہیں ہوا۔ اگر کوئی ہوا ہے تو اُسے انگریزی قانون کی اعلیٰ عدالت نے منسوخ کر دیا ہے۔ وہ کیسی شرعی عدالت ہے جو انگریزی عدالت کی سرپرستی میں کام کرتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ خود صاحب اقتدار لوگ دین کی بات کو نہ خود قبول کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے ہیں یہاں بھی یہی بات ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے آپ کی مخالفت کرتے ہوئے آپ کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر دیا کہ آپ معاذ اللہ کھلی گمراہی میں ہیں۔ اور ہمارے آباؤ اجداد کے طریقے کو بدلنا چاہتے ہیں۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی ان حالات سے گزرنا پڑا۔ مکے کے امراء نے کہا اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ کہ آپ معاذ اللہ پاگل ہیں حالانکہ نبی تو اعقل الناس یعنی تمام لوگوں سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ مکے والے بھی آپ کو دیوانہ کہتے۔ اگر کوئی ملنے کے لیے آتا تو اُسے ٹالنے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ تم اُس پاگل کو ملنا چاہتے ہو، چھوڑو اُسے، وہ تو بہکی بہکی باتیں کرتا ہے تم اُس کی بات سن کر کیا کرو گے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا جواب

جب نوح علیہ السلام کی قوم نے آپ پر گمراہی کا الزام لگایا تو آپ نے فرمایا

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَۃٌ اے میری قوم ! میں تو گمراہی میں ملوث نہیں ہوں
قوم نے آپ کے متعلق ضلال کا لفظ استعمال کیا تھا یعنی آپ گمراہ ہیں مگر آپ نے
ضلالۃ فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ اور چھوٹی سے چھوٹی
گمراہی میں بھی مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں تو حق پر ہوں ۔ وَلٰکِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِیْنَ میں تو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ یعنی رسول ہوں میں تو وہی بات کرتا ہوں
جس کے ساتھ اُس نے مجھے بھیجا ہے ۔ بھلا میں کوئی غلط یا گمراہی کی بات
کیسے کرسکتا ہوں اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ میں اپنے رب کے پیغامات
تم تک پہنچاتا ہوں ۔ ہر نبی کا یہی کام ہے ۔ جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے
آتا ہے وہ اپنی قوم تک پہنچاتا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی اللہ تعالیٰ
نے یہی حکم دیا "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ" جو آپ کے رب کی طرف
سے نازل ہوا ہے اُسے آگے امت تک پہنچا دیں اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو
آپ نے گویا رسالت کا حق ادا نہ کیا حضرت نوح علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ
میں تو اپنے رب کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں وَاَنْصَحُ لَکُمْ اور تمہاری خیر خواہی
کی بات کرتا ہوں تاکہ تم کفر اور شرک سے بچ کر جہنم سے بچ جاؤ ۔ مجھے تو
تمہاری خیر خواہی منظور ہے ، میں تمہیں حق کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور
تم مجھے گمراہ بتا رہے ہو ، خدارا ذرا سوچو تو سہی کہ تم کس طرف جا رہے ہو ؟

دین مجسم نصیحت ہے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے الدین النصیحۃ (صحیحین) دین
تو سراسر خیر خواہی کا نام ہے ۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور ! کس کے لیے خیر خواہی
ہونی چاہیئے ، فرمایا للّٰہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین
وعامتھم یعنی نصیحت کی بات اللہ کے لیے اُس کتاب کے لیے
اس کے رسول کے لیے مسلمان حکام کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے
ہونی چاہیئے ۔ اللہ تعالیٰ کے حق میں نصیحت یہ ہے کہ اُس پر ایمان لایا
جائے اور اُس کے ساتھ کفر اور شرک نہ کیا جائے ۔ رسول کے حق میں نصیحت

کا مطلب یہ ہے کہ اس پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اس کا اتباع کیا جائے
کتاب کی خیر خواہی یہ ہے کہ کتاب کی تصدیق کی جائے، اس پر ایمان لایا
جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ مسلمان حکمرانوں کے سامنے سچی بات کہنا، ان
کو صحیح مشورہ دینا ان کی خیر خواہی ہے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی
کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے لیے بھی وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے
پسند کرتا ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے اور حتی الوسع عام
مسلمانوں کے لیے ایمان، نیکی، تقویٰ اور طہارت کو پسند کرے۔ جو آرام و راحت
خود اپنے لیے چاہتا ہے، وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرے اور حتی المقدور
ان کی اعانت کرے کسی کو برائی سے روک دینا بھی اس کے لیے بہت
بڑی خیر خواہی ہے غرضیکہ حضور علیہ السلام نے دین اور نصیحت کی اچھی طرح
وضاحت فرما دی ہے۔

بہر حال نوح علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ مجھے گمراہ نہ سمجھو میں تمہارا خیر خواہ
ہوں اور خیر خواہی کا حق ادا کر رہا ہوں میں بھی وہی بات کہتا ہوں جو
اللہ کا ہر نبی کہتا آیا ہے "وَاَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ" میں تمہارے
لیے امانتدار اور خیر خواہ ہوں۔ نیز فرمایا وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ
اور میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ میرے پاس
قطعی اور یقینی علم ہے، میرے پاس وحی الٰہی آتی ہے جس کے مطابق میں خود
بھی عمل کرتا ہوں اور خدا کا پیغام تم تک بھی پہنچاتا ہوں، میں ایمان اور کفر دونوں
کے انجام سے واقف ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے علم دیا ہے مگر تم مجھ پر گمراہی
کا الزام لگاتے ہو۔

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ﴿٦٤﴾ ع

ع ٨ / ١٥

ترجمہ:- کیا تم نے تعجب کیا ہے اس بات پر کہ آئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک مرد پر تم میں سے تاکہ وہ تم کو ڈرا دے اور تاکہ تم بچ جاؤ ۔ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے (٦٣) پس جھٹلایا ان لوگوں نے اُن (نوح علیہ السلام) کو ۔ پھر ہم نے بچا لیا اُس کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ تھے کشتی میں اور ہم نے غرق کر دیا اُن لوگوں کو جنہوں نے جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو ، بیشک وہ لوگ اندھے تھے (٦٤)

ربط آیات

نبوت اور رسالت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا ہے ۔ آپ کی تبلیغ ، آپ کے ساتھ قوم کا سلوک ، آپ کی بددعا اور پھر قوم کی ہلاکت کو یہاں پر اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ سورۃ نوح صرف آپ ہی کے حالات پر مشتمل ہے ۔ سورۃ ہود میں پورے دو رکوع میں آپ کے حالات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ بعض دوسری سورتوں میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کے جستہ جستہ واقعات موجود ہیں ۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد انبیاء کے سلسلے کی اہم ترین شخصیت حضرت نوح علیہ السلام ہیں ۔ آپ نے سب سے پہلے اپنی قوم کو توحید کا درس دیا اور

کفر اور شرک سے منع کیا مگر آپ کی قوم کے سرداروں نے آپ کی دعوت کو جھٹلا دیا اور کہنے لگے کہ تم خود گمراہ ہو اور ہمیں اپنے آباؤ اجداد کے دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے نہایت وثوق کے ساتھ فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! مجھ میں گمراہی والی کوئی بات نہیں، میں تو رب تعالیٰ کی طرف سے رسول ہوں، اُس کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور مجھے تمہاری خیر خواہی مقصود ہے۔ نیز میرے پاس یقینی علم ہے جس کی وجہ سے میں ایسی چیزوں کو جانتا ہوں، جن کو تم نہیں جانتے۔ میں اُن نتائج سے بھی واقف ہوں جو کہ بربادی پر مرتب ہونے والے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ ایمان کا نتیجہ کیا ہوگا اور کفر و شرک کس انجام کو پہنچے گا۔

بشریتِ رسول

آج کے درس کی پہلی آیت بھی حضرت نوح علیہ السلام کے اپنی قوم سے خطاب ہی کا حصہ ہے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آپ نے قوم سے فرمایا اَوَعَجِبْتُمْ کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو اَنْ جَآءَکُمْ ذِکْرٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نصیحت آئی ہے عَلٰی رَجُلٍ مِّنْکُمْ تمہیں میں سے ایک مرد پر۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں کون سی انوکھی بات ہے کہ اللہ کی وحی اس کے بندوں میں سے ایک مرد پر آجائے، یہ تو معروف بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا تو اُن کی بعض خصوصیات اُن کی اولاد میں بھی رکھیں چنانچہ آپ کی اولاد میں سے اللہ تعالیٰ نے ایسے صاحب استعداد و کمال بندے پیدا کیے جنہیں نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا۔ فرمایا تمہیں میں سے ایک مرد کو یہ شرف بخشا کہ اُس کے پاس نصیحت آئی۔ گذشتہ درس میں بھی گزر چکا ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ ہم نے نوح علیہ السلام کو اُنہی کی قوم کے پاس بھیجا ہے۔ لہٰذا کسی نبی یا رسول کا اس کی اپنی قوم میں سے ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں بلکہ یہ تو عین فطرت کی بات ہے یہ تو

کافروں اور مشرکوں کا شیوہ ہے کہ وہ انسان کی رسالت سے انکار کرتے رہے ہیں۔ اُن کا استدلال یہ رہا ہے اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا (التغابن) کیا آدمی اور بشر ہماری راہنمائی کریں گے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان رسول بن کر آجائے یہ تو ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، ان کے بیوی بچے ہیں، تمام لوازمات انسانی ان میں پائے جاتے ہیں، ہم انہیں کیسے رسول تسلیم کریں۔ قرآنِ پاک نے یہ باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔ سورۃ قمر میں قومِ لوط کا یہ اعتراض بھی ہے اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی اختیار کر لیں؟ اگر ہم ایسا کریں گے تو غلط کار اور گمراہ ہو جائیں گے۔ ہم بے عقل ہو جائیں گے۔ غرضیکہ کفار نے ہمیشہ رسالت کو بشریت کے منافی سمجھا۔

رسول بطور نمونہ

کفار کا نظریہ یہ تھا کہ اگر کوئی رسول ہماری طرف آتا ہے تو وہ انسان نہیں ہونا چاہیئے بلکہ فرشتہ ہو جو نہ کچھ کھائے، نہ پیئے، نہ گلیوں بازاروں میں پھرے نہ اُس کے بیوی بچے ہوں۔ یہی کفر کی بات تھی۔ سورۃ انعام کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔ کہ کافر لوگ کہتے تھے کہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ اگر ہم کسی فرشتے کو نازل کر دیتے تو ان کا کام ہو چکا ہوتا کیونکہ یہ لوگ بحیثیت انسان فرشتے کو برداشت ہی نہ کر سکتے اور فوراً ہلاک ہو جاتے اور اگر ہم فرشتے کو انسانی صورت میں بھیجتے تو پھر اسی شک و شبہ میں مبتلا رہتے اور ایمان نہ لاتے۔ اسی مضمون کو سورۃ بنی اسرائیل میں واضح طور پر یوں بیان کیا گیا ہے "قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝" یعنی اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ان پر فرشتے کو ہی رسول بنا کر نازل کرتے۔ مقصد یہ کہ رسول اُسی جنس میں ہونا چاہیئے جس جنس کو ہدایت دینا مطلوب ہے۔ چونکہ اس زمین پر انسان

بستے ہیں لہذا اُن کی ہدایت بھی انسان ہی کے ذریعے ممکن ہے جو اپنی قوم کے لیے ایک نمونہ بن سکے۔ سورۃ احزاب میں واضح طور پر موجود ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین اسوہ ہے یہی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق سورۃ ممتحنہ میں یوں ہے "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ" حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں میں تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے۔ انسان ہوتے ہوئے انہوں نے کیسے پاکیزہ کام انجام دیے اور کس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر کمربستہ رہے۔ فرشتے کسی انسان کے لیے نمونہ نہیں بن سکتے کیونکہ وہ انسانی لوازمات اور ضروریات سے پاک ہیں حتیٰ کہ اُن میں جنسی تفریق بھی نہیں ہے۔ اسی طرح جن بھی انسانوں کے لیے نمونہ نہیں بن سکتے۔ انسانوں میں مٹی کا غلبہ ہوتا ہے جبکہ جنوں میں ناریت غالب ہوتی ہے۔ ان دو اجناس کے قویٰ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ لہذا جن بھی نمونہ نہیں بن سکتے غرضیکہ انسانوں کے لیے انسان ہی نمونہ بن سکتے ہیں، لہذا اللہ تعالیٰ انسانوں کو ہی نبی اور رسول بنا کر بھیجتا رہا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمہیں میں سے ایک مرد رسول بن کر آیا ہے۔

مرد و زن میں تفاوت

اس آیت کریمہ میں رَجُلٍ کا لفظ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی توجہ طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت فرما دی ہے کہ نبی اور رسول ہمیشہ مرد ہوتا ہے۔ کوئی عورت اس منصب پر فائز نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ خدائی قانون میں مرد اور عورت یکساں مکلف ہیں مگر اپنی اپنی ساخت کے اعتبار سے بعض کام مرد نہیں کر سکتے اور بعض کام عورتیں نہیں کر سکتیں۔ اللہ نے مرد کو عورت پر حاکم بنایا ہے، اُن کے قویٰ اور حواس مردوں سے کم تر ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نظام حکومت جیسا مشکل کام مردوں کے

سپرد کیا ہے۔ شرائع الٰہیہ میں عنان حکومت سنبھالنے کے لیے ایسے مرد کی خدمات درکار ہیں جو عاقل، بالغ، صاحب عقل و اجتہاد، حکیم اور کامل الاخلاق ہو۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کے لیے بہادر اور شجاع ہونا بھی ضروری ہے اور وہ معیوب بھی نہیں ہونا چاہیئے۔

علم عقائد والے کہتے ہیں کہ لفظ نبی دو مادوں سے ہے۔ اس کا ایک مادہ نبوۃ ہے جس کا معنی بلندی ہوتا ہے۔ اللہ کا نبی اپنے اعمال اور اخلاق کے لحاظ سے عام اہل ایمان کی نسبت بہت بلند ہوتا ہے بلکہ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ہر انسان میں پانچ حواس ہوتے ہیں جب کہ نبی میں چھٹا حاسہ بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ وحی الٰہی کو قبول کرتا ہے اور ملائکہ سے ارتباط قائم کرتا ہے لہٰذا نبی ہر لحاظ سے امت کی نسبت بلند تر ہوتا ہے اگر نبی کا مادہ نبأ لیا جائے تو معنی خبر دینے والا بنتا ہے گویا اللہ کا نبی اللہ تعالیٰ سے عالم بالا کی خبر پا کر امت تک پہنچاتا ہے۔ دین اور شریعت کے تمام احکام اللہ کی طرف سے نبی پر نازل ہوتے ہیں لہٰذا وہ ان سب امور کی خبر دینے والا ہوتا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ اہل بدعت نبی کا غلط معنی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبی کا معنی غیب دان ہے حالانکہ غیب دان صرف خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔ علم عقائد والے نبی کی تعریف یوں کرتے ہیں ھو انسان بعثہ اللہ لتبلیغ ما اوحیٰ اللہ الیہ (عقائد جلالی) یعنی نبی انسان ہوتا ہے جو شریعت کے احکام لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہوتا ہے۔ گویا نبی کے انسان ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ سورۃ انبیاء میں یہ تصریح موجود ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ "اے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے پہلے بھی ہم نے مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا، ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے یعنی آج تک نبوت کسی عورت کے حصے میں نہیں آئی۔ اسی لیے حضور علیہ السلام

کا فرمان ہے کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا... یعنی مردوں میں سے تو بہت سے کامل لوگ گزرے ہیں مگر عورتوں میں کوئی کامل درجے کی نہیں ہوئی سوائے حضرت مریم، آسیہ (فرعون کی بیوی) خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد۔ آپ نے ان چند عورتوں کا ذکر فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کی فضیلت کا بھی ذکر ہوا۔ اللہ تعالےٰ نے ان عورتوں کو صدیقیت کے درجے پر فائز فرمایا جو کہ انبیاء کے بعد درجہ ہے، نبوت اس سے بلند تر مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا اُمُّهٗ صِدِّيقَةٌ (المائدہ) یعنی حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی والدہ صدیقہ تھیں نہ کہ نبی کیونکہ نبوت ان کے حسب حال نہیں تھی۔

مردوں کا دائرہ کار

امام عبدالوہاب شعرانیؒ لکھتے ہیں کہ تمام اہل حق اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے احکام شرع کی تبلیغ کا کام مردوں پر لازمی قرار دیا ہے مگر عورتوں پر۔ عورتوں کو تبلیغ کا کام سونپنا عیسائی مشنریوں کی تقلید ہے اب تک یکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی عورتوں کو تبلیغ پر بھیجنا شروع کر دیا ہے مگر یہ غلط ہے عورتیں گھروں اور مدرسوں میں تعلیم و تربیت کا کام تو انجام دے سکتی ہیں مگر مردوں کی طرح جماعت کی شکل میں تبلیغ کے لیے نکلنا غیر فطری امر ہے اس کے نتائج اچھے نہیں نکل سکتے بلکہ قباحتیں پیدا ہونیکا خطرہ ہے۔ انگریزوں نے تو اسی آڑ میں بے حیائی کے بڑے بڑے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ وزیر اعظم ہیتھ غیر شادی شدہ تھا۔ اسے کسی تقریب کی دعوت دینے کے لیے جو نوجوان لڑکیاں اس کے پاس گئیں، وہ بالکل برہنہ تھیں اور پولیس ان کی حفاظت کر رہی تھی۔ کہیں پرانے زمانے کی تاریخ میں یہ ملتا ہے کہ لیڈی گوڈیوا نے بالکل برہنگی کی حالت میں گھوڑے پر سوار ہو کر ٹیکس کے خلاف جلوس کی قیادت کی تھی۔ آج مسلمانوں میں فرنگی چیزیں قبول کر رہی ہیں جو کہ نہایت ہی شرم کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو ہر معاملہ میں پیچھے

لے بخاری صفحہ ۵۳۲ ج ۱ (فیاض)

رکھا ہے حتیٰ کہ نماز میں بھی عورتوں کی صف مردوں کے پیچھے ہوتی ہے۔ اگر عورتیں اگلی صف میں کھڑی ہو جائیں تو نماز فاسد ہو جائیگی۔ آج دُنیا میں ہر جگہ عورتوں کو آگے لایا جا رہا ہے۔ اسلامی ممالک میں بھی انہیں پارلیمنٹ کا ممبر، وزیر اور مشیر بنایا جاتا ہے حتیٰ کہ سربراہ مملکت بنانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا بخاری شریف میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واضح اشارہ موجود ہے لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیئے۔ بہرحال یہ عقلی دلیل کی تشریح میں عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی یا رسول بنا کر نہیں بھیجا بلکہ یہ فریضہ ہمیشہ مردوں کو سونپا جاتا رہا ہے۔

بشر کی فضیلت

نبی ہمیشہ انسان، بشر اور مرد ہوتا ہے۔ البتہ عام انسانوں کی نسبت انبیاء معصوم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی براہ راست نگرانی میں ہوتے ہیں اور بلند ترین مرتبہ پہ فائز ہوتے ہیں۔ نبی کو بشر کہنا معاذ اللہ کوئی توہین کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو عزت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ" (ص) میں مٹی سے انسان جیسی عظیم ہستی کو پیدا کرنے والا ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت، اس کا فیضان اور رحمت ہے کہ مٹی جیسی حقیر چیز سے انسان جیسی بڑی ہستی پیدا فرمائی اور اس طرح انسان کو اللہ کے مقرب فرشتوں پہ بھی برتری حاصل ہوگئی اللہ تعالیٰ نے خود حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے بھی اس معاملے کی تشریح کر دی "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" (سورۃ کہف) میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں۔ میں بھی جسم رکھتا ہوں۔ مجھے بیماری بھی آتی ہے میرے بال بچے اور بیویاں ہیں۔ باقی انسانوں کی طرح مجھے بھی زندگی کے لوازمات کی ضرورت پیش آتی ہے۔ البتہ "یُوْحٰٓی اِلَیَّ" مجھ پہ وحی آتی ہے جو کہ بلند ترین اعزاز ہے مگر اہل بدعت نے سمجھا کہ حضور علیہ السلام اور باقی انبیاء کو بشر

تسلیم کرنے سے اُن کی توہین ہو جائیگی (معاذ اللہ) چنانچہ انہوں نے بھی عیسائیوں والا عقیدہ اپنا لیا ہے۔ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو ولد اللہ اور ابن اللہ کہا جس کی بنا پر اللہ نے فرمایا "جَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا" (زخرف) انہوں نے خدا کے بندوں میں سے اُس کا جزو بنا لیا اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو گئے۔ آج اہل بدعت نے بھی نُورٌ مِّنْ نُورِ اللّٰهِ کا عقیدہ وضع کر لیا ہے اور اس طرح حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا جزو بنا دیا ہے۔

معصوم صرف نبی ہوتا ہے

اہل بدعت نے نبی کو اللہ کے برابر کر دیا تو رافضیوں نے اماموں کو بھی نبی کے برابر ٹھہرا لیا۔ کہتے ہیں کہ انبیاء کی طرح امام بھی معصوم ہوتے ہیں انبیاء کی عصمت تو قرآن پاک سے ثابت ہے۔ شرح عقائد میں لکھا ہے کہ خدا کی جانب سے انبیاء کو گنہگاری ملی حاصل ہوئی ہے اللہ تعالیٰ اُن سے گناہ نہیں سرزد ہونے دیتا۔ جہاں تک شرک کا تعلق ہے وہ تو آنکھ جھپکنے کے برابر بھی نبی کی ذات سے محال ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پاک بندوں کی خود حفاظت کرتا ہے۔ برخلاف اس کے ائمہ کی عصمت خود ساختہ ہے امام شاہ ولی اللہ اپنی کتاب تفہیمات الٰہیہ میں لکھتے ہیں کہ اماموں کی معصومیت کو تسلیم کرنا ختم نبوۃ کے انکار کے مترادف ہے۔ اگر نبی کے علاوہ امتی بھی معصوم بن جائیں تو پھر نبی کی نبوت کہاں گئی؟

فرمایا کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک مرد پر نصیحت آئی ہے اس آیت میں عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ کے الفاظ ہیں جب کہ قرآن پاک کے کئی دوسرے مقامات پر آتا ہے "كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ" (البقرہ) جس طرح ہم نے تمہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں عرض کیا "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ" (البقرہ) اے پروردگار! انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما سورۃ الجمعہ

میں آتا ہے "ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ" اللہ تعالٰی وہی ذات ہے جس نے امیوں میں سے رسول بنا کر بھیجا۔ اللہ تعالٰی نے اپنا آخری رسول آپ کی قوم قریش میں سے مبعوث فرمایا جس کو سب پہچانتے تھے آپ کسی کے باپ تھے کسی کے بیٹے، کسی کے چچا تھے اور کسی کے بھتیجے آپ نے اپنے کردار کو اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا "فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ" (سورۃ یونس) میں نے عمر کا بڑا حصہ تمہارے درمیان گزارا ہے، چالیس سال تک تم میں رہا ہوں کبھی کسی نے میری طرف انگلی اٹھائی ہے کہ اس میں فلاں عیب پایا جاتا ہے مگر جب میں نے اللہ کا پیغام سنایا ہے تو میرے دشمن بن گئے ہو اور مجھے جھوٹا قرار دینے لگے ہو "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" کیا تم اتنی بھی عقل نہیں رکھتے۔ اور ایک جانے پہچانے شخص پر الزام تراشی کرتے ہو۔ تم تو آج تک مجھے صادق اور امین کہتے رہے ہو مگر آج میری بات کو جھٹلا رہے ہو۔

بعثت انبیا کا مقصد

فرمایا ہم نے تم میں سے ایک مرد کو نصیحت دے کر بھیجا "لِیُنْذِرَکُمْ" تاکہ تمہیں کفر، شرک اور برائی کے انجام سے ڈرا دے "وَلِتَتَّقُوْا" اور تاکہ تم جہنم کے عذاب سے بچ جاؤ "وَلَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ" اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ جو شخص اللہ تعالٰی کی وحدانیت کو مانے گا، اس کے رسول اور کتاب پر ایمان لائے گا، صحیح پروگرام کو قبول کریگا تو اللہ تعالٰی کی رحمت اسکی طرف متوجہ ہوگی۔ ابھی پچھلے رکوع میں گزر چکا ہے "اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ" یعنی اللہ تعالٰی کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہوتی ہے۔ بہرحال یہاں پر "یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ" سے لیکر "لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ" تک حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب تھا۔ اللہ تعالٰی نے یہاں پر اپنے نبی کی تقریر اور اس کے تبلیغ کے طریقے کو اختصار کے ساتھ بیان فرما دیا ہے آگے مزید تفصیلات آئیں گی کہ نوح علیہ السلام

نے کون کونسی باتیں کی تھیں۔ تاریخ انبیاء میں پہلا باب نوح علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا ہے۔

قوم کی تکذیب

جب نوح علیہ السلام نے قوم کو دعوتِ توحید دی فَكَذَّبُوهُ تو انہوں نے اس دعوت کو جھٹلایا کہنے لگے ہم تیرے دعوے کو نہیں مانتے۔ تو العیاذ باللہ جھوٹا ہے۔ بھلا ہمیں میں سے ایک انسان پر وحی کیسے آسکتی ہے۔ کوئی فرشتہ یہ پیغام لاتا تو ہم مان جاتے یا کوئی امیر کبیر، صاحبِ مال و جاہ دعویٰ کرتا تو ہم تسلیم کر لیتے۔ تیرے جیسے نادار آدمی کا دعوئے نبوت تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ آگے آرہا ہے کہ حضور خاتم النبیین علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں مکے والوں نے بھی یہی جواب دیا تھا جو قوم نوح نے دیا۔ کہنے لگے تیرے پیرو کار تو کمین لوگ ہیں۔ تیرے پاس نہ کوٹھی نہ باغات اور نہ مال و دولت۔ بھلا تمہیں ہم نبی کیسے مان لیں۔ مکہ اور طائف میں بڑے بڑے رئیس موجود ہیں ان میں سے کوئی دعوے کرتا تو بات بھی بنتی۔ نبوت کے لیے ابوطالب کا یتیم بھتیجا ہی رہ گیا تھا۔ بہر حال قوم نوح نے نوح علیہ السلام سے آپ کو جھٹلایا۔ پھر خدا تعالیٰ کا عذاب آیا اور چند ایمانداروں کے سوا سب غرق کر دیے گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ دین کے لیے بڑی محنت کی، بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں۔ سورۃ نوح کا مطالعہ کریں، آپ نے تبلیغ دین کے سلسلے میں دن رات ایک کر دیا۔ لوگوں کو فرداً فرداً سمجھانے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے اجتماعات میں خطاب کیا۔ دعوت کے تمام طریقے اپنائے مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ کہتے ہیں کہ آپ کے زمانہ میں دجلہ اور فرات کا درمیانی حصہ اور مصر کا علاقہ بڑے متمدن خطے تھے۔ نسل انسانی خوب پھیل چکی تھی مگر حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ نے ان پر کچھ اثر نہ کیا اور بالآخر وہ ہلاک ہو گئے۔

متقین نجات

ارشاد ہوتا ہے جب خدا کا عذاب بھڑکا فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ تو ہم نے نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھ کشتی میں سوار

لوگوں کو بچالیا۔ جب اللہ کے حکم سے آپ نے کشتی بنانی شروع کی تو لوگ تمسخر اڑاتے تھے۔ یہ کوئی چھوٹی موٹی کشتی نہیں تھی بلکہ تورات کے بیان کے مطابق ۵۰۴ فٹ لمبی، ۸۴ فٹ چوڑی اور ۵۴ فٹ بلند تھی۔ جب طوفان آیا تو صرف کشتی کے سوار ہی بچ سکے۔ بائبل کے بیان کے مطابق یہ کشتی ۱۵۰ دن یعنی پانچ ماہ تک پانی میں تیرتی رہی اور پھر آرمینیا کی پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی جودی پر جا کر ٹک گئی۔ کشتی والوں کی تعداد کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ زیادہ راجح روایت یہ ہے کہ ان میں چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں جن میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام اور یافث بھی تھے۔ طوفان ختم ہو جانے کے بعد جب یہ لوگ دوبارہ زمین پر آباد ہوئے تو آگے نسلِ انسانی نوح علیہ السلام کے ان تین بیٹوں سے چلی۔ ان کے علاوہ کسی اور سے نسل نہیں بڑھی۔ چنانچہ اسوقت پوری دنیا میں جتنے لوگ بھی آباد ہیں وہ ان تین کی اولاد ہیں۔ ہم لوگ سام کی اولاد ہونے کی نسبت سے سامی نسل کہلاتے ہیں۔ اسی طرح حبشہ والے حام کی اولاد سے ہیں اور باقی سب یافث سے۔

فرمایا نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کو ہم نے بچالیا وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اور ہماری آیات کو جھٹلانے والوں کو ہم نے پانی میں غرق کر دیا۔ کیونکہ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ بیشک وہ اندھے لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری قوم کو اندھا فرمایا۔ اندھا ہونے سے مراد ظاہر آنکھوں کے اندھے نہیں بلکہ دل کے اندھے مراد ہے۔ سورۃ حج میں ہے "فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ" ان کی ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں رکھے ہوئے دل اندھے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق اسی سورۃ کے آخر میں آرہا ہے وَتَرَاهُمْ يَنظُرُونَ

مستحقِ عذاب

اِلَیْکَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ" وہ آپ کی طرف تک رہے ہیں مگر آپ کو دیکھ نہیں پاتے۔ اُن کی دل کی بصیرت ختم ہو چکی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے ملک ایسے ہیں جن پر شیطان چھایا ہوا ہے اور ہمارے ممالک بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں ہمیشہ ناشائستہ کام کرتے ہیں مگر مہلت ملتی رہتی ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ندی کے آگے بند باندھا ہوا ہو پھر جب وہ بند کسی حادثہ کے باعث ٹوٹ جائے یا لوگوں کو موت آ جائے تو تمام لوگ سزا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب مہلت پوری ہو جاتی ہے تو پھر خدا تعالیٰ کسی نافرمان کو نہیں چھوڑتا۔ ابوالحسن مؤرخؒ نے لکھا ہے کہ عباسی خلفاء میں بھی یہی خرابیاں پائی جاتی تھیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کا ساڑھے چھ سو سالہ عظمت کا دور ختم ہو گیا۔ عباسی دین کا دامن چھوڑ چکے تھے دولت کی حرص، اقتدار کی خواہش، لڑائی جھگڑا اور فتنہ فساد اُن میں در آیا تھا ہر طرف باطل رسوم اور بدعات کا دور دورہ تھا۔ ایسے حالات میں اللہ نے اُن پر تاتاریوں کو مسلط کر دیا۔ وہاں سے مسلمانوں کا پاؤں بحیثیت قوم پھسلا ہے اور یہ آج تک اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکے۔ اس وقت بھی یہی برائیاں قوم میں موجود ہیں۔ ہر شخص کے دل میں اقتدار کی خواہش ہے۔ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کرنے کا جنون سر پر سوار ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کو پھیلایا جا رہا ہے اور اس طرح شیطانی کام کیے جا رہے ہیں۔ انبیاء کے لائے ہوئے دین کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے قرآنی پروگرام کو فراموش کر چکے ہیں من حیث القوم دنیا کے مسلمان ذلت کا شکار ہیں تاہم انفرادی طور پر دین کی رمق باقی رہتی ہے مگر ان کی اقلیت سے معاشرہ تو نہیں بدلا جا سکتا۔ انقلاب تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ کم از کم ساٹھ فیصد ہی اچھے لوگ موجود ہوں جو دوسروں کو بھی راہ راست پر لے آئیں۔ مگر قوم تو ساری کی

ساری اندھی ہے۔ دل میں بصیرت نہیں ہے اسی وجہ سے قوم نوح غرق ہو
کر آنے والی نسلوں کے لیے باعث عبرت بنی مگر آج پھر دُنیا کا وہی حال ہے

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾ أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾

ترجمہ :- اور قوم عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود کو (ہم نے رسول بنا کر بھیجا) آپ نے کہا ، اے میری قوم ! عبادت کرو اللہ کی ، نہیں ہے تمہارے لیے اُس کے سوا کوئی معبود کیا تم ڈرتے نہیں (۶۵) کہا اُن سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا اُن کی قوم میں سے ، ہم خیال کرتے ہیں تم کو بیوقوفی میں ، اور ہم گمان کرتے ہیں تیرے بارے میں کہ تو جھوٹا ہے (۶۶) کہا ہود (علیہ السلام نے) اے میری قوم کے

لوگو ! نہیں ہے میرے اندر کسی قسم کی بیوقوفی، لیکن میں بھیجا ہُوا (رسول) ہوں رب العلمین کی طرف سے (۶۷) میں پہنچاتا ہوں تم تک اپنے رب کے پیغامات اور میں تمہارے لیے خیرخواہ ہوں اور امانت والا ہوں (۶۸) کیا تم کو تعجب ہُوا ہے اس بات پر کہ آئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد پر تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور یاد کرو جب کہ تم کو اللہ نے نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد خلیفہ بنایا اور زیادہ کیا تمہارے جسموں میں پھیلاؤ، پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تاکہ تم فلاح پا جاؤ (۶۹)

ربطِ آیات

گذشتہ رکوع سے اللہ تعالیٰ نے تاریخ انبیاء کا بیان شروع کیا ہے جس میں اُن کی دعوت الی التوحید اور طریقہ تبلیغ کا ذکر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت، آپ کی دعوت اور قوم کا جواب بیان ہو چکا ہے۔ کہ کس طرح انہوں نے اپنے نبی کی دعوت کا انکار کیا، آپ کی نافرمانی کی اور آپ پر گمراہی کا الزام لگایا۔ اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے چند اہل ایمان کے علاوہ پوری قوم کو غرق کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ساری قوم اندھی تھی یعنی دل کی بصیرت سے محروم تھی۔ نوح علیہ السلام نے تبلیغ دین اور خیرخواہی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ قوم کو ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی مگر انہوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔

قومِ عاد

قوم عاد کا حال بیان اس سورۃ کے علاوہ سورۃ یونس، سورۃ ہود، سورۃ شعراء، سورۃ عنکبوت، سورۃ احقاف اور بعض دیگر سورتوں میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ لوگ عرب کے صحرائے اعظم میں وادی دھنا میں رہتے تھے۔ احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں اور انہی کے درمیان یہ قوم آباد تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد اس قوم نے دنیا میں بڑا عروج حاصل کیا۔ ان کی بنائی ہوئی مضبوط عمارات اور خاص طور پر یمن میں تعمیر شدہ عمدہ ہزاروں سال

تک قائم ہے اس سے کہ کھنڈرات حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک تک بھی موجود
تھے۔ ان کی طرز تعمیر ویسی ہی تھی جیسے مصر کے اہرام آج بھی موجود ہیں۔ یہ اہرام
ساڑھے چار سو فٹ سے لیکر پانچسو فٹ تک بلند سہ گوشہ مینار ہیں جو چھ ہزار سالہ
پرانی تاریخ کے حامل ہیں مورخین کے بیان کے مطابق ان میں دو ہرم حضرت
شیث علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام کی قبروں پر بنائے گئے ہیں۔ باقی
اہرام میں بھی بعض فراعین کی لاشیں ممی کر کے رکھی گئی تھیں۔ یہ عمارات بڑے
بڑے اور مضبوط پتھروں سے اس طرح بنائی گئی تھیں کہ وہ ہر قسم کے حوادثات
سے محفوظ رہیں۔ نیز ان کے راستے اس قدر پیچدار بنائے گئے تھے کہ کوئی
ناواقف شخص اندر داخل نہ ہو سکے۔ آج بھی لوگ جیزا کا ہرم خاص طور پر دیکھنے
کے لیئے جاتے ہیں۔ ان کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ ان عمارات
کے بعض پتھر پچھتر من وزنی ہیں جنہیں عجیب طریقے سے اتنی بلندی تک
چڑھایا گیا۔ اور انہیں جوڑنے کے لیے خاص ترکیب اور خاص قسم کا مصالحہ
استعمال کیا گیا جس کی وجہ سے یہ آج تک اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

قرآن میں اس قوم عاد کی کئی خصوصیات بیان کی گئی ہیں مثلاً یہ قوم بڑی
جسیم اور طاقتور تھی۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ اس قوم کے عام آدمیوں کے
قد ۱۲ ہاتھ یعنی ۱۸ فٹ ہوتے تھے بعض روایات میں ۸۰ ہاتھ قد یعنی ۱۲۰ فٹ
کا ذکر بھی آتا ہے۔ ان لوگوں کی جسمانی طاقت کے متعلق سورۃ شعراء میں موجود
ہے وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ جب وہ پکڑتے تھے تو ایسا کہ کوئی
ان کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی غیر معمولی قوت کی وجہ سے وہ لوگ
غرور میں مبتلا ہو گئے۔ کہتے تھے مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً (حٰمٓ السجدۃ)
ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟

اسی قوم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا آپ کا نام
عابر بھی بیان کیا جاتا ہے۔ آپ سام کے بیٹے ارم کی چھٹی پشت میں پیدا ہوئے۔

آپ کے والد کا نام عبداللہ یا شالخ تھا۔ آپ کی والدہ بھی قوم عاد ہی سے تھیں جن کا نام مقعنہ تھا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی تاریخ کی کتاب "حسن المحاضرۃ فی احوال المصر والقاھرۃ" میں لکھا ہے کہ طوفان نوح کے ۲۶۰۰ سال بعد مصر بن مصر کے دور حکومت میں حضرت ہود علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ آپ ۴۶۰ یا ۴۸۰ سال تک زندہ رہے اور قوم میں تبلیغ کرتے رہے۔ قوم نے انکار کیا اور سرکشی اختیار کی جس کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہوا دوسری سورتوں میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیز ہوا بھیج کر ساری قوم کو ہلاک کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام (کو رسول بنا کر بھیجا)۔ اس آیت کا عطف گذشتہ رکوع کی ابتدائی آیت پر ہے۔ وہاں تھا لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ یعنی ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور یہاں پر ہود علیہ السلام کا اپنی قوم عاد کی طرف مبعوث ہونے کا ذکر ہے۔ البتہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا کے الفاظ محذوف ہیں۔

یہاں پر ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی کہا گیا ہے قوم اور بھائی کے الفاظ عام ہیں۔ بھائی بندی کا اطلاق کبھی نسلی لحاظ سے ہوتا ہے اور کبھی وطنیت کے اعتبار سے ہوتا ہے بعض اوقات لسانی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں اور کبھی دینی اشتراک کی وجہ سے بھائی بھائی کہلاتے ہیں۔ یہاں پر معاملہ یہ ہے کہ قوم عاد ساری کی ساری کافر ہے اور ہود علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی ہیں۔ ظاہر ہے کہ دینی اشتراک کی بنا پر تو قوم اور ہود علیہ السلام کے درمیان بھائی بندی نہیں ہو سکتی۔ البتہ جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ سب لوگ ارم کی اولاد سے تھے اس لیے ایک دوسرے کے بھائی تھے بعض

اوقات مختلف ادیان سے رکھنے والے مگر ایک وطن کے باشندے بھی ایک دوسرے کے بھائی کہلاتے ہیں۔ وطن سے باہر جب دو آدمی ملتے ہیں تو وہ مختلف خاندان یا مختلف مذاہب سے رکھنے کے باوجود پاکستانی بھائی کہلاتے ہیں۔
اسی طرح ایک زبان بولنے والے بھی لسانی بھائی کہلا سکتے ہیں بغرضیکہ حضرت ہود علیہ السلام اور آپ کی قوم میں دینی اشتراک تو نہ تھا۔ البتہ وہ نسلی، وطنی اور لسانی لحاظ سے ایک دوسرے کے بھائی تھے چنانچہ اسی وجہ سے اللہ نے اَخَاهُمْ هُودًا فرمایا ہے کہ اللہ نے قوم عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود کو بھیجا۔
حضرت ہود علیہ السلام کا تعلق اُسی نسل، خاندان اور وطن سے تھا جس سے باقی قوم کا تھا لہٰذا آپ اُن کے بھائی تھے۔
بہرکیف جب ہود علیہ السلام اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تو انہوں نے اپنی قوم کو سب سے پہلے توحید کا درس دیا اور فرمایا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ انبیاء کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں انبیاء کا اولین درس توحید ہی رہا ہے تمام نبیوں نے لوگوں کو سب سے پہلے توحید کی دعوت دی، پھر تمام سلف صالحین اور مرشدانِ برحق بھی انبیاء کے اتباع میں سب سے پہلے توحید ہی کا سبق پڑھاتے ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی عمل شروع کرنے سے پہلے عقیدہ کی پاکیزگی ضروری ہے اور اس کے لیے توحید و رسالت کی گواہی لازمی ہے یعنی انسان دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے اور حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لائے۔ چنانچہ دوسرے انبیاء کی طرح ہود علیہ السلام نے بھی یہی کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں، کوئی مشکل کشا اور حاجت روا نہیں۔ اُس کے بغیر کوئی نافع اور ضار نہیں۔ وہی قادرِ مطلق ہے، وہی عالم الغیب ہے مافوق الاسباب ہر چیز پر اُسی کا تسلط ہے، لہٰذا جو ذات ان صفات کی

حاصل ہے اس کے سوا الٰہ بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب یہ عقیدہ راسخ ہو جائے گا تو انسان کی فکر پاک ہو جائے گی اور پھر اس کی ہر عبادت اور ریاضت بھی ٹھکانے لگے گی۔ اور اگر فکر ہی فاسد رہی تو پھر کوئی عبادت کسی کام نہ آئیگی لہذا سب سے پہلے توحید کے ذریعے خدا تعالیٰ کی پہچان کرنا ضروری ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا وہاں پہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ انہیں سب سے پہلے توحید و رسالت کی دعوت دینا فَاِذَا ھُمْ عَرَفُوْا ذٰلِکَ پھر جب وہ اس بات کو پہچان لیں تو پھر انہیں پانچ نمازوں، مہینہ بھر کے روزوں، زکوٰۃ اور حج کا حکم دینا۔ مقصد یہی تھا کہ جب تک انہیں اللہ رب العزت کی پہچان نہ ہو جائے اس وقت تک عبادات کا کچھ فائدہ نہیں لہذا سب سے پہلے انہیں توحید کی دعوت دیکر ان کی فکر کو پاک کرنا اور پھر باقی احکام کی تبلیغ کرنا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حشر کے دن خدا تعالیٰ کی مختلف تجلیات کا ظہور ہوگا، مگر مومن لوگ انکار کر دیں گے پھر جب مومنوں کی جانی پہچانی شکل میں تجلی ظاہر ہوگی تو وہ فوراً تسلیم کر لیں گے کہ یہی ہمارا رب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اولین چیز ہے، تمام انبیاء اسی کی تلقین کرتے رہے اور سب سے پہلا درس توحید ہی کا دیتے رہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عکاظ کی منڈی میں جاتے تھے اور فرماتے تھے یَا اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو تو فلاح پا جاؤ گے۔ پیچھے سے ایک بڑا خوبصورت اور وجیہہ آدمی پتھر مارتا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ لوگو! اس شخص کی بات نہ سننا، یہ دیوانہ ہے۔ یہ شخص ابولہب تھا۔ غرضیکہ حضور علیہ السلام نے بھی سب سے پہلے لوگوں کو توحید ہی کی دعوت دی۔ اسی طرح ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو یہی دعوت دی کہ اللہ کی عبادت کرو جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فرمایا

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ کیا تم اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ڈرتے نہیں۔ یاد رکھو اگر شرک کا ارتکاب کرو گے تو ضرور پکڑے جاؤ گے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو قبول کر لو۔

قوم کی الزام تراشی

دعوت توحید کے جواب میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم میں سے کفر کرنے والوں کے سربرآوردہ لوگوں نے کہا اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیْ سَفَاهَةٍ اے ہود (علیہ السلام)! ہم تو تمہیں بیوقوفی میں دیکھتے ہیں (العیاذ باللہ) قوم نے دعوت توحید قبول کرنے کی بجائے الٹا اپنے نبی پر بیوقوفی کا الزام لگا دیا۔ حالانکہ اللہ کا نبی تو اعقل الناس یعنی پوری امت میں سب سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو بڑی فوقیت دیتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ عام انسانوں میں پانچ باطنی حواس ہوتے ہیں جب کہ نبی میں اللہ نے چھٹا حاسہ بھی رکھا ہوتا ہے جس کے ذریعے اُسے وحی الٰہی کا ادراک ہوتا ہے۔ اللہ کا نبی کمال درجے کا ذہین، دانا اور کمال درجے کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے مگر قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تو تجھے بیوقوف جانتے ہیں، العیاذ باللہ تم بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ تم ہمیں آباؤ اجداد کی رسوم سے ہٹانا چاہتے ہو۔ تم ہمارے اسلاف کے بتوں کی پوجا سے روکنا چاہتے ہو جیسا کہ اگلے درس میں آرہا ہے کہ قوم نے کہا کہ اے ہود علیہ السلام! کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم ایک خدا کی پوجا کریں! وَنَذَرَ مَا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں اُن کو چھوڑ دیں اُن لوگوں نے واقعی بے شمار معبود بنا رکھے تھے، ہر مقصد کے لیے الگ معبود تھا، کوئی بارش برسانے والا، کوئی روزی دینے والا، کوئی اولاد عطا کرنے والا اور کوئی مشکل بنانے والا۔ بھلا وہ اتنے معبودوں کو یکدم چھوڑ کر صرف ایک معبود برحق پر کیسے اکتفا کر سکتے تھے۔ اُن کی سمجھ میں ہی یہ بات نہ آتی

تھی کہ جو کام اتنے سارے معبود مل کر کرتے ہیں، وہ اکیلا خدا کیسے کر سکتا ہے لہذا انہوں نے ہود علیہ السلام سے کہہ دیا کہ تو سبکی سبکی اور بیوقوفی کی باتیں کرتا ہے۔

یہ سفاہت کا سلسلہ آجکل بھی بدستور چل رہا ہے آج بھی ایسے لوگ دنیا میں موجود ہیں جو حق کی بات کہنے والے پر بیوقوفی کا الزام لگاتے ہیں۔ بڑے بڑے سرداران قوم، دولت مند، صاحب جاہ و اقتدار اور مکرک غریب دینداروں کو اپنی القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ یہ مولوی اور ملا ہے، بڑا نمازی اور پرہیزگار بنا پھرتا ہے۔ داڑھی کا لیبل لگا رکھا ہے، اسے کیا پتہ کہ دنیا کدھر جا رہی ہے لوگ آسمانوں پہ کمندیں ڈال رہے ہیں اور یہ ابھی تک پاکی پلیدی کے مسائل میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو قوم عاد نے اپنے عظیم المرتبت نبی حضرت ہود علیہ السلام سے کہی تھی کہ ہم تو تجھے بیوقوف سمجھتے ہیں۔

اور دوسری بات جو قوم نے اپنے نبی سے کہی تھی، وہ یہ تھی وَاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ہم تو تجھے جھوٹا خیال کرتے ہیں تم جھوٹے رسولے ہو کہ خدا نے تم پہ وحی نازل کی ہے۔ اس قسم کی گفتگو گزشتہ سورۃ میں بھی گزر چکی ہے " مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ " (الانعام) یعنی خدا تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی چیز نازل نہیں فرمائی۔ یہ اپنی چودھراہٹ جمانے کے لیے وحی کے نزول کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہر نبی کے ساتھ یہی سلوک ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ فرعون، ہامان اور قارون تینوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق سٰحِرٌ كَذَّابٌ (المومن) کہا کہ تم جادوگر ہو اور جھوٹے بھی ہو۔ ابوجہل اور اس کی پارٹی نے بھی حضور علیہ السلام کے متعلق اہل ایمان سے کہا " اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا " (بنی اسرائیل) کہ تم تو ایک سحر زدہ آدمی کا اتباع کر رہے ہو۔ بہرحال قوم عاد نے بھی حضرت ہود علیہ السلام کو بیوقوف اور جھوٹا کہا۔

حضرت ہود علیہ السلام کا جواب

اس کے جواب میں حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ

بِیْ سَفَاهَةٌ۔ اے میری قوم کے لوگو! میرے اندر کسی قسم کی بے عقلی کی بات نہیں ہے۔ برخلاف اس کے وَلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں تو تمام جہانوں کے رب کا فرستادہ رسول ہوں۔
اور میرا کام یہ ہے اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ میں اپنے رب کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ میں تمہارا خیر خواہ اور امانتدار ہوں۔ انسانیت کا ہر فرد خواہ نبی ہو یا پیر و مرشد، وہ لوگوں کی خیر خواہی کی بات کرتا ہے تاکہ وہ برائی سے بچ جائیں اور بالآخر جہنم سے خلاصی پا جائیں۔
حضور علیہ السلام نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص آگ جلائے اور اس پر پروانے پتنگے اکٹھے ہو جائیں۔ پھر وہ کوشش کرتا ہے کسی طرح یہ کیڑے مکوڑے آگ میں جلنے سے بچ جائیں۔ وہ انہیں آگ کے قریب آنے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر وہ اُدھر جانے سے باز نہیں آتے اور آگ میں جل مرتے ہیں۔ فرمایا اسی طرح میں بھی تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑ پکڑ کر آگ سے پیچھے ہٹاتا ہوں کہ اللہ کے بندو! اس غلط راستے پر نہ جاؤ، آگے جہنم ہے مگر تم میری بات نہیں مانتے اور جہنم میں جانے کی کوشش کرتے ہو۔ فرمایا ہر نیک انسان نے لوگوں کو جہنم سے بچانے کی کوشش کی ہے مگر اکثریت ہمیشہ غلط راستے پر ہی چلی ہے۔ شیطان کی پارٹی کو ہمیشہ عددی برتری حاصل رہی ہے
فرمایا تم مجھے جھوٹا کہتے ہو مگر میں امین ہوں۔ اللہ کے پیغام میں بال برابر بھی کمی بیشی نہیں کرتا اور من وعن تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے پیغام اور اس کے احکام میں کسی قسم کی خیانت کرنا قطعی حرام ہے۔ میں امین ہوں اور اپنے منصب کے مطابق اللہ کا حکم پہنچاتا ہوں۔
فرمایا اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ کیا تم اس بات میں تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت

آئی ہے عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ تمھی میں سے ایک مرد پر یعنی میں تمہاری قوم اور تمہارے ہی خاندان کا ایک فرد ہوں۔ اور اس میں تعجب کی کون سی بات ہے کہ مجھ پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے جس میں تمہارے لیے نصیحت ہے۔ میری پوری زندگی تمہارے سامنے ہے تم میرے اخلاق و کردار سے واقف ہو، اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ لہٰذا مجھ پر وحی نازل ہونے میں تمہیں کیا اعتراض ہے اور وحی الٰہی کا مقصد تو یہ ہے لِيُنْذِرَكُمْ تاکہ اللہ کا نبی تمہیں برے انجام سے ڈرائے کسی انسان پر وحی کا نزول کوئی توہین کی بات نہیں بلکہ یہ تو اعلیٰ درجے کی فضیلت کی بات ہے۔

تذکرۂ انعامات الٰہیہ

اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو اُن پر کیے جانے والے انعامات یاد دلاتے ہوئے فرمایا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ یاد کرو جب کہ تمہیں قوم نوح کے بعد خلیفہ بنایا، درمیان میں کسی قوم کو اتنا عروج حاصل نہیں ہوا جتنا تمہیں ہوا۔ اس کے علاوہ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً تمہارے جسموں کو کشادہ بنا دیا، تمہارے جسموں کو مضبوط اور طاقتور بنایا۔ ظاہری اور باطنی قوتوں سے نوازا، مال و دولت اور حکومت عطا فرمائی۔ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تم فلاح پا جاؤ اگر ان نعمتوں کی قدردانی کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے ورنہ ناکام و نامراد ہو گے اگر دنیا میں مصلحت خداوندی کے تحت بچ بھی گئے تو آخرت کے عذاب سے نہیں بچ سکو گے اور اس طرح دائمی فلاح سے محروم ہو جاؤ گے۔ اسی لیے فرمایا کہ خدا کی نعمتوں کو یاد کرو اور اُن کا شکریہ ادا کرو۔ سب سے بڑی شکرگزاری یہ ہے کہ اس کی وحدانیت کو تسلیم کرو۔ شرک اور کفر کو اختیار نہ کرو۔

یہ ہود علیہ السلام کی قوم کے سامنے تقریر ہے۔ اب اگلے درس میں قوم کے جواب کا ذکر ہو گا۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾ ع

ترجمہ :۔ کہا اُن لوگوں (ہود علیہ السلام کی قوم) نے ، کیا تو آیا ہے ہمارے پاس اس مقصد کے لیے کہ ہم عبادت کریں اکیلے اللہ کی اور چھوڑ دیں ہم اُس چیز کو جس کی عبادت کرتے تھے ہمارے آباؤ اجداد ، پس لاؤ ہمارے پاس جس چیز کا تم وعدہ کرتے ہو ، اگر تم سچے ہو ﴿۷۰﴾ کہا (ہود علیہ السلام نے) تحقیق ثابت ہو چکا ہے تم پر ہمارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب ۔ کیا تم جھگڑا کرتے ہو میرے ساتھ اُن ناموں میں جن کو تم نے رکھ لیا ہے ۔ اور تمہارے آباؤ اجداد نے ۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کے بارے میں کوئی سند نہیں اُتاری
پس انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں
میں ہوں (۷۱) پس ہم نے بچا لیا اُس کو اور اُن لوگوں
کو جو اُس کے ساتھ تھے اپنی مہربانی سے اور کاٹ دی
ہم نے جڑ اُن لوگوں کی جنھوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو
اور نہیں تھے وہ ایمان لانے والے (۷۲)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں حضرت ہود علیہ السلام کا تذکرہ ہوا۔ اللہ نے اُن کی بعثت کا ذکر کیا۔ انھوں نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور غیر اللہ کی عبادت سے منع فرمایا مگر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے آپ کی دعوت کو قبول نہ کیا اور آپ پر جھوٹ اور بیوقوفی کا الزام لگایا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے نہایت نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ اے میری قوم کے لوگو! مجھ میں بے عقلی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو رب العلمین کی طرف سے تمہارا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ میں اپنے رب کے پیغام تم تک پہنچانے پر مامور ہوں۔ میں تمہارا خیر خواہ اور امانت دار ہوں۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نصیحت ایک ایسے شخص پر نازل ہوئی ہے جو تمہارے خاندان، قوم اور نسل سے تعلق رکھتا ہے تاکہ وہ تمہیں خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائے؟ فرمایا خدا کے انعامات کو یاد کرو کہ قوم نوح کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلیفہ بنایا، زمین پر اقتدار بخشا۔ تمہیں بڑے بڑے جسم دیے اور طاقتور بنایا، لہٰذا تمہیں اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کر کے اُن کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

آباؤ اجداد کے معبود

حضرت ہود علیہ السلام کی تقریر کا جواب آپ کی قوم کے کفار سرداروں نے اس طرح دیا قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ کہنے لگے کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں؟ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا اور اُن چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباؤ اجداد پرستش کرتے

سکتے۔ جن معبودوں کی ہم نذر و نیاز دیتے ہیں اور جو ہماری حاجت روائی اور مشکل کشائی
کرتے ہیں، ہم انہیں یک لخت کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اے ہود (علیہ السلام)
ہم آپ کی یہ بات ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ تم تو بیوقوفی کی باتیں کرتے
ہو۔ بھلا ان معبودوں کے بغیر ہمارے مقاصد کیسے پورے ہو سکتے ہیں؟ بالکل
یہی بات مشرکین مکہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کے جواب میں
کہی تھی۔ انہوں نے دو چیزوں پر استعجاب کا اظہار کیا تھا۔ ایک یہ کہ جب
ہم مر کر مٹی میں رل جائیں گے اور ہماری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی تو
عجیب بات ہے کہ ہم جی اٹھیں گے۔ اور دوسری بات یہ کہ اَجَعَلَ
الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (ص)
ہم تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کی عبادت کریں، یہ تو عجیب بات
ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد میں سے تو کبھی کسی نے ایسی بات نہیں کی ہم صدیوں
سے لات، منات اور عزیٰ وغیرہ کی پوجا کرتے ہیں مگر کسی نے نہیں روکا۔
تو ہود علیہ السلام کی قوم نے بھی یہی کہا کہ کیا ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو
چھوڑ دیں اور صرف ایک معبود کی عبادت کریں۔ یہ ناممکن ہے فَاْتِنَا بِمَا
تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ہود علیہ السلام سے کہنے لگے
کہ اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو پھر لے آ جس چیز کا تو نے ہم سے وعدہ
کیا ہے یعنی ہم پر وہ عذاب نازل کر دو جس سے ہمیں ڈراتے ہو۔

اس قسم کی بات بعض دوسرے انبیاء کے ساتھ بھی پیش آئی ہے حضرت
شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا كِسَفًا مِّنَ
السَّمَآءِ (الشعراء) اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے۔
حضرت لوط علیہ السلام سے بھی یہی مطالبہ کیا گیا قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو تو ہم پر اللہ
کا عذاب لے آؤ۔ مشرکین مکہ بھی حضور علیہ السلام کو سچا نہیں مانتے تھے، اور

سکتے تھے اس کا لایا ہوا کلام اگر برحق ہے "فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" (الانفال) تو اے اللہ ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہمیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دے۔

حضرت ہود علیہ السلام کا جواب

جب قوم نے حضرت ہود علیہ السلام سے عذاب کا مطالبہ کیا، تو آپ نے فرمایا "قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ" تحقیق واقع ہو چکا ہے تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب یعنی تمہاری سرکشی، گستاخی اور بے حیائی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہونے والا ہے لفظ رجس دو مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے اس کا ایک معنی گندگی ہے۔ جیسے "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ" (الحج) بتوں کی گندگی سے بچو۔ یہ معنوی نجاست ہوتی ہے کہ انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو جاتی ہے اور جس سے انسان کی روح پلید ہو جاتی ہے۔ رجس کا دوسرا معنی عذاب ہے جیسا کہ اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں دیگر مقامات پر بھی رجس یا رجز عذاب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسے بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا "فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ" (البقرہ) ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل فرمایا۔ اسی طرح غضب کا لفظ بھی قرآن پاک میں متعدد بار غصہ اور ناراضگی کے معنوں میں آیا ہے۔ جیسے فرمایا "فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ" (البقرۃ) وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی پر ناراضگی لے کر لوٹے

حضرت ہود علیہ السلام نے مزید فرمایا "أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءٍ" کیا تم میرے ساتھ ان ناموں کے متعلق جھگڑتے ہو "سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم" جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں اور ہر ایک کو کسی خاص صفت سے متصف کر دیا ہے کہ فلاں بت روزی دینے والا ہے، فلاں اولاد دینے والا ہے۔ فلاں بارش برسانے والا اور فلاں

مقدمہ میں روزی دلانے والا ہے۔ بتوں کے مختلف نام رکھے ہیں اور پھر ان کی عبادت کرتے ہو، ان سے مرادیں مانگتے اور بگڑی بنواتے ہو حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ نام ہی نام ہیں مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کوئی سند نہیں اتاری کہ جن امور کو ان کے ساتھ منسوب کرتے ہو، وہ کام واقعتاً کر بھی سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اولاد، شفاء، روزی، عروج و زوال، مافوق الاسباب استعانت یہ سب اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہیں ان میں سے کوئی بھی صفت ان معبودانِ باطلہ میں نہیں پائی جاتی، یہ بالکل بے اختیار ہیں بلکہ بعض انہیں سے بے جان ہیں، لہٰذا یہ تمہارے کچھ کام نہیں آ سکتے تمہیں کوئی نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے حتیٰ کہ ملائکہ بھی خدا تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔ یہ تو تم نے محض نام رکھ دیئے ہیں جن میں حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں کوئی سند نہیں اتاری۔

یہی بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تقریر میں بھی پائی جاتی ہے" اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ " (النجم) اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے لات، عزیٰ اور منات کا نام لے کر فرمایا ہے کہ یہ مشرکین کے خود رکھے ہوئے نام تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کوئی سند نہیں اتاری۔ اللہ تعالیٰ نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ فلاں بت کی پوجا کرو اور فلاں سے مدد مانگو، یا فلاں کی تعظیم کرو تو تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ فرمایا اس کو تو عقل بھی جانتی ہے کہ مٹی اور پتھر کے بت کسی نفع نقصان کے مالک نہیں اور جن بزرگوں کے نام پر بت بنائے گئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عاجز مخلوق تھے۔ عابد اور معبود مخلوق ہونے کے اعتبار سے دونوں ضعیف ہیں ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (الحج) میں یہی بات سمجھائی گئی ہے کہ حاجت مند اور حاجت روا دونوں کمزور ہیں، دو نفع نقصان کے مالک

نہیں ہیں۔

فیصلے کا انتظار

فرمایا شرک کے ارتکاب اور پھر اللہ کے نبی کے ساتھ جھگڑا کرنے کی وجہ سے تمہاری بدبختی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف سے شرک سے باز آجانے کی اب کوئی اُمید باقی نہیں رہی لہٰذا فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ تم بھی فیصلے کا انتظار کرو اور تمہارے ساتھ میں بھی اسی انتظار میں ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں کیا فیصلہ کرتا ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ حضرت ہود علیہ السلام ۴۶۰ یا ۴۸۰ سال تک اس دنیا میں زندہ رہے، قوم کو خدا کا پیغام سناتے رہے اتنا لمبا عرصہ تبلیغ کا حق ادا کرنے کے باوجود جب قوم سرکشی سے باز نہ آئی تو پھر اُن کے لیے فیصلے کا وقت آن پہنچا۔ خدا تعالیٰ نے اس قوم پر تین سال تک قحط مسلط کر دیا۔ وادیٔ دہنا میں عمان سے حضرموت تک گرم ترین علاقے میں بارش کا قطرہ نہ برسا جس کی وجہ سے قوم ہود نے سخت تکلیف اٹھائی مگر پھر بھی اپنے نبی کی بات ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ اس کے بعد اُن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔ آسمان سے آگ برسی اور آٹھ دن اور سات رات تک مسلسل آندھی چلی جس سے پوری قوم ملیا میٹ ہوگئی۔

وفدِ عاد کا حال

کہتے ہیں کہ جب قوم عاد سخت قحط میں مبتلا ہوگئی تو انہوں نے اپنے ایک سردار قیل کی سرکردگی میں ایک وفد مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا جو وہاں جا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کے لیے دعا کرے۔ اُس وقت بیت اللہ شریف کی عمارت تو طوفان کی وجہ سے مٹ چکی تھی تاہم لوگ اس جگہ کو مقدس جانتے تھے اور اس مقام پر دعائیں کرتے تھے۔ قوم عاد نے بھی ایک وفد اُسی مقام کے لیے روانہ کیا۔ اس وفد کا حال ترمذی شریف اور مسند احمد میں مذکور ہے۔ حارث ابن یزید بکری عربوں کے قبیلہ بکر کا ایک شخص صحابی رسول ہے۔ یہ شخص قوم عاد کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ جب یہ مدینہ آیا تو کسی شخص

نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ حضور! عاد کا ایک وفد آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے حضرت حارث تو دبیان کرتے ہیں ذُكِرْتُ وَافِدَ عَادٍ کہ میرا وفد عاد کے طور پر ذکر کیا گیا ہے یہ سُن کر میں نے کہا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ وَافِدَ عَادٍ پناہ بخدا کہ میں وفد عاد جیسا ہوں، اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حارثؓ سے دریافت کیا کہ تم عاد کے وفد کے متعلق کیا جانتے ہو وہ کہنے لگا کہ میں یہ جانتا ہوں کہ مرثد بن سعد کی قیادت میں ایک وفد مکہ مکرمہ گیا تھا جب قحط پڑا تو قوم نے اس وفد کو روانہ کیا تا کہ وہ وہاں جا کر بارش کے لیے دعا کرے۔ یہ وفد مکے کے قریب پہنچا تو وہاں پر معاویہ ابن بکر سردار کے پاس اُترا۔ اُس نے مہینہ بھر وفد کی خوب خدمت تواضع کی، شراب پلائی اور مہمانوں کے دل بہلا دینے کے لیے جرادتان تغنیان ناچنے گانے والی دو لونڈیاں بھی ان کے سپرد کیں۔

یہ وفد اپنے عیش و آرام میں لگا رہا حتیٰ کہ اُن کا میزبان اُن سے تنگ آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب یہ لوگ چلے جائیں مگر کُھل کر انہیں کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے گانے والی لونڈیوں سے کہا کہ تم ایسے اشعار گاؤ کہ جن کو سُن کر یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں اور ہماری توہین بھی نہ ہو تو لونڈیوں نے مہمانوں کے سامنے یہ اشعار گائے

اَلَا يَا قَيْلُ وَيْحَكَ قُمْ فَهَيْنِمْ   لَعَلَّ اللّٰهَ يَسْقِيْنَا غَمَامَا

اے سردار افسوس ہے تمہاری حالت پر اٹھو دعا کرو   شاید کہ خدا ہم کو بادلوں سے سیراب کر دے

فَيَسْقِيْ اَرْضَ عَادٍ اِنَّ عَادًا   قَدْ اَمْسَوْا لَا يُبِيْنُوْنَ الْكَلَامَا

شاید خدا عاد کی سرزمین کو سیراب کر دے کیونکہ قوم عاد کے لوگ اتنے عاجز ہو گئے کہ بات بھی نہیں کر سکتے۔

مِنَ الْعَطَشِ الشَّدِيْدِ فَلَيْسَ نَرْجُوْ   بِهِ الشَّيْخَ الْكَبِيْرَ وَلَا الْغُلَامَا

پیاس شدید کی وجہ سے ہم تو مایوس ہو گئے ہیں بوڑھے بھی اور بچے بھی (یہ سب پیاس کا شکار ہو کر نیست و نابود ہی نہ ہو جائیں)

وَقَدْ كَانَتْ نِسَاؤُهُمْ بِخَيْرٍ   فَقَدْ أَمْسَتْ نِسَاؤُهُمْ عَيَامَا

ان کی عورتیں بھی خوشحال تھیں، لیکن اب بالکل بدحال ہو چکی ہیں اور بانجھ ہو چکی ہیں تکلیف اور پریشانی کی وجہ سے۔

وَإِنَّ الْوَحْشَ يَأْتِيهِمْ جِهَارًا   وَلَا يَخْشَى بِعَادِيٍّ سِهَامَا

اگر ان کے پاس جانور بھی آجائیں تو ان میں اتنی طاقت نہیں کہ عاد کا کوئی فرد ان پر تیر چلا سکے۔ جانور سب بے خوف ہو چکے ہیں وہ کمزور ہو کر اس درجے تک پہنچ چکے ہیں

وَأَنْتُمْ هَاهُنَا فِيمَا اشْتَهَيْتُمْ   نَهَارَكُمْ وَلَيْلَكُمُ التَّمَامَا

اے وفد کے لوگو! تم یہیں ٹھہرے ہوئے ہو قوم کا یہ حال ہے اور تم یہاں آرام کر رہے ہو

فَقُبِّحَ وَفْدُكُمْ مِنْ وَفْدِ قَوْمٍ   وَلَا لَقُوا التَّحِيَّةَ وَالسَّلَامَا

تمہارا وفد نوبت ہی بُرا ہے وہ تو سلام کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ یا اس قابل بھی نہیں ہے کہ اس کے لیے دُعا کی جائے۔

لونڈیوں کے اشعار کا وفد عاد پر یہ اثر ہوا کہ وہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مکہ کی پہاڑیوں جبال مہرۃ میں آکر اس طرح دُعا کی۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي لَمْ آتِكَ لِمَرِيضٍ فَأُدَاوِيَهُ وَلَا لِأَسِيرٍ فَأُفَادِيَهُ فَاسْقِ عَبْدَكَ مَا كُنْتَ مُسْقِيَهُ (ترمذی صـ۱۷۲)

اے خدا! میں کسی مریض کی شفا یابی کے لیے نہیں آیا اور نہ کسی قیدی کو فدیہ میں چھڑانے کے لیے حاضر ہوا ہوں میں تو اس لیے آیا ہوں کہ اپنے بندوں کو بارش سے سیراب کر دے۔ جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔

سردار وفد اگرچہ مشرک تھا اور معبودانِ باطلہ کو مانتا تھا مگر اس وقت اس نے خداوند کریم سے بارش کی دُعا کی۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمارے میزبان معاویہ بن بکر کو سیراب کر دے کیونکہ اس نے ہماری بڑی خدمت کی ہے۔

قوم عاد کی دُعا

اِدھر وفد مکے میں بارش کی دُعا کر رہا تھا تو اُدھر قوم عاد اپنے علاقے میں

بارش کے لیے معبودانِ باطلہ کو پکار رہی تھی مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ حضرت ہود علیہ السلام کو ماننے والے ایک اہلِ ایمان مرثد ابن سعد نے قوم سے کہا کہ جن معبودوں کو تم پکار رہے ہو، ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے لہٰذا ان کی منت سماجت کرنے سے قحط دُور نہیں ہوگا۔ اس صاحبِ ایمان آدمی نے اپنی بات ان اشعار میں کی۔

عَصَتْ عَادٌ رَسُوْلَهُمْ فَأَمْسَوْا عِطَاشًا مَا تَبُلُّهُمُ السَّمَاءُ

(قوم عاد نے اپنے رسول کی نافرمانی کی تو پیاسے ہو گئے ہیں کہ آسمان سے ایک قطرہ پانی بھی نہیں برستا (سخت تکلیف میں ہیں)

لَهُمْ صَنَمٌ يُقَالُ لَهُ صَمُوْدٌ يُقَابِلُهُ صُدَاءٌ وَالْهَبَاءُ

ان کا ایک بت صمود ہے جس کی پرستش کرتے ہیں اور صدار اور هباء ہے (ان سب کو پکارتے ہیں، ان پر نذرانے چڑھاتے ہیں مگر ان کو بارش برسانے کا کہاں اختیار ہے؟)

فَبَصَّرَنَا الرَّسُوْلُ سَبِيْلَ رُشْدٍ فَأَبْصَرْنَا الْهُدٰى وَخَلَا الْعَمَاءُ

ہمیں تو اللہ کے رسول نے ٹھیک راستہ سمجھا دیا ہے (یعنی اللہ کی عبادت کرو اور اسی سے مدد چاہو) ہم نے تو دل کی بصیرت سے ہدایت کو پا لیا ہے اور ہم سے اندھاپن دور ہو چکا ہے۔

وَإِنَّ إِلٰهَ هُوْدٍ هُوَ إِلٰهِيْ عَلَى اللّٰهِ التَّوَكُّلُ وَالرَّجَاءُ

بیشک ہود علیہ السلام کا معبود ہی ہمارا معبود ہے۔ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی سے توکل اور امید کرتے ہیں (بارش وہی برسائے گا اور تکلیف وہی دُور کرے گا۔)

بہر حال اُدھر قوم نے دُعا کی اور ادھر وفد نے بارش کے لیے التجا کی۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اُس وقت تین قسم کے بادل نمودار ہوئے یعنی سفید، سُرخ اور سیاہ۔ ان بادلوں سے آواز آئی اختیار ان میں سے جو نہیں پسند ہے اختیار کر لو۔ یہ آواز سن کر وفد کے سردار نے سیاہ بادل کو پسند کیا کیونکہ عام طور پر کالی گھٹائیں زیادہ بارش لاتی ہیں۔ پھر کالی گھٹا میں سے آواز آئی ؎

خذ رمداً رماداً   لا تبقی احداً من عاد

یہ سیاہی مائل جلا ہوا بادل لے لو   یہ قوم عاد میں سے کسی کو نہیں چھوڑے گا

قوم عاد پر عذاب

وفد اور قوم کے لوگ خوش تھے کہ بادل جھوم کر آئے ہیں ان کی دُعا رنگ لائی ہے اور اب جل تھل ہو جائے گا اور قحط سالی ختم ہو جائے گی، ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انگوٹھی کے دائرے کے برابر ہوا چھوڑی جو سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (الحاقہ) لگاتار سات راتیں اور آٹھ دن چلتی رہی۔ سورۃ احقاف میں ہے کہ جب کالے بادل عاد کی وادیوں پر چھا گئے تو قوم کے لوگ کہنے لگے ”هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا“ کہ آسمان کے کنارے پر بادل چھا گئے ہیں، ابھی خوب بارش ہوگی انھوں نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ بادلوں کی آمد پر بڑی خوشی منائی کہ اُن کی دُعا قبول ہوگئی ہے جب بادل قریب آئے تو اُن میں سے ٹھنڈی ہوا آئی۔ لوگ دوڑ کر بادلوں کے نیچے گئے۔ وہاں انہیں بڑا سکون حاصل ہو رہا تھا، جب بہت سے لوگ بادلوں کے نیچے جمع ہو گئے تو اُن میں آگ برسنا شروع ہو گئی جس سے لوگ جل بھن گئے۔ امام محمد باقرؒ کی روایت میں آتا ہے، اور صاحب روح المعانی نے بھی نقل کیا ہے کہ اللہ نے تیز ہوا چھوڑی جس نے بادیوں کو زمین سے اٹھا اٹھا کر پٹخ دیا، یہ ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو گئے۔ اور پھر ان کی لاشیں زمین پر اس طرح پڑی تھیں کَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ

مخنل خاویۃ (الحاقۃ) گویا کہ اکھاڑی ہوئی کھجوروں کے بڑے بڑے تنے ہوں۔ بہت بڑے بڑے قد آور لوگ تھے ان کے سر اتنے بڑے بڑے تھے جتنا کوئی چھوٹا سا گنبد۔ اللہ نے ان کے سروں کو آپس میں ٹکرا ٹکرا کر نیست و نابود کر دیا۔

اہل ایمان کا بچاؤ

اُدھر حضرت ہود علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوا کہ اس مغضوب علیہ قوم سے الگ ہو جائیں۔ کہتے ہیں کہ جانوروں کا کوئی باڑہ تھا، اللہ کا نبی اور اس کے ساتھی جو چار یا چھ ہزار کی تعداد میں تھے اُس باڑے میں چلے گئے۔ خدا کی حکمت کہ اُس باڑے میں تیز آندھی اثر نہیں کرتی تھی لہذا اہل ایمان کا گروہ آٹھ روز تک وہیں رکا رہا اور اُن کا بال بھی بیکا نہ ہوا اللہ نے فرمایا فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ہم نے ہود علیہ السلام اور اس کے حواریوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ہم نے اُن کی جڑ کاٹ ڈالی۔ انہیں نیست و نابود کر دیا کیونکہ وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی وفات

قوم کی تباہی کے بعد حضرت ہود علیہ السلام مکہ مکرمہ پہنچے اور کچھ عرصہ وہیں مقدس مقام پہ عبادت کرتے رہے اور پھر اپنے پیروکاروں کو لے کر حضر موت کے علاقے میں چلے گئے۔ آپ کی وفات کے متعلق دو روایات ملتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ مکہ میں ہی فوت ہو گئے اور وہیں حرم شریف حجر کے مقام پہ دفن ہوئے جہاں پہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہؓ اور بعض دیگر انبیاء کی قبور ہیں۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ آپ حضر موت میں جا کر فوت ہوئے یہی روایت زیادہ قرین قیاس ہے۔ وہیں یمن کے علاقے میں بریت کے ٹیلوں میں آپ کی قبر ہے یہ سب تاریخی روایات ہیں

حضورؐ کی حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہے۔ لہذا تاریخی واقعات غلط بھی ہو سکتے ہیں۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَٰلِحًا ۗ قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥ ۖ قَدْ جَآءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِۦ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ ءَايَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِىٓ أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِى الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَاذْكُرُوٓا ءَالَآءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٧٤﴾

ترجمہ :- اور قوم ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو (ہم نے رسول بنا کر بھیجا) انہوں نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ نہیں ہے تمہارے لیے اُس کے سوا کوئی الہٰ۔ تحقیق آئی ہے تمہارے پاس کھلی دلیل تمہارے رب کی طرف سے۔ یہ اونٹنی ہے اللہ کی۔ تمہارے لیے نشانی ہے۔ پس چھوڑ دو اس کو۔ یہ کھائے اللہ کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اس کو بُرائی سے۔ پس پکڑے گا تم کو دردناک عذاب ﴿٧٣﴾ اور یاد

کرو جب کہ اللہ نے تم کو نائب بنایا قوم عاد کے بعد
زمین میں اور ٹھکانا دیا تم کو زمین میں کہ بناتے ہو تم
اس کی نرم جگہوں میں محلات۔ اور تراشتے ہو پہاڑوں میں
گھروں کو۔ پس یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو اور نہ چلو زمین
میں فساد کرتے ہوئے (۷۴)

قوم ثمود

گذشتہ رکوع سے انبیاء کی تاریخ کا کچھ حصہ بیان ہو رہا ہے جس میں ان کے طریقۂ تبلیغ، قوم کے جواب اور پھر ان پر وارد ہونے والے عذاب کا ذکر ہے۔ اس سے سردارِ امت آخر الزمان کے لیے عبرت اور اُس کے لیے حوصلہ افزائی ہے تاکہ وہ سابقہ قوموں کے حالات سے سبق سیکھیں اور ان قوموں کے نقش قدم پر نہ چلیں جو اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوئیں۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر ہوا، پھر حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغ دین کا تذکرہ ہوا اور امت کی نافرمانی کی وجہ سے ان کی سزا کا بیان ہوا۔ اب تیسرے نمبر پر حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی امت قوم ثمود کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان ہوں گے اور پھر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ عام کا ذکر ہوگا۔

ثمد پانی کی قلت کو کہتے ہیں۔ جس علاقے میں یہ قوم آباد تھی وہاں پانی کی شدید قلت تھی، اس لیے اس قوم کا نام قوم ثمود مشہور ہوگیا۔ نیز ثمود، ایک شخص کا نام بھی تھا۔ جو ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔ کسی فردِ واحد کے نام پر قوم یا علاقے کا نام پڑ جانا عین ممکن ہے اور اس کی بعض دیگر مثالیں بھی موجود ہیں مثلاً مدین ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام ہے جو آپ کی تیسری بیوی کی اولاد میں سے تھے بعد میں اُسی کے نام پر قوم کا نام بھی مدین مشہور ہوا اور اسی نام سے ایک شہر بھی آباد ہوا۔ اسی طرح ثمود بھی ایک فرد کا نام تھا۔ جو کہ قوم عاد کے پس ماندگان میں سے تھا۔ چونکہ ثمود بھی قوم عاد ہی کی نسل سے تھے اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ قوم

قوم ثمود کا وطن

جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے اس کو عادِ اولیٰ کہتے ہیں اور ثمود کو عادِ ثانیہ کہا جاتا ہے
قوم عاد صحرائے اعظم عرب میں وادی دہنا، حضرموت اور اس کے اطراف
میں پھیلے ہوئے تھے جو کہ جزیرہ نمائے عرب کا جنوب مشرقی حصہ ہے۔ البتہ
قوم ثمود کا وطن عرب کے شمال مغرب میں وادی حجر سے لے کر وادی قریٰ تک
تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے مدائن صالح بھی کہتے ہیں۔ ترکوں کے زمانہ میں مدینہ اور
تبوک کے درمیان حجاز ریلوے لائن تھی جس پر مدائن صالح نام سے ریلوے
اسٹیشن بھی تھا جو بعد میں اکھاڑ دی گئی۔ دراصل انگریزوں نے مسلمان ممالک کو
تقسیم کرنے کے لیے ترکوں اور عربوں کے درمیان نفرت پیدا کی۔ عربوں
سے کہا کہ تم ترکوں کے ماتحت کیوں رہتے ہو، تم اپنی حکومت قائم
کرو۔ عربوں نے بغاوت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اپنی بادشاہی تو قائم
نہ ہوسکی، البتہ انگریز کا مقصد پورا ہوگیا۔ شریف مکہ کو وہاں سے نکال کر پہلے
عراق دیا۔ پھر اردن کے دو حصے کردیے ان کو فلسطین کا حصہ دیا مگر وہاں
بھی جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے، چالیس سال سے وہاں پہ
اسرائیلی ریاست قائم ہے۔ بہرحال شریف مکہ کے پوتے پڑپوتے اب
بھی اردن میں موجود ہیں۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ قوم ثمود کا وطن مدائن صالح والا علاقہ تھا جو تبوک
تک چلا گیا ہے تبوک وہی مقام ہے جہاں حضور علیہ السلام رومیوں سے
جہاد کرنے کے لیے مدینہ طیبہ سے تشریف لے گئے تھے اور مدائن صالح
راستے میں آتا ہے۔ احادیث میں آپ کے اس سفر کی بہت سی
تفصیلات موجود ہیں۔ اس علاقے میں تبوک سے لے کر مکے کی طرف وادی قریٰ
تک قوم ثمود کے ایک ہزار سات سو بڑے بڑے شہر اور قصبے آباد تھے
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں کہ قوم ثمود بڑے
متمدن لوگ تھے۔ ان میں بڑے بڑے انجینئر اور کاریگر تھے۔ یہ لوگ محل

مکان بنانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ بڑے بڑے نقش و نگار والے عالیشان محل اور کوٹھیاں تعمیر کرتے تھے ۔ یہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر اُن کے اندر نہایت مضبوط مکان بناتے تھے جو حوادثات سے محفوظ رہتے تھے ان کے کھنڈرات دیکھنے کے لیے آج بھی سیاح جاتے ہیں ۔ ان پر ارامی زبان میں تحریر شدہ کتبے اب بھی موجود ہیں ۔ اس قوم کو گزرے پانچ ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے ۔

حضرت صالح علیہ السلام

ارشاد ہوتا ہے وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا اور قوم ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا ۔ یہاں پر بھی لَقَدْ أَرْسَلْنَا کے الفاظ محذوف ہیں ابتداء میں حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرے کے ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں جن کا اطلاق اس آیت میں بھی ہوتا ہے ۔ یہاں پر أَخَاهُمْ سے مراد برادری اور قومیت کی اخوت ہے جیسے ہود علیہ السلام کے متعلق بھی ذکر کیا جا چکا ہے ۔ حضرت صالح علیہ السلام بھی سام ابن نوح کی اولاد میں سے تھے ۔ آپ کے والد کا نام عبید تھا ۔ آپ بڑے جلیل القدر رسول تھے نہایت زاہد ، متقی اور عبادت گزار تھے ۔ آپ نے اپنی قوم کو حتی المقدور تبلیغ کی اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی مگر قوم اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئی بلکہ قوم نے اونٹنی کا معجزہ طلب کیا ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وہ فرمائش بھی پوری کر دی انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی تعلیم کے خلاف اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب آیا اور وہ نیست و نابود ہو گئے

درس توحید

حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو وہی سبق دیا جو سابقہ نبی دیتے آئے ہیں ۔ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ اے میری قوم کے لوگو ! اللہ کی عبادت کرو ۔ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ اُس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ کوئی حاضر و ناظر ، مختار کل ، نافع ضار ، ہمہ بین اور ہمہ توان نہیں ہے ۔ وہی خالق اور علیم کل ہے مافوق الاسباب وہی مدد

کر سکتا ہے۔ کوئی اس کے بغیر فریاد رسی کرنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا عبادت
بھی اسی کی کرنی چاہیے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" میں یہی فلسفہ
کارفرما ہے۔ عالمِ اسباب میں تو ایک دوسرے کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے
مگر جب ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو پھر خزانۂ غیب سے روزی دینے والا
اولاد عطا کرنے والا، ترقی و تنزل سے دوچار کرنے والا اور بیماروں کو شفا
بخشنے والا صرف وہی ہے۔ اگر یہ بات سمجھ آجائے تو پھر یاد رکھو عبادت
بھی اسی کی روا ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، کوئی مشکل کشا اور حاجت روا
نہیں اسی لیے آپ نے فرمایا کہ اے میری قوم! صرف اللہ کی عبادت کرو کہ
اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔

اونٹنی بطور بیّنہ

توحید کا درس دینے کے بعد صالح علیہ السلام نے قوم سے کہا قَدْ
جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ تمہارے پاس کھلی نشانی یا دلیل آچکی ہے تمہارے رب کی طرف سے۔
یہاں بیّنہ سے مراد وہ اونٹنی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قوم صالح کی فرمائش
پر پتھر سے پیدا کیا تھا۔ قرآن میں بیّنہ کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی بولا
گیا ہے۔ سورۃ بیّنہ میں موجود ہے کہ یہ اہل کتاب کفر سے باز آنے والے
نہ تھے "حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ" جب
تک کہ ان کے پاس اللہ کی واضح دلیل اللہ کے رسول نہ آجاتے۔ اس سے
یہ مسئلہ بھی حل ہوتا ہے کہ کوئی تعلیم اس وقت تک کماحقہ بارآور نہیں ہوتی
جب تک وہ نمونہ بن کر سامنے نہ آجائے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام
کی تعمیل کے لیے انبیاء کو نمونہ بنا کر بھیجا۔ ہر نبی دینی تعلیم کا نمونہ ہوتا ہے
تاکہ دوسرے لوگ انہیں دیکھ کر ان کا طریقہ اختیار کریں۔ بہر حال یہاں پر بیّنہ
سے مراد وہ اونٹنی ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

فرمایا هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ یہ اللہ کی اونٹنی ہے لَكُمْ اٰيَةً یہ تمہارے
لیے بطور نشانی ہے۔ مسند احمد کی حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے فرمایا، لوگو! نشانیاں طلب نہ کیا کرو کیونکہ صالح علیہ السلام کی قوم نے اللہ کے نبی سے نشانی طلب کی تھی کہ اس رنگ اور جسامت کی اونٹنی ہو جو آپ ہمارے سامنے اس پہاڑ کے پتھر میں سے نکالیں۔ وہ گابھن بھی ہو اور ہماری آنکھوں کے سامنے بچہ جنے۔ اللہ تعالیٰ نے ہزاروں آدمیوں کے سامنے اس فرمائش کو پورا کیا۔ حضرت صالح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں نے نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے پتھر کو پھاڑ کر اس میں سے اونٹنی کو نکالا، مگر قوم پھر بھی ایمان نہ لائی اور آخر عذاب میں مبتلا ہوئی۔ اس اونٹنی کی خصوصیت یہ تھی کہ چشمے یا تالاب سے ایک دن وہ پانی پیتی تھی اور دوسرے دن باقی جانور پیتے تھے۔ قرآن میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ پانی کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور پھر وہ اونٹنی دودھ بھی خوب دیتی ہے، جس کا جی چاہے اس سے دودھ نکال لے۔ البتہ اللہ کے نبی نے واضح طور پر حکم دیا تھا۔ کہ جس دن اونٹنی کے پانی پینے کی باری ہو اس دن کوئی دوسرا جانور گھاٹ پر نہ جائے۔ نیز یہ کہ اس اونٹنی سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے اور نہ اسے ایذا پہنچائی جائے، مگر جب قوم اپنی قبیح حرکات سے باز نہ آئی تو اللہ تعالیٰ نے قوم پر ایسی چیخ مسلط کی جس سے ان کے دل پھٹ گئے۔ نیچے سے زلزلہ آیا اور پوری کافر قوم ہلاک ہو گئی۔

تمام اونٹنیاں اور دیگر جانور سب اللہ ہی کی مخلوق ہیں مگر اس اونٹنی کو خاص طور پر اللہ کی اونٹنی اس کی شرافت کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ غیر معمولی طریقے سے پیدا فرمایا تھا۔ اس کی مثال بعض دوسری چیزیں بھی ہیں جیسے مساجد اللہ یعنی اللہ کی مسجدیں یا بیت اللہ یعنی اللہ کا گھر، حالانکہ ہر چیز کا مالک تو خدا تعالیٰ ہی ہے مگر یہ ایک خاص گھر ہے جو رہائش کے لیے نہیں بلکہ عبادت کے لیے بنایا گیا ہے لہٰذا اس کے شرف کی وجہ سے اسے بیت اللہ کہا گیا ہے۔ کہ اس کے

اور ہر روز چوبیس گھنٹے طواف ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد ہر وقت عبادت ہوتی ہے بلکہ دنیا بھر کے مسلمان اسی گھر کی طرف منہ کر کے محبوب ترین عبادت نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح مذکورہ اونٹنی باقاعدہ تناسل کے ذریعے کسی دوسری اونٹنی کے بطن سے نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پتھر کو پھاڑ کر نکالا تھا۔ جیسا کہ مؤرخین اور سیاح بیان کرتے ہیں کہ جس پتھر سے اونٹنی کو نکالا گیا تھا اس میں سات فٹ کا شگاف اب بھی موجود ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ میں اس علاقے میں گیا جہاں وہ اونٹنی بیٹھا کرتی تھی میں نے بیٹھنے کی جگہ کی ۹۰ فٹ پیمائش کی۔ یہ روایت تفسیر عزیزی میں مذکور ہے۔

فرمایا یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ اس میں تمہارے لیے نشانی ہے فَذَرُوهَا اس کو چھوڑ دو۔ اس کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اس کے ساتھ کوئی تعرض نہ کرو تاکہ تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ یہ اللہ کی زمین میں جہاں سے چاہے کھا لے۔ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ اور اسے کبھی بُرے ارادے سے ہاتھ مت لگانا۔ اس کو ایذا نہ پہنچانا۔ اگر ایسا کرو گے فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ تو تم کو دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ بہرحال یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کی دو باتوں کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے کیں۔ ایک درس توحید دیا اور دوسرے نشانی کا ذکر کیا۔

احسانات الٰہی

آگے اللہ تعالیٰ نے قوم صالح کو اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے فرمایا وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ اور اس بات کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں قوم عاد کے بعد نائب بنایا تمہیں پہلی قوم کا جانشین بنایا۔ ان کی نافرمانی کی وجہ سے ان کا جو حال ہوا وہ تم نے دیکھ لیا۔ اب ایک سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں عروج دیا ہے، بڑے بڑے شہر اور قصبے ہیں صنعت و حرفت اور تجارت ہے

متمدن دنیا کی تمام سہولت میسر ہیں۔ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ اللہ تعالے نے تمہیں زمین میں ٹھکانا دیا۔ تم اپنے آرام کے لیے تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا اس سرزمین کی نرم جگہوں پر محلات تعمیر کرتے ہو۔ سورۃ شعراء میں اس طرح آیا ہے وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ "اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔ یہ لوگ بڑی بڑی بلڈنگیں تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گنبد اور اونچے اونچے مینار تعمیر کرتے تھے مصریوں کی طرح قوم صالح نے بھی یادگاریں تعمیر کیں۔ یہاں بھی فرمایا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اپنے لیے گھر بنا لیے ہو یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے اور اس کا بہت بڑا احسان ہے

قوم ثمود کی سنت

قوم ثمود کی سنت ہمارے ہاں بھی جاری ہے۔ یہاں پر بھی بڑی بڑی عمارات بنانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ جس طرح قوم ثمود اپنی یادگار بناتے تھے۔ اسی طرح ہم بھی ذہن کی تسکین کے لیے یادگاریں تیار کرتے ہیں جن پر کروڑوں روپیہ صرف ہو رہا ہے مسٹر جناح کا اتنا بڑا گنبد بنا دیا ہے جس پر کروڑوں روپیہ خرچ آیا ہے۔ لاہور میں مینار پاکستان پر ۲۵ لاکھ روپیہ خرچ آیا لاہور ہی میں اسمبلی ہال کے سامنے سمٹ مینار پر خطیر رقم صرف ہوئی۔ ان چیزوں کا قوم کو کیا فائدہ ہوا۔ ان کی بجائے یونیورسٹی، مدرسہ، مسجد یا ہسپتال بنائے جاتے تو لوگ فائدہ اٹھاتے مگر ہم بھی قوم ثمود ہی کی سنت کو اپنا رہے ہیں اور غریب ملک کا پیسہ برباد کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی یادگاروں کا تو شمار ہی نہیں۔ ہر سال کتنے نئے مزار بنتے ہیں۔ پھر ان پر عرس ہوتے ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ لوگوں کا وقت اور پیسہ برباد کیا جا رہا ہے۔ جس کے پیچھے صرف جھوٹی تسکین کارفرما ہے۔ یہ تو نبی کے فرمان کی خلاف ورزی ہے جس میں آپ نے قبروں کو پختہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

فرمایا فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرو۔ اس کی احسان فراموشی نہ کرو۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ اور زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے نہ چلو۔ سب سے بڑا فساد کفر اور شرک ہے، اس سے باز آجاؤ، نبی کی مخالفت، قیامت کا انکار، برائیوں کا ارتکاب، عیاشی اور فحاشی، دولت کا ضیاع، بلیک مارکیٹ بازی وغیرہ سب فساد فی الارض کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں امن و سکون توحید اور ایمان سے حاصل ہوتا ہے، دین اور شریعت کی پابندی سے سکون ملتا ہے۔ نبی کے اتباع میں آرام اور چین ہے۔ اس کے برخلاف فساد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔

یہ حضرت صالح علیہ السلام کی تقریر تھی جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے کی۔ اب اگلے درس میں قوم کے جواب کا بیان ہوگا۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٧٥﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿٧٦﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٧٧﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ ﴿٧٩﴾

ترجمہ:۔ کہا اُن سرداروں نے جنہوں نے تکبر کیا صالح (علیہ السلام) کی قوم میں سے اُن لوگوں سے جو کمزور خیال کیے جاتے تھے اور جو اُن میں سے ایمان لائے تھے۔ کیا تم جانتے ہو کہ صالح (علیہ السلام) خدا کی جانب سے بھیجا ہوا رسول ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم تو اُس چیز پر ایمان رکھنے والے ہیں جس کے ساتھ اُنہیں (صالح علیہ السلام کو) بھیجا گیا

ہے (۷۵) کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے تکبر کیا تھا کہ بیشک ہم انکار کرنے والے ہیں اُس چیز کا جس پر تم ایمان لائے ہو (۷۶) پھر اُن لوگوں نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے اور سرکشی اختیار کی اپنے رب کے حکم سے۔ اور کہنے لگے اے صالح (علیہ السلام)! لے آ تو ہمارے پاس جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو رسولوں میں سے ہے (۷۷) پس پکڑا اُن کو زلزلے نے پھر ہو گئے وہ اپنے گھروں میں زمین پر گھٹنے ٹیک کر گرنے والے (۷۸) پھر صالح علیہ السلام وہاں سے پلٹے اور انہوں نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تحقیق میں نے پہنچا دیا ہے تم تک اپنے رب کا پیغام۔ اور میں نے تمہارے حق میں خیرخواہی کی ہے، مگر تم نہیں پسند کرتے خیرخواہی کرنے والوں کو (۷۹)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں حضرت صالح علیہ السلام کا ابتدائی ذکر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کی طرف اُن کے خاندان کے فرد کو نبوت و رسالت دے کر مبعوث فرمایا اور انہوں نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ تمام انبیاء کے دستور کے مطابق صالح علیہ السلام نے بھی سب سے پہلے قوم کو توحید کا درس دیا اور کفر و شرک سے منع کیا۔ پھر لوگوں کی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کو اونٹنی بطور نشانی اور معجزہ عطا کی۔ آپ نے فرمایا۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اُس کو برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا۔ یہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے گی مگر تم کو پریشان نہیں کریگی۔ لہٰذا تم بھی اس سے تعرض نہ کرنا ورنہ خدا تعالیٰ کے غضب کا شکار بن جاؤ گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کو احسانات یاد دلائے اور فرمایا کہ دیکھو قوم ہود کی تباہی کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں عروج عطا کیا، تمہیں دولت صنعت و حرفت اور سلطنت عطا کی۔ تم میدانوں میں پہاڑوں کو تراش تراش کر عالیشان

مکان بناتے ہو اور ان کو نقش و نگار سے مزین کرتے ہو یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ان امور کا سلیقہ بتایا لہذا اب اس کی نعمتوں کی ناقدری نہ کرنا اور زمین میں شر و فساد کا بازار گرم نہ کرنا۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت کی دعوت دیں، کفر اور شرک سے منع کریں اور ان کے عقیدے اور عمل کی اصلاح کریں بعض اوقات لوگ رسومات باطلہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو نبی کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ قوم کو ایسی قبیح رسومات سے نجات دلائے شاہ صاحب فرماتے ہیں[1] کہ انبیاء کی بعثت کا ایک اہم مقصد رفع التظالم من بین الناس ہوتا ہے یعنی وہ لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو ختم کرتے ہیں فان تظالمهم يضيق عليهم کیونکہ اگر وہ ایک دوسرے پر ظلم کریں تو ان پر تنگی واقع ہو جاتی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی بعثت کا پورا پورا حق ادا کیا اور لوگوں کو ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی

متکبرین اور مستضعفین میں مکالمہ

صالح علیہ السلام کی تقریر کے جواب میں قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ آپ کی قوم کے سربرآوردہ لوگ جنہوں نے تکبر کیا، وہ کہنے لگے لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا ان لوگوں سے جو کمزور خیال کیے جاتے تھے یعنی جو لوگ مال و دولت اور جاہ و اقتدار کی وجہ سے مغرور ہو چکے تھے انہوں نے غریب اور کمزور لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ مگر اہل ایمان لوگوں سے یوں خطاب کیا أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُرْسَلٌ مِنْ رَبِّهِ کیا تم جانتے ہو کہ حضرت صالح علیہ السلام واقعی اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں قَالُوا تو ایمان والوں نے کہا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ بیشک ہم اس چیز پر ایمان رکھنے

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵ ج ۱ (فیاض)

ہیں جو صالح علیہ السلام کو دے کر بھیجا گیا ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کہ فلاح اور کامیابی صالح علیہ السلام کے پروگرام میں ہی ہے اور وہ پروگرام یہی ہے کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔

ہر نبی کے دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ اولین ایماندار غریب لوگ ہی ہوتے ہیں، امیر لوگ اگر ایمان لائیں بھی تو بڑی دیر کے بعد، ابتدا میں ظلم و ستم کا نشانہ ہمیشہ غریب لوگ ہی بنتے رہے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے بدا الاسلام غریبا و سیعود کما بدا فطوبیٰ للغرباء[1] یعنی اسلام کی ابتداء ہمیشہ غریب لوگوں سے ہوئی اور آخر میں بھی یہ غرباء تک ہی محدود ہو کر رہ جائیگا، لہٰذا غرباء کے لیے خوشخبری ہے۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے کمزور مگر اہل ایمان لوگوں سے اُن کے ایمان کا امتحان لینا چاہا تو وہ کامیاب نکلے مگر سرداران قوم اپنی ضد پر اڑے رہے اور کہنے لگے قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ قوم کے متکبرین نے کہا کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو، ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔

کفر کا معنیٰ انکار کرنا ہے۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرنے سے کفر لازم آتا ہے اگر کوئی شخص دین کے کسی جزو توحید، رسالت، قیامت، ملائکہ یا کتب سماویہ وغیرہ کا انکار کرے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ کفر کا معنی حق بات کو چھپا دینا بھی ہوتا ہے۔ کسان کو بھی عربی زبان میں کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ دانے کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ اِنَّ الَّذِينَ سَتَرُوا الْحَقَّ عِنَادًا جو عناد کی وجہ سے حق کو چھپاتے ہیں وہ کافر ہیں۔ اور شرک یہ ہے کہ

[1] مسلم ص۸۴ ج ۱ (فیاض)

خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کو مانتے ہوئے اس کی صفاتِ مختصہ میں کسی مخلوق کو شریک کرلے۔ وہ بھی کافروں کی طرح ناپاک ہوجاتا ہے۔ منافق کی تعریف یہ ہے کہ وہ زبان سے اقرار کرتا ہے مگر دل سے انکار کرتا ہے۔ اور ملحد وہ شخص ہوتا ہے جو دین میں کج روی اختیار کرتا ہے۔ خدا کی صفات کے ایسے معانی بیان کرتا ہے جو نہ اللہ کی مراد ہوتے ہیں نہ اس کے رسول کی اور نہ باقی اہل ایمان ایسا سمجھتے ہیں۔

اونٹنی کا قتل

اب قوم نے اللہ کی نشانی اونٹنی کو قتل کرنے کی سازش کی، سورۃ نمل میں موجود ہے وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ شہر میں غنڈہ قسم کے نو آدمی رہتے تھے ان کا کام ہی فتنہ فساد برپا کرنا تھا۔ ان میں ایک سرکردہ آدمی قدار بن سالف تھا۔ حضور علیہ السلام نے اس کی مثال مکہ کے ابو زمعہ سے دی جو کہ بڑا شرپسند آدمی تھا۔ تو قدار اونچے خاندان کا فرد تھا، پورا خاندان اور قبیلہ اس کی پشت پر تھا۔ مالدار ہونے کے باوجود ناجائز طریقے سے مال پر قبضہ کر لینا اس کا معمول تھا شہر میں عنیزہ نامی ایک حسین وجمیل عورت رہتی تھی۔ جس کی جوان اور خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ عورت کے پاس بہت سی بھیڑ بکریاں تھیں جسے اللہ کی اونٹنی کی وجہ سے اپنے جانوروں کو پانی پلانے میں دقت پیش آتی تھی ادھر قدار اس عورت اور اس کے مال پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں میں یہ طے ہوا کہ اگر قدار اونٹنی کو قتل کر ڈالے تو عورت اپنی جس لڑکی سے چاہے اس کا نکاح کر دیگی۔ قدار نے اس کا ذکر اپنے ساتھیوں سے کیا اور وہ پروگرام کے مطابق اونٹنی کی گزرگاہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ پھر جب اونٹنی اس راستے سے گزری تو قدار نے آگے بڑھ کر اس پر تلوار سے حملہ کیا اور اس کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ جب وہ اونٹنی گر پڑی تو اس کے باقی ساتھی بھی آ گئے اور انہوں نے اونٹنی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

یہاں پر اسی بات کو ذکر کیا گیا ہے فَعَقَرُوا النَّاقَةَ اُن لوگوں نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ اور انہوں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ اللہ نے تو فرمایا تھا یہ نشانی ہے اس کو بُری نیت سے ہاتھ بھی نہ لگانا مگر انہوں نے اللہ کے حکم کی کچھ پروا نہ کی اور اونٹنی کو قتل کر دیا بلکہ صالح علیہ السلام کو بھی ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ چونکہ آپ کے ساتھ کافی لوگ تھے اس لیے وہ کھلم کھلا آپ کو ایذا نہ پہنچا سکے ایک موقع پر آپ مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے کہ منکرین نے حملہ کر دیا مگر آپ بچ گئے۔

عذابِ الٰہی کا نزول

جب صالح علیہ السلام نے قوم کو اونٹنی کے قتل پر سخت سرزنش کی اور عذابِ الٰہی کی پیش گوئی کی تو کہنے لگے وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اگر تو واقعی رسولوں میں سے ہے تو وہ چیز لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے۔ اتنے بے باک ہو چکے تھے کہ خود عذاب کا مطالبہ کرنے لگے۔ سورۃ ہود میں موجود ہے کہ صالح علیہ السلام نے کہا تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ تین دن تک فائدہ اٹھا لو۔ پھر یہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہوگا اور قوم پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ فرمایا پہلے دن تمہارے چہروں پر زردی چھا جائیگی۔ دوسرے دن سرخ ہو جائینگے اور تیسرے دن سیاہ۔ پھر چوتھے دن تم خدا کی گرفت میں آجاؤ گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔ یہ جمعرات کا دن تھا۔ پھر جمعہ اور ہفتہ بھی گزر گئے اور اتوار کے روز علی الصبح ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا جو دو قسم کا تھا فرمایا فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ایک تو انہیں زلزلے نے آپکڑا۔ سورۃ الذٰریٰت میں آتا ہے فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ ان کو چیخ نے آپکڑا۔ فرشتے نے ایسی خوفناک چیخ ماری کہ لوگوں کے دل اور جگر پھٹ گئے اور ان میں سے کوئی بھی نہ رہ

نہ بچا سوائے ان لوگوں کے جو صالح علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے۔ فرمایا فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ پس وہ ہو گئے اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل گرے پڑے۔ جب زبردست زلزلہ آیا تو زمین پر گر پڑے، دوبارہ اٹھنے کی ہمت نہ رہی۔ اور ساتھ ہی خوفناک چیخ سنائی دی اور وہ وہیں ہلاک ہو گئے۔

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام طائف کے سفر پر گئے تو راستے میں ایک قبر سے گزرے جس پر آتے جاتے لوگ پتھر مارتے تھے۔ آپ نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ کیا تمہیں معلوم ہے ایسا کیوں ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ قوم ثمود کے ایک آدمی ابو رغال کی قبر ہے۔ جب اس قوم پر عذاب آیا تو یہ شخص حرم مکہ میں تھا جس کی وجہ سے عذاب سے تو بچ گیا مگر جب وہ طائف جانے کے لیے حرم سے باہر نکلا تو اس مقام پر اس شخص کو ویسی ہی چیخ سنائی دی جیسی اس کی قوم پر آئی تھی اور یہیں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی ایک خاص نشانی یہ ہے کہ اس کی لاش کے ساتھ اس کی سونے کی چھڑی بھی دفن کر دی گئی تھی۔ چنانچہ صحابہؓ نے وہاں پر کھدائی کی تو لاش تو گل سڑ کر ختم ہو چکی تھی البتہ سونے کی چھڑی مل گئی۔ بہرحال اس عذاب میں پوری قوم ثمود نیست و نابود ہو گئی اور صرف وہی لوگ بچے جو صالح علیہ السلام کے متبعین میں شامل ہو چکے تھے۔

قتل ناقہ اور شہادت علیؓ

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ پہلی امتوں میں قدار ابن سالف بڑا بدبخت آدمی تھا جس نے اللہ کی نشانی اور معجزے اونٹنی کو تلوار سے قتل کیا اور اس امت میں بڑا بدبخت وہ شخص ہوگا جو تیرے سر پر تلوار چلا کر تیری داڑھی کو رنگین کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت علیؓ صبح کی نماز کے لیے کوفے کی جامع مسجد کی طرف نکلے۔

مسجد کے دروازے کے قریب عبدالرحمٰن بن ملجم خارجی چھپا ہوا تھا اس نے تلوار سے حضرت علیؓ کے سر پر وار کیا جس سے سر سے خون نکلا اور داڑھی مبارک رنگین ہو گئی۔ اونٹنی کے قتل اور حضرت علیؓ کی شہادت میں اس لحاظ سے بھی مماثلت پائی جاتی ہے کہ اونٹنی کے قتل کی وجہ بھی عنیزہ نامی عورت تھی اور حضرت علیؓ پر وار کرنے کے لیے بھی قطامہ نامی عورت نے عبدالرحمٰن کو ابھارا تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسانی جذبات میں سے سب سے خسیس جذبہ شہوت کا ہوتا ہے یہ دونوں واقعات اسی جذبہ کی تسکین کی خاطر رونما ہوئے۔

حضرت علیؓ کے قتل کو خوارج بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں چنانچہ عمران بن قطان خارجی شاعر کہتا ہے۔

يَا ضَرْبَةً مِّنْ تَقِيٍّ مَا اَرَادَ بِهَا ۔۔۔ اِلَّا لِيَبْلُغَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ رِضْوَانًا
اِنِّي لَاَذْكُرُهُ حِيْنًا فَاَحْسِبُهُ ۔۔۔ اَوْفَى الْبَرِيَّةِ عِنْدَ اللّٰهِ مِيْزَانًا

مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے حضرت علیؓ کے سر پر تلوار سے وار کیا وہ اللہ کا قرب تلاش کر رہا تھا۔ جب میں اس کا ذکر کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بہت اچھا کام کیا۔

مگر حضرت علیؓ کی شہادت سے وہ خلافت راشدہ ختم ہو گئی ہے جسے حضور علیہ السلام نے علیٰ منہاج النبوۃ فرمایا تھا۔

اہل ایمان کی علیحدگی

جب ساری قوم ہلاک ہو گئی تو حضرت صالح علیہ السلام اور آپ کے چار ہزار یا چھ ہزار ساتھی وہاں سے چل دیے۔ ان میں ایک مالدار آدمی بھی تھا جو اہل ایمان کی خدمت کیا کرتا تھا مگر اس کی بیوی اس سلوک کو پسند نہیں کرتی تھی چنانچہ اس نے علیحدگی اختیار کر لی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گیا اور عذاب الٰہی سے بچ گیا۔ فرمایا فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ پھر صالح علیہ السلام وہاں سے پلٹے اور اپنی ہلاک شدہ قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ

اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَۃَ رَبِّیْ اے میری قوم! میں نے تو تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا۔ بیس سال تک تمہیں وعظ کرتا رہا۔ میں نے تبلیغ کا پورا پورا حق ادا کر دیا وَنَصَحْتُ لَکُمْ اور تم سے پوری پوری خیر خواہی کی ۔
بعض اوقات ایسی بات تاسف کے طور پر کی جاتی ہے کہ دیکھو! میں نے تمہیں کتنا سمجھایا، ہر طرح سے تمہیں بچانے کی کوشش کی مگر تم نے میری ایک نہ مانی اور آج تباہ و برباد ہو کر رہ گئے ہو۔ اللہ کا ہر نبی اپنی امت کے لیے نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ہوتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس کی قوم عذاب کا شکار ہو مگر قوم کی بدقسمتی کہ وہ نبی کی تکذیب کر کے سزا میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔ دنیا میں جو کوئی خیر خواہی کی بات کو ٹھکراتا ہے وہ ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتا ہے قرآن میں عبرت کے لیے بہت سے واقعات مذکور ہیں۔ آگے آ رہا ہے "فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُجْرِمِیْنَ" دیکھو! مجرمین کا کیسا برا حشر ہوا۔

سماعِ موتیٰ

حضرت صالح علیہ السلام کا یہ خطاب اپنی نافرمان ہلاک شدہ قوم سے تھا مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ بیان القرآن کے حاشئے پہ لکھتے ہیں کہ اس آیت کے ظاہری الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ مردے سنتے ہیں۔ اس کی مثال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمل سے بھی ملتی ہے۔ جنگ بدر کے خاتمے پر آپ نے کفار کے مدفن (قلیب) پہ کھڑے ہو کر فرمایا تھا، اے ابوجہل، اے عتبہ، اے شیبہ، اے فلاں ہم نے تو اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا، کیا تم نے بھی خدا کے وعدے کو سچا پایا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا حضور! آپ بے جان لاشوں سے خطاب کرتے ہیں، فرمایا اللہ کی قسم اس وقت یہ تم سے زیادہ سنتے ہیں۔ مگر جواب نہیں دے سکتے۔ سماعِ موتیٰ کے مسئلہ میں امت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض انکار کرتے ہیں مگر اکثر اس کے قائل ہیں۔ تاہم سننے سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ چونکہ وہ سنتے ہیں اس لیے ان سے حاجتیں طلب کرتے

نگیں یا وہ کوئی جواب دے سکتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے قبرستان میں جاکر مردوں کو سلام کرتے ہیں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ۔ امام ابن کثیرؒ نے حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ قبرستان جاؤ تو یوں کہا کرو اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ۔ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ سلام ہو تم پر اے مومن قوم کی بستی کے رہنے والو! اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ اللہ ہمیں اور تمہیں معاف کرے۔ بہر حال حضرت صالح علیہ السلام نے بھی مردوں سے اسی طرح کلام کیا جس طرح زندوں سے کیا جاتا ہے۔

باہمی ہمدردی کا فقدان

انبیاء علیہم السلام کے اسوہ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا سلوک کرے سابقہ ادوار میں محدود وسائل کے باوجود مسلمانوں نے خیر خواہی کے بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ میں ہنولر لو شہر میں گیا تو وہاں پر ۲۲ مدرسے مردوں کے اور ۱۳ عورتوں کے تھے جو نہایت کامیابی سے چل رہے تھے۔ اس شہر میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو حافظ قرآن نہ ہو۔ آٹھویں صدی میں مسلمانوں نے اتنا کام کیا۔ دمشق میں عورتوں کے دو مدرسے تھے۔ دو عورتیں خود محدث تھیں اور علم حدیث پڑھاتی تھیں۔ ان مدرسوں میں ہزاروں آدمی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مگر آج وہ چیز کہاں ہے آج کا مولوی شر پسند بن چکا ہے۔ چند حدیثیں پڑھ کر وعظ کرنے لگتا ہے۔ نہ کوئی تعلیم، نہ تحقیق، نہ اخلاق نہ دیانت۔ محض لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ آج اہل ثروت مسلمانوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ ساری دولت اپنے عیش و آرام کے لیے خرچ کی جا رہی ہے۔ نہ کوئی مدرسہ نہ یونیورسٹی، نہ ہسپتال الا ماشاء اللہ۔ تاہم اکثریت دین سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اس وقت دنیا عجیب مخمصے میں پھنسی ہوئی ہے

ان کی اکثریت بشمول مسلمان سوشلسٹ پارٹی کے ممبر ہیں۔ ہر قسم کا شر و فساد، حیاتی اور بدمعاشی ان میں پائی جاتی ہے۔ بے ایمانی، فراڈ، تجارتی بددیانتی، وہ کون سا بڑا کام ہے جو مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا۔ کیا خیر خواہی کا یہی تقاضا ہے؟ یہ تو انبیاء کا مشن تھا جسے بھلا دیا گیا ہے۔ کوئی پھٹے پرانے کپڑوں والا آجاتا تو حضور علیہ السلام بے چین ہو جاتے۔ لوگوں کو اکٹھا کر کے خطبہ ارشاد فرماتے کہ لوگو! صدقہ کرو، یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، ان کو لباس مہیا کرو۔ آپ کے توجہ دلانے پر ہر شخص حسب توفیق ضرورت مند کی خدمت کرتا ہے۔

بہر حال حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے مردہ لوگوں سے خطاب فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیغام تم تک پہنچا کر خیر خواہی کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا مگر تم نے میری بات نہ مانی اور آج عذاب کا شکار ہو چکے ہو۔ اگر تم میری بات مان جاتے تو اس دنیا میں بھی سرخرو ہو جاتے اور آخرت کے دائمی عذاب سے بھی بچ جاتے مگر افسوس کہ تم اسی دنیا میں خدا تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بن گئے اور آخرت میں بھی دائمی عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ میں نے تو خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔
وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ
مگر تمہاری حالت یہ ہے کہ تم خیر خواہی کرنے والوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔
فرعون کے واقعہ میں بھی ایسا ہی آتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو ہر چند سمجھانے کی کوشش کی اور ان کے ساتھ پوری پوری ہمدردی کی مگر قوم نہ مانی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم غرق ہو گئی۔ تو حضرت صالح علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ اے میری قوم میں نے اپنا فرض پورا کر دیا، تم پر حجت تمام کر دی مگر تم ہمیشہ میری بات کو ٹھکراتے رہے جس کا نتیجہ تمہاری تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڮ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ ع۱۰

ترجمہ :- اور (ہم نے) لوط (علیہ السلام) (کو رسول بنا کر بھیجا)۔ جب کہا انہوں نے اپنی قوم سے (اے لوگو!) کیا تم بے حیائی کا ایسا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا جہان والوں میں سے (۸۰) بیشک تم دوڑتے ہو مردوں پر شہوت رانی کرتے ہوئے عورتوں کو چھوڑ کر۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے) کہ تم لوگ حد سے گزرنے والے ہو (۸۱) اور نہیں تھا جواب اُن کی قوم کا مگر یہ کہ انہوں نے کہا نکال دو اِن کو اپنی بستی سے بیشک یہ لوگ ہیں جو پاک بنتے ہیں (۸۲) پس ہم نے نجات دی لوط (علیہ السلام) اور اُن کے گھر والوں کو مگر اُس کی بیوی کو، کہ تھی وہ پیچھے رہنے والوں میں سے (۸۳) اور برسائی

ہم نے اُن پر (ایک خاص قسم کی) بارش۔ پس دیکھو کیا
انجام ہوا مجرموں (گنہگار) کا (۸۴)

رابطہ آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ حضرات نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کے تاریخی واقعات بیان کر چکے ہیں جن کے ذریعے اہل ایمان کو جرأت دلائی جا رہی ہے کہ دیکھو! اللہ کے انبیاء نے کتنے نامساعد حالات میں بھی دین کی خدمت کی اور خدا کا پیغام اپنی اپنی قوموں تک پہنچایا۔ یہ واقعات اگرچہ اجمالاً بیان کیے گئے ہیں تاہم مقصد یہ ہے کہ امت آخر الزمان کو بھی یہ واقعات پیش نظر رکھ کر دین کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔ اس سورۃ میں حضرت صالح علیہ السلام کے بعد حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم کا حال بیان فرمایا ہے۔ وَلُوْطًا اس کا عطف بھی لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا پر ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی تقریر اور قوم کے جواب کا تذکرہ فرمایا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے آپ کا تعلق کلدانی خاندان سے ہے۔ آپ کا اور ابراہیم علیہ السلام کا وطن مالوف بابل ہے جو موجودہ بغداد سے ساٹھ ستر میل دور تقریباً سو مربع میل پر پھیلا ہوا بہت بڑا شہر تھا۔ یہ شہر کلدانیوں اور آشوریوں کا دارالخلافہ رہا ہے، بڑا متمدن شہر تھا۔ ابراہیم علیہ السلام اسی شہر میں پیدا ہوئے، جوان ہوئے تو اللہ کی طرف سے نبوت عطا ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچایا مگر آپ کی بیوی سارہ اور بھتیجے لوط علیہ السلام (جو اس وقت بچے تھے) کے سوا کوئی شخص ایمان نہ لایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ" (العنکبوت) مردوں میں صرف لوط علیہ السلام آپ پر ایمان لائے پھر اللہ تعالیٰ نے ہجرت کر جانے کا اشارہ فرمایا تو ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور لوط علیہ السلام کے ساتھ بابل سے نکل کھڑے ہوئے پہلے مصر پہنچے وہاں سے ایک خادمہ ہاجرہ بھی مل گئی جسے ساتھ آپ نے بعد میں نکاح کر لیا پھرتے پھرتے کسی مقام پر حضرت لوط علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی اور حکم ہوا کہ شرق اردن میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچاؤ یہ بھی اُس

زمانے میں بڑا متمدن علاقہ تھا۔ امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس علاقے میں چار بڑے بڑے شہر تھے جن کی آبادی چار لاکھ سے کم نہ تھی۔ یہ شہر سدوم، عامورہ، ادوما اور صعورا تھے۔ سدوم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہ دارالخلافہ تھا بڑا سرسبز علاقہ تھا کھیتی باڑی اور باغات عام تھے۔ تجارت بھی وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو اہل سدوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ آپ کا سلسلہ نسب لوط بن ہاران بن تارخ یا آزر ہے۔

مشترک اور متفرق جرائم

جن جن اقوام کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء مبعوث فرمائے ان میں بعض مشترک جرائم تھے اور بعض مختلف۔ کفر اور شرک تمام اقوام کا مشترک جرم ہے۔ اس میں سب لوگ ہی مبتلا رہے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے ہر نبی کی پہلی دعوت یہی ہوتی تھی۔ "یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ"[۱] اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بعض جرائم مختلف اقوام میں مختلف رہے ہیں مثلاً شعیب علیہ السلام کی قوم تجارتی بددیانتی کا شکار تھی، وہ ناپ تول میں کمی بیشی کرتے تھے۔ ہود علیہ السلام کی قوم میں غرور و تکبر کی فراوانی تھی، صالح علیہ السلام کی قوم اسراف و تبذیر کا شکار تھی، بے جا عمارتیں بناتے تھے اور لہو و لعب میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح قوم لوط فعل خلاف وضع فطری یعنی اغلام بازی میں ملوث تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کے تذکرے میں ان کی قوم کی اس قبیح بیماری لواطت یا سدومیت کا ذکر بھی آتا ہے۔ زنا اور لواطت ملتے جلتے جرائم ہیں مگر لواطت زنا سے بھی شدید تر جرم ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یہ فعل طبعاً عقلاً اور شرعاً ہر لحاظ سے قبیح ہے۔ زنا قطعاً حرام ہے اگرچہ وہ طبعی محل میں ہوتا ہے، مگر لواطت کا تعلق تو غیر طبعی محل سے ہے، لہٰذا یہ تو زنا سے بھی بڑا جرم ہے۔ کہتے ہیں کہ اس علاقے میں باغات عام تھے لوگ ان کا پھل توڑ لیتے تھے جن میں بچے بھی ہوتے تھے۔ شیطان نے ان کو یہی پڑھائی کہ بچوں سے یہ

فعل کرو تو وہ پھل توڑنے سے باز آجائیں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس طرح اس فعل بد کی ابتدا ہوئی۔ قوم لوط سے پہلے یہ بیماری کسی قوم میں نہ تھی۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ عادی ہو گئے حتیٰ کہ ان کی فطرت سلیمہ ہی مسخ ہو کر رہ گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کی طرف التفات ختم ہو گیا اور شہوت رانی مردوں کے ذریعے ہونے لگی

فحاشی کا ارتکاب

نیکی کا حکم اور برائی سے امتناع ہر نبی کے فرائض منصبی میں شامل رہا ہے تمام نبی لوگوں کو برائیوں سے روکتے رہے۔ کفر شرک کے علاوہ مخصوص برائیوں کے خلاف بھی انبیائے کرام آواز اٹھاتے رہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے نے بھی اپنا فرض ادا کیا۔ اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ کیا تم ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو۔ مَا سَبَقَکُمْ بِھَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ کہ تم سے پہلے جہان بھر میں یہ کام کسی نے نہیں کیا۔ یہاں پر لواطت کو بے حیائی کہا گیا ہے جب کہ زنا کو بھی اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً (بنی اسرائیل) زنا کے قریب نہ جاؤ کہ بیشک یہ بے حیائی ہے۔ قرآن پاک میں بخل کو بھی فحش کہا گیا ہے کیونکہ ذہنی طور پر وہ بھی فحاشی ہوتی ہے۔ عملی طور پر زنا بھی فحش ہے اور لواطت اس سے بڑھ کر مولانا عبید اللہ سندھیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ لواطت انتہائی خلاف طبع بات ہے کہ جانوروں میں بھی نہیں پائی جاتی، ماسوائے بندر کے۔ یہی وجہ ہے کہ جن قوموں کی اللہ نے سزا کے طور پر شکلیں بدل دیں، انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا۔ بندر اور خنزیر دونوں غلیظ جانور ہیں اللہ تعالیٰ نے شہوانی خواہش کی تکمیل کے لیے مرد کے مقابلے میں عورت کو پیدا کیا ہے مگر اس بدترین فعل کے اولین مرتکب قوم لوط ٹھہری۔ چنانچہ لوط علیہ السلام نے صریح لفظوں میں اپنی قوم سے فرمایا اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَہْوَۃً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ

تم مردوں پر شہوت رانی کرتے ہوئے دوڑتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر دوسری جگہ کو جو درست ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے عورتیں پیدا کی ہیں تاکہ نکاح کر کے اپنے طبعی تقاضے پورے کرو۔ فرمایا تم نے جائز ذریعہ چھوڑ کر غیر فطری طریقہ اختیار کیا بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۔

شہوت رانی کے جائز ذرائع

اللہ تعالیٰ نے انسان میں میلانِ شہوانی دو مقاصد کے لیے پیدا کیا ہے ایک تو نفسانی خواہش کی تکمیل ہے اور دوسرے نسلِ انسانی کا بقا ہے۔ شہوانی مادہ انسان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے اسی لیے دعا میں کہا گیا ہے اللھم انی اعوذ بک من شر منی اے اللہ! میں مادہ شہوت سے تیری پناہ پکڑتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طبعی خواہش کو پورا کرنے کے لیے عورتوں سے نکاح کا حکم دیا ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء) منکوحہ عورتوں کے علاوہ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے مطابق لونڈیوں سے بھی طبعی خواہش پوری کی جا سکتی ہے اس زمانے میں چونکہ لونڈیوں کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لیے نکاح ہی واحد ذریعہ ہے جس سے انسان طبعی تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ فرمایا فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (المعارج) اس کے علاوہ اگر کوئی دیگر راستہ اختیار کرے گا تو وہ تعدی کرنے والا ہوگا۔

اغلام بازی کی طرح جانوروں کے ساتھ خلاف وضع فطری فعل کا ارتکاب بھی قطعاً حرام ہے۔ اسی طرح مشت زنی کے ذریعہ مادہ منویہ کو خارج کرنا بھی ملعون ہے۔ گویا جائز طریقہ صرف نکاح ہے۔ حضور نے فرمایا کہ نکاح وہ بابرکت ہے جس میں تکلف نہ ہو۔ سہل اور آسان طریقے سے نکاح کرو تاکہ برائیوں کا تدارک ہو سکے۔ ہمارے ہاں تو نکاح کو سخت مشکل بنا دیا گیا۔ لمبا چوڑا جہیز، بلاوجہ لاتعداد جوڑے اور زیورات اور پھر پرتکلف دعوتیں ایسی قباحتیں ہیں جو نکاح کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ ان

غلط رسومات کی وجہ سے ۲۰ سال ۲۵ سال تک بچے بچیاں نکاح سے محروم رہتے ہیں جس کی وجہ سے طرح طرح کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اُدھر تعددِ ازدواج پر بھی پابندی ہے، حالانکہ نکاح کو عام کرنے کا حکم ہے تاکہ فحاشی کو پھیلنے کا موقع ہی نہ ملے۔ تندرست آدمی ہو، کمائی کر سکتا ہو، نمازی اور دیانتدار ہو، بس کافی ہے نکاح کر دو۔ جہیز کی لعنت نے تو نکاح کو محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ جب اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں تو پھر یہ مکروہ تحریمی بن جاتا ہے حضور علیہ السلام کا اسوہ ہمارے پاس موجود ہے، اس کے مطابق نکاح کرو یہ جہیز وغیرہ نہ تو فرض واجب ہے اور نہ سنت۔ آخر ہم نے خود اپنے آپ پر کیوں پابندیاں عائد کر لی ہیں؟ انہی پابندیوں کی وجہ سے فحاشی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے خلاف وسیع پیمانے پر جہاد کی ضرورت ہے۔

قوم لوط کا سلوک

جب لوط علیہ السلام نے قوم کو اس بے حیائی سے منع کیا وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ تو نہیں تھا قوم کا جواب إِلَّا أَنْ قَالُوا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ ان کو یعنی لوط علیہ السلام اور آپ کے ماننے والوں کو اپنے شہر سے نکال باہر کرو۔ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ یہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ انہیں ہم گنہگاروں کی بستی سے کیا سروکار، انہیں یہاں سے کسی اچھی جگہ چلے جانا چاہئے۔ لوط علیہ السلام نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِينَ (الشعراء) میں تو تمہارے عمل سے نفرت کرتا ہوں۔ آپ دعا کرتے تھے رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ (الشعراء) اے پروردگار! مجھے اور میرے اہل کو ان کے قبیح فعل سے نجات دے۔ آپ اس متمدن علاقے میں عرصے تک تبلیغ کرتے رہے جس کے جواب میں قوم نے سخت مخالفت کی۔ آپ کو مارا پیٹا، گالیاں دیں، آپ پر پتھر برسائے اور آپ کا تمسخر اڑایا مگر ان میں سے کوئی بھی

ایمان نہ لایا۔ آپ کی دو بچیاں ایماندار تھیں۔ باقی ساری قوم بمعہ آپکی بیوی آپکے خلاف تھے۔ جب آپ نے ہجرت کی تو اس وقت دو جوان بچیاں آپکے ساتھ تھیں۔

فرمایا فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ ہم نے نجات دی لوط علیہ السلام اور آپ کے اہل یعنی دو بچیوں کو اِلَّا امْرَاَتَهٗ ماسوائے بیوی کے وہ بھی عذاب الٰہی سے بچ نہ سکی کَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ کیونکہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی۔ اس نے لوط علیہ السلام کے ساتھ تو ہجرت نہیں کی۔ اسکی تفصیل سورۃ حجر میں موجود ہے۔ اللہ نے فرمایا "فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ" لے لوط علیہ السلام! رات کے ایک حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جائیں وہاں بھی آگے ہے "اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ" مگر بیوی نہیں جائے گی وہ بھی پیچھے رہنے والوں میں ہوگی اور عذاب کا شکار بنے گی۔

قوم پر عذاب

جب لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کو لے کر بستی سے نکل گئے تو فرمایا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ہم نے ان پر خاص قسم کی بارش برسائی، جس میں پتھر برسے، سورۃ ہود میں اسکی تفصیل موجود ہے۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ۔ ہم نے پتھروں سے بارش کی اور پتھر بھی ایسے مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ جن پر نشان لگے ہوئے تھے کہ یہ پتھر فلاں آدمی کے سر پر لگے گا اور یہ فلاں کو ہلاک کرے گا۔ اس کے ساتھ آتش فشانی کی کیفیت بھی تھی۔ جس طرح آتش بازی کی صورت میں شعلے نکلتے ہیں، اسی طرح آگ کے شعلے بھی نکل رہے تھے اور پتھروں کی بارش بھی ہو رہی تھی اس طرح وہ قوم ہلاک ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں بھی عذاب نازل کیا ہے وہاں یہ ایسا ہی ذکر کیا ہے کہیں پتھر برسائے، کہیں زلزلہ آیا، کہیں ہوا کو مسلط کیا، کہیں طوفان آیا اور کہیں چیخ نے کام تمام کر دیا۔ اللہ نے مختلف

اقوام پر مختلف طریقوں سے عذاب نازل کیا۔ فرمایا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ. دیکھو! مجرموں کا کیسا انجام ہوا۔ بُرے کاموں کا ہمیشہ بُرا ہی انجام ہوتا ہے۔ قوم لوط نہایت ہی قبیح فعل کی مرتکب ہوئی بلکہ ہم جنسی کے موجد ہی وہ تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت ہی سخت عذاب کے ذریعے ہلاک کیا۔ جو بھی اللہ کی نافرمانی کرے گا، وہ بالآخر خدا تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ اگر کسی طرح دنیا میں بچ گیا تو برزخ اور آخرت میں تو بہر حال پکڑا جائیگا۔

لواطت کی شرعی سزا

لواطت کی شرعی سزا کے متعلق فقہائے کرام اور محدثین میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں زنا کے تو کئی واقعات پیش آئے اور مجرمین پر حد بھی جاری کی گئی مگر لواطت کا کوئی کیس پیش نہیں آیا، نہ آپ نے ایسا کوئی معاملہ نمٹایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس فعل شنیع کی سزا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت جسے ترمذی، ابوداؤد اور امام احمد نے اپنی اپنی کتب میں نقل کیا ہے، کے مطابق لواطت کی سزا یہ ہے کہ فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے مگر امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں کلام ہے۔ اس کے راوی ضعیف ہیں، لہٰذا یہ صحیح نہیں ہے۔ البتہ حضور علیہ السلام نے فرمایا مَنْ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ فَهُوَ مَلْعُونٌ یعنی جو کوئی قوم لوط کا عمل انجام دیگا وہ ملعون ہے مگر اس حدیث میں قتل کرنے کا حکم نہیں۔

حضرت سعید ابن مسیبؒ، عطاؒ، امام حسن بصریؒ، امام ابراہیم نخعیؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ وغیرہم فرماتے ہیں کہ لواطت کی سزا زنا کی سزا کے برابر ہے یعنی شادی شدہ کو سنگسار کیا جائیگا، اور غیر شادی شدہ کو سو کوڑے مارے جائیں گے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ اس فعل کے پہلی دفعہ مرتکب کے لیے سزا نہیں ہے اور

اگر دوسری دفعہ پھر یہ فعل کرے تو اُسے زانی کے برابر سزا دی جائے۔ امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ کا مذہب یہ ہے کہ ہم جنسی کرنے والا شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اُسے ہر حالت میں سنگسار کر دینا چاہیئے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ لوطی کو ہر حالت میں قتل کر دو۔ یہ سب تعزیرات ہیں جو مختلف فقہائے کرام نے بیان کی ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ فعل لواطت کی حد نہیں بلکہ تعزیر ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ لواطت میں حد نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے جو کہ مسلمان حاکم وقت کی صوابدید پر ہے کہ وہ عمر قید کی سزا دے، سزائے موت دے یا کوڑے لگوائے۔ چنانچہ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں وقد ذهب الامام ابوحنيفة الى ان من... شاهق و يتبع بالحجارة كما فعل بقوم لوط یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ اس طرف گئے ہیں کہ لواطت کے مرتکب کو کسی اونچی جگہ سے گرا کر اُوپر پتھر بھی مارنے چاہئیں کیونکہ اللہ نے قوم لوط کو یہی سزا دی تھی۔ اس مسئلہ میں بعض حضرات امام صاحبؒ کو مطعون کرتے ہیں کہ ہدایہ میں لکھا ہے کہ لواطت کی حد نہیں ہے حالانکہ یہ بھی لکھا ہے کہ تعزیر ہے۔ اور تعزیر میں سخت ترین سزا بھی دی جاسکتی ہے جیسا کہ امام صاحبؒ کا مسلک ہے کہ کسی اونچے مینار سے گرا کر پتھر بھی مارو۔ بہرحال امام صاحبؒ سزا کے قائل ہیں۔

صاحب مشکوٰۃ نے مسند رزین کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ نے احرقهما یعنی لواطت کرنے والے دونوں کو آگ میں جلا ڈالا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق آتا ہے هدم عليهم حائطا آپ نے مجرموں کو دیوار کے نیچے کھڑا کر کے اوپر دیوار گرا دی۔ مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے کیس خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں پیش آئے تو انہوں نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق تعزیر

ـــــــــــــــــــــــ
لے ابن کثیر صفحہ ۲۴۵ ج ۲ (فیاض)

لگائی کیونکہ اس جرم کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

حضرت جابرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا انی اخاف علی امتی من عمل قوم لوط مجھے اپنی امت سے زیادہ خطرہ ہے کہ وہ قوم لوط والے عمل میں ملوث نہ ہو جائے۔ اس شنیع فعل کے موجد قوم لوط کے لوگ ہیں۔ اس سے پہلے یہ کام نہ عرب میں تھا اور نہ عجم میں مگر جس بات کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطرہ تھا، وہی ہوئی۔ اب یہ فعل ساری دنیا میں پایا جاتا ہے حتیٰ کہ برطانوی پارلیمنٹ نے تو یہ قانون پاس کر دیا ہے کہ اگر دو بالغ مرد باہمی رضامندی سے ہم جنسی کا ارتکاب کرتے ہیں تو اُن پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا۔ البتہ اگر یہ فعل کسی کے ساتھ زبردستی کیا جائے تو پھر قابلِ مواخذہ ہے۔ خنزیر کھانے والے لوگ اسی طرح بے غیرت ہوتے ہیں۔ انگریز اور سکھ دونوں قومیں خنزیر کا گوشت کھاتی ہیں اور دونوں پرلے درجے کی بے حیا ہیں۔ ان لوگوں کو زنا کے متعلق بھی یہی نظریہ ہے کہ اگر رضامندی سے کیا جائے تو کوئی گرفت نہیں اور اگر بالجبر (RAPE) ہو تو پھر جرم ہے۔

شہوت رانی کے ناجائز ذرائع

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ عورت کے مقام مکروہ سے مجامعت کرنا بھی قطعی حرام ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے ملعون من اتی امرأۃ فی دبرھا ایسا شخص ملعون ہے۔

ترمذی شریف[1] میں یہ بھی آتا ہے من اتی حائضا او امرأۃ فی دبرھا او کاھنا فصدقہ فقد کفر بما انزل علی محمد جس شخص نے حائضہ عورت سے مجامعت کی یا عورت کے ساتھ قوم لوط کا عمل کیا یا کاہن کے پاس گیا اور اس کی باتوں کی تصدیق کی اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ چیز

[1] ترمذی ص۱۹ ج۱ (فیاض)

کا انکار کیا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عباس سے ترمذی شریف میں منقول ہے من اتی بھیمۃ فلاحد علیہ جس نے کسی جانور سے فعل بد کا ارتکاب کیا اس پر حد نہیں ہے۔ البتہ تعزیر ہوگی یہی قول امام ابوحنیفہ رح کا ہے جس حدیث میں آتا ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی جانور کے ساتھ ملوث پایا جائے تو دونوں کو قتل کر دو یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ فعل بہرحال حرام ہے اور مرتکب شخص ملعون ہے۔ شیخ عبدالحق رح اپنی کتاب لمعات میں لکھتے ہیں کہ چاروں آئمہ اس بات پر متفق ہیں کہ جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے والے پر حد نہیں ہے یہی مسلک امام ابوحنیفہ رح کا ہے۔

مولانا مودودی کا سہو

مولانا مودودیؒ نے حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق آیت ۸۰ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

"اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے"

مولانا کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے نبوت کو عام سرکاری ملازمت یا سول سروس پر قیاس کیا ہے۔ گویا لوط علیہ السلام پہلے ٹریننگ حاصل کرتے رہے اور اس کے بعد منصب نبوت پر فائز ہوئے۔ ایسی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے انبیاء کا انتخاب کرتا ہے وہ ان کی صلاحیتوں سے واقف ہوتا ہے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام) وہ جانتا ہے کہ منصب رسالت کو کہاں رکھتا ہے اور پھر اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ نبوت عطا ہونے سے پہلے خود نبی کے علم میں بھی نہیں ہوتا کہ اُسے کس منصب پر سرفراز ہونا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کے متعلق واضح طور پر موجود ہے "مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ" (الشوریٰ)

نبوت سے پہلے آپ کو کتاب وایمان کا علم نہیں تھا۔ پھر جب نبوت عطا ہو جاتی ہے تو نبی کو حکم ہوتا ہے ”بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ“ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا جاتا ہے اس کو پہنچا دیں ”فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ“ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو حق رسالت ادا نہیں کیا۔ بہرحال یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ جس کو چاہے نبوت و رسالت کے لیے منتخب فرمائے اور پھر جسے اس منصب کے لیے منتخب فرماتا ہے اس کی تربیت اور حفاظت کا انتظام بھی خود ہی فرماتا ہے کسی نبی کے لیے کسی دوسری جگہ سے تربیت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ
مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن
رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا
النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ
بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن
كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٨٥﴾ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ
تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ
بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا
فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨٦﴾
وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ
بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ
يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿٨٧﴾

ترجمہ :- اور مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب (علیہ السلام)
کو (ہم نے رسول بنا کر بھیجا) انھوں نے کہا ، اے میری قوم
کے لوگو ! عبادت کرو اللہ کی ۔ نہیں ہے تمہارے لیے
اُس کے سوا کوئی الٰہ ۔ تحقیق آئی ہے تمہارے پاس کھلی
نشانی تمہارے رب کی طرف سے ۔ پس پورا کرو ماپ اور

تول اور نہ گھٹاؤ لوگوں سے اُن کی چیزوں کو اور نہ فساد کرو
زمین میں اس کی اصلاح کے بعد ۔ یہ بات تمہارے لیے بہتر
ہے اگر تم ایمان والے ہو (۸۵) اور نہ بیٹھو ہر راستے میں
کہ ڈراتے ہو تم لوگوں کو اور روکتے ہو اللہ کے راستے
سے جو ایمان لایا ہے اس پر اور تلاش کرتے ہو تم
اس راستے میں کجی ۔ اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے تعداد
میں ، پس اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا اور دیکھو کیسے ہوا
انجام فساد کرنے والوں کا (۸۶) اور اگر تم میں سے ایک
گروہ ایمان لایا ہے اُس چیز پر جس کے ساتھ میں بھیجا
گیا ہوں اور ایک گروہ ایسا ہے جو ایمان نہیں لایا پس
صبر کرو یہاں تک کہ فیصلہ کر دے اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان
اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (۸۷)

ربط آیات

تبلیغ رسالت کے سلسلے میں اس سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام ،
حضرت ہود علیہ السلام ، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کا تذکرہ
ہو چکا ہے ۔ اب پانچویں نمبر پہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کا حال
بیان فرمایا ہے ۔ اگرچہ ان انبیاء کی پوری تفصیلات تو یہاں بیان نہیں کی گئیں تاہم
یہ اُن کی تاریخ کے بعض اہم حصے ہیں شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم کے واقعات
سورۃ ہود ، سورۃ شعراء اور بعض دیگر سورتوں میں بھی بیان ہوئے ہیں ۔ اِن واقعات
سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء نے کس قدر نامساعد حالات میں
تبلیغ کا حق ادا کیا اور لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچایا ۔ امت آخر الزمان کو ترغیب
دلائی گئی ہے کہ وہ بھی تبلیغ دین کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائیں اور لوگوں سے
پوری پوری خیر خواہی کا اظہار کرتے ہوئے اللہ کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے تک

پہنچا دیں۔ سلسلہ تبلیغ کی آخری کڑی حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ہے جو اس باب کے آخر میں بیان ہوگی۔

حضرت شعیب علیہ السلام

ارشاد ہوتا ہے وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ہم نے مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ یہ بھی اس کے باب کے ابتدائی الفاظ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ پر عطف ہے۔ اس لیے یہاں پر لَقَدْ أَرْسَلْنَا کے الفاظ محذوف ہیں۔ مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام ہے جو آپ کی بیوی قتورا کے بطن سے تھا۔ اسی نام سے بعد میں ایک قبیلہ مشہور ہوا اور جس بستی یا علاقے میں وہ مقیم تھے اس کا نام بھی مدین پڑ گیا۔ شعیب علیہ السلام اسی مدین کی اولاد میں سے تھے، اسی علاقے اور بستی میں پیدا ہوئے، آپ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ اسی لیے یہاں پر فرمایا کہ ہم نے مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے سلسلہ نسب میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم محمد ابن اسحاق کے مطابق شجرہ نسب اس طرح ہے شعیب علیہ السلام بن میکائیل بن یشجر بن مدین بن ابراہیم علیہ السلام ہو سکتا ہے کہ درمیان میں کچھ اور کڑیاں بھی ہوں، اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بائبل میں شعیب علیہ السلام کے لیے یترو اور حوباب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ممکن ہے آپ اُن ناموں سے بھی موسوم ہوں تاہم قرآن پاک میں آپ کا نام صراحتاً شعیب آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دو قوموں یعنی مدین اور ایکہ کی طرف مبعوث فرمایا۔ ایکہ جنگل کو کہتے ہیں۔ مدین کی بستی کے قریب بہت بڑا جنگل بھی تھا شاید اسی لیے وہ ایکہ والے مشہور ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مدین اور ایکہ والے ایک ہی قوم ہیں تاہم صحیح بات یہ ہے کہ مدین اور ایکہ الگ الگ خاندان تھے، الگ الگ قبیلے یا قومیں

تھیں اور حضرت شعیب علیہ السلام دونوں قبائل کے رسول تھے۔ قرآن پاک میں دونوں کا ذکر آتا ہے۔

مدین کی بستی

مدین حجاز سے شمال مغرب اور فلسطین سے بطرف جنوب خلیج عقبہ اور بحر احمر کے کنارے ایک مشہور شہر اور تجارتی منڈی تھی۔ یہ شہر مکے سے مصر اور شام جانے والی بڑی شاہراہ پر واقع تھا۔ ارد گرد کے لوگ تجارت کے لیے اسی شاہراہ کو اختیار کرتے تھے۔ یہ شہر اسی شاہراہ پر واقع تھا جہاں سے یمن مکہ شام اور مصر کو راستے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے مدین بہت بڑا تجارتی مرکز بن گیا تھا۔ یہ وہی مدین کی بستی ہے جس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی آتا ہے۔ جب آپ سے ایک قبطی آدمی قتل ہو گیا اور آپ کا مصر میں رہنا دشوار ہو گیا تو آپ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور کئی دن کی مسافت طے کرنے کے بعد مدین پہنچے جہاں شعیب علیہ السلام سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جس شخص کے پاس ٹھہرے وہ خود شعیب علیہ السلام تھے یا ان کے بھانجے تھے تاہم وہ معمر آدمی تھے خدا کے نبی اور رسول تھے آپ کی بینائی کمزور ہو چکی تھی اور کام کاج میں عملی طور پر حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی آتا ہے کہ جب آپ مدین پہنچے تو آپ نے کنوئیں پر دو لڑکیوں کو پایا جو جانوروں کو پانی پلانے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس پر تعجب ہوا تو لڑکیوں نے بتایا کہ ان کا باپ کافی بوڑھا ہو چکا ہے اور کام کاج کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے جانوروں کی دیکھ بھال انہیں کرنا پڑتی ہے۔

درس توحید

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اللہ کے تمام انبیاء اپنی اپنی قوموں کو سب سے پہلے توحید کا درس ہی دیتے رہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو نبوت و رسالت عطا فرمائی تو آپ نے بھی اپنی قوم

کو سب سے پہلے یہی سبق پڑھایا۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فرمایا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ جیسا کہ گذشتہ دروس میں بھی بیان ہو چکا ہے عقیدہ کی اصلاح اور فکر کی پاکیزگی کے لیے توحید کا درس ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسان کا باطن ناپاک رہتا ہے۔ عقیدے کا فساد شرک کی علامت ہے اور مشرک کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" (ترجمہ) یعنی مشرک ناپاک ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ توحید باری تعالیٰ طہارت کا پہلا سبق ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور مجدد الف ثانیؒ اپنی کتابوں میں فرماتے ہیں کہ تمام مرشدان برحق، نیک اور صالح لوگ اپنے مریدوں کو سب سے پہلا درس توحید ہی کا دیتے ہیں تاکہ باطن پاک ہو جائے، عقیدہ درست ہو جائے اور تاکہ اس بنیاد کی استواری کے بعد اس پر عمل اور اخلاق کی عمارت تعمیر کی جا سکے۔ اگر کسی شخص کا عقیدہ درست نہیں ہے تو اس کا عمل اور اخلاق بیکار ہے، اس کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ لہٰذا عقیدے کی درستگی کو اولیت حاصل ہے۔ اسی طریقے کے مطابق حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو توحید کا درس دے کر شرک کی جڑ کاٹی اور پھر اس کے بعد ان کی معاشرتی خرابی یعنی ماپ تول میں کمی کی طرف توجہ دی۔ یہ لوگ بدترین قسم کی تجارتی بددیانتی میں مبتلا تھے۔ لوگوں کے حقوق ضائع کرتے تھے۔ جب خود کوئی چیز ماپ کر یا تول کر لیتے تو پورا پورا لیتے اور جب دوسروں کو دیتے تو کم دیتے اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی بینہ

آپ نے قوم سے فرمایا قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بینہ، نشانی یا معجزہ آگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی معجزہ یا نشانی عطا کی ہے جسے بینہ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مقام پر حضرت شعیب علیہ السلام کی کسی خاص

نشانی یا معجزے کی نشاندہی نہیں کی گئی، تاہم آپ کو بھی اللہ نے کوئی نہ کوئی واضح نشانی ضرور عطا کی ہو گی جس کے متعلق فرمایا کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے کھلی دلیل آچکی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ بینہ کا لفظ حکم اور دلیل پر بھی بولا جاتا ہے اور بحیثیت نبی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی احکام اور دلائل دیئے جن کی طرف یہاں پر اشارہ کیا گیا ہے۔ بینہ کا لفظ خود نبی کی ذات پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ سورۃ بینہ میں اللہ تعالیٰ نے دو دفعہ اس لفظ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مراد لی ہے نبی کا قول فعل اور عمل سب بینہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہاں پر بینہ سے مراد خود شعیب علیہ السلام کی ذات ہو۔ اس کے علاوہ بینہ کا لفظ نبی کے چہرہ اور آواز پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ مولانا رومیؒ کہتے ہیں "روئے و آواز پیغمبر معجز است" یعنی نبی کا چہرہ اور آواز معجزہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی خاص معجزہ مراد نہ بھی ہو تو بہر حال اس سے نبی کی ذات مراد ہو سکتی ہے۔

ماپ تول میں کمی

اس کے بعد شعیب علیہ السلام نے قوم کی توجہ ان کی معاشرتی خرابی کی طرف دلائی فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ پس پورا کرو ماپ اور تول کو وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ اور نہ گھٹاؤ لوگوں کو ان کی چیزیں مقصد یہ ہے کہ ماپ تول میں ڈنڈی مار کر لوگوں کا حق ضائع نہ کرو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے تاجروں کی گندی ذہنیت کا تذکرہ کیا ہے سورۃ مطففین میں اللہ کا ارشاد اس طرح ہے "اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ" یعنی جب لوگوں سے ماپ کر یا تول کر خود لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں جب دوسروں کو دیتے ہیں تو اس میں کمی کر جاتے ہیں۔ عام طور پر تاجر اسی ذہن کے مالک ہوتے ہیں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ حضور علیہ السلام نے ایماندار تاجر کو خوشخبری سنائی ہے کہ اس کا حشر انبیاء، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔ وہ تو حلال و حرام کا امتیاز رکھے گا، کسی کا حق تلف نہیں کرے گا۔

بلکہ کمزور ایمان والوں مشرکوں اور کافروں کے پیش نظر محض فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مذمت بیان فرمائی ہے سورۃ ہود میں آتا ہے حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم سے کہا "بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" لوگوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد تمہارے پاس جو کچھ بچ رہے گا وہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔ قوم نے جواب دیا "یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا" اے شعیب! تیری نمازیں یہ کہتی ہیں کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں تصرف کرنا ترک کر دیں؟ ہم جس طرح چاہیں گے کمائیں گے اور جس طرح چاہیں گے خرچ کریں گے، تو اپنی نمازوں کی فکر کر۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے نہایت ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی کہ حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی، اس میں تردد اور شبہات پائے جاتے ہیں روحانیت تباہ ہو جاتی ہے، لہٰذا حلال ذرائع سے کماؤ اور پھر اس میں سے مستحقین کے حقوق ادا کرو۔ اس کے بعد جو کچھ بچے گا وہی بابرکت ہو گا مگر قوم نے ایک نہ سنی۔

فساد فی الارض

فرمایا "وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" نہ فساد کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ تقریر اس زمانے کی ہے جب ان کے ارد گرد ہر طرف فساد ہی فساد تھا مگر یہاں پہ "بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے زمین میں بالکل امن و امان تھا اور اس کے بعد فساد کا بازار گرم ہوا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اصلاح سے مراد وہ اصلاحی پروگرام ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی طرف بھیجا۔ خداوند تعالیٰ نے اس سلسلے میں انبیاء

مبعوث فرمائے، کتابیں نازل فرمائیں۔ قانون اور شریعت دی تاکہ لوگ اس پروگرام پر عمل کر کے دنیا میں امن قائم کریں مگر ان لوگوں نے اس پروگرام کی طرف توجہ نہ دی۔ ظاہر ہے کہ اس پروگرام کی آمد کے بعد جو شخص اس قانون کو توڑتا ہے اور اس کے خلاف چلتا ہے۔ وہ باغی، شریر اور مفسد فی الارض ہے اور سزا کا مستحق ہے۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں ان من اعظم مقاصد بعثۃ الانبیاء رفع التظالم من بین الناس فان تظالمھم یضیق علیھم یعنی انبیاء کی بعثت کے اہم ترین مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں یہ ایسی چیز ہے جو لوگوں پر تنگی ڈال دیتی ہے اور لوگ مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی ارشاد گرامی ہے انی حرمت الظلم علی نفسی جعلتہ بینکم حراماً فلا تظالموا (اے لوگو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر بھی حرام قرار دیا ہے اور تم پر بھی حرام کیا ہے لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔ شرک اور کفر ظلم ہے، کسی کا حق غصب کرنا، کسی کے ساتھ ناانصافی کرنا، چوری، زنا، حق تلفی وغیرہ سب ظلم کی تعریف میں آتے ہیں اللہ نے ان سے منع فرمایا ہے تو شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ زمین میں فساد نہ کرو یعنی ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی سے باز آجاؤ۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اخلال بالشرائع یعنی خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون شریعت کے خلاف فساد فی الارض میں شامل ہے۔ ہر برائی فساد ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ فرمایا فساد نہ کرو بلکہ امن اور چین قائم کرو ذٰلکم خیر لکم ان کنتم مؤمنین یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ تجارتی بد دیانتی اس امت میں بھی موجود ہے اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا اے تاجرو! پہلی امتوں کو خدا تعالیٰ نے ماپ تول

ۃ حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۳ (فیاض)

کا متولی بنایا تھا انہوں نے اس معاملہ میں تعدی کی۔ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے، لہٰذا ہلاک ہوگئے، اب تمہاری باری ہے، دیکھو! کسی پر زیادتی نہ کرنا کہ پہلے قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

راستے کی رکاوٹ

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بھی فرمایا وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ ہر راستے میں مت بیٹھو تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِهٖ تم لوگوں کو ڈراتے ہو اور ایمان لانے والے کو اللہ کے راستے سے روکتے ہو۔ ڈرانے سے مراد یہ ہے کہ تم شاہراؤں پر ڈاکے ڈالتے ہو، لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے مال چھین لیتے ہو اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو جان سے مار دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ قوم شعیب کا یہ قبیح طریقہ آج بھی جاری ہے۔ ہر روز اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ فلاں شاہراہ پر ڈاکوؤں نے بس کو لوٹ لیا، یا فلاں مقام پر ڈاکو ساری رات بسوں اور ٹرکوں کو لوٹتے رہے۔ ان کا طریقہ واردات بھی عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی بس میں سوار ہو جاتا ہے اور اس کے باقی ساتھی کسی مقررہ مقام پر انتظار کرتے ہیں رات کو جب بس غیر آباد مقام پر پہنچتی ہے تو بس کو روک لیا جاتا ہے۔ اور پھر تمام ڈاکو مسافروں سے نقدی، گھڑیاں اور زیورات چھین کر فرار ہو جاتے ہیں۔ اب تو دن دہاڑے ڈاکے پڑنے لگے ہیں یورپ اور امریکہ جیسے متمدن ممالک میں کار چوری کی وارداتیں کثرت سے ہو رہی ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو اس قبیح فعل سے منع فرمایا۔

اہل ایمان کو اللہ کے راستے سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا پروپیگنڈا کیا جائے جس سے متاثر ہو کر لوگ اللہ کے راستے کو چھوڑ دیں اور نئے آنے والے رک جائیں۔ جو لوگ شعیب علیہ السلام کی بات سننا چاہتے تھے قوم کے لوگ انہیں حیلے بہانے سے آپ کے پاس جانے سے روکتے تھے

اور آپ کے خلاف غلط پراپیگنڈا کر کے لوگوں کو آپ سے متنفر کرتے تھے۔ مشرکین مکہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اُن کی بھی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی نووارد حضور علیہ السلام سے ملاقات نہ کر سکے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ایک دفعہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سن لی تو وہ انہی کا ہو کر رہ جائے گا

حضرت ضمادؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ آپ اسلام لانے سے پہلے بہت بڑے کاہن اور طبیب تھے۔ مکے آئے تو حضور علیہ السلام سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مشرکین نے کہا، وہ تو پاگل ہے اس کے پاس جا کر کیا کرو گے۔ کہنے لگے میں طبیب ہوں، اگر وہ بیمار ہیں تو ان کا علاج کروں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر علاج کی پیشکش کی تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا، بس آپ کی بات سننا تھا کہ گھائل ہو گیا۔ اور حضور علیہ السلام کے ہاتھ پہ بیعت کر کے واپس آیا۔ تو راستے سے روکنے کا یہی مطلب ہے

کجی کی تلاش

شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا اور دین کے راستے میں کجی تلاش کرتے ہو۔ دین میں ایسی خامیاں تلاش کرتے ہو جن کا پراپیگنڈا کر کے لوگوں کو برگشتہ کرنا چاہتے ہو۔ مشرکین اور کفار ہمیشہ یہی کرتے آتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کے لیے کوئی مواد ہاتھ آئے۔ آج کے نام نہاد مستشرقین بھی یہی کر رہے ہیں تحریروں اور تقریروں کے ذریعے اسلام کی خامیاں بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ اس سے متنفر ہو جائیں کبھی دین کے مسائل کو غلط رنگ میں پیش کریں گے جیسے ایک لندن پلٹ اعلیٰ ڈگری یافتہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا دین کیسا ہے کہ جانور کو چھری سے رگڑ رگڑ کر ذبح کرتے ہیں۔ یہ تو جانور کے ساتھ ظلم ہے کیوں نہ ایک ہی وار میں جانور کا سر تن سے جدا کر دیا جائے

اس قسم کا پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ حالانکہ تیز چھری کے ساتھ حلق سے ذبح کرنا ملت ابراہیمی کا مسلمہ اصول اور فطرت کے عین مطابق ہے جبکہ ذر گردن قلم کر دینا غلط ہے اور اس سے مذبوحہ جانور مکروہ تحریمی بن جاتا ہے۔ یہ بدبخت پیغمبر اسلام کی ذات بابرکت کو بھی اپنے غلط پراپیگنڈا کا نشانہ بناتے ہیں۔ حضور علیہ السلام پر نعوذ باللہ بادشاہ اور عیاش ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ عیسائی، یہودی، ہندو اور دہریوں کی اسلام دشمنی میں ان کے مسلمان شاگرد بھی شامل ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی ڈیوٹی یہ انجام دینے لگتے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے لوگ بھی یہی کام کرتے تھے جس سے آپ نے منع فرمایا۔

عددی برتری

حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو اللہ کا یہ احسان بھی یاد دلایا وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ اور یاد کرو جب تم قلیل تعداد میں تھے تو اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا۔ تمہاری نسل میں برکت دی جو خوب پھیلی اور تمہیں عددی اکثریت حاصل ہوگئی۔ کثرت تعداد اللہ تعالیٰ کا انعام ہے مگر اس زمانے میں اسے وبال جان سمجھا جانے لگا ہے۔ انگریز نے ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ آبادی بڑھ جانے سے خوراک کی قلت پیدا ہو جائیگی۔ لہٰذا آبادی پر کنٹرول ہونا چاہیئے۔ بچے کم پیدا کرو، خاندانی منصوبہ بندی کو اپناؤ وغیرہ وغیرہ۔ دنیا پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ اکثریت نے اقلیت کو مغلوب کیا۔ قبرص اور لبنان میں کیا ہوا۔ عیسائیوں کی عددی اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ہمیں ہندوستان سے کیوں علیحدہ ہونا پڑا کہ ہندو اکثریت میں تھے۔ اگر ہم اکثریت میں ہوتے تو پورا ملک ہمارا ہوتا۔

عددی اکثریت دو طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ یا تو فکری جذبہ کے تحت تبلیغ عام کی جائے تاکہ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں

یا پھر دوسرا طریقہ تعدد ازدواج کا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا مسلمانوں کی
عددی برتری میرے لیے باعث فخر ہے۔ آبادی میں کمی کرنا مشرکانہ،
اور جاہلانہ تصور ہے۔ اگر وسائل رزق کی تقسیم صحیح ہو جائے تو کسی چیز کی
قلت نہیں پیدا ہوگی مشکل تو یہی ہے کہ ہم اسلامی اصولوں کو اپنانے کی
بجائے انہیں مٹانے پر کمربستہ ہیں۔ بعض لوگ دن میں چھ چھ مرتبہ پر تکلف
کھانا کھاتے ہیں اور بعض کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر میسر نہیں، ہم نے
کاروبار، ملازمت، تعلیم کوئی بھی چیز اسلامی اصولوں کے مطابق تقسیم نہیں
کی جس کی وجہ سے بے چینی پائی جاتی ہے۔ اگر بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح
ہو تو جتنی عددی اکثریت ہوگی اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ بنگال کے
کچھ لوگ تبلیغ کے لیے روس میں گئے تو وہاں کے مفتی نے کہا کہ خدا سے
دعا کرو کہ یہاں کے لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو جائے، وہ کم از کم عبادت
تو کھلے بندوں کر سکیں، ہمیں تو کوئی عبادت بھی نہیں کرنے دیتا کیونکہ ہم
اقلیت میں ہیں، غرضیکہ عددی برتری کو اللہ نے بطور احسان یاد دلایا ہے

فرمایا فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ دیکھو فساد
کرنے والوں کا کتنا برا انجام ہوا۔ دنیا میں جس نے بھی من مانی کی ظلم و ستم
کا بازار گرم کیا، وہی قوم باعث عبرت بن گئی۔ اللہ نے مختلف قوموں
کا حال بیان کر کے بعد میں آنے والوں کی توجہ دلائی ہے کہ دیکھو قوم نوح
کا کیا حال ہوا۔ قوم عاد اور ثمود کس انجام کو پہنچی۔ قوم لوط کا حال بیان کرتے
ہوئے فرمایا وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِمْ (الصّٰفّٰت) تم ان پر صبح
شام گزرتے ہو۔ کیا یہ باعث عبرت نہیں ہے۔

خدائی فیصلے کا انتظار

فرمایا وَإِنْ كَانَ طَائِفَةٌ مِنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ
بِهِ تم میں سے ایک گروہ ایمان لایا ہے اس چیز پر جس کے ساتھ میں
بھیجا گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے اپنا پیغام دین اور شریعت

بھیجی ہے۔ تمہارے سے لیے اصلاح کی دعوت بھیجی ہے جس پر ایک گروہ ایمان لا چکا ہے وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا۔ وہ اُٹھا دین کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے لوگوں کو دین کے راستے سے روکتا ہے۔ فرمایا اس کا علاج یہ ہے کہ دل برداشتہ نہ ہو بلکہ فَاصْبِرُوا صبر کا دامن تھامے رکھیں اور اس وقت کا انتظار کریں حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے حضور علیہ السلام نے بھی یہی سبق دیا، موسیٰ علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ اور اہل ایمان کو صبر کی تلقین کی۔ آگے آرہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے "اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا" (اعراف) اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ خود حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے، آپ اس کا اتباع کریں وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ (یونس) اور صبر کریں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ کر دے۔ یہی بات شعیب علیہ السلام نے کہی کہ صبر کرو حتیٰ کہ اللہ ہمارے درمیان کوئی فیصلہ کر دے۔ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ آخری فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اہل ایمان کے حق میں ہوگا۔ "اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ" (الانعام) اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو کبھی فلاح نہیں دیتا بلکہ وہ ہمیشہ نامراد رہتے ہیں آخری کامیابی اہل ایمان کی ہوگی۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ
يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ
لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ
افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ
بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَاۤ
اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ
رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا
افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ
خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ
اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ
لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۛ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا
هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ
لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ
فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ :- کہا اُن سرداروں نے جنہوں نے تکبر کیا شعیب (علیہ السلام) کی قوم سے کہ ہم ضرور نکال دیں گے تم کو اے شعیب! اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے، یا یہ کہ تم پلٹ آؤ ہمارے دین میں۔ کہا شعیب علیہ السلام نے اگرچہ ہم ناپسند کرنے والے ہوں (تمہارے دین کو)؟ (۸۸) بیشک ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا اگر ہم لوٹیں گے تمہاری ملت میں بعد اس کے اللہ نے ہمیں بچایا ہے اُس سے اور نہیں ہمارے لیے کہ ہم لوٹیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ ہمارا پروردگار۔ وسیع ہے ہمارا پروردگار ہر چیز پر علم کے اعتبار سے، ہم اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! فیصلہ کر دے ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (۸۹) اور کہا سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا شعیب علیہ السلام کی قوم سے، اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو بیشک اُس وقت تم نقصان اٹھانے والے ہو گے (۹۰) پھر پکڑا اُن کو زلزلے نے، پس ہو گئے اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرنے والوں میں (۹۱) وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا تھا شعیب (علیہ السلام) کو ایسے نابود ہوئے گویا وہ ان بستیوں میں بسنے والے ہی نہ تھے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی تھے نقصان اٹھانے والے (۹۲) پس پلٹے (شعیب علیہ السلام) اُن لوگوں سے اور آپ نے کہا اے میری قوم کے لوگو! بیشک میں نے تمہیں پہنچا دیئے اپنے رب کے پیغام اور میں نے تمہاری

خیر خواہی کی۔ پس کیسے افسوس کروں میں ان لوگوں پر جو کفر کرنے
والے ہیں (۹۳)

ربط آیات

تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ پانچواں واقعہ حضرت
شعیب علیہ السلام کا بیان فرمایا ہے۔ گذشتہ درس میں آپ کی اپنی قوم
کی طرف بعثت اور ان کو دعوتِ توحید پیش کرنے کا ذکر تھا۔ حضرت
شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اُن کی خرابیوں کی نشاندہی کی
اور اُن سے منع فرمایا۔ قومِ شعیب کی چیدہ چیدہ خامیاں ناپ تول میں کمی
زمین میں فساد، راستوں میں ڈاکے ڈالنا، لوگوں کو ایذا پہنچانا۔ خدا کے رستے
سے روکنا، پیغمبر اور دینِ حق کے خلاف غلط پراپیگنڈا اور لوگوں کو متنفر کرنے
کے لیے دینِ حق میں کجی تلاش کرنا تھیں۔ آپ نے قوم کو اللہ تعالیٰ
کی نعمتیں یاد دلائیں کہ اس نے تمہاری قلتِ تعداد کو کثرت میں تبدیل کر
دیا۔ پھر آپ نے قوم کے دو گروہوں کا ذکر کیا۔ ایک گروہ اُن پر ایمان
لایا اور دوسرے نے انکار کر دیا۔ آپ نے مؤخر الذکر کو فسادی گروہ قرار دیا اور
اہلِ ایمان کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ اس معاملہ
میں کیا فیصلہ کرتا ہے۔

قوم کی طرف سے دھمکی

شعیب علیہ السلام کی تقریر کے جواب میں قوم نے آپ کو دھمکیاں
دینا شروع کیں جسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے قَالَ الْمَلَاُ
الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم
کے متکبر سرداروں نے آپ کو جواب دیا لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اے شعیب ہم تمہیں اور
تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔
ایک طرف قوم کے صاحبِ جاہ و مال اور متکبر لوگ ہیں جو اپنے آپ
کو اعلیٰ و ارفع خیال کرتے ہیں، اپنی دولت پر مغرور ہیں، انبیاء اور اہلِ حق

کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر تصور کرتے ہیں اور دوسری طرف پیغمبر کے کمزور اور ضعیف لوگ ہیں کیونکہ ہر نبی کے اولین متبعین غریب لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ تو یہ سردار لوگ ضعفا کو اپنی بستی میں رہنے کی اجازت دینے پر بھی تیار نہ ہوئے اور انہیں نکال باہر کرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ انہوں نے کہا کہ تم صرف ایک صورت میں یہاں رہ سکتے ہو اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا کہ تم ہمارے دین میں واپس پلٹ آؤ۔ شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی اور بری رسومات سے منع کرتے تھے، لوگوں کو ایذا پہنچانے اور لوٹ مار کرنے سے روکتے تھے مگر قوم کو آپ کی یہ تبلیغ پسند نہ تھی اس لیے قوم کے بڑے بڑے سربرآوردہ لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں تبلیغ کرنے اور برے کاموں سے روکنے سے باز آجائیں اور جس طرح ہم کرتے ہیں آپ بھی کرنے لگ جائیں۔ دین کے نام پر رسومات باطلہ کو قبول کرلیں ورنہ ہم آپ کو اپنے شہر سے نکال دیں گے۔

دیگر انبیاء سے سلوک

اس قسم کا سلوک صرف شعیب علیہ السلام سے ہی نہیں ہوا بلکہ ہر نبی کے ساتھ اُس کی قوم اسی طرح کرتی رہی ہے حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں ایک موڑ ایسا بھی آتا رہا ہے جب وہ اپنا ملک اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ جب آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ نے اس کا واقعہ اپنی زوجہ محترمہ کے ہمراہ اُن کے بھائی ورقہ بن نوفل کے سامنے بیان کیا تو اس نے آپ کی بات سن کر یہی کہا تھا کاش میں اس وقت جوان ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔ حضور علیہ السلام نے نہایت تعجب سے پوچھا کیا یہ لوگ مجھے مکہ سے نکال دیں گے۔ بخاری شریف کی پہلی حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں اَوَ مُخْرِجِیَّ هُمْ کیا یہ لوگ مجھے یہاں سے

نکال دیں گے؟ آخر میں اُن کے ساتھ کون سا بُرا سلوک کرتا ہوں کہ یہ لوگ مجھے برداشت نہیں کریں گے۔ ورقہ بن نوفل پہلی کتابوں کا عالم تھا، کہنے لگا کہ جو چیز آپ نے بیان کی ہے، اس کو جس نے بھی پیش کیا اِلَّا عُوْدِیَ اس کے ساتھ دشمنی ہی کی گئی۔ گویا یہ تو ایک پرانی ریت ہے کہ ہر نبی کے ساتھ عداوت اختیار کی گئی۔ حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ میں بھی گزر چکا ہے قوم نے کہا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِن لوگوں کو اپنی بستیوں سے نکال دو، یہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ ان کا پلید لوگوں میں کیا کام ہے۔ یہود و نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اُن کا نظریہ یہ تھا وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ: ۱۲۰) کہ وہ آپ سے کبھی راضی نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ آپ اُن کے دین کا اتباع کریں۔ بہرحال شعیب علیہ السلام کی قوم نے بھی یہی کہا۔ کہ یا تو ہمارے دین میں واپس آجاؤ، ورنہ ہم تمہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے

لفظ "عود" کی تشریح

یہاں پر لَتَعُوْدُنَّ میں عود کا لفظ قدرے اشکال پیدا کرتا ہے۔ کفار کے دین میں واپس لوٹ آنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ معاذ اللہ شاید شعیب علیہ السلام ابتداء میں انہی کے دین پر تھے۔ پھر نبوت عطا ہوئی تو دینِ حق قبول کیا اور اب پھر وہ آپ کو واپس پلٹانا چاہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کسی نبی کے لیے ایک لمحہ بھر کے لیے بھی کفر یا شرک اختیار کرنا محال ہے۔ ہر نبی اوائل عمر سے ہی اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوتا ہے اور کفر و شرک سے بیزار۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق سورۃ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ابتداء ہی سے رشد عطا فرمائی۔ امام ابن کثیرؒ مِنْ قَبْلُ کی تفسیر میں لکھتے ہیں من صغرہ الی کبرہ یعنی بچپن سے لے کر بڑا ہونے تک اللہ تعالیٰ نے خوب فہم عطا فرمایا، گویا بچپن میں بھی آپ سے کفر و شرک

کا احتمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہی بات حضرت شعیب علیہ السلام پر بھی صادق آتی ہے۔ البتہ جو لوگ آپ پر ایمان لائے تھے، وہ بلاشبہ پہلے شرک اور کفر میں ملوث تھے مگر بعد میں انہوں نے دین حق قبول کر لیا تو ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی قوم ان لوگوں کو اپنے دین پر واپس پلٹانا چاہتے تھے۔ گویا اس آیت کے مصداق وہ لوگ ہیں مگر ان میں تغلیباً پیغمبر کو بھی شامل کر لیا گیا ہے ورنہ نبی کی ذات سے کسی بھی دور میں کفر شرک پر پایا جانا ناممکن ہے۔

مفسرین کرام لفظ عود کی ایک دوسری توجیہ بھی کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ عود کا ایک معنی دوبارہ پلٹ آنا ہے اور اس کا دوسرا معنی صار یعنی مطلقاً ہو جانا بھی آتا ہے۔ جیسے سورۃ یٰسٓ میں آتا ہے ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر دیں "حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ" یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ کہ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے دین میں ہو جاؤ

مشرکانہ عقائد سے بیزاری

قوم نے شعیب علیہ السلام کو اپنے دین کی طرف آنے کی دعوت دی تو آپ نے جواب میں فرمایا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ اگرچہ ہم ناپسند کرنے والے اور بیزار ہوں یعنی ہم تو کفر و شرک سے بیزار ہیں اور تم ہمیں اس باطل دین کی طرف بلاتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ہر اہل ایمان گندے عقائد اور گندی رسوم سے بیزار ہی ہوگا۔ کفر و شرک اور بدعات سے بیزاری ایمان کی شرائط میں سے ہے۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام نے اپنی بات کی مزید وضاحت فرمائی کہ تمہارا دین اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ کہ ہم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھیں اگر ہم لوٹیں گے تمہاری ملت میں۔ جھوٹے مذہب کو قبول کرنا تو خدا تعالیٰ پر کذب بیانی ہے۔ گویا اس نے یہ جھوٹا دین نازل کیا ہے۔ فرمایا ہم

اللہ تعالیٰ پر یہ افترا و کیسے باندھیں بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس باطل عقیدے سے بچا لیا ہے۔ ہم ایسے دین کو کیسے اختیار کر سکتے ہیں۔

فرمایا وَمَا یَکُوْنُ لَنَآ ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَآ کہ ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا سوائے اس کے کہ ہمارا پروردگار اللہ ایسا چاہے۔ ہمارا رب وسیع ہے ہر چیز پر علم کے لحاظ سے یعنی اگر خدا تعالیٰ کسی شخص پر ناراض ہو کر ایسے دین ہی کی توفیق دے دے پھر تو ہو سکتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو کوئی شخص عقائدِ بد کی طرف لوٹ سکتا ہے، ورنہ جس شخص کو اللہ نے ایک دفعہ اس غلاظت سے بچا لیا ہے۔ وہ اسی میں واپس جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسی لیے دعا میں عرض کیا جاتا ہے یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِكَ اے دلوں کے پلٹنے والے خدا ہمارے دلوں کو ہمیشہ ثابت قدم رکھ، ایسا نہ ہو کہ ہم تیری ناراضگی کا شکار ہو کر کفر و شرک کی طرف پلٹ جائیں۔ دعا کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ اے اللہ میں ترقی کے بعد تنزل کی طرف جانے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تیری اطاعت اختیار کرنے کے بعد پھر معصیت کی طرف چلے جائیں اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا کا یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ ہر ایک کی استعداد، صلاحیت، نیت اور ارادے کو جانتا ہے اور اسی کے مطابق کسی کے حق میں فیصلہ کرتا ہے۔

توکل بر خدا

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ایمان سب سے زیادہ نبی کے دل میں راسخ ہوتا ہے۔ وہ خدا کی ذات پر سب سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں ان کے قلوب ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت سے بھرپور رہتے ہیں چنانچہ

لہ ترمذی صفحہ (ریاض)

شعیب علیہ السلام اسی چیز کا اظہار کرتے ہیں عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا
ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں اس لیے ہمیں امید ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں
رسوا نہیں کرے گا اور ہمارے ایمان کو سلب نہیں کرے گا بلکہ ہم اس کی
توحید پر ثابت قدم رہیں گے اور باطل دین کو کبھی اختیار نہیں کریں گے
اہل ایمان کو ہمیشہ یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ کسی مادی چیز پر بھروسہ نہ
کریں، تمام چیزیں ناپائیدار ہیں، اعتماد کے لائق ذات صرف اللہ تعالیٰ
کی ہے، لہٰذا اسی پر بھروسہ ہونا چاہیئے. وہ کسی کو مایوس نہیں لوٹاتا۔
اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی یہی تعریف کی ہے کہ ہر مشکل وقت
میں ان کی زبان پر یہی ہوتا ہے "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ"
ہمارے لیے وہی ذات کفایت کرنے والی ہے اور وہی ہمارے
لیے بہترین کارساز ہے شعیب علیہ السلام نے بھی سرداران قوم کی دھمکیوں
کے جواب میں صاف بات کی اور اللہ پر بھروسے کا ذکر کیا۔ ہود علیہ السلام
کے واقعہ میں بھی یہی بات ملتی ہے. جب کافروں نے ڈرایا دھمکایا تو
آپ نے فرمایا "اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ"
(ہود) میں تو اللہ ہی پر بھروسہ کرتا ہوں جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا
بھی شعیب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ پر بھروسے کا اعلان فرمایا اور پھر
بارگاہ رب العزت میں یوں دعا کی رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ
قَوْمِنَا بِالْحَقِّ اے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان
حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ یہ تو ہمیں طرح طرح کی تکالیف پہنچانے
اور ہمیں شہر بدر کرنے پر تلے بیٹھے ہیں، ہمارے قتل کے درپے ہیں۔
مولیٰ کریم! وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ تو ہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے
اب تو ہی کوئی بہتر فیصلہ فرما کیونکہ قوم تو ہماری بات ماننے کے لیے
تیار نہیں تمام انبیاء نے آخر میں مایوس ہو کر اسی قسم کی دعا کی ہے۔

رسومات باطلہ کا اتباع

قوم کے سردار پہلے تو شعیب علیہ السلام سے مخاطب تھے جب آپ نے اُن کا دین قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تو پھر ان کا روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھرا اور وہ آپ کی پیروی کرنے والے لوگوں سے کہنے لگے وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ قوم کے کفر کرنے والے سربرآوردہ لوگوں نے کہا لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ اگر تم نے حضرت شعیب علیہ السلام کا اتباع کیا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو گے اگر تم نے اپنے باپ دادا کا دین ترک کر دیا، شعیب علیہ السلام کے پیچھے لگ کر تجارتی پابندیاں قبول کر لیں تو پھر تمہارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا اور تم سخت گھاٹے میں پڑ جاؤ گے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگوں نے بھی یہی کہا تھا کہ اگر ہم ایک بشر کے پیچھے لگ گئے "اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ" (القمر) تو ہم گمراہ اور بے وقوف ہوں گے۔ یہ بھی ہمارے جیسا انسان ہے۔ بھلا یہ ہمیں کیا نصیحت کر سکتا ہے۔ شعیب علیہ السلام کی قوم نے بھی متبعین سے کہا کہ تم ایمان قبول کر کے مالی نقصان اٹھاؤ گے نیز تمہاری تمام سابقہ رسوم چھوٹ جائیں گی۔ لہٰذا اس دین کو قبول نہ کرو بلکہ اپنے سابقہ دین میں واپس آجاؤ۔

رسومات باطلہ ہمیشہ انسانوں کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر جاتی ہیں کہ انہیں ترک کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ آج بھی یہی حال ہے لوگ فضول رسم و رواج میں اس طرح پھنس چکے ہیں کہ اب اگر چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑ سکتے۔ اب تو اپنے آپ کو توحید پرست کہلانے والے بھی رسم و رواج پر قائم ہیں، ان کے خلاف چلنے کو باعث نقصان سمجھتے ہیں، کہتے ہیں اگر رسوم ادا نہیں ہونگی تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، برادری کیا کہے گی، خاندان کے لوگ مطعون کریں گے

لہٰذا وہ چار و ناچار رسوم کو نبھانے پر مجبور ہیں۔ کتنی بڑی بات ہے حضور علیہ السلام نے یہی تو فرمایا تھا لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ ۔ تم بھی اپنے سے پہلے والے لوگوں کے رسم و رواج پر چلو گے۔ اگر وہ ایک بالشت چلے ہیں تو تم بھی ایک بالشت چلو گے اور اگر وہ ایک ہاتھ چلے ہیں تو تم بھی ایک ہاتھ چلو گے۔ شبراً اور ذراعًا کے الفاظ آتے ہیں

عذابِ الٰہی

بہرحال شعیب علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ اگر تم نے شعیب علیہ السلام کی بات مان لی تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ شعیب علیہ السلام کی پوری کوشش کے باوجود قوم نے تسلیم نہ کیا اور چند لوگوں کے سوا اکثریت اپنی بات پر اڑی رہی، بلکہ الٹا شعیب علیہ السلام کی جان کے درپے ہو گئی، کہنے لگے لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (ھود) اے شعیب علیہ السلام! ہم تیرے خاندان کا خیال کرتے ہیں ورنہ ہم تجھے پتھر مار مار کر ختم کر دیتے۔ آخر اس قوم پر خدا کے غضب کا وقت آ گیا۔ ان کی نافرمانی انتہا کو پہنچ چکی تھی، تشدد پر اتر آئے تھے، شعیب علیہ السلام کو بستی سے نکال دینا چاہتے تھے، خدا کا غضب بھڑکا فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پھر پکڑا ان کو زلزلے نے فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ پھر وہ ہو گئے اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرنے والوں میں۔ جب آدمی گرتا ہے تو منہ کے بل گرتا ہے اور اس کے قدم نہیں جم سکتے تو ان پر بھی زلزلہ آیا اور وہ اوندھے گر پڑے اور وہیں ہلاک ہو گئے۔

اس قوم پر تین قسم کا عذاب نازل ہوا تھا۔ زلزلے کا ذکر تو اس مقام پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان پر سائبان کی شکل میں عذاب آیا فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ (الشعراء) انہوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا تو ان کو سائبان کے عذاب نے

ـــــــــــ

لہ بخاری صـ۴۹۱ـ ج۱ و مسلم صـ۳۳۹ـ ج۲ و مستدرک صـ۱۲۹ـ ج۱ و ترمذی صـ۳۱۲ـ (فیاض)

پکڑ لیا سخت گرمی سے بچنے کے لیے ان لوگوں نے تہہ خانوں کا رخ کیا مگر وہاں بھی سکون نہ ملا۔ پھر آسمان پر بادل نما دھواں سا اٹھا، لوگ اسے بادل سمجھ کر اس کی طرف دوڑے کہ شاید بارش ہوگی۔ بادل کے نیچے پہنچ کر انہیں وقتی طور پر ٹھنڈک بھی محسوس ہوئی۔ جب سب لوگ وہاں جمع ہو گئے تو بادل سے پانی کی بجائے آگ برسی جس نے سب کو جھلسا کر رکھ دیا۔ یہ یوم الظلہ یعنی سائبان والے دن کا عذاب تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اس قوم پر آتشیں ابر چھایا ہوا تھا تو انہیں ایک شخص نے کہا کہ شعیب علیہ السلام کا انکار نہ کرو۔

یَا قَوْمِ اِنَّ شُعَیْبًا مُرْسَلٌ فَذَرُوْا عَنْکُمْ شُمَیْرًا وَعِمْرَانَ بْنَ شَدَّاد

اے لوگو! بیشک شعیب علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ شمیر اور عمران بن شداد جن کی ترغیب پر تم پوجا کرتے ہو ان کو چھوڑ دو۔

اِنِّیْ اَرٰی غَیْمَۃً لِقَوْمٍ قَدْ طَلَعَتْ تَدْعُوْا بِصَوْتٍ عَلٰی صُمَانَۃِ الْوَادِیْ

مجھے یہ خطرناک بادل نظر آ رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔

فَاِنَّہٗ لَنْ یَّرَوْا فِیْہَا ضُحًی غَدًا اِلَّا الرَّقِیْمُ یَمْشِیْ بَیْنَ اَنْجَادِیْ

(حقانی ج۲ ص۲۸)

اب کوئی آدمی نہیں بچ سکے گا۔ صرف اس وادی میں کتے ہی چلتے پھرتے نظر آئیں گے مگر اس شخص کی تنبیہ کے باوجود قوم نہ مانی اور آخر ان پر عذاب آ ہی گیا۔

اس قوم پر تیسرا عذاب خوفناک چیخ کی صورت میں آیا۔ وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ (ہود) ظلم کرنے والوں کو چیخ نے آ پکڑا۔ فرشتے کی چیخ سے ان کے قلب و جگر پھٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا جن لوگوں نے شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْہَا وہ ایسے

ملیامیٹ ہو گئے گویا کبھی تھے ہی نہیں۔ فرمایا اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ جن لوگوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہی نقصان اٹھانے والے ٹھہرے۔ دنیا میں ذلت ناک ہلاکت کا نقصان ہوا اور آخرت میں ابدی تباہی کی طرف چلے گئے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کا دلی افسوس

جب قوم عذاب میں مبتلا ہو گئی تو شعیب علیہ السلام فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ ان سے پلٹے اور وَقَالَ اس طرح خطاب کیا یٰقَوْمِ اے میری قوم کے لوگو لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ میں نے تو اپنے رب کے سارے پیغام تمہیں پہنچا دیے تھے۔ وَنَصَحْتُ لَکُمْ اور تمہارے ساتھ خیر خواہی کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے لیکن تم نے میری کوئی بات نہیں مانی اور آخر کار لقمۂ اجل بن گئے فرمایا فَکَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ پس میں کافروں پر کیسے اظہار افسوس کروں۔ یہاں سے یہ اصول بھی نکلتا ہے کہ کافر اور معاند لوگوں کی تکلیف پر افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ اسی قابل تھے اور اپنے انجام کو پہنچ گئے فرمایا فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (الانعام) جو ظالم تھے ان کی جڑ کاٹ دی گئی وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ کسی رعایت کے مستحق نہیں اور نہ ہی ان پر افسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے کفر کیا اپنی بات پر اڑے رہے، میں ایسے لوگوں پر کیسے افسوس کروں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی مگر یہ کہ ہم نے پکڑا وہاں کے بسنے والوں کو ساتھ پریشانی اور تکلیف کے تاکہ یہ لوگ عاجزی کریں اور گڑگڑائیں (۹۴) پھر ہم نے تبدیل کر دیا برائی کی جگہ پر اچھائی کو یہاں تک کہ وہ لوگ بڑھ گئے اور انہوں نے کہا تحقیق پہنچی ہے ہمارے باپ دادوں کو تکلیف اور خوشی۔ پس پکڑا ہم نے اُن کو اچانک اور وہ بے خبر تھے (۹۵)

ذہنیت اقوام و رسالت عامہ

تبلیغ رسالت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے یہاں تک پانچ انبیاء علیہم السلام کا ذکر فرمایا ہے کہ ان جلیل القدر انبیاء نے کس طرح محنت و جانفشانی سے اپنی اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچایا اور پھر اقوام نے آگے کیا جواب دیا اور انبیاء کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ان اقوام کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی گرفت آئی اور لوگ مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا ہو کر اپنے انجام کو پہنچے۔ یہ واقعات بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والے لوگوں کو عبرت دلائی ہے کہ دیکھو اللہ کے احکام سے روگردانی کرنے والوں کا

کیا حشر ہوا۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم کی ذہنیت اور اس معاملہ میں اپنے دستور کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں صرف یہی پانچ نبی تو مبعوث نہیں ہوئے بلکہ ہر قوم اور بستی کی طرف اللہ کا رسول آیا جس نے اپنی قوم تک اللہ کا پیغام پہنچایا اور حتی المقدور لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ پھر ہر قوم نے اپنے اپنے نبی کی دعوت کے مختلف جوابات دیئے۔ تو یہاں ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے بحیثیت مجموعی اقوام عالم کی ذہنیت، ناکامی کے اسباب اور ان کے ساتھ کیے گئے سلوک کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد اگلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ پھر ملت ابراہیمی کے عظیم الشان رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کا ذکر ہوگا اور ان کے مدمقابل فرعون اور ہامان جیسے مجرمین کا بیان ہوگا ان کے واقعات اللہ تعالیٰ نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں اور بڑے بڑے اصولوں کی وضاحت کی ہے۔ پھر آخر میں حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آئے گا۔ بہر حال یہاں پر اللہ تعالےٰ کا یہ دستور بیان ہوا ہے کہ انعام اور سزا کے بارے میں اللہ کا اصول ہمیشہ یکساں رہا ہے اس میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔ اگر کسی قوم پہ انعام ہوتا ہے تو وہ بھی کسی خاص بنیاد کی وجہ سے اور اگر کسی کو سزا ملی ہے تو اس کے لیے بنیاد ہوتی ہے۔ یہ سنت اللہ ہمیشہ سے جاری ہے اور اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ سزا یا جزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

آزمائش بذریعہ بدحالی اور تکلیف

ارشاد ہوتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی رسول۔ قریہ کسی بھی آبادی کو کہتے ہیں خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ چھوٹے سے لیکر بڑے شہروں تک کے لیے قریہ کا لفظ استعمال

ہوتا ہے۔ چنانچہ مصر کے بڑے بڑے شہروں پر بھی بستی کا اطلاق کیا گیا ہے سورۃ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا اپنے باپ کے سامنے یہ بیان ذکر کیا گیا ہے "وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا" یعنی اے باپ ! اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آتا تو اس بستی سے دریافت کریں جہاں ہم اترے۔ نیز ظاہر ہے کہ جہاں وہ مصر میں گئے تھے وہ تو بہت بڑا شہر تھا۔ اسی طرح قریہ کا اطلاق مکہ معظمہ پر بھی کیا گیا ہے طائف کو بھی قریہ کہتے ہیں کہ مکہ اور طائف دو بڑے شہر ہیں۔ بہر حال قریہ سے مراد آبادی ہے جس میں چھوٹی بڑی سب شامل ہیں۔

فرمایا، ہم نے نہیں بھیجا کسی بستی میں کوئی نبی مگر ہمارا دستور یہ رہا ہے إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا کہ ہم پکڑتے ہیں اس کے رہنے والوں کو بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ بدحالی اور تکلیف کے ساتھ۔ مقصد یہ کہ کسی قوم یا بستی کی طرف اپنا رسول بھیج کر پھر ہم انہیں اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ انہیں آزماتے ہیں۔ عام طور پر آزمائش کے دو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ لوگوں کو مشکل اور تکلیف میں ڈال کر آزمایا جائے کہ وہ کس حد تک صبر کر سکتے ہیں اور دوسرا یہ کہ آرام اور راحت دے کر آزمائش کی جائے کہ یہ کس طرح شکر ادا کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (انبیاء) ہم تمہیں بھلائی اور برائی کے ذریعے آزمائیں گے۔ تو یہاں بھی فرمایا کہ ہم نے بستی والوں کو آزمایا بدحالی اور تکلیف دے کر۔ باساء بیرونی تکلیف کو کہتے ہیں جیسے قحط اور خشک سالی وارد ہو جائے، زلزلہ آجائے، سیلاب اور طوفان آجائے، سخت گرمی یا سخت سردی کی لہر آجائے، یہ سب بیرونی مصیبتیں ہیں جو کسی قوم پر نازل ہو سکتی ہیں۔ اور ضراء انسان کی اندرونی تکلیف کو کہتے ہیں جیسے کوئی بیماری لاحق ہو جائے، وبا پھوٹ پڑے، کوئی شخص ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو جائے

خوف طاری ہو جائے۔ تو یہ اندرونی تکالیف ہیں۔ فرمایا ہماری آزمائش
کی پہلی صورت یہ ہے کہ کسی قوم کو بیرونی یا اندرونی تکلیف میں مبتلا کر دیں
اور ایسا کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ تاکہ وہ
اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائیں اور عاجزی کا اظہار کریں۔ جب مشکل
درپیش ہوتی ہے تو عام طور پر لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔
اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے
اور ان کی تکلیف رفع کر دے اور ان کو مصیبت سے نجات دے دے،

صبر اور شکر

کسی شخص یا قوم پر تکلیف کا آجانا اس کے لیے اللہ کی طرف سے
تنبیہ ہوتی ہے تاکہ لوگ کفر اور شرک سے باز آجائیں، برائی کو ترک کر دیں
اور نیکی کو اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ کو خشوع و خضوع اور عاجزی بڑی پسند ہے
حدیث شریف میں آتا ہے عجبا لامر المومن ان اصابه ضراء
فصبر فكان خيرا له وان اصابه سراء فشكر فكان
خيرا له یعنی مومن کی حالت بڑی عجیب ہے۔ اگر اس کو تکلیف پہنچتی
تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور اگر اس کو راحت
پہنچتی ہے، عزت و ترقی ملتی ہے صحت و عافیت حاصل ہوتی ہے
مال و دولت کی فراوانی ہو جاتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے،
فرمایا یہ حالت بھی اس کے لیے بہتر ہوتی ہے ایک دوسری روایت
میں آتا ہے کہ ایمان دو چیزوں میں بند ہے اس کا نصف حصہ صبر میں
ہے اور نصف حصہ شکر میں۔ یہ بھی ارشاد ہے لا يزال البلاء
بالمومن یعنی مومن کسی وقت آزمائش سے خالی نہیں رہتا ہے
حتی یخرج نقیا من الذنوب یہاں تک کہ وہ گناہوں سے
پاک صاف ہو کر نکل جاتا ہے۔ مومن شخص تنگی اور آسانی دونوں حالتوں
میں کامیاب و کامران ہو کر نکلتا ہے سختی میں صبر کرتا ہے اور راحت

ہیں شکر ادا کرتا ہے۔ مومن کا شعور صحیح ہوتا ہے، وہ کبھی غرور میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برخلاف منافق کی مثال گدھے کی ہے، اُسے کچھ پتہ نہیں کہ مالک نے اُسے کیوں باندھ رکھا ہے اور کیوں کھول دیا ہے۔ اسی طرح منافق بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے تکلیف میں کیوں مبتلا کیا تھا اور راحت کیوں عطا کی۔ وہ ہر حالت میں اپنی ڈگر پر چلتا رہتا ہے

تکلیف کی بجائے راحت

قوموں کی آزمائش کا پہلا طریقہ اللہ نے یہ بتایا کہ ہم متعلقہ قوم کو تکلیف میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ وہ عاجزی کریں اور گڑگڑائیں، اب آزمائش کا دوسرا طریقہ بیان کیا جا رہا ہے ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ پھر ہم برائی کو بھلائی میں بدل دیتے ہیں۔ پہلے تکلیف میں مبتلا تھے، پھر راحت آگئی۔ پہلے بیمار تھے، اب تندرست ہو گئے، پہلے مال میں تنگی تھی پھر فراوانی آگئی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے کسی شخص یا قوم کی بدحالی کو آسودگی میں تبدیل کر دیا حَتّٰى عَفَوْا یہاں تک کہ وہ آسودگی میں بڑھ گئے، عفو کا معنی بڑھنا اور پھلنا پھولنا ہوتا ہے یعنی جب انہیں آرام و راحت میں فراوانی حاصل ہو گئی وَّقَالُوْا اور انہوں نے کہا قَدْ مَسَّ اٰبَاۗءَنَا الضَّرَّاۗءُ وَالسَّرَّاۗءُ یہ تکلیفیں اور راحتیں ہمارے آباؤ اجداد کو بھی آتی رہی ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے دنیا کے دور اس طرح چلتے رہتے ہیں، کبھی مصیبت آگئی کبھی راحت مل گئی، کبھی خشک سالی اور کبھی فراوانی، کبھی بیماری اور کبھی صحت، کبھی غریبی اور کبھی امیری، یہ زمانے کے چکر ہیں۔ افسوس کہ انہوں نے اللہ کی طرف سے ان آزمائشوں سے کوئی سبق نہ سیکھا بلکہ اسے معمولی چیز سمجھ کر اس سے گزر جاتے ہیں۔

دراصل یہی چیز انسان کی ناکامی کا سبب بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

انسان پر مختلف حالتیں اس لیے وارد کرتا ہے کہ وہ ان سے سبق حاصل کریں اور تکذیب سے باز آجائیں، سرکشی کو چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ پھر جو لوگ ان تنبیہات کا اثر قبول کرکے راہ راست پر آجاتے ہیں، وہ کامیاب ہوجاتے ہیں اور جو صرف نظر کرتے ہیں، وہ دائمی ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔

آزمائش بصورت راحت:

جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو راحت عطا کرتا ہے تو پھر وہ قوم دو گروہوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ جو مومن ہوتے ہیں وہ اسے اللہ تعالیٰ کا احسان مانتے ہوئے اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور جو منافق ہوتے ہیں وہ عیش و آرام صحت، مال و دولت پاکر تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ غفلت میں پڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ خدا تعالیٰ اور عاقبت کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہی ہوتا ہے کہ ایسی تکلیفیں تو اکثر آتی رہتی ہیں، ہمارے بڑوں کو بھی آئیں اس میں فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب کسی قوم کی یہ حالت ہوجاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور قوم دائمی عذاب میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ اگر بندے کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچی ہے تو امید ہے کہ وہ توبہ کرلے اور جب گناہ راس آگیا تو یہ اللہ کا بھلاوہ ہے۔ پھر ڈر ہے ہلاکت کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی زہر کھالے۔ پھر اگر وہ الٹے اگل دے تو بچ جانے کی امید ہوتی ہے اور اگر زہر ہضم ہوجائے تو انسان کا کام تمام ہوگیا انسان کا یہی حال ہے اگر اللہ کی طرف سے تنبیہ آنے پر سنبھل گیا تو بچ گیا، تھوڑی سی سزا پر ہی سمجھ آگئی، توبہ کرلی اور دائمی سزا سے بچ گیا۔ اور اگر وہ گناہ میں راسخ ہوگیا۔ تو ہلاک ہوگیا، پھر وہ مستقل عذاب کا مستحق بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور ہے

اچانک گرفت

بہرحال فرمایا کہ اللہ نے جہاں بھی اپنے انبیاء مبعوث فرمائے ان

لوگوں کو راحت اور تنگی دونوں طریقوں سے آزمایا۔ پھر جب وہ اس آزمائش میں پورے نہ اترے فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا۔ بغتۃ قیامت کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اچانک ہی آئے گی حضور علیہ السلام نے فرمایا اچانک موت مومن کے حق میں بہتر ہے، کیونکہ وہ ایمان کی حالت میں اچانک فوت ہو گیا، وہ اللہ کی رحمت میں چلا گیا۔ یہ موت اس کے لیے باعث برکت بن جائے گی۔ اور کافر کے لیے اچانک موت نہایت افسوسناک ہوگی کہ وہ کوئی بات نہ کر سکا ہو سکتا ہے کہ وقت ملتا تو وہ توبہ ہی کر لیتا مگر اسے موقع ہی نہ ملا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہو گیا۔

فرمایا ہم نے انہیں اچانک پکڑا، اس حالت میں وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ کہ وہ بے خبر تھے۔ ان کو عذاب کی آمد کا علم ہی نہ ہو سکا اور وہ غفلت ہی کی حالت میں ہی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ اب اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فلاح اور کامیابی کے اصول بیان فرمائے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٦﴾ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿٩٧﴾ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩٨﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾ ع

ترجمہ:- اور اگر بستیوں کے بسنے والے ایمان لاتے اور تقوے کی راہ اختیار کرتے تو البتہ ہم کھول دیتے اُن پر برکتیں آسمان کی طرف سے اور زمین سے، لیکن انہوں نے جھٹلایا، پس پکڑا اُن کو اُن کاموں کے بدلے جو وہ کماتے تھے (٩٦) کیا بے فکر (نڈر) ہو گئے ہیں۔ بستیوں کے بسنے والے اس بات سے کہ آجائے اُن کے پاس ہماری گرفت رات کے وقت اور وہ سوئے ہوئے ہوں (٩٧) کیا بے فکر (نڈر) ہو گئے ہیں بستیوں کے بسنے والے اس بات سے کہ آجائے اُن کے پاس ہماری گرفت دوپہر کے وقت اور وہ کھیل میں مشغول ہوں (٩٨) کیا بے فکر ہو گئے ہیں یہ لوگ اللہ کی مخفی تدبیر سے۔ پس نہیں بے فکر ہوتے اللہ کی مخفی تدبیر سے مگر وہی جو نقصان اٹھانے والے ہیں (٩٩)

ربط آیات

تبلیغ رسالت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کی ابتداء میں تخلیق انسان اور خلافت ارضی کا ذکر کیا۔ پھر انبیاء کی بعثت اور سلسلہ تبلیغ کے ضمن میں پانچ انبیاء اور ان کی قوموں کا حال بیان کیا۔ گذشتہ دو آیات میں اللہ نے اقوام عالم کی ذہنیت کا حال بیان فرمایا، ان کی انبیاء دشمنی اور اللہ کی سنت کا ذکر کیا۔ جب لوگ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت پر تل جاتے ہیں تو ابتداء میں اللہ تعالیٰ معمولی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اندرونی اور بیرونی تکالیف میں ڈال کر قوم کو متنبہ کرتا ہے۔ اگر لوگ اس تنبیہ کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تو پھر اللہ تعالیٰ تکلیف کی جگہ راحت اور بدحالی کی جگہ اچھائی کو لے آتا ہے آرام و راحت میں پڑ کر اکثر لوگ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ تکلیف اور راحت کو زمانے کا چکر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ اچھے اور برے وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت اچانک آتی ہے اور انہیں بے خبری میں ہی ہلاک کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ نے یہاں پر صرف پانچ اقوام کا تذکرہ کیا ہے جو نافرمانی اور تکذیب کی وجہ سے تباہ ہوئیں مگر انسانی تاریخ شاہد ہے کہ ہر نبی کے زمانے میں اسی قسم کے حالات پیش آئے۔

ایمان اور تقویٰ کی برکات

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے ان ذرائع کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے انسان دنیا اور آخرت میں کامیابی کی منازل طے کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اگر بستیوں میں رہنے والے، جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا، بستی سے مراد ہر چھوٹا بڑا شہر، قصبہ یا دیہات ہے۔ اگر ان بستیوں کے رہنے والے اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے، پرہیزگاری کا راستہ پکڑتے لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ تو ہم ان

پر آسمان کی طرف سے اور زمین سے برکتیں کھول دیتے۔ یعنی اگر یہ لوگ خدا کی گرفت سے ڈرتے اور کفر، شرک اور معاصی سے بچتے رہتے تو یقیناً ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا نزول ہوتا اور آسمان و زمین کی برکات کے دروازے کھل جاتے۔

آسمان کی طرف سے نزول کا ایک سیدھا سادہ مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش برساتا اور زمین بھی اناج، سبزہ اور پھل اگاتی۔ اس طرح بارش بھی ان کے لیے باعث رحمت ہوتی اور یہ لوگ زمین کی مختلف الانواع پیداوار سے بھی مستفید ہوتے۔ غرضیکہ دنیا و آخرت میں کامیابی کے اللہ تعالیٰ نے دو اصول بیان فرمائے ہیں، ایک ایمان اور دوسرا تقویٰ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اگر انسان نیکی، ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو ہم ان پر ایسی مہربانی کریں کہ رات کو بارش برسائیں اور گرج کی آواز تک لوگوں کے کانوں میں نہ پہنچے۔ پھر دن کے وقت سورج کو خوب روشن کر دیں اور اس طرح ان کی بدحالی خوشحالی میں بدل جائے۔ ترمذی شریف کی حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یابن ادم تفرغ لعبادتی ملأ صدرک غنی — اے آدم کے بیٹے! اپنے دل کو میری عبادت کے لیے فارغ کر دے، اگر ایسا کرو گے لا مــلأ قلبك غنی تو میں تمہارے دل کو غنا سے بھر دوں گا اسُدّ فقرك اور تیری محتاجی کو دور کر دوں گا، اور اگر ایسا نہیں کرو گے، میری عبادت کی طرف رجوع نہیں کرو گے، میرے سامنے عاجزی کا اظہار نہیں کرو گے تو تمہارے دل کو فکر اور اندیشے سے بھر دوں گا اور تمہاری احتیاج کو کبھی بند نہیں کروں گا۔

ایمان اور تقویٰ کی اہمیت سے متعلق سورۃ مائدہ میں بھی گزر چکا ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہ معاف کر کے انہیں جنت

میں داخل کرتے تھے مگر انہوں نے ناشکری کی اور طرح طرح کے آلام و مصائب کا شکار ہوئے۔ یہاں بھی اللہ کا فرمان ہے کہ اگر اہل القریٰ ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ پر چلتے تو ہم ان کے لیے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

مکذبین کی گرفت

فرمایا ایمان اور تقویٰ کی بجائے اکثر لوگوں نے وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا اللہ کے پیغمبروں کی تکذیب کی۔ اطاعت کی بجائے نافرمانی کا راستہ اختیار کیا اور نیکی کے بجائے بدی کو قبول کیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا فَاَخَذْنٰهُمْ ہم نے ان کو پکڑ لیا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ان اعمال کی پاداش میں جو وہ انجام دیتے تھے۔ جن گناہوں میں وہ لوگ مبتلا تھے اور برائی کے کام کرتے تھے، کفر، شرک اور معاصی میں غرق تھے، لہٰذا پہلے ہم نے انہیں مہلت دی اور جب انہوں نے تنبیہ کو قبول نہ کیا تو پھر اچانک ہماری گرفت آئی اور وہ عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت ذلت ناک طریقے سے ہلاک کیا۔ کسی پر زلزلہ آیا، کسی پر آسمان سے آگ برسی، کوئی طوفان کا شکار ہوئے اور کسی پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے پانچ قوموں کا حال بیان کیا ہے تاہم باقی اقوام کے لیے بھی یہی اصول ہے جو بھی قوم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتی ہے، وہ طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔ اور پھر آخرت کا عذاب تو سب سے بڑھ کر ہے اور دائمی ہے۔

برکت کا مفہوم

برکت ایسی زیادتی کو کہتے ہیں جس میں تقدس کا مفہوم پایا جائے اس مقدس زیادتی کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض اوقات کسی ظاہری چیز میں فی الواقع اضافہ ہو جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے کئی معجزات کے ذکر میں آتا ہے کہ پانی یا کھانا قلیل مقدار میں تھا، پھر اس میں اللہ نے برکت دی تو چند آدمیوں کا کھانا سینکڑوں آدمیوں نے کھایا۔ یا تھوڑا سا پانی تھا مگر اس

سے سینکڑوں جانور اور آدمی سیراب ہوئے۔ بعض اوقات تھوڑی مقدار کھانے میں اللہ تعالیٰ ایسی برکت عطا کرتا ہے کہ اچھے سے اچھا اور زیادہ مقدار کی نسبت بہتر صحت اور توانائی حاصل ہو جاتی ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کھانا کھاؤ تو برتن کو اچھی طرح صاف کر لیا کرو۔ پھر اپنی انگلیوں کو بھی چاٹ لیا کرو۔ فانکم لا تدرون فی ایّہ البرکۃ کیونکہ تمہیں علم نہیں کہ اللہ نے کس حصہ میں برکت رکھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پورے کھانے میں سے صرف انگلی کو لگنے والے حصہ میں ہی برکت ہو، پیٹ بھر کھانا کھانے میں وہ صحت اور طاقت نہ ہو جو اس معمولی سے حصہ میں ہو۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ معمولی سی چیز کو بڑی چیز کی نسبت زیادہ بابرکت بنا دیتا ہے۔

بسا اوقات کسی خاص وقت میں بڑی برکت ہوتی ہے کوئی انسان بارہ گھنٹے میں اتنا کام نہیں کر سکتا جتنا ایک گھنٹے میں کر لیتا ہے بزرگانِ دین کے اوقات مصروفیت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ کام کیسے انجام دے لیتے تھے مولانا شاہ اشرف علی تھانوی ؒ کی تصانیف کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اس کے علاوہ آپ درس و تدریس کا کام بھی کرتے تھے، روزانہ دس پارے تلاوت بھی کرتے، بیعت ہونے والے مریدوں کو بھی ہدایات دیتے اور پھر روزانہ دو دو، چار چار سو آنے والے خطوط کا جواب خود اپنے قلم سے تحریر فرماتے۔ آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ اتنے بہت سے کام کیسے انجام دے لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اوقات میں برکت دے رکھی تھی کہ تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ کام انجام پا جاتا تھا۔

امام جلال الدین سیوطی ؒ کا بھی یہی حال تھا۔ اللہ نے عمر زیادہ نہیں دی مگر جتنی دی ہے اس میں بہت زیادہ برکت عطا کی۔ آپ کے سینکڑوں

لہ ترمذی صفحہ ۲ ج ۲ (فیاض)

تصانیف چھوڑی ہیں جن سے مخلوقِ خدا مستفید ہوتی ہے تعلیم بھی دیتے تھے عبادات کی طرف بھی خاص رغبت تھی اور پھر روزمرہ کے دیگر امور بھی انجام دیتے تھے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی جس نے وقت میں اتنی برکت ڈال دی کہ عام حالات میں اتنا کام سوگنا زیادہ وقت میں بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صحت میں، جان میں اور مال میں برکت عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے انسان کو فلاح نصیب ہو جاتی ہے۔ تاہم برکات کے نزول کا دارومدار دو چیزوں پر ہے یعنی ایمان اور تقویٰ یہ دونوں چیزیں جس قدر پُرخلوص ہوں گی، اللہ تعالیٰ ان میں اتنی ہی برکت عطا فرمائے گا۔

بے برکتی کے نتائج

اس زمانے میں اپنے اردگرد نظر ماریں۔ اشیاء کی تعداد اور مقدار لامحدود ہے۔ اناج پہلے سے کئی گنا زیادہ ہے، روزمرہ ضروریاتِ زندگی کی فراوانی ہے۔ ہر گھر میں ہر کام مشینوں کے ذریعے ہونے لگا ہے مہینوں کا کام ہفتوں میں اور ہفتوں کا دنوں میں ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں ہیں جن میں سوسو مزدور کا کام ایک ایک مشین انجام دے رہی ہے مگر اس کے باوجود ایک عام آدمی کی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آخر وجہ کیا ہے؟ ضروریاتِ زندگی کی کثرت کے باوجود آدمی کو سکون کیوں میسر نہیں۔ بات وہی ہے کہ ہر چیز سے برکت اُٹھ گئی ہے۔ برکت دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے یعنی ایمان اور تقویٰ۔ جب انسان سے یہ بنیادی چیزیں مفقود ہو گئیں تو اللہ نے ہر چیز سے اپنی برکت اٹھالی۔ اب بے چینی اور اضطراب کے سوا کچھ نہیں۔ ایک مزدور بھی پریشان ہے اور کروڑوں روپے میں کھیلنے والا، محلات میں رہنے والا اور دنیا کی تمام آسائشوں کا حامل بھی بے چین اور مضطرب ہے۔ نہ آج روپے پیسے کی خوب ریل پیل

ہے۔ پرانے زمانے میں جو کام ایک پیسے کے ذریعے ہو جاتا تھا وہ کام آج ایک روپیے میں نہیں ہوتا۔ نہ دلوں میں ایمان اور تقویٰ ہے اور نہ مال میں خیر و برکت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچتا ہے اس پر گاہک تو اعتماد کر لیتا ہے مگر اس کی کمائی سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ ایمان اور تقویٰ ہو گا تو تھوڑی چیز میں بھی برکت ہو گی ما قل وکفی خیر مما کثر والھی جو چیز تھوڑی مگر کفایت کر جائے وہ بہتر ہے اس سے جو زیادہ ہو مگر غفلت میں ڈال دے۔ آج لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، کفر، شرک اور معاصی عام ہیں، ایمان اور تقویٰ کمزور ہیں، خوف خدا مفقود ہے، ہر چیز کی فراوانی مگر سکون نایاب ہے۔

عذاب سے بےخوفی

فرمایا پہلے لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ اگر بستیوں والے ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم برکات نازل کرتے مگر انہوں نے کبھی زبان سے جھٹلایا اور کبھی عمل سے۔ پھر ہم نے انہیں سزا میں مبتلا کیا۔ کبھی بھوک کی سزا میں مبتلا کیا اور کبھی بدامنی اور بے چینی پیدا کر دی۔ برے اعمال کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ فرمایا اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى کیا بستیوں والے اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا کہ ان کے پاس ہماری گرفت رات کے وقت آ جائے وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ اس حالت میں کہ وہ سوئے ہوئے ہوں انسان کو ڈرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی گرفت کہیں رات کو سوتے میں نہ آ جائے ابھی پندرہ بیس سال کی بات ہے الجزائر کے ساحلی شہر بندرگاہ میں رات تین بجے ایسا زلزلہ آیا کہ پورا شہر ملیامیٹ ہو گیا پچاس ہزار کی آبادی میں سے اکثر ہلاک ہوئے اور جو بچ گئے وہ بے گھر ہو گئے۔ کوئٹہ کا مشہور زلزلہ بھی رات کے وقت ہی آیا تھا جس میں ڈیڑھ لاکھ انسان مارے گئے

آگے فرمایا اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰی کیا اہلِ شہر اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًی کہ آ جائے اُن کے پاس ہماری گرفت دوپہر کے وقت وَهُمْ یَلْعَبُوْنَ اور وہ کھیل میں مصروف ہوں مقصد یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیئے کہ کہیں اس کی پکڑ اچانک ہی نہ آ جائے اور وہ غفلت ہی میں مارے جائیں

مایوسی کبیرہ گناہ ہے

اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بے خوف ہو جانا کبیرہ گناہ ہے صاحب روح المعانی حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ کبیرہ گناہ کون سے ہیں فرمایا الشرک باللہ سب سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا ہے والیاس من روح اللہ اور خدا کی رحمت سے مایوس ہو جانا ہے۔ والامن من مکر اللہ اور خدا کی مخفی تدبیر سے بے فکر ہونا ہے۔ سورۃ یوسف میں بھی آتا ہے اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ اللہ کی رحمت سے صرف کافر ہی نا اُمید ہوتے ہیں مومن ہمیشہ اس کی رحمت اور مہربانی کا امیدوار رہتا ہے اور بے فکر نہیں ہوتا۔ اسی لیے امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے بزرگان دین فرماتے ہیں الایمان بین الخوف والرجا یعنی ایمان جو ہے وہ خوف اور امید کے درمیان ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا ڈر بھی ہونا چاہیئے اور اس کی رحمت کی امید بھی۔ اگر وہ مایوس ہو گیا تو خدا کی رحمت سے دور ہو گیا اور اگر نڈر ہو گیا تو پھر بھی تباہ ہو گیا۔

مخفی تدبیر سے بے فکری

فرمایا اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخفی تدبیر سے بے خوف اور بے فکر ہو گئے ہیں۔ مکر کا معنی پوشیدہ تدبیر ہوتی ہے وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (آل عمران) انہوں نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ بہترین تدبیر کنندہ ہے یا اردو

یا پنجابی والا مکر نہیں جس کا معنیٰ دھوکہ اور فریب ہوتا ہے بلکہ عربی زبان میں مکر سے مراد خفیہ تدبیر ہوتی ہے۔ تو فرمایا کیا یہ لوگ مخفی تدبیر سے بے فکر ہو گئے ہیں۔ حالانکہ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ اللہ کی پوشیدہ تدبیر سے نقصان اٹھانے والے لوگ ہی بے فکر ہوتے ہیں۔ کامیابی حاصل کرنے والوں کا یہ شیوہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ہمیشہ اس کی گرفت سے ڈرتے رہتے ہیں۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا مقولہ ہے کہ مومن آدمی نیک اعمال بھی انجام دیتا ہے اور ساتھ خدا تعالیٰ سے ڈرتا بھی رہتا ہے۔ قرآن پاک میں مُشْفِقُوْنَ کا لفظ بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیئے کہ شاید کوئی کوتاہی ہو گئی ہو اور یہ کہ خدا تعالیٰ ناراض نہ ہو جائے۔ فرمایا منافق قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو برائی کا ارتکاب بھی کرتے ہیں مگر بے خوف بھی ہوتے ہیں۔ انہیں نہ کوئی فکر ہوتا ہے اور نہ اندیشہ۔ ایک حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جب مومن سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس کے سر پر پہاڑ آگرا ہے۔ اور منافق بڑے سے بڑا گناہ بھی کرتا ہے تو ایسے محسوس کرتا ہے جیسے ناک پر مکھی بیٹھ گئی ہو، اس یوں کیا اور اُڑ گئی۔ اُسے گناہ کا اتنا بھی خوف نہیں ہوتا جتنا مکھی کے بیٹھنے کا۔ یہ منافقوں کی حالت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے شکوہ کیا ہے اور جس کے اکثر لوگ شکار ہیں۔ خدا کی مخفی تدبیر سے بے خوف ہونا نقصان اٹھانے والوں کا شیوہ ہے۔ فلاح پانے والے ایمان اور تقویٰ کو اپنا شعار بناتے ہیں جس کے ذریعے دنیا میں بھی امن و سکون اور رزق نصیب ہوتی ہے اور عقبیٰ میں کامیابی حاصل ہوگی۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ :- کیا نہیں واضح ہوا ان لوگوں کے لیے جو وارث ہوتے ہیں زمین کے اُس کے اہل کے ہلاک ہونے کے بعد ، کہ اگر ہم چاہیں تو اُن کو مبتلائے مصیبت کر دیں اُن کے گناہوں کی وجہ سے ، اور ہم مہر کر دیں اُن کے دلوں پر ، پس وہ لوگ نہیں سُنتے (۱۰۰) یہ بستیاں ہیں ہم بیان کرتے ہیں تجھ پر ان کے کچھ حالات ۔ اور البتہ تحقیق ان کے پاس ان کے رسول واضح باتیں لے کر آئے ۔ پس نہیں تھے وہ لوگ کہ ایمان لاتے اُس چیز پر جس کو انہوں نے پہلے ہی جھٹلا دیا تھا ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے

کافروں کے دلوں پر (۱۰۱) اور نہیں پایا ہم نے اُن میں سے
اکثروں کے لیے کوئی عہد۔ اور بیشک پایا ہے ہم نے ان میں
سے اکثروں کو نافرمان (۱۰۲)

ربط آیات

گذشتہ چند رکوع میں اللہ تعالیٰ نے تاریخ انبیاء کے سلسلے میں پانچ انبیاء علیہم السلام اور اُن کی قوموں کا حال بیان فرمایا۔ ان قوموں نے اپنے انبیاء کی تکذیب کی اور اللہ کی ناشکرگزاری کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے اُن پر اللہ کا عذاب نازل ہوا اور وہ دنیا سے ناپید ہو گئے۔
اب اللہ تعالیٰ نے ان پانچ اقوام کی مجموعی حالت پر تبصرہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سے مواقع فراہم کیے مگر انہوں نے اُن سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ انہوں نے اپنی پیش رو اقوام کے انجام سے کوئی سبق نہ سیکھا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔ ان واقعات میں امت آخر الزمان کو تسلی بھی دی گئی ہے اور انہیں نصیحت بھی کی گئی ہے کہ وہ ان حالات سے ضرور فائدہ اٹھائیں اور ان اقوام کے کردار کو نہ اپنائیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت کا شکار ہوئیں۔ اس تبصرے کے بعد آیات کا ربط پھر تاریخ انبیاء کے ساتھ ہو جائے گا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کا تفصیل کے ساتھ ذکر آئے گا۔

مقام عبرت

ارشاد ہوتا ہے اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ اَهْلِهَا کیا واضح نہیں ہوئی اُن لوگوں کے لیے جو زمین کے وارث بنے اُس کے اہل کی ہلاکت کے بعد۔ يَهْدِ کا عام فہم معنی ہدایت دینا یا راہ دکھانا ہے مگر یہاں پر مطلب ہے اَوَلَمْ يَتَبَيَّنْ یعنی کیا نئی آنے والی اقوام پر سابقہ قوموں کی ہلاکت سے یہ بات واضح نہیں ہوئی اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ کہ اگر ہم چاہیں تو اُن کے گناہوں کی وجہ سے انہیں بھی مبتلائے مصیبت کر دیں۔ سابقہ لوگوں کے حالات بیان کر کے موجودہ لوگوں کو عبرت دلانا مقصود ہوتا ہے کہ دیکھو! اُن لوگوں نے کس طرح خدا تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی، انبیاء کو جھٹلایا اور اپنی ضد پر اڑے رہے تو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا، لہٰذا تم اُن کے نقش قدم پر نہ چلنا ورنہ تمہارا انجام بھی اُن سے مختلف نہیں ہوگا۔ زمین

کا وارث بنانے سے مراد یہ ہے کہ جن مکانوں میں پہلے لوگ رہتے تھے اور جس زمین پر کھیتی باڑی اور کاروبار کرتے تھے اُس پر ہم نے تمہارا تصرف قائم کر دیا گویا تم ہی اُن کے وارث بنے ہو۔ یہ تو عام مقولہ ہے کہ "اگلا گرا تو پچھلا ہوشیار ہو گیا" کہ جو نسی غلطی کر کے یہ گرا ہے اُس کو میں نہ دہراؤں مگر عام طور پہ اقوامِ عالم کی ذہنیت یہی رہی ہے کہ انہوں نے پہلی قوموں کے حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ پیچھے آنے والے اس بات پہ غور کرتے کہ پہلوں کی تباہی کی کیا وجہ تھی تاکہ اُس سے بچ جاتے مگر تاریخ گواہ ہے کہ پچھلے بھی اگلوں کی راہ پہ ہی اُسی طرح تباہی کے گڑھے میں گرے جس طرح پہلے گرے تھے۔

حجاباتِ ثلاثہ

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اقوامِ عالم کے حالات کا تجزیہ کرتے فرماتے ہیں کہ عام طور پہ یہ لوگ تین قسم کے حجابات میں مبتلا ہو کر غفلت کا شکار ہوتے رہے ہیں اور پھر خدا تعالیٰ کی گرفت کا شکار ہوتے ہیں پہلا حجاب حجابِ طبع ہے۔ انسان مادی تقاضوں یعنی اپنے جسمانی لوازمات کی تکمیل میں ہی مصروف رہے۔ انہیں کھانے پینے اکام کاج چلنے پھرنے اور میل ملاقات سے ہی فرصت نہ ملی۔ انہوں نے عجائبات قدرت کی طرف غور ہی نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی اور جسمانی تقاضوں کو ہی پورا کرتے رہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں حجاب کی دوسری قسم حجابِ رسم ہے۔ اکثر لوگ قوم، قبیلہ، برادری، محلہ یا گاؤں کی رسم و رواج میں ہی زندگی گزارتے ہیں۔ حقیقی زندگی کی طرف اُن کی توجہ مبذول ہی نہیں ہوتی۔ نہ انہوں نے فکر کو پاک کیا، نہ فرائض کو سمجھا بلکہ شادی بیاہ، کھیل کود اور دیگر رسومات میں ہی پھنسے رہے اور زندگی میں ناکام ہو گئے

شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں تیسرا حجاب سوءِ معرفت ہے۔ یعنی انہوں نے خدا تعالیٰ کی ذات کو صحیح طور پہ پہچانا ہی نہیں۔ ایسے لوگ

خدا تعالیٰ کے متعلق غلط قسم کا عقیدہ قائم کر کے حجاب سوءِ معرفت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حجاب سوءِ معرفت کے مصداق دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ لوگ تشبیہ میں مبتلا ہو جاتے یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے وہ صفات ثابت کرتے ہیں جو مخلوق کا خاصہ ہے۔ عیسائیوں نے ولدیت اور ابنیت کا عقیدہ خدا کے لیے ثابت کیا اور کہا مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کر لیا اور اس طرح مخلوق کی صفات خدا کی ذات میں مان کر عقیدہ تشبیہ میں مبتلا ہوئے۔ اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی صفات خاصہ مخلوق میں مان کر شرک کے مرتکب ہوئے خدا کے علاوہ دوسروں کو بھی عالم الغیب، علیم کل، قادر مطلق اور مختار کل تسلیم کیا، کبھی انبیاء کو پکارا کبھی جنات اور فرشتوں کی دہائی دی کبھی اولیاء اللہ سے استعانت طلب کی، کسی سے مراد پوری کرائی، کسی سے حاجت روائی کرائی اور جو تعظیم خدا تعالیٰ کے ساتھ مختص تھی وہی دوسروں کے سامنے بھی کرنے لگے یہی شرک ہے اور اسی کے ارتکاب سے حجاب سوءِ معرفت کا شکار ہوئے۔ گویا شاہ صاحب نے تین حجابات کا ذکر کیا ہے جن میں مبتلا ہو کر اکثر اقوام قہر الٰہی کا نشانہ بنیں۔

ہلاکت بوجہ گناہ

فرمایا اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں مبتلائے مصیبت کر دیں پہلی قوموں کو بھی اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ہی مبتلائے مصیبت کیا تھا۔ سورۃ کہف میں فرمایا وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا یہی وہ (تباہ شدہ) بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ان کے گناہوں (کفر و شرک وغیرہ) کی وجہ سے ہلاک کیا۔ سورۃ ابراہیم میں ہے وَسَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ تم انہی لوگوں کے مکانوں

میں رہائش پذیر ہوئے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور تمہارے لیے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ اور ہم نے تمہارے لیے طرح طرح کی مثالیں بیان کیں۔ پہلی قوموں کی ہلاکت کے یہی اسباب ہیں۔ جن پانچ قوموں کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہی ہلاکت کے گڑھے میں گریں مگر اکثر لوگوں نے ان تاریخی واقعات سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ پہلے لوگوں کی طرح خرمستیوں میں پڑے اور حجابات کا شکار رہے۔ دنیا میں عروج و زوال کی داستانیں بار بار دہرائی جاتی ہیں مگر کتنے لوگ ہیں جو ان سے عبرت حاصل کرتے ہیں ہمارے ملک کے لوگوں نے سقوط ڈھاکہ سے کیا عبرت حاصل کی۔ آدھا ملک کٹ گیا، کتنے لوگ ہلاک ہوئے، کتنے بے گھر ہوئے، مگر پچھلوں نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا۔ پھر وہی عیش و عشرت، وہی نافرمانی، وہی چال ڈھال، کوئی فرق نہیں پڑا۔ اللہ تعالیٰ بار بار توجہ دلاتے ہیں کہ سابقہ امتوں کے واقعات سے عبرت پکڑو اور ظلم و زیادتی اور نافرمانی سے باز آجاؤ۔ مقصد یہ کہ گناہ ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے قوموں پہ زوال آتا ہے ذلت چھا جاتی ہے، نظام بگڑ جاتا ہے اور پوری انسانی سوسائٹی خراب ہو جاتی ہے۔ جب اعتقادی اور عملی گناہوں کی فراوانی ہو جاتی ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت آتی ہے۔ اگر گناہوں سے بچتے رہیں تو امن و سکون قائم رہتا ہے اور خدا کی طرف سے برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

دلوں پر مہر

فرمایا اگر ہم چاہیں تو انہیں گناہوں کی وجہ سے مبتلائے مصیبت کر دیں وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیں پس وہ لوگ نہیں سنتے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ پہلے گناہ پر ہی دل پر ٹھپہ نہیں لگتا بلکہ کوئی انسان جوں جوں برائی اختیار کرتا جاتا ہے، اس کا دل سیاہ ہوتا جاتا ہے

اور پھر آخر میں اُس کے دل پر مُہر لگا دی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں اس کی صلاحیت اور استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اُس کے نزدیک نیکی اور بُرائی میں کوئی تمیز نہیں رہتی اور برائیوں میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے سورۃ بقرہ کی ابتدا میں بھی فرمایا ہے "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور اب اُن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جب کسی کے دل پر ٹھپہ لگ جاتا ہے تو وہ دل سخت ہو جاتا ہے جو کہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے۔ سورۃ بقرہ ہی میں بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا "ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ" پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے "فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً" پھر یہ پتھر یا اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ اب ایسے دل میں نیکی کی کوئی بات داخل نہیں ہو سکتی اور آدمی ہلاک ہو جاتا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے ان ابعد شیٔ من اللّٰه القلب القاسی یعنی اللہ تعالیٰ سے دُور رہنے والی چیزوں میں سب سے دور وہ دل ہے جو سخت ہے۔ خدا سے دُوری کا مطلب کوئی مسافت کی دوری نہیں بلکہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان پر غفلت کے دبیز پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور انسان خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور توحید کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ دل کو سختی سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نسخہ بیان فرمایا ہے "وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ" (اعراف: ۲۰۵) اے لوگو اپنے رب کو صبح و شام اپنے دل میں گڑگڑاتے ہوئے اور اس سے ڈرتے ہوئے پست آواز سے یاد کرتے رہو۔ اور دیکھو اس سے غافل نہ ہونا

سابقہ اقوام کے حالات

فرمایا تِلْكَ الْقُرٰى یہ بستیاں ہیں نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا

ہم آپ پر بیان کرتے اُن کی خبروں میں سے کچھ۔ تمام کے تمام حالات نہیں بلکہ اُن میں بعض حالات بیان کرتے ہیں۔ یہاں مِنْ تبعیضیہ ہے دوسری جگہ آتا ہے "وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ" اُن میں سے بعض واقعات ایسے ہیں جو ہم نے بیان نہیں کیے۔ ویسے اجمالاً فرما دیا کہ ہم نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے نبی بھیجے مگر اللہ نے ہر ایک کی تفصیل ذکر نہیں کی کہ ہر ایک کے ساتھ کس قسم کے حالات پیش آئے۔ البتہ اتنی بات واضح کر دی کہ اللہ کے ہر نبی نے خدا کا پیغام اپنی امت تک پہنچایا، اور انہیں پوری پوری نصیحت کر دی مگر اکثر و بیشتر لوگوں نے تسلیم نہیں کیا عاد و ثمود جیسی قوموں کے کھنڈرات سے ان کی تہذیب کا کچھ پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے۔ ہمارے ہاں ٹیکسلا میں پرانی گندھارا تہذیب کے آثار موجود ہیں۔ کھدائی کے دوران نکلنے والے برتن اور اوزار سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کا تہذیب و تمدن کیسا تھا۔ اب تو ٹیکسلا چھوٹی سی بستی ہے مگر آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے یہ شہر میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ مہاتما بدھ کے زمانے کی تہذیب ہے جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی پانچ سو سال پہلے ہوئی ہے۔ اس دور میں موجودہ پشاور، پرشاپوری کہلاتا تھا اسی طرح سندھ میں موہنجوداڑو کے مقام پر پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کے آثار ملے ہیں۔ اُدھر عراق میں آشوریوں کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے مصر کے عجائبات تو مشہور و معروف ہیں یہ سب پرانی تہذیبیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ اللہ نے فرمایا کہ ان میں سے ہم نے بعض کے کچھ حالات بیان کر دیے ہیں تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔

انبیاء کی واضح باتیں

فرمایا وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ البتہ ان بستیوں اور قوموں کے پاس ہمارے رسول آئے واضح باتیں لے کر۔

اللہ تعالیٰ نے کھلا بتا دیا ہے کہ ہمارے رسول ہمارا پیغام لے کر ان پرانی اقوام کی طرف آئے بینہ سے عام طور پر معجزہ مراد لیتے ہیں تاہم یہ لفظ دلیل کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ اسی طرح قرآن پاک میں احکام کو بھی بینات کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ کے احکام بڑے واضح ہوتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ سورۃ یونس میں موجود ہے۔ آپ نے قوم سے فرمایا میری باتیں اچھی طرح سن لو ثُمَّ لَا یَکُنْ اَمْرُکُمْ عَلَیْکُمْ غُمَّۃً" اب کوئی چیز مخفی نہیں رہنی چاہیئے، میں واضح باتیں کر رہا ہوں، بینہ سے خود نبی کی ذات بھی مراد ہوتی ہے اور احکام اور دلائل بھی۔

امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کا آنا چوتھے درجے میں ہوتا ہے سب سے پہلے انسان کی فطرت سلیمہ پہ پیدائش ہے۔ پھر اس کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی توجہ اور ان کی دعائیں یا بددعائیں انسان کے ساتھ شامل ہوجاتی ہیں پھر شرائع مکتوبہ نازل ہوتے اور اس کے بعد چوتھے نمبر پر نبی آتا ہے جو تمام باتوں کو واضح کر دیتا ہے۔ اس کے بعد حجت تمام ہوجاتی ہے لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ" (النساء) رسول آنے کے بعد خدا تعالیٰ کے سامنے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ اللہ کا نبی توحید اور شرک، اچھائی اور برائی، حلال اور حرام، ایمان اور کفر، اخلاص اور نفاق ہر چیز کو واضح کر دیتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ نافرمانی کرتے ہیں وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل) ہم اس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک رسول بھیج کر اپنی حجت تمام نہ کر دیں۔

مفسر قرآن مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں بینات اور ہدیٰ دو مختلف چیزیں بیان کی گئی ہیں، سورۃ البقرہ میں آتا ہے" اِنَّ

الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى بینات سے مراد واضح باتیں ہیں جن کو ہر انسان بغیر محنت اور کاوش کے آسانی سے سمجھ سکتا ہے جیسے توحید جو بغیر کاوش کے سمجھ میں آجاتی ہے خدا تعالٰی کا شکر، صبر، عبادت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ذرا سی توجہ سے انسانی عقل میں آجاتی ہیں۔ اور ہدایت سے مراد باریک باتیں ہیں جو بغیر کاوش کے انسانی فہم میں نہیں آتیں اور ان کے لیے استاذ اور راہنما کی ضرورت ہوتی ہے جیسے تعظیم شعائر اللہ، حلال و حرام کی تمیز وغیرہ ہدیٰ میں شامل ہیں جنہیں نبی یا استاذ سمجھاتا ہے۔

مکذبین کی ہٹ دھرمی

فرمایا ہمارے رسول ان کے پاس واضح باتیں لے کر آئے فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ وہ لوگ اس چیز پر ایمان لانے والے نہیں تھے جسے وہ پہلے جھٹلا چکے تھے۔ جب اللہ کے نبی نے خدا کا پیغام پہلی دفعہ پہنچایا اور امت نے نہ مانا تو پھر کتنے بھی دلائل و شواہد پیش کیے ان لوگوں نے نہ مانا مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کافر لوگ قیامت کے دن اللہ تعالٰی سے درخواست کریں گے کہ ہمیں واپس دنیا میں لوٹا دیا جائے ہم نیکی اختیار کریں گے مگر اللہ فرمائیں گے وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام) اگر ان کو واپس لوٹا دیا جائے تو پھر بھی وہی کچھ کریں گے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ یہ ضدی لوگ ہیں، اللہ تعالٰی ان کی مخفی استعداد سے واقف ہے کہ واپس جا کر یہ کیا کریں گے فرمایا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ اسی طرح اللہ تعالٰی کافروں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتا ہے۔ ان کے ضد، عناد اور تعصب کی بنا پر ان کے دل سربمہر کر دیے جاتے ہیں۔

عہد شکنی

فرمایا وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ہم نے ان کی اکثریت میں کوئی عہد نہیں پایا۔ یعنی اکثر لوگوں نے عہد کی وفا نہیں کی۔

اس جہان میں آنے سے پہلے سب نے اللہ تعالیٰ سے عہد الست کیا تھا کہ مولا کریم تو ہی ہمارا رب ہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام آکر اس عہد کی یاد دہانی کراتے رہے کہ جو کوئی اس عہد و پیمان کو توڑے گا، اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا مگر ان میں سے اکثروں نے عہد سے وفا نہ کی۔ اس دنیا میں آکر بھی انسان ایک عہد (AGREEMENT) کرتا ہے ہر کلمہ گو دو باتوں کا عہد کرتا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور دوسرا یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برحق رسول ہیں میں ان کا اتباع کروں گا۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ اکثر لوگ ان دونوں عہدوں کو فراموش کر لیتے ہیں اور ان کے خلاف چلتے ہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کی توحید پہ پکے رہتے ہیں اور نہ اللہ کے نبی کی اطاعت پہ قائم رہتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے بہتوں کو عہد شکن ہی پایا۔

فسق کی تین اقسام

فرمایا ایک تو ہم نے اکثریت کو عہد کی خلاف ورزی کرتے پایا وَ اِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِیْنَ اور دوسری بات یہ کہ ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں کو نافرمان ہی پایا۔ اب فسق یا نافرمانی کی تین قسمیں ہیں جن میں سے کسی نہ کسی قسم میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کا نافرمان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کا صریحاً انکار کرتا ہے اللہ کے نبیوں کو جھوٹا کہتا ہے۔ ایسا آدمی کافر ہوتا ہے۔ یہ بھی فاسق کے زمرے میں داخل ہے۔ دوسرا فاسق وہ ہے جو زبان سے تو تسلیم کرتا ہے مگر دل سے انکار کرتا ہے۔ اس کو عام اصطلاح میں اعتقادی منافق کہتے ہیں۔ اور یہ بھی فاسق ہے۔ تیسرا فاسق وہ ہے جو دل و زبان سے اقرار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کے رسولوں کی رسالت کتب سماویہ، اور معاد پہ ایمان رکھتا ہے مگر عمل نہیں کرتا۔ یہ عملی منافق ہے اور آج ایسے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ اعتقادی منافق کی نسبت عملی منافقوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہر چیز کو مانتے ہوئے

اُس پر عمل نہیں کرتے۔ نماز کی فرضیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر پڑھتے نہیں۔ عدل کو ضروری سمجھتے ہیں مگر حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ اور دل سے رسومات کو بُرا سمجھتے ہیں مگر ایسے مجبور ہیں کہ ان کو انجام بھی دیے جاتے ہیں۔ تو فاسق کی تعریف میں یہ تینوں گروہ آتے ہیں۔ جن کے متعلق فرمایا کہ ہم نے ان میں سے اکثریت کو فسق کے درجے میں پایا۔

اللہ تعالیٰ نے پانچ اقوام کے حالات ذکر کرنے کے بعد اس درس میں ان پر بحیثیت مجموعی تبصرہ فرمایا ہے۔ آگے پھر سلسلہ کلام تاریخ انبیاء کے ساتھ منسلک ہو جائے گا اور چھٹے نبی اور اُن کی قوم کا حال بیان ہوگا۔ دو دور اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اب تیسرے دور کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان ہوں گے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ :- پھر بھیجا ہم نے ان (انبیاء اور اُن کی قوموں) کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سربرآوردہ لوگوں کے پاس پس انہوں نے ظلم کیا ان نشانیوں کے ساتھ۔ پس دیکھو کیسا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا (۱۰۳) اور کہا موسیٰ علیہ السلام نے اے فرعون! بیشک میں بھیجا ہوا ہوں رب العالمین کی طرف سے (۱۰۴) اور میں سزاوار ہوں اس بات کا کہ میں نہ کہوں اللہ پر مگر حق۔ تحقیق میں لایا ہوں تمہارے پاس

کھلی نشانی تمہارے رب کی طرف سے ۔ پس بھیج دو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو (۱۰۵) کہا فرعون نے اگر تو لایا ہے کوئی نشانی تو لا اس کو اگر تو سچا ہے (۱۰۶) پس ڈالا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی کو ، پس اچانک وہ ایک بڑا اژدھا بن گیا (۱۰۷) اور نکالا انھوں نے اپنے ہاتھ کو ، پس اچانک وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے لیے (۱۰۸)

ربط آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے پانچ انبیاء علیہم السلام اور اُن کی قوموں کا حال بیان کر کے حضور علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کو جرأت دلائی اور تسلی دی کہ ان قوموں کا حال پیش نظر رکھو اور تبلیغ دین کے لیے مستعد ہو جاؤ ۔ پھر اللہ نے درمیان میں اقوام عالم کی عمومی ذہنیت کا ذکر کیا اور اللہ کی وہ سنت اور دستور بیان کیا جس کے تحت نافرمانوں کو سزا ملتی ہے اور اطاعت گزاروں کو فلاح نصیب ہوتی ہے ۔ اب اس درس سے تاریخ انبیاء ہی کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن لوگوں کا ذکر شروع ہو رہا ہے جن کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا ۔ تو یہاں سے کافی دور تک حضرت موسیٰ علیہ السلام آپ کی قوم بنی اسرائیل اور فرعون اور اُس کی قوم کے لوگوں کا حال بیان ہوگا ۔

موسیٰ علیہ السلام کی بعثت

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک صابی دور تھا ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حنیفی دور شروع ہوا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تقریباً سات سو سال بعد اور حضرت یوسف علیہ السلام سے تقریباً چار سو سال بعد مبعوث ہوئے ۔ اس لحاظ سے آپ حنیفی آئمہ میں سے عظیم المرتبت امام ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰی پھر ہم نے اُن کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ۔ اُن سے مراد وہ پانچ انبیاء علیہم السلام اور اُن کی اقوام ہیں جن کا ذکر تبلیغ رسالت کے ضمن میں ہو چکا ہے ۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا بِاٰیٰتِنَآ اپنی نشانیاں دے کر ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام

کو کل نو نشانیاں یا معجزات عطا کیے تھے جن میں سے دو کا ذکر اس مقام پر
ہے، چھ معجزات کا ذکر آگے آئیگا اور ایک کا ذکر سورۃ یونس میں آیا ہے
تو فرمایا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اِلٰی فِرْعَوْنَ
وَ مَلَائِہٖ فرعون اور اس کے سربرآوردہ لوگوں کی طرف۔ موسیٰ علیہ السلام
کی امت دعوت قبطی لوگ اور ان کا بادشاہ فرعون تھا جو مصر میں برسراقتدار
تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں ان کی اپنی قوم بنی اسرائیل بھی
تھی جو کہ آپ کو ماننے والی امت اجابت تھی۔ مصر کی تاریخ میں کئی دور
گزرے ہیں۔ وہاں پر سولہ سو سال تک فراعین کو عروج حاصل رہا۔ مصر میں
چار تاریخی ادوار گزرنے کے بعد پانچواں دور مسلمانوں کا آیا جب صحابہ کرامؓ کے
زمانے میں مصر فتح ہوا۔

لفظ فرعون

لفظ "فرعون" کے مادہ اشتقاق میں مفسرین کا اختلاف ہے بعض
فرماتے ہیں کہ فرعون تفرع سے مشتق ہے جس کا معنی تکبر کرنا ہے۔
چونکہ فرعون بڑا مغرور اور متکبر آدمی تھا۔ اس لیے وہ اس نام سے مشہور ہوا
تفسیر حقانی میں فرعون کا مادہ اشتقاق فرع بنایا گیا ہے اور مصری زبان
میں اس کا معنی بڑا بادشاہ (GREAT EMPFROR) ہے۔ فرعون نے
آپ کو بڑا رب اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النّٰزعٰت) کہلاتا تھا۔ اس لیے
یہ فرعون کے نام سے موسوم ہوا۔ فرعون کا معنی دیوتا بھی ہوتا ہے بعض
فرماتے ہیں کہ فرعون کو سورج کا مظہر قرار دیا جاتا تھا۔ صابیوں کے دور میں
ستاروں کی پرستش ہوتی تھی اور ان کے نام پر مندر بھی بنے ہوئے تھے،
جس طرح ہندو مختلف مظہر اور اوتار مانتے ہیں اسی طرح فرعون کو سورج
کا اوتار مانا جاتا ہے۔ بہرحال لفظ فرعون کا معنی کچھ بھی کیا جائے یہ مصر کے
بادشاہوں کا لقب تھا اور سارے مصری بادشاہ اسی لقب سے ملقب
ہوتے تھے۔ بعد میں قبطی اپنے بادشاہ کو مقوقس بھی کہتے تھے۔ اس قسم کے

شاہانہ القاب باقی دنیا میں بھی پائے جاتے تھے جیسے ہندوستان میں بادشاہ کو راجہ کہتے تھے، چین میں خاقان، ایران کا بادشاہ کسریٰ کہلاتا تھا۔ جب کہ رومی اپنے بادشاہ کو قیصر کہتے تھے بہر حال مصر کے بادشاہ کا اصل نام مصعب، ابن ریان یا اخمیس تھا بعض کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے دو مختلف بادشاہوں کا زمانہ پایا یعنی آپ کی پرورش کرنے والا فرعون اور تھا اور غرق ہونے والا دوسرا، تاہم زیادہ مشہور یہی ہے کہ وہ اخمیس ہی تھا جس کے عہد حکومت میں موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اسی کے ساتھ آپ کے بحث مباحثے ہوتے رہے اور وہی غرق ہوا۔ اسی کو قرآن پاک میں فرعون کا نام دیا گیا ہے۔

معجزات کا انکار

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے حواریوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور کہا کہ میں تمہارے پاس اپنے رب کی طرف سے نشانیاں یا معجزات لے کر آیا ہوں فَظَلَمُوْا بِهَا تو انہوں نے ان نشانیوں کا انکار کر دیا اور کہا یہ تو جادو ہے۔ ظلم کا عام فہم معنی زیادتی ہے اور اس سے مراد شرک اور کفر ہے۔ ظلم عدل کے مقابلے میں ناانصافی کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قتل، حق تلفی اور فتنہ و فساد سب ظلم کی تعریف میں آتے ہیں۔ یہاں پر ظلم سے مراد انکار ہے یعنی فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے معجزات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تو فرمایا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ دیکھو! فساد کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے سفیر ہوتے ہیں، وہ بنی نوع انسان کے لیے نوید خیر خواہ اور ان کے لیے نمونہ ہوتے ہیں، وہ ایمان، تقویٰ اور نیک اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان انبیاء کا انکار کرتا ہے ان کے لائے ہوئے معجزات کو جھٹلاتا ہے، ان کو ایذا پہنچاتا ہے اس نے

بڑھ کر فسادی کون ہوسکتا ہے؟ ایسے لوگوں کا انجام وہی ہوتا ہے جو فرعون اور اسکی قوم کا ہوا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا دیکھو! فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

فرعون سے خطاب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اس طرح دعوت پیش کی۔ وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اے فرعون میں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ دوسرے مقام پہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کا ذکر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو فرعون کی طرف بھیجا اور فرمایا خوف نہ کھاؤ، میں تمہارے ساتھ ہوں "فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ" (طٰہٰ) انہوں نے کہا، ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں۔ یہاں پہ صرف موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے فرعون سے اپنا تعارف کرا کے یہ بھی فرمایا حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ میں اس بات کا سزاوار ہوں کہ اللہ تعالیٰ پہ حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ حقیق حق کے مادے سے ہے اور اس کا معنیٰ ثابت ہونا یا قائم ہونا بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت مولانا شیخ الہند اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں۔ میں قائم ہوں اس بات پر کہ اللہ کے بارے میں وہی بات کہوں جو سچی ہے اور کوئی غلط بات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کروں۔ جھوٹی بات منسوب کرنا تو کذاب کا کام ہوتا ہے۔ اللہ کا نبی سچا ہوتا ہے، وہ کبھی جھوٹی بات نہیں کرتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں اس بات کے لائق ہوں کہ اللہ تعالیٰ پہ حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔

معجزہ اور کرامت

آپ نے یہ بھی فرمایا قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانی لے کر آیا ہوں۔ اس نشانی سے دین، شریعت، ایمان، معجزہ وغیرہ مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پہ دو واضح نشانیاں یعنی معجزات کا ذکر کیا ہے جو موسیٰ علیہ السلام

فرعون کے پاس لے کر گئے تھے۔ معجزہ اس لیے معجزہ کہلاتا ہے کہ
وہ انسان کے بس میں نہیں ہوتا اور انسان اس سے عاجز ہوتے ہیں۔
معجزہ طبعی امور میں سے نہیں ہوتا بلکہ خارقِ عادت چیز ہوتی ہے یہ ایسی
غیر معمولی اور خلافِ طبع چیز ہوتی ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور انسان
مجبور ہو جاتا ہے، لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ جب کوئی معجزہ دیکھے تو اس
کو تسلیم کر لے، اس کا انکار نہ کرے۔

اگر کوئی خارقِ عادت چیز نبی کے ہاتھ پہ ظاہر ہو تو معجزہ کہلاتی ہے
اور اگر ولی سے ظاہر ہو تو اسے کرامت کہتے ہیں تاہم یاد رکھنا چاہیئے
کہ معجزہ یا کرامت غیر اختیاری چیز ہے کسی نبی یا ولی کے اختیار میں نہیں
ہوتا کہ جب چاہے کوئی معجزہ یا کرامت ظاہر کر دے۔ سورۃ مومن میں موجود
ہے وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کسی رسول
کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا کوئی معجزہ پیش کر سکے۔ امام شاہ ولی اللہ
محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اکثر لوگ نبی یا ولی کے ہاتھ پہ معجزہ یا کرامت
دیکھ کر اسے ان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو جاتے
ہیں۔ حالانکہ معجزہ یا کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو وہ نبی یا ولی کے
ہاتھ پہ ظاہر کر کے ان کو عزت بخشتا ہے۔ نصاریٰ اسی مقام پہ آ کر گمراہ ہوئے
انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات دیکھے تو ان کے متعلق
الوہیت کا اعتقاد قائم کر لیا اور اس طرح شرک میں ملوث ہو گئے۔

بنی اسرائیل کی آزادی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر فرعون کے سامنے جاری ہے آپ
نے سب سے پہلے اپنا تعارف بحیثیت رسول کرایا، پھر کہا کہ میں اللہ تعالیٰ
کے متعلق صرف حق بات کہنے پہ مامور ہوں۔ پھر بتایا کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف
سے نشانیاں لے کر آیا ہوں۔ اس کے بعد چوتھے نمبر پہ آپ نے اپنا
مدعا بیان کیا اور فرعون سے فرمایا فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ پس

بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ انہیں اپنی غلامی سے نکال دے
تاکہ میں ان کو مصر سے ان کے اصل وطن شام اور فلسطین لے جاؤں۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا اصل وطن تو فلسطین تھا مگر مصر میں پہنچ کر اللہ
نے آپ کو اقتدار بخشا۔ اس زمانے میں آپ کے خاندان کے ستر یا بہتر
افراد تھے جنہیں یوسف علیہ السلام سے تعلق کی بناء پر بڑی عزت حاصل تھی
تاہم آپ کے بعد وہاں کے مقامی قبطی لوگ ہی برسر اقتدار آگئے اور انہوں
نے آہستہ آہستہ بنی اسرائیلیوں کو غلام بنا لیا اور انہیں سخت تکالیف میں مبتلا
کر دیا۔ اس دوران کئی صدیاں گزر گئیں۔ ان کی تعداد بڑھتی رہی چنانچہ جب
موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر راتوں رات مصر سے نکلے تو اس وقت تک
ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار افراد تک پہنچ چکی تھی۔ اصلاً یہ لوگ موحد تھے۔
اور مصر کے مقامی لوگ مشرک تھے۔ مذہبی اختلاف کی بناء پر بھی بنی اسرائیل
قبطیوں کے مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے اور دوسری بات یہ ہوئی
کہ کسی نجومی نے فرعون کو اس وہم میں مبتلا کر دیا کہ بنی اسرائیل میں ایک
ایسا شخص پیدا ہونے والا ہے جو تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا
چنانچہ فرعون نے اسرائیلی بچوں کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا جس کا ذکر
سورۃ البقرہ اور دیگر سورتوں میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر
اپنے احسانات یاد کراتے ہوئے فرمایا وَإِذْ نَجَّيْنَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ
يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تمہیں
قوم فرعون سے نجات دی۔ وہ تمہیں سخت تکالیف میں مبتلا کرتے تھے
تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری بچیوں کو زندہ رکھتے تھے
بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا

غلامی غیر فطری چیز ہے

غلامی ایک غیر فطری چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غلامی کا مسئلہ سورۃ

نحل میں سمجھایا ہے عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ یعنی غلام
آدمی کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر وہ کوئی مال چھوڑ کر مر جائے تو اس
کے کسی وارث کو نہیں ملتا بلکہ اُس کے آقا کی ملکیت ہوتا ہے کیونکہ وہ
آقا کے تابع ہوتا ہے اسی لیے شریعت کا یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر غلام اپنے
آقا کے ساتھ سفر پہ جائے تو قیام یا سفر کے لیے غلام کی اپنی کوئی نیت
نہیں ہوتی بلکہ جو نیت آقا کی ہوتی ہے۔ غلام پر بھی اُس کا اطلاق ہوتا ہے
اگر آقا نے کسی جگہ پہ پندرہ دن یا زیادہ کے قیام کی نیت کی ہے تو
غلام کی بھی وہی نیت شمار ہوگی اور اُسے پوری نماز پڑھنی ہوگی۔ اسی طرح
اگر آقا کسی مقام پہ مسافر ہے تو غلام بھی مسافر سمجھا جائے گا۔ یہ بالکل اسی
طرح ہے جس طرح بیوی کی نیت اپنے خاوند کے تابع ہوتی ہے جہاں
خاوند نے قیام کی نیت کی بیوی بھی مقیم سمجھی جائیگی اور جہاں خاوند نے
سفر کی نیت کی بیوی بھی مسافر ہوگی۔ بہرحال غلامی ایک غیر فطری چیز ہے
اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ خاص طور پر غلاموں کے ساتھ
غیر انسانی سلوک کرنا اُس سے طاقت سے زیادہ مشقت لینا اور خوراک
لباس وغیرہ مناسب نہ دینا نہایت ہی ظلم کی بات ہے جو کہ کسی طرح
بھی مستحسن نہیں۔ قدیم زمانے میں پوری دنیا میں غلامی کا رواج پایا جاتا تھا
مگر اب گذشتہ صدی سے یہ قباحت ختم ہو چکی ہے۔

غلاموں کے لیے اصلاحات

نزولِ قرآن کے زمانہ میں غلامی کا رواج عام تھا جس سے تمدن کا سارا
نظام بگڑ چکا تھا۔ اُس وقت اکثر کاروبار غلاموں کے سر پہ تھا اس لیے
اس نظام کو یکسر ختم کر دینا ممکن نہیں تھا ایسا کرنے سے پورے معاشی نظام
کے اُلٹ پلٹ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ لہذا حضور علیہ السلام نے اس نظام
کی بتدریج اصلاح کا اہتمام کیا۔ آپ نے فرمایا اِن غلاموں کو حقیر نہ سمجھو یہ تمہارے
بھائی ہیں۔ اللہ نے کسی وجہ سے انہیں تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے

ان کو ویسا ہی کھلاؤ جیسا خود کھاتے ہو اور ان کو ویسا ہی پہناؤ جیسا خود پہنتے ہو۔ ان سے استطاعت سے زیادہ کام نہ لو۔ اگر کسی مشقت کے کام میں لگاؤ تو خود بھی اُن کے ساتھ تعاون کرو اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کرو۔ مسلم شریف میں ابو مسعود انصاریؓ کا واقعہ منقول ہے کہ اُس نے راستے میں غلام کو مارا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پیچھے آ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا وَاللّٰہِ اَقْدَرُ عَلَیْکَ مِنْکَ عَلٰی ھٰذَا یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تم پر زیادہ قدرت رکھتا ہے اس سے جتنا تم اس غلام پر قادر ہو پھر انہوں نے عمر بھر غلام کے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کی۔ حضور علیہ السلام نے غلاموں کی آزادی کا ایک راستہ بتا دیا چنانچہ کئی گناہوں کا کفارہ غلام کی آزادی قرار دیا۔ ویسے بھی حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جو شخص غلام کو آزاد کرے گا اُس کے ہر ہر عضو کے بدلے اللہ تعالیٰ آزاد کنندہ کے ہر ہر عضو کو جہنم کی آگ سے آزاد کرے گا۔

مسلمانوں کی مجموعی غلامی

مسلمانوں کا پہلا ساڑھے چھ سو سال کا دور آزادی کا دور تھا۔ انہیں دنیا میں عروج حاصل تھا، آزادی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے مگر تاتاریوں کے حملے کے بعد مسلمانوں پر زوال آیا اور ان پر مجموعی غلامی کا دور شروع ہوا۔ اس وقت یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلمان غلام بھی ہو سکتا ہے۔ علمائے وقت کو سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کو کیسے برقرار رکھا جائے مگر غلامی کے سائے گہرے ہوتے گئے اور پھر آخر میں انگریزوں کا زمانہ آیا جس میں انہوں نے مسلمانوں کو اخلاقی اور اقتصادی غلامی میں مبتلا کر دیا۔ مسلمانوں سے اُن کی تعلیم ختم کر کے اپنی تعلیم رائج کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ذہنی غلامی میں پھنس گئے۔ وہ اپنی سوچ اور فکر سے بھی محروم ہو گئے اور ان کی فکر کا واحد معیار انگریزی تعلیم رہ گئی۔

آج بھی تمام مشرقی ممالک ذہنی طور پر انگریز کے غلام ہیں۔ امریکہ تو اب اٹھا ہے مگر ہے یہ بھی انگریز۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو دین اور قرآن سے دور کر دیا ہے۔ عورتوں میں شیطانی آزادی کی روح پھونک دی ہے۔ اب تمام ممالک انگریز کی سیاسی اور اقتصادی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ روسی بھی بگڑے ہوئے انگریز ہیں۔ یہودی اور عیسائی پہلے ہی مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اہل اسلام کے خلاف یہ سب لوگ اکٹھے ہیں اور ثابت کرتے ہے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کہ یہ ایک ہی ملت کے افراد ہیں امریکہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کی اجارہ داری ہے۔ اقتصادی غلبہ یہودیوں کو حاصل ہے۔ سرمایہ دار لوگ ہیں اور تمام بنک انہی کے قبضے میں ہیں۔ چنانچہ اقتصادیات کے معاملہ میں حکومت بھی اِن کی دستِ نگر ہے۔ ایسی گہری سازش تیار کرتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ اقتصادی غلامی بھی بہت بڑی لعنت ہے جس کے سامنے مسلمان بے بس ہیں۔ اِن کی ذہنی غلامی نے انہیں اس حد تک پست کر دیا ہے کہ کوئی باعزت کام کر ہی نہیں سکتے۔ آزاد اقوام کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کریں۔ صنعت و حرفت میں ترقی کریں اور دوسروں کے دستِ نگر بننے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ مگر دیکھ لیں آج مسلمان دنیا کس تنزل میں پھنسی ہوئی ہے۔ غریب ممالک اقتصادی طور پر تباہ حال اور ترقی سے محروم ہیں۔ اور جن ممالک کے پاس پیسے کی فراوانی ہے ان کے پاس افرادی قوت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو تیل کی دولت سے مالا مال کیا ہے مگر وہ ماہرین کے محتاج ہیں۔ چالیس سال کے عرصے میں اپنے انجنیئر پیدا نہیں کر سکے۔ تیل کے کنوئیں میں آگ لگ جائے تو اس پر قابو پانے کے لیے امریکہ اور جرمنی سے ماہرین منگوانا پڑتے ہیں مغربی ممالک نے صنعت و حرفت میں ترقی کر کے

مشرقی ممالک کو تجارتی منڈیاں بنا رکھا ہے۔ ان کے لیے ہر چیز باہر سے آتی ہے۔ یہ ایسے ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں کہ جس سے نکلنے کے لیے ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں۔

انسان کی عزت و آبرو آزادی میں ہے۔ اس کے بغیر تو علامہ اقبال کہتے ہیں "غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر" غلامی میں رہ کر انسان پست اور گھٹیا کام کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ فتنہ فساد، کھیل تماشے، عیاشی اور فحاشی اس کے محبوب مشغلے ہوتے ہیں۔ اپنوں سے دشمنی اور اغیار سے دوستی اس کا معمول بن جاتا ہے۔ انگریزوں کے زمانہ میں برصغیر میں مسلمانوں نے ایک دو ٹکے کی جاسوسی کر کے من حیث القوم مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچایا۔ کسی کو سزا دلوائی، کسی کو قید کرایا اور کسی کو کالے پانی بھجوایا۔ اپنوں سے دشمنی مگر انگریز کے کہنے پر کعبہ پر بھی گولی چلا دی اور ترکوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے۔ یہ سب غلامی کے اثرات ہیں۔

بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر کے میرے ساتھ روانہ کر دو تاکہ میں انہیں گندے ماحول سے نکال لے جاؤں۔ چنانچہ فرعون کی غرقابی کے بعد جب آپ صحرائے سینا میں پہنچ گئے تو پھر وہیں کھلی فضا میں رہنا پسند کیا، واپس مصر نہیں گئے۔ کیونکہ وہاں پر بھی قوم آباد تھی جس سے انہوں نے آزادی حاصل کی تھی۔

دو عظیم معجزے

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو معجزات کی پیشکش کر چکے تھے چنانچہ فرعون نے کہا قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ اگر آپ کوئی نشانی یا معجزہ لائے ہیں فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ اور اگر آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو وہ معجزات پیش کریں۔ چنانچہ فَاَلْقٰى عَصَاهُ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی کو ڈالا۔ یہ ان کا پہلا معجزہ تھا۔ کہ ان کے ہاتھ میں جو لاٹھی تھی اسے زمین پر پھینک دیا فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ

ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ پس اچانک وہ بڑا اژدھا بن گیا۔ یہاں پر ثعبان کا ذکر ہے جب کہ بعض دوسرے مقامات پر جان یعنی چھوٹے سانپ کا ذکر آتا ہے عصا کے سانپ بننے کا واقعہ کئی مواقع پر پیش آیا۔ ضرورت کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کا عصا کبھی بڑا اژدہا بن جاتا ہے اور کبھی چھوٹا۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کے سامنے کھلا مقابلہ ہوا اور جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا ڈالے تو موسیٰ علیہ السلام کا عصا بہت بڑا اژدہا بن گیا جو تمام سانپوں کو نگل گیا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی جس میں کئی آدمی ہلاک ہو گئے۔ خود فرعون پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اسہال شروع ہو گئے۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے دوسری نشانی پیش کی وَنَزَعَ يَدَهٗ آپ نے اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈال کر باہر نکالا فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ پس اچانک وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا۔ آپ کا ہاتھ اتنا روشن تھا کہ اس نے زمین و آسمان کی درمیانی فضا کو منور کر دیا۔ دوسری جگہ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ کے الفاظ بھی آتے ہیں کہ اس سفیدی میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ بعض اوقات برص کی بیماری کی وجہ سے انسانی جسم کے بعض حصے سفید ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں تھا، بلکہ آپ کے ہاتھ میں نورانیت تھی اور وہ سورج کی طرح چمکتا تھا۔

یہاں پر اجمالی طور پر دو معجزات کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے۔ آگے کئی رکوع تک مزید تفصیلات آرہی ہیں۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ
عَلِيمٌ ﴿١٠٩﴾ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِّنْ أَرْضِكُمْ
فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ﴿١١٠﴾ قَالُوٓا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ
فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِينَ ﴿١١١﴾ يَأْتُوكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ
عَلِيمٍ ﴿١١٢﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوٓا إِنَّ
لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِينَ ﴿١١٣﴾ قَالَ
نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿١١٤﴾ قَالُوا
يٰمُوسٰىٓ إِمَّآ أَنْ تُلْقِيَ وَإِمَّآ أَنْ نَّكُونَ نَحْنُ
الْمُلْقِينَ ﴿١١٥﴾ قَالَ أَلْقُوا ۚ فَلَمَّآ أَلْقَوْا سَحَرُوٓا
أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَآءُو بِسِحْرٍ
عَظِيمٍ ﴿١١٦﴾ وَأَوْحَيْنَآ إِلٰى مُوسٰىٓ أَنْ أَلْقِ
عَصَاكَ ۚ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿١١٧﴾ فَوَقَعَ
الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوا
هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صٰغِرِينَ ﴿١١٩﴾

ترجمہ :- کہا سربرآوردہ لوگوں نے فرعون کی قوم سے بیشک
یہ (موسیٰ علیہ السلام) البتہ بڑا جاننے والا جادوگر ہے (۱۰۹) یہ چاہتا ہے

کہ تم کو نکال دے تمہاری زمین سے۔ پس تم کیا مشورہ دیتے ہو (۱۱۰) انہوں نے کہا مہلت دے دے اس کو اور اس کے بھائی کو ، اور آدمیوں کو بھیج دے مختلف شہروں میں کہ وہ اکٹھا کرنے والے ہوں (۱۱۱) جو لائیں تیرے پاس ہر علم والے جادوگر کو (۱۱۲) چنانچہ آ گئے جادوگر فرعون کے پاس تو انہوں نے کہا کہ بیشک ہمارے لیے اجر ہو گا اگر ہم غالب آ گئے (۱۱۳) تو فرعون نے کہا ہاں ، یقیناً تم البتہ مقربین میں سے ہو جاؤ گے (۱۱۴) اُن لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ ! یا تو تم ڈالو ، یا ہم ہوں پہلے ڈالنے والے (۱۱۵) موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم ڈالو تو جب انہوں نے ڈالا ، تو انہوں نے سحر کر دیا لوگوں کی آنکھوں میں اور خوفزدہ کر دیا اُن کو ، اور لائے وہ بہت بڑا جادو (۱۱۶) اور ادھر ہم نے وحی کی موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف کہ ڈال دو تم اپنی لاٹھی کو ، پس وہ تیزی سے نگلتی ہے اُس چیز کو جس کو وہ بناتے ہیں (۱۱۷) پس ثابت ہو گیا حق اور باطل ہو گئی وہ بات جو وہ کرتے تھے (۱۱۸) اس موقع پہ وہ مغلوب کر دیے گئے اور لوٹے وہ ذلیل ہو کر (۱۱۹)۔

ربط آیات

۔ تبلیغ رسالت کے سلسلے میں پہلے پانچ انبیاء علیہم السلام اور اُن کی اقوام کا ذکر ہوا۔ پھر سنت اللہ اور اقوام کی ذہنیت کا بیان ہوا۔ یہ صرف اُن پانچ انبیاء کی بات نہیں بلکہ دیگر انبیاء کے ساتھ بھی اُن کی قوموں نے ایسا ہی سلوک کیا۔ پھر اللہ کا دستور یہ رہا کہ پہلے اُن لوگوں پر تنگی ڈال کر انہیں آزمایا اور پھر آسودگی دے کر بھی آزمائش کی۔ اکثر و بیشتر نتیجہ یہی نکلا کہ لوگوں نے انبیاء کو تسلیم نہ کیا اور تباہ ہوئے۔ اُن کی ہلاکت کا تذکرہ اِن الفاظ میں ہو چکا ہے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ دیکھو! فساد کرنے

والوں کا کیا بُرا انجام ہوا۔ ان انبیاء کے بعد پھر دوسرے دور میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو قوموں کی طرف بھیجا۔ ایک آپ کی اپنی قوم بنی اسرائیل تھی اور دوسری قبطی قوم تھی جس کا سربراہ فرعون تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے پہلا حکم خداوندی یہی تھا کہ فرعون اور اس کے حواریوں کو ہمارا پیغام پہنچاؤ۔ اللہ نے فرعون کے مقابلے کے لیے دو نشانیاں یا معجزات بھی آپ کو عطا فرمائے۔ ان میں سے ایک عصا تھا اور دوسرا یدِ بیضا۔ جب موسیٰ علیہ السلام اللہ کا پیغام لے کر فرعون کے پاس پہنچے تو اس نے نشانیوں کا مطالبہ کیا۔ آپ نے دونوں معجزات ظاہر کر دیے تو فرعونی مرعوب ہو گئے مگر ایمان نہ لائے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون کے جادوگروں کے مقابلے کا ذکر کیا ہے۔ یہ سلسلہ بیان آگے دور تک چلا جا رہا ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام اور قوم کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

معجزات کا انکار

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا اور یدِ بیضا کے معجزات پیش کیے تو فرعون اور اس کی قوم کہنے لگی قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ تو فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ موسیٰ علیہ السلام تو بڑا ماہر جادوگر معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے معجزات کو جھٹلا دیا۔ انہوں نے نہ تو حقیقت کو دیکھا اور نہ انصاف سے کام لیا اور اللہ کے نبی کو جادوگر کہہ دیا۔ اس کے بعد لوگوں کو بدظن کرنے کے لیے موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں زمین سے نکال دے۔

لوگوں کو اللہ کے نبیوں سے بدظن کرنے کے لیے جابر قسم کے لوگوں کا ہمیشہ یہی وطیرہ رہا ہے کہ وہ انبیاء کے خلاف ملک گیری کا جھوٹا

پراپیگنڈا کرتے ہیں ۔ دیکھو! اگر اس شخص کی بات مان لی تو یہ تمہیں ملک بدر کر دے گا اور خود تمہارے علاقے پر قبضہ کر لے گا ۔ اس ملک کے اصل مالک تم ہو، تمہاری حکومت ہے، تمہیں یہاں اقتدار حاصل ہے مگر یہ شخص اپنا تسلط چاہتا ہے، لہٰذا اس سے خبردار رہنا اور اس کی باتوں میں نہ آنا، ہر مصلح اور نبی کے بارے میں یہی پراپیگنڈا کیا گیا مشرکین مکہ بھی حضور علیہ السلام کو ساحر کہتے تھے ۔ شق القمر کا معجزہ دیکھا تو کہنے لگے اس شخص نے جادو کر دیا ہے ۔ فرعون اور اس کے حواریوں نے بھی یہی ہتھیار استعمال کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو سحر اور آپ کو ساحر کا خطاب دیا ۔

بعثت انبیاء کا مقصد

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کی دعوت دیں گویا بندوں کو اللہ تعالیٰ سے روشناس کرائیں ۔ انبیاء کے فرائض منصبی میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ رسوم باطلہ کو مٹائیں اور لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو ختم کریں ۔ معرفت الٰہی کے بعد دوسرے امور کے لیے جماعت کی ضرورت ہوتی ہے جو معاشرتی نظام بھی درست کرتی ہے اور جہاد کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے ۔ مگر نبی کا بنیادی مقصد ملک گیری نہیں بلکہ ملکی اصلاح ہوتا ہے ۔ اسی لیے تاریخ انبیاء میں ہم دیکھتے ہیں کہ پورے سلسلہ انبیاء میں صرف چند ایک ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کے ساتھ ساتھ خلافت ارضی بھی عطا فرمائی ورنہ اکثر و بیشتر انبیاء کا مشن اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے اور لوگوں کی اصلاح تک محدود رہا اور اگر کوئی بادشاہ دین حق کو قبول کر لے اس پر عمل پیرا ہو جائے تو پھر نبی کو تخت حکومت پر بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ۔ جب اغیار کے نظام کی جگہ اللہ کا مقرر کردہ نظام آ گیا تو نبی کا مشن پورا ہو گیا ۔ خود حضور علیہ السلام کے زمانہ میں کئی حکمرانوں نے اسلام قبول کیا تو آپ نے حکم دیا کہ حکومت

انہی کے پاس رہنے دو، ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ غرضیکہ نبی کا کام سلطنت پر متمکن ہونا نہیں ہوتا۔ اور اگر باطل رسومات کو مٹانے اور ظلم کو ختم کرنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہو تو پھر ایسی جماعت تیار کرنی پڑتی ہے جو تبلیغ کے ذریعہ اور بضرورت ہو تو جہاد کر کے اللہ کے دین کو دوسروں تک پہنچائے اور عدل و انصاف قائم کرے۔

جادوگروں کا اجتماع

بہر حال سربرآوردہ لوگوں نے یہ پراپیگنڈا کیا کہ موسیٰ علیہ السلام تمہیں ملک بدر کرنا چاہتا ہے فَمَاذَا تَأْمُرُونَ اب بتلاؤ، تم اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہو یعنی موسیٰ علیہ السلام کی تحریک کا کیا جواب دینا چاہیئے قَالُوْا تو اُن لوگوں نے کہا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی ہارون علیہ السلام کو کچھ مدت مہلت دو۔ وہ خوفزدہ تو ہو چکے تھے کہنے لگے اس معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ اور اس دوران میں وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَائِنِ حٰشِرِيْنَ اور مختلف شہروں میں آدمی بھیجو يَأْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ جو ہر علم والے جادوگر کو تیرے پاس لے آئیں گے۔

جس طرح آجکل سائنس اور ٹیکنالوجی کو بڑا عروج حاصل ہے۔ قدیم زمانے میں نجومیوں اور سحروں کی بڑی قدر و منزلت تھی جس طرح موجودہ زمانے میں مختلف امور میں فنی ماہرین کے مشورے کے بغیر حکومت کوئی کام شروع نہیں کرتی اسی زمانے میں نظام حکومت میں ساحروں کا بڑا عمل دخل ہوتا تھا۔ حکمران ہر کام میں اُن سے مشورہ لیتے تھے۔ چنانچہ فرعون کے دربار میں جب موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ زیر بحث آیا تو سربرآوردہ لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ ہمارے ملک میں بڑے بڑے قابل ساحر موجود ہیں انہیں اکٹھا کر کے اُن کی خدمات سے استفادہ حاصل کرنا چاہیئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جادو کا کھیل دکھایا ہے تو اس کا مقابلہ ماہر جادوگر ہی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حکومت کے کارندے مختلف شہروں میں بھیجے

گئے اور جادوگروں کو بلایا گیا۔ بڑے بڑے جادوگر دور دراز علاقوں سے معہ اپنے ساز و سامان کے اکٹھے ہو گئے۔ ان کی تعداد کے متعلق مفسرین کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض نے بیس ہزار، بعض نے نوے ہزار، حتیٰ کہ تین لاکھ کی تعداد بھی روایات میں آتی ہے۔ تاہم جادوگروں کی کم از کم تعداد امام بغویؒ نے بیان کی ہے، وہ پندرہ ہزار ہے۔ ان جادوگروں کے کرتب کا سامان کم و بیش تین سو اونٹوں پر لاد کر لایا گیا۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے اور یوں کہنے لگے قَالُوٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا بے شک ہمارے لیے کوئی معاوضہ یا اجر ہوگا؟ اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ بس یہی وہ موڑ ہے جہاں آ کر نبی اور ساحر میں امتیاز ہوتا ہے۔ ساحر خود غرض اور مفاد پرست ہوتے ہیں۔ وہ جو کام کرتے ہیں پیسے کی خاطر کرتے ہیں۔ ان جادوگروں نے بھی کہا کہ ہم دور دراز سے سفر کر کے آئے ہیں، تکالیف برداشت کی ہیں، وقت دیا ہے، زادِ راہ خرچ کیا ہے۔ ہمیں ہماری محنت کا کچھ معاوضہ بھی ملے گا یا نہیں؟ اُدھر اللہ کا نبی ہے جو کہتا ہے لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا "میں تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ" (سورۃ ھود) میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے وَاَنَا نَاصِحٌ لَّكُمْ (اعراف) میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔ میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔ یہ دو انداز کا فرق ہے۔ جادوگروں کو شک تھا کہ کہیں فرعون محض بیگار میں ہی ہم سے کام نہ لے لے لہٰذا انہوں نے اجرت کا مطالبہ پہلے کر دیا۔ اُدھر اللہ کا سچا نبی ہے جو بلا معاوضہ لوگوں کی خیر خواہی کا حق ادا کر رہا ہے۔

جادوگروں کی عزت افزائی

جب جادوگروں نے اپنی اجرت کا مطالبہ کیا قَالَ نَعَمْ تو فرعون نے کہا، ہاں، تمہیں نہ صرف معاوضہ ملے گا بلکہ وَاِنَّكُمْ

لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ تم میرے مصاحب بن جاؤ گے، مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمہیں بڑے بڑے اعزاز دونگا۔ اپنا وزیر اور مشیر بنا لوں گا۔ بس تم ذرا کام کر کے دکھاؤ۔ اس زمانے میں فرعون جیسے ڈکٹیٹر کا مشیر بن جانا بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا وہ اس بات سے خوش ہو گئے اب ہمارا بھی کچھ نہ کچھ کام بن جائے گا۔ اس زمانے میں بھی نجومی، ساحر، پامسٹ، دست شناس، میجک ماسٹر، مداری وغیرہ سب وہی ذہن رکھتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے پیسہ کماؤ۔ کوئی بھی ماہر بلا معاوضہ خدمت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ فرعون کے ساحروں کی طرح آج بھی سب پیسے کے پجاری ہیں۔ تو بہرحال فرعون نے جادوگروں کو تسلی دی کہ فکر نہ کرو تمہیں بہت کچھ دیا جائے گا۔

جادوگروں کا کرتب

جب فرعون اور جادوگروں کے درمیان معاملہ طے ہو گیا قَالُوْا يٰمُوْسٰى جادوگر کہنے لگے اے موسیٰ علیہ السلام اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ کیا پہلے تم اپنا فن دکھانا چاہتے ہو وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ یا ہم اپنا کرتب ظاہر کریں۔ سورۃ طٰہٰ میں آتا ہے۔ اس مقابلے کے لیے دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا۔ لاکھوں آدمی میدان میں اکٹھے ہو گئے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو پہلے وار کرنے کی دعوت دی قَالَ اَلْقُوْا فرمایا ڈالو جو جادو تمہارے پاس ہے اُسے ظاہر کرو۔ فَلَمَّآ اَلْقَوْا جب انہوں نے ڈالا اور اپنا جادو پیش کیا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ لوگوں کی آنکھوں میں سحر کر دیا یعنی تماشائیوں کی نظر بندی کر دی۔ جادو کی حقیقت بس اتنی ہی ہے۔ یہ نظر کا دھوکہ کہہ لیں یا ہاتھ کی صفائی۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اصلیت نہیں ہوتی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ قرب قیامت میں دجال کا معاملہ بھی ایسا ہی فریب نظر ہو گا۔ حقیقت میں وہ دن معمول کے مطابق ہی ہو گا مگر لوگوں کو بہت

لمبا محسوس ہو گا۔ یہ میجک ماسٹر کیا کرتے ہیں۔ ہاتھ میں ایک انڈا پکڑتے ہیں، پھر ایک سے دو اور دو سے چار بنا دیتے ہیں۔ یہ محض ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے جو دو دو یا چار چار نظر آتے ہیں حقیقت میں ایک ہی انڈا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف معجزہ انقلاب حقیقت پہ مبنی ہوتا ہے اس کے ذریعے کسی چیز کی ماہیت ہی کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کیمسٹری کے ماہرین پتھر کو کسی فارمولے کے تحت سونے میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اگر چاہے تو پتھر کو سونا بنا دے۔ تمام کائنات، ذرات اور عناصر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ جو تبدیلی چاہے کر دے۔ بہر حال جادوگروں نے لوگوں کی آنکھوں میں سحر کر دیا وَاسْتَرْهَبُوهُمْ اور ان کو ڈرایا وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ اور وہ بہت بڑا جادو لے کر آئے۔

عصائے موسیٰ

جب جادوگر اپنا کرتب دکھا رہے تھے تو موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم کے منتظر تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ کہ اپنی لاٹھی ڈال دیں۔ یہ معجزے کی لاٹھی تھی۔ اللہ کے حکم سے آپ نے وہ نیچے پھینک دی فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ پس وہ جادوگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کو تیزی سے نگل گئی۔ انہوں نے تو رسیاں پھینکیں تھیں جو سانپ نظر آنے لگے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈالی تو وہ بہت بڑا اژدہا بن کر جادوگروں کے جعلی سانپوں کو نگل گئی۔ لقف کا معنی کسی چیز کو تیزی کے ساتھ نگل جانا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فتوح الغیب میں فرماتے ہیں اَلْمُؤْمِنُ وَقَّافٌ وَالْمُنَافِقُ لَقَّافٌ یعنی مومن رک جاتا ہے اور منافق تیزی سے نگل جاتا ہے جب کسی شخص پہ کھانے کے لیے کوئی چیز پیش کی جاتی ہے تو

مومن آدمی اُس کو کھانے سے پہلے خوب تحقیق کر لیتا ہے اور حلال و حرام میں امتیاز کرتا ہے وہ جانچتا ہے کہ کوئی حرام یا مشکوک چیز تو نہیں۔ نذر لغیر اللہ گیارہویں شریف یا صدقہ خیرات تو نہیں۔ بہ خلاف اس کے منافق آدمی بلا تحقیق تیزی سے نگل جاتا ہے یہ گویا مومن اور منافق کی پہچان ہے۔

بہر حال موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی بہت بڑا اژدہا بن کر جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو نگل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا میدان صاف ہو گیا۔ پھر اژدہا اچھل اچھل کر تماشائیوں کی طرف لپکنے لگا جس سے خوف وہراس پیدا ہو گیا۔ فرمایا فَوَقَعَ الْحَقُّ پس حق ثابت ہو گیا۔ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ اور جادوگروں کا بنایا ہوا کھیل باطل ہو گیا۔ حقیقت کے سامنے جادو ناکام ہو گیا فَغُلِبُوا هُنَالِكَ فرعونی اور جادوگر مغلوب ہو گئے وَانْقَلَبُوا صٰغِرِينَ اور وہ ذلیل ہو کر واپس لوٹ آئے۔

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۴

ترجمہ :- اور ڈال دیے گئے جادوگر سجدے میں ﴿۱۲۰﴾ انہوں نے کہا ہم ایمان لائے ہیں رب العلمین پر ﴿۱۲۱﴾ جو کہ رب ہے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ﴿۱۲۲﴾ کہا فرعون نے کیا تم ایمان لائے اس پر میری اجازت کے بغیر، بیشک یہ ایک داؤ ہے جو تم نے شہر میں کھیلا ہے تاکہ تم نکالو جس کے ذریعے اس کے رہنے والوں کو۔ پس عنقریب تم جان لو گے ﴿۱۲۳﴾ میں ضرور کاٹ دوں گا تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے

پاؤں، پھر تم سب کو سولی پہ لٹکا دوں گا (۱۲۴) انہوں نے
کہا بیشک ہم اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں (۱۲۵)
اور نہیں تو عیب پاتا ہم میں سوائے اس کے کہ ہم ایمان
لائے ہیں اپنے رب کی آیتوں پہ جب وہ ہمارے پاس آچکیں
اے ہمارے پروردگار! ڈال دے ہم پہ صبر اور وفات دے ہمیں
فرمانبرداری کی حالت میں (۱۲۶)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے جادوگروں کے درمیان مقابلے کا ذکر ہوا تھا معجزات دیکھ کر فرعون نے کہا یہ بڑا جادوگر ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے اور خود عنانِ حکومت سنبھال لے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون کے سرداروں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی فرعون کو مشورہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی کاروائی کرنے میں جلدی نہ کی جائے بلکہ اُسے مہلت دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے بڑے بڑے جادوگروں کو اکٹھا کر کے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلہ کرایا جائے اس پروگرام کے تحت تمام چیدہ چیدہ ساحروں کو جمع کیا گیا۔ سب لوگ میدان میں اکٹھے ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پہ جادوگروں نے اپنا کرتب دکھایا۔ ان کے مقابلے میں اللہ کے حکم سے آپ نے اپنی لاٹھی میدان میں ڈال دی۔ وہ بہت بڑا اژدھا بن گیا اور جادوگروں کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے سارے سانپوں کو نگل گیا۔ اس طرح حق ثابت ہو گیا اور فرعونی مغلوب ہو گئے اور نہایت ذلیل ہو کر وہاں سے لوٹے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے جادوگروں کا حال بیان فرمایا ہے۔

ساحرین کا اعترافِ حقیقت

جب جادوگروں نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سے بننے والا اژدھا اُن کے بنائے ہوئے سارے سانپوں کو نگل گیا ہے تو وہ دم بخود رہ گئے وہ سمجھ گئے کہ جو کچھ موسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا ہے وہ حقیقت ہے اگر یہ بھی جادو ہوتا تو جس طرح

ہمارے بنائے ہوئے سانپ دوڑتے پھرتے تھے، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کا اژدہا بھی چلتا پھرتا نظر آتا، مگر اس کا جادو کے سانپوں پر غالب آجانا اس کی حقیقت کو ظاہر کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے کیا کیا؟ وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ اور سجدے میں ڈال دیے گئے یعنی جادوگر اس قدر دم بخود ہوئے کہ انہیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ فوراً سجدہ ریز ہو گئے، گویا اعتراف حقیقت کریں کہ یہ کسی انسانی طاقت کا کام نہیں بلکہ اس کام کو انجام دینے والی کوئی بلند و بالا طاقت ہے۔ جادوگروں کی اس بے قابو حالت کو اللہ تعالیٰ نے اُلْقِيَ سے تعبیر کیا ہے۔ ان پہ دہشت طاری ہوگئی۔

ساحر ایمان لے آئے

جادوگر سجدہ ریز ہوگئے اور قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہنے لگے کہ ہم تمام جہانوں کے پروردگار پہ ایمان لے آئے ہیں جس نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پہ یہ واضح نشانی ظاہر کر دی۔ رب تو فرعون بھی اپنے آپ کو کہلاتا تھا اس لیے وہاں شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ جادوگر کس رب پہ ایمان لائے ہیں، فرعون پہ یا اس رب پہ جس کی دعوت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے بھائی ہارون علیہ السلام دیتے ہیں۔ تو اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ساحروں نے کہا رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ہم اُس رب پہ ایمان لائے ہیں جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے وہی رب العٰلمین جس نے ہزاروں ساحروں کے سحر کو ایک لحظہ میں باطل کر کے رکھ دیا ہے بہرحال اس عظیم معجزے کا فرعون پہ تو اثر نہ ہوا، وہ اپنی ضد پہ اڑا رہا مگر ہزاروں ساحر جو کفر کے پتلے اور اپنی پیٹ پروری کے لیے آئے تھے ان کی کایا پلٹ گئی۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور رب العالمین پہ ایمان لے آئے۔ جو لوگ چند لمحے پہلے کافر اور مشرک تھے وہ یکایک ایماندار بن گئے۔

فرعون کا ردِّ عمل

پہلے تو فرعون کے حواری حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف پراپیگنڈا کرتے تھے کہ یہ شخص تمہارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور خود تمہیں ملک بدر کر دینا چاہتا ہے مگر جب مقابلے پر بلائے گئے جادوگر خود ایمان لے آئے تو فرعون کو خطرہ پیدا ہوگیا کہ اب باقی لوگ بھی ایمان قبول کر لیں گے لہذا اس نے جادوگروں کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا قَالَ فِرْعَوْنُ فرعون کہنے لگا اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ تم میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے ہو اور موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کر دی ہے۔ کہنے لگا۔ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ یہ تو ایک داؤ ہے جو تم نے شہر میں کھیلا ہے لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا تاکہ یہاں کے باشندوں کو نکال باہر کرو۔ فرعون کہنے لگا کہ یہ تمہاری اور موسیٰ علیہ السلام کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ یہ سب کچھ تم نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت کیا ہے۔ تم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نورا کشتی کی ہے۔ تم نے اپنی شکست پہلے سے طے کر لی تھی اور اس آڑ میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ کہنے لگا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ تمہیں جلد علم ہو جائے گا کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں میں تمہیں اس بغاوت کا ضرور مزا چکھاؤں گا۔

سخت سزا کی دھمکی

پھر فرعون نے جادوگروں کو دھمکی دی لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ میں ضرور کاٹ دوں گا تمہارے ہاتھ اور پاؤں الٹے۔ یہاں پر لام تاکیدی اور نون ثقیلہ دونوں تاکید کے لیے آئے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ میں یہ کارروائی ضرور بالضرور کر کے رہوں گا۔ الٹے ہاتھ پاؤں کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور دوسری طرف کا پاؤں۔ سورۃ مائدہ میں ڈاکو کی یہی سزا بیان کی گئی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے "اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ"

وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ یا ان کے ہاتھ اور پاؤں الٹے کاٹ دیئے جائیں۔ یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ ایسی سزا دیتے وقت ہاتھ کلائی سے کاٹا جاتا ہے اور پاؤں ٹخنے سے۔ اگر ہاتھ پاؤں کاٹا جائے اگر ہاتھ دایاں ہو تو پاؤں بایاں ہوتا ہے اور ہاتھ بایاں ہو تو پاؤں دایاں، ڈاکو اور راہزن کے جرم کی نوعیت کے مطابق حاکم وقت چار قسم کی سزائیں دے سکتا ہے یعنی قتل کر دیا جائے۔ سولی پر چڑھا دیا جائے۔ الٹے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں یا قید کر دیا جائے (یا ملک بدر کر دیا جائے) جیسا حاکم مناسب سمجھے ویسی سزا دے دے۔

بشمول رجم اس قسم کی سخت سزائیں زمانہ قدیم سے ہی رائج تھیں۔ چور کی قطع ید والی سزا تورات میں بھی موجود ہے۔ قرآن کی طرح رجم کی سزا بھی شریعت موسوی میں روا تھی۔ چنانچہ فرعون نے جادوگروں کو دھمکی دی کہ میں تم سب کے الٹے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دوں گا ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ تاکہ لوگوں کو دیکھ کر عبرت ہو کہ ملک کے غداروں کا یہ حشر ہوتا ہے محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ عبرت کے لیے اس قسم کی سزا کو مشتہر کرنا ہماری شریعت میں بھی جائز ہے۔ کسی مجرم کو چوراہے میں سولی پہ چڑھا کر کچھ دن تک لٹکتا چھوڑ دیا جائے یا چور کا ہاتھ کاٹ کر ہفتہ بھر کے لیے اس کے گلے میں لٹکا دیا جائے تاکہ وہ جہاں جائے لوگوں کو عبرت ہو کہ مجرم کو اس طرح سزا دی جاتی ہے۔ اسی طرح قصاص میں قتل کرنے کی سزا بھی سرعام دی جاتی ہے تاکہ لوگ دیکھ کر عبرت پکڑیں۔

ساحروں کی راسخ الایمانی

فرعون کی اس دھمکی کا جادوگروں پر کچھ اثر نہ ہوا، کیونکہ وہ تو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو چکے تھے، وہ اس قسم کی سزاؤں سے بے نیاز تھے انہیں علم تھا کہ اگر وہ قتل کر دیئے گئے تو بہرحال اپنے رب کے ساتھ ملاقات

کریں گے جس پر وہ ایمان لا چکے تھے۔ کہنے لگے قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ بیشک ہم تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں اگر تو ہمیں سزا دے گا تو وہ رب تیرے جیسے ظالموں کو بھی سزا دیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ ہم اُس قادرِ مطلق کے پاس جا رہے ہیں جس کے قبضہ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ جب وہ پکڑنے پر آئیگا تو پھر تیرا حشر بھی بہت بُرا ہوگا۔ انہوں نے مزید کہا وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا تم ہم میں کیا عیب پاتے ہو سوائے اس کے کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لے آئے ہیں جب وہ ہمارے پاس آگئیں۔ ہم معجزات کو دیکھ کر اُن کی حقیقت کو پہچان گئے ہیں لہٰذا ہم ایمان لائے ہیں۔ بجز اس کے ہمارا کیا قصور ہے؟ ہماری نہ کسی سے عداوت ہے نہ دشمنی نہ کسی کا مال چھینا ہے اور نہ کسی کو بے آبرو کیا ہے۔ آخر ہمیں کس جرم کی سزا دی جائیگی؟

اس قسم کے الفاظ بعض دوسری قوموں کے متعلق بھی قرآن پاک میں آئے ہیں۔ مثلاً جب اصحاب الاخدود کو آگ میں ڈالا گیا تو انہوں نے بھی یہی کہا تھا۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اس کے سوا ان کا کیا قصور تھا کہ وہ اللہ عزیز وحمید پر ایمان لائے تھے۔ حضور علیہ السلام کے اولین رفقاء جو عام طور پر غریب اور کمزور لوگ تھے، وہ بھی مشکلات برداشت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا اس کے سوا کیا جرم ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں جو ہمارا رب ہے ایمان تو کمال درجے کی چیز ہے جسے تم جرم سمجھ کر سزا دیتے ہو بہرحال ساحر بھی کامل الایمان ہو چکے تھے جو کہ اولیاء اللہ کا درجہ ہے، اللہ کے بندے ہر آزمائش کو برداشت کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور یہی عزم ان جادوگروں کا بھی تھا، جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے رب

پر صدق دل سے ایمان لا چکے تھے۔

جب جادوگروں کو یقین ہو گیا کہ فرعون انہیں سزا دیے بغیر نہیں چھوڑے گا تو انہوں نے ایمان پر استقامت اور مصائب پر صبر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ پھیلا دیے۔ کہنے لگے رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا اے ہمارے پروردگار! ڈال دے ہم پر صبر۔ صبر ملت ابراہیمیہ کا ایک اہم اصول ہے۔ توحید، ایمان، شکر، تعظیم شعائر اللہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اور صبر نہایت اعلیٰ درجے کے اصول ہیں۔ سورۃ البقرہ میں آتا ہے اے ایمان والو! اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ جب کبھی مصیبت آ جائے تو صبر اور نماز کے ساتھ استعانت طلب کرو۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ ایمان کے دو حصے ہیں۔ نصف حصہ صبر میں ہے اور دوسرا نصف شکر میں۔ حضرت علیؓ کے قول میں جہاں ایمان کے ستون شمار کیے گئے ہیں وہاں صبر کو بھی ایک ستون کہا گیا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح آتا ہے الصبر من الایمان بمنزلۃ الرأس من الجسد صبر کا تعلق ایمان کے ساتھ اس طرح لازمی ہے جس طرح سر کا تعلق دھڑ سے ہے جسم سر کے بغیر بے جان ہو جاتا ہے اور ایمان صبر کے بغیر باقی نہیں رہتا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے سل اللہ العافیۃ یعنی اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کیا کرو، سلامتی چاہو اور آزمائش کی خواہش کبھی نہ کرو۔ اور جب تم کسی مصیبت میں ڈال دیے جاؤ تو صبر کرو۔ اگر میدان جنگ میں دشمن کے ساتھ آمنا سامنا ہو جائے تو جان لو ان الجنۃ تحت ظلال السیوف جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ اس وقت ثابت قدم رہو اور صبر سے کام لو۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت کے طالب رہو اور جب مصیبت

آ ہی جائے تو پھر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ چنانچہ طالوت کے ساتھیوں نے جالوت کے مقابلے میں یہی دعا کی تھی "رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا" (البقرہ) اے مولا کریم! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو مضبوط کر دے۔ جنگ احد کے موقع پر بھی مسلمانوں نے یہی دعا کی تھی۔ کہ اے اللہ ہمارے گناہ اور زیادتیاں معاف کر دے ہمارے قدم مضبوط کر دے اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما۔ مطلب یہ ہے کہ کامل مومنین نے جزع فزع کرنے کی بجائے مصیبت کے وقت ہمیشہ صبر اور استقامت الٰہی کی دعا کی۔ اسی مقام پر ایمان لانے والے ساحروں نے بھی اپنے پروردگار سے صبر ہی کی دعا کی۔

اس بات میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ جس سزا کی دھمکی فرعون نے دی تھی، وہ فی الواقع دی بھی تھی یا نہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ محض دھمکی تھی، اس پر عمل درآمد نہیں ہوا تھا بلکہ جادوگروں کو زندہ چھوڑ دیا گیا تھا بعض فرماتے ہیں کہ فرعون نے عام حیثیت کے جادوگروں کو تو رہا کر دیا تھا مگر جو سرکردہ جادوگر تھے ان کو سزائے موت دیدی تھی تاہم فرعون کے مزاج کی جس قسم کی جھلک نظر آتی ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سزا ضرور دی ہوگی۔ جادوگروں کو بھی سزا کا یقین ہو چکا تھا اسی لیے انہوں نے صبر و استقامت کے لیے دعا کی تھی۔

صبر کی بعض دوسری قسمیں بھی ہیں مثلاً صبر مصیبت پر بھی ہوتا ہے اور اطاعت پر بھی نفس کو خواہشات سے روکنے پر بھی صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ صبر کا مفہوم بڑا وسیع ہے صبر کے بغیر اطاعت بھی نہیں ہو سکتی۔ جب تک انسان صبر سے کام نہ لے نہ وضو ہو سکتا ہے اور نہ غسل، نہ نماز ادا ہو سکتی ہے اور نہ روزے کا فریضہ، ہمارے دین میں صبر بہت بڑا اصول ہے۔

اسلام پہ موت

بہرحال جادوگروں نے رب العزت سے ایک تو صبر کی دعا کی اور دوسری عرض یہ کی وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ اے مولا کریم! ہمیں ایسی حالت میں موت دینا کہ ہم مسلمان ہوں یعنی تیرے مکمل طور پہ اطاعت گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر انبیا حضرات ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہی نصیحت کی تھی فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (البقرہ: ۱۳۲) تمہاری موت صرف اسی حالت میں آنی چاہیے کہ تم اطاعت کرنے والے ہو یعنی تمہاری موت اسلام کی حالت میں آنی چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی یہی دعا کی تھی "تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ" (سورۃ یوسف) اے اللہ! مجھے اسلام پہ موت دینا اور صالحین کی رفاقت نصیب فرما۔

موت ایک غیر اختیاری چیز ہے اور یہ اسی وقت آئیگی جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔ تاہم اسلام کی حالت میں موت طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت نیکی اور اطاعت کے کاموں میں لگے رہنا چاہیے تاکہ اس کی موت اسی حالت پہ آئے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کفر، شرک، بدعات اور معصیت کے کاموں میں مصروف رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی موت بھی اسی حالت پہ آئیگی۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندے ہمیشہ یہی دعا کرتے ہیں کہ مولا کریم! ہمیں اپنی اطاعت پہ قائم رہنے کی توفیق عطا فرما تاکہ ہماری موت بھی اسی حالت میں آئے کہ ہم مسلمان یعنی تیری اطاعت کرنے والے ہوں۔

یہ جادوگروں کی دعا تھی جنہوں نے ایمان کو قبول کر لیا تھا اس سے پہلے وہ کفر کی حالت پہ تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے تو انہیں یقین ہوگیا کہ یہ جادو نہیں بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے جو قادر مطلق ہے۔ لہٰذا وہ کامل ایمان لا کر اولیاء اللہ کی صف میں شامل ہوگئے۔ دوسری

آیات میں یہ بھی تشریح ہے۔ کہ جب فرعون نے سزا دینے کی دھمکی دی تو
ساحروں نے اس سے کہا تھا کہ تو ہمیں ہماری دنیاوی زندگی ختم کرنے کی
دھمکی دیتا ہے مگر تیرے اختیار میں اس کے سوا ہے بھی کیا؟ تو بیشک
ہمیں موت سے ہمکنار کر دے مگر ہمیں اپنے رب سے اُمید ہے کہ وہ ہماری
غلطیوں کو معاف کر کے ہمیں اعلیٰ درجہ عطا کریگا اور اپنا قرب نصیب
کریگا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی انسان کا ایمان مکمل ہو جاتا ہے تو پھر اُس سے
اسی بات کی توقع ہوتی ہے۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾

ع ۱۵ ۵

ترجمہ :- اور کہا سرداروں نے فرعون کی قوم سے کیا تو چھوڑتا ہے موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کی قوم کو تاکہ وہ فساد کریں زمین میں اور وہ چھوڑ دیں تجھے اور تیرے مقرر کردہ معبودوں کو ۔ تو کہا (فرعون نے) ہم ضرور قتل کریں گے ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھیں گے ان کی عورتوں کو اور بیشک ہم ان پر غالب ہیں (۱۲۷) کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لوگوں سے مدد مانگو اللہ تعالیٰ سے اور صبر کرو ۔ بیشک زمین اللہ تعالیٰ کی ہے ، وہ وارث بناتا ہے اس کو جسے چاہے اپنے بندوں میں سے اور اچھا انجام ہے

متقیوں کے لیے (۱۲۸) کہا انہوں (موسیٰ علیہ السلام کی قوم) نے ہمیں تکالیف دی گئی ہیں تیرے آنے سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی جب تو ہمارے پاس آیا ہے ۔ کہا (موسیٰ علیہ السلام) نے امید ہے کہ تمہارا پروردگار ہلاک کرے گا تمہارے دشمن کو اور خلیفہ بنائے گا تمہیں زمین میں ۔ پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسے کام کرتے ہو (۱۲۹)

ربط آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جب جادوگروں نے اپنا کمال دکھایا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے باطل کر دیا اور فرعونی ذلیل ہو گئے اُدھر جادوگر موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے رب پر ایمان لائے اور اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے ۔ وہ معجزے کی حقیقت کو سمجھ کر شرک کی زندگی سے تائب ہو چکے تھے ۔ انہیں دیکھ کر دوسرے لوگ بھی ایمان لانے پر تیار ہو گئے تو فرعون اور اس کے حواریوں کو فکر لاحق ہوئی کہ یہ معاملہ تو ہماری خواہش کے الٹ ہو گیا ۔ اب آج کی آیات میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کی اگلی کارروائی کا بیان ہے نیز موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو تسلی دینے کا ذکر ہے ۔

مشیرانِ فرعون کا مشورہ

جب فرعون کے درباریوں نے دیکھا کہ جادوگروں کے ایمان لے آنے سے دوسرے لوگ بھی اس طرف مائل ہو رہے ہیں اور اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو غلبہ حاصل ہو جانے کا احتمال ہے تو انہوں نے فرعون سے کہا وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے فرعون سے یوں کہا : اَتَذَرُ مُوسٰى وَقَوْمَهٗ کیا تو موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑتا ہے کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں اور اب اُن کا ارادہ ہے لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ کہ زمین میں فساد برپا کریں قوم فرعون کے لوگ جانتے تھے کہ بنی اسرائیل تو پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام پر قومی حیثیت سے یقین رکھتے ہیں اب جادوگروں کے ایمان لانے کی وجہ سے مزید لوگ موسیٰ علیہ السلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں تو انہوں نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اگر اُن کو اسی طرح آزاد

چھوڑ دیا گیا، اِن کی تبلیغ پہ پابندی عاید نہ کی گئی یا انہیں سزا نہ دی گئی تو یہ لوگ ملک میں فساد کا باعث بنیں گے، لہٰذا اِن کا کوئی بندوبست ہونا چاہیئے۔

فرعون کے حواریوں نے دوسری بات یہ کی وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ یہ لوگ تمہیں بھی موقوف کر دیں گے یعنی تمہاری سلطنت کا خاتمہ کر دیں گے اور تمہارے مقرر کردہ معبودوں کو بھی چھوڑ دیں گے یعنی لوگوں کو اُن کی پرستش سے روک دیں گے۔ اس طرح گویا فرعون کے سرآوردہ لوگوں نے اس کے سامنے تین باتیں کر کے اُسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قوم بنی اسرائیل کے خلاف ابھارا۔ پہلی بات یہ کہ تو نے موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو بلا بازپرس آزاد چھوڑ رکھا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم کریں گے اور تیسری بات یہ کہ نہ تو یہ لوگ تیرا حکم مانیں گے اور نہ تیرے مقرر کردہ معبودوں کی پوجا پاٹ کریں گے۔

فساد کی تعریف

موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے فرعونیوں کو دینی اور دنیاوی دو قسم کا فساد نظر آ رہا تھا۔ اُن کا دینی یا مذہبی فساد یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ کی صورت میں اُن کی تمام مشرکانہ رسومات ختم ہو جائیں گی اور فرعون سمیت تمام معبودانِ باطلہ کی پرستش نہیں ہو سکیگی۔ اُن کے نزدیک دنیاوی فساد یہ تھا کہ اُن کی حکومت بھی چھن جائیگی اور سلطنت کے بل بوتے پہ جو من مانی کر رہے ہیں، لوگوں پہ ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں اور انہیں غلام بنا رکھا ہے وہ سب کچھ جاتا رہے گا۔ فرعونیوں کی ذہنیت اس حد تک گر چکی تھی کہ فساد کو ختم کرنے والی چیزوں کو خود فساد سے تعبیر کر رہے تھے اللہ کا سچا نبی تو خدا کا پیغام پہنچاتا ہے، اُس کی وحدانیت کی دعوت دیتا ہے اس کی عبادت کا طریقہ سکھاتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ جوڑتا ہے اور دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنے کی تعلیم دیتا ہے، نبی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مصلح نہیں ہوتا خدا کا پیغمبر پوری امت میں ہر لحاظ سے اعلیٰ و ارفع انسان ہوتا ہے مگر یہ

لوگ نبی پر فساد برپا کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ لہٰذا فرعون کے سربرآوردہ
لوگوں نے فرعون سے سفارش کی کہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ماننے
والوں کے خلاف فوراً کارروائی ہونی چاہیئے۔

فساد فی الارض کے ضمن میں منافقوں کا بھی یہی حال ہے یہ لوگ بھی بڑی
بڑی سازشیں کرتے ہیں، لوگوں کو آپس میں لڑاتے ہیں۔ اسلام اور اہل اسلام
کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب ان سے کہا جاتا" کہ
لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ" اپنی کرتوتوں کے ذریعے زمین میں فساد برپا
نہ کرو، کفر، شرک، نفاق، اور شریعت کی مخالفت فساد فی الارض ہے
اس سے باز آجاؤ، قتل ناحق، بدعات، ظلم و زیادتی سب فساد فی الارض۔
ہے اس سے باز آجاؤ، قتل ناحق، بدعات، ظلم و زیادتی سب فساد ہے
اس سے رک جاؤ تو وہ کہتے ہیں اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ہم تو
اصلاح کرنے والے ہیں، ہم فسادی تو نہیں ہیں۔ فرعونیوں کی ذہنیت بھی
ایسی ہی تھی، انہوں نے خود ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا، فسق و فجور میں مبتلا تھے
کفر، شرک اور بدعات کے مرتکب تھے مگر اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے
اور اللہ کے برگزیدہ نبی پر مفسد کا الزام لگاتے تھے۔ بزرگان دین اس قسم
کی الٹی ذہنیت سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کی دعا کے الفاظ یہ ہیں اَللّٰھُمَّ
انقلنی من ذل المعصیۃ الی عزۃ الطاعۃ۔ اے اللہ! ہمیں معصیت
کی ذلت سے بچا کر اطاعت کی عزت میں لگا دے کیونکہ اطاعت میں
عزت ہے اور معصیت میں ذلت ہے۔ معاصی کے تمام کام فساد فی
الارض میں داخل ہیں۔ اور جو کام حکم الٰہی کے مطابق انجام دیا جائیگا وہ زمین میں
اصلاح کے مترادف ہوگا۔ اللہ کے نبی تو یہی تعلیم دیتے ہیں کہ شریعت
کے خلاف کوئی کام نہ کرو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے مگر فرعونی حضرت موسیٰ علیہ السلام
اور آپ کے ماننے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ زمین میں فساد کرتے ہیں

لہٰذا ان کا بندوبست ہونا چاہیئے ۔

معبودانِ فرعون

اس آیت کریمہ میں اٰلِھَتَکَ کا لفظ توجہ طلب ہے فرعون تو خود اپنے آپ کو معبود کہلاتا تھا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" مگر اس کے حواری کہتے ہیں کہ اے فرعون! یہ تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں گے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فرعون نے اپنے علاوہ کوئی دوسرے معبود بھی بنا رکھے تھے؟ اس ضمن میں مفسرین کی دو رائیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی طرح فرعون کے بھی معبود تھے جن کی وہ پرستش کرتا تھا۔ بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ فرعون اپنے آپ کو تو سب سے اعلیٰ معبود کہتا تھا بلکہ خود کو سورج دیوتا مشہور کر رکھا تھا اور اپنی ذاتی پوجا بھی کرواتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے مجسمے بنا کر لوگوں کو مہیا کر رکھے تھے کہ جہاں کہیں ہو ان کے ذریعے میری پوجا کر لیا کرو۔ ایسے ہی خود ساختہ معبودوں کے متعلق درباریوں نے کہا کہ اے فرعون! اگر ان لوگوں کا راستہ نہ روکا گیا تو یہ تجھے بھی چھوڑ دیں گے اور تیرے مقررہ معبودوں سے بھی کنارہ کش ہو جائیں گے۔

سزا کی تجویز

اپنے درباریوں کے دلائل سننے کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کے لیے یہ سزا تجویز کی۔ کہنے لگا قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَھُمْ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔ یہ سزا بنی اسرائیل اس سے پہلے بھی برداشت کر چکے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب فرعون کو کسی نے وہم میں مبتلا کر دیا کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو بڑا ہو کر تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا۔ چنانچہ فرعون نے حکم دے دیا کہ اسرائیلی عورتوں کے ہاں جو بھی بچہ پیدا ہو اسے ہلاک کر دیا جائے۔ اسی بات کے متعلق اگلی آیت میں آرہا ہے کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام

سے کہا کہ آپ کی آمد یعنی بعثت سے پہلے بھی ہم مصائب میں مبتلا تھے ہمارے لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور ہماری لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا۔ سورۃ بقرہ میں اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے "وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ" اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔ اب جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کے ساتھ مقابلہ کیا اور وہ مغلوب ہو کر ایمان لے آئے تو اپنے حواریوں کے کہنے پر فرعون نے بنی اسرائیل کے لیے پھر وہی سزا تجویز کی کہ ان کے بچوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی بچیوں کو زندہ چھوڑ دیا۔ بہر حال فرعون کے ان دو انتہائی فیصلوں کے درمیانی عرصہ میں اس سزا میں نرمی کر دی گئی تھی۔ اسی عرصہ میں موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے گھر میں پرورش پائی۔ جوان ہوئے تو قبطی کے قتل کا حادثہ پیش آ گیا۔ پھر آپ وہاں سے مدین چلے گئے۔ دس سال کا عرصہ وہاں گزارا، پھر واپسی پر راستے میں نبوت عطا ہوئی اور ساتھ حکم ہوا کہ اب واپس مصر جاؤ اور فرعون کو اپنے رب کا پیغام پہنچاؤ۔ پھر جب آپ نے فرعون کو حق کی دعوت دی، عصا اور ید بیضا کے معجزات پیش کیے، پھر جادوگروں سے مقابلہ ہوا اور وہ مغلوب ہوئے تو فرعون نے پھر بنی اسرائیل کے لیے یہی سزا تجویز کی۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ فرعون نے نوے ہزار سے زیادہ بچے ان کے والدین کی آنکھوں کے سامنے قتل کروائے۔ بہر حال فرعون نے کہا کہ ہم انہیں یہ سزا دیں گے وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ کیونکہ ہم ان پر غالب ہیں۔ ہماری حکومت ہے، ہم صاحب اقتدار ہیں۔ تمام وسائل ہمارے پاس ہیں لہٰذا ہم انہیں مجوزہ سزا ضرور دیں گے۔

استعانت بالله و صبر

بنی اسرائیل کو سخت پریشانی میں مبتلا دیکھ کر قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ اے

لوگو! اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرو۔ وہی مالک و خالق ہے۔
تمہاری مشکلات کو وہی حل کر سکتا ہے۔ ان ظالموں سے وہی نپٹ
سکتا ہے۔ یہ انسان کے بس کا روگ نہیں ہے لہذا اللہ ہی سے مدد
طلب کرو۔ آپ نے دوسری بات قوم سے یہ فرمائی وَاصْبِرُوْا
اور صبر کا دامن تھامے رکھو۔ ان کڑی آزمائشوں کو صبر کے ساتھ ہی عبور
کیا جا سکتا ہے۔ دونوں باتیں فرمائیں۔ "وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ" خدا کی ذات
سے مدد طلب کی جا سکتی ہے۔ خدا کے سوا مافوق الاسباب مدد کرنے والی
کوئی ذات نہیں ہے لہذا ہر وقت اپنا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ قائم
رکھنا چاہیئے۔ سورۃ مزمل میں ارشاد ہے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ
وَکِیْلًا" خدا کے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں، لہذا اسی کو کارساز
سمجھو۔ وہی بگڑی بنانے والا ہے نماز میں ہمیشہ یہی اقرار کرتے ہیں۔
"اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" اے مولا کریم! ہم صرف
تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ دینی،
دنیاوی، ظاہری اور باطنی تمام معاملات میں صرف اللہ ہی مددگار ہے۔
فرمایا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ بیشک زمین کا مالک تو اللہ ہے یہ ملک
نہ فرعون کا ہے اور نہ کسی اور ڈکٹیٹر کا۔ بادشاہی اللہ کی ہے یُوْرِثُھَا
مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وہ جسے چاہے اپنے بندوں میں
سے اس کا وارث بناتا ہے۔ اب اس ملک کے فرعونی وارث ہیں
مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں اس لیے انہیں وارث
بنایا گیا ہے، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے تحت ایسا ہے۔ وہ اقتدار دے
کر بھی آزماتا ہے مگر یاد رکھو! وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ انجام بخیر بہر حال
متقیوں یعنی ان لوگوں کا ہوگا جو کفر اور شرک سے بچ کر تقویٰ کی راہ اختیار
کریں گے۔ یہ نہ سمجھو کہ آج فرعونیوں کے پاس اقتدار ہے تو آخرت بھی

اسی کے حصے میں آئیگی کیونکہ آخرت کا وعدہ تو اللہ نے اپنے متقین کیلئے
کر رکھا ہے۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو تسلی دی۔ ایسی ہی تسلی کا تذکرہ
آگے سورۃ یونس میں بھی آرہا ہے۔ کہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے مدد
طلب کرو اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔

بنی اسرائیل کی بے بسی

بنی اسرائیل کے لوگوں نے اپنے مصائب کا ذکر کرتے ہوئے
موسیٰ علیہ السلام سے کہا قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا
ہمیں تکلیفیں دی گئی تھیں قبل اس کے کہ آپ ہمارے پاس آئے تھے
یعنی آپ کی نبوت سے پہلے بھی ہم مصائب کا شکار رہے۔ آپ
کی پیدائش کو روکنے کے لیے اس وقت بھی ہمارے بچوں کو قتل کیا گیا۔
وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا اور اس کے بعد بھی کہ آپ نبوت اور
معجزات لے کر آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ ذلت ناک سلوک ہو رہا ہے
ہماری مصیبتیں اب پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے
قوم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ
قریب ہے اور امید ہے کہ خدا تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا
وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ اور زمین پر تمہیں خلافت عطا کریگا
اگلی آیتوں میں آئیگا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے شام و فلسطین کی
خلافت کا وعدہ فرمایا۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو یقین دلایا کہ وہ
وقت قریب ہے جب فرعونی تباہ ہو جائیں گے اور زمین کی خلافت
اللہ تعالیٰ تمہارے سپرد کریگا۔

فرمایا فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ پھر اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ
خلافت ملنے کے بعد تم کس قسم کے کام انجام دیتے ہو۔ یعنی جس
طرح آج فرعون کی آزمائش ہو رہی ہے کل کو تمہاری آزمائش بھی ہو گی۔ پھر
پتہ چلے گا کہ تم بھی فرعونوں کے نقش قدم پر چلتے ہو، یا اللہ کے بندوں

کے طریقے پر ملک میں عدل و انصاف قائم کرتے ہو خدا تعالیٰ کے علم میں تو سب کچھ ہے کہ تم اس ذمہ داری کو کس طرح نبھاؤ گے مگر وہ اقتدار کی ذمہ داری تمہیں سونپ کر تمہاری بھی آزمائش کرے گا اللہ کی آزمائش ہر دور میں آتی رہی ہے۔ آج بھی جو لوگ صاحب اقتدار ہیں ان میں اکثر و بیشتر فرعون کے نقش قدم پر ہی چل رہے ہیں جو کہ بالآخر ناکام ہوں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو تعلق باللہ قائم کرنے کی تلقین کی۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے، آپ نے صبر کی تاکید کی اور دشمن پر فتح کی خوشخبری بھی سنائی۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ (۱۳۰) فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۱۳۱) وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ (۱۳۲) فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ (۱۳۳)

ترجمہ :- اور البتہ تحقیق ہم نے پکڑا آلِ فرعون کو قحطوں کے ساتھ اور پھلوں کی کمی کے ساتھ تاکہ وہ نصیحت پکڑیں (۱۳۰) پس جب آتی تھی اُن کے پاس بھلائی تو کہتے تھے یہ ہمارے لائق ہے اور اگر پہنچتی تھی اُن کو بُرائی تو شگون لیتے تھے موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ۔ سُن لو ! بیشک اِن کا شگون اللہ کے پاس ہے، لیکن اکثر اِن میں سے ایسے ہیں جو نہیں جانتے (۱۳۱) اور کہتے تھے جب بھی تم لاؤ گے ہمارے پاس کوئی نشانی تاکہ تم سحر کرو

ہم پر اس کے ساتھ۔ پس نہیں ہم تجھ پر ایمان لانے والے (۱۳۲)
پھر ہم نے بھیجا اُن پہ طوفان اور ٹڈی دل اور گھن اور مینڈک
اور خون جُدا جُدا نشانیاں۔ پس تکبر کیا اِن لوگوں نے اور
تھے وہ مجرم (۱۳۳)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کے لیے جادوگروں کو اکٹھا کیا تو وہ حاضر آ گئے اور موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد فرعون کے مصاحبوں نے ابھارا کہ اگر موسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کے پیروکاروں کو یونہی چھوڑ دیا گیا اور اُن پر پابندیاں عاید نہ کیں تو یہ زمین میں فساد پھیلائیں گے اور تجھے اور تیرے معبودوں کو موقوف کر دیں گے۔ فرعون نے کہا کہ ہم انہیں وہی سزا دیں گے جو پہلے دیا کرتے تھے یعنی ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے انہیں لونڈیاں بنائیں گے اور اُن سے خدمت لیں گے۔ چنانچہ جب بنی اسرائیل پر مصائب کا دور شروع ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی مظلوم قوم کو نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور تکالیف پر صبر کرو۔ یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اس نے اِس دور میں آزمائش کے طور پر فرعون کو زمین کا وارث بنا رکھا ہے مگر نیک انجام بالآخر متقیوں کا ہوگا۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے شکوہ کیا کہ آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم مصائب کا شکار رہے اور آپ کے آنے کے بعد بھی ہمارے آلام میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوا ہے اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو تسلی دی کہ اُمید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو عنقریب ہلاک کر دیگا اور زمین کی نیابت تمہیں بخش دے گا اس کے بعد تمہارے اعمال بھی خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ہوں گے اور تمہاری بھی آزمائش ہوگی۔

آزمائش کا اصول

گذشتہ دروس میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بیان ہو چکا ہے کہ آزمائش کے لیے ہم کسی قوم پر پہلے سختی ڈالتے ہیں اور پھر آسودگی یہاں تک کہ جب وہ بالکل غافل ہو جاتے

ہیں تو ہماری گرفت آجاتی ہے۔ آلِ فرعون کو بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف
طریقوں سے آزمایا جب انہیں اقتدار دیا تو ان کا ظلم و ستم انتہا کو پہنچ
گیا۔ اب ان کے مصائب کے دور کی ابتداء ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں
طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا کیا جس سے مقصود یہ تھا کہ کسی طرح یہ لوگ سمجھ
جائیں اور بنی اسرائیل پر زیادتی کرنا چھوڑ دیں۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر چند نشانیاں بھی ظاہر کیں شاید کہ ان نشانیوں
کو دیکھ کر ہی سمجھ جائیں مگر ان کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی نشانی دیکھتے تو
قدرے نرمی اختیار کر لیتے مگر جب پھر ذرا آسانی آئی تو انکار کر دیتے بلکہ
پہلے سے زیادہ متکبر ہو جاتے آخر کار وہ وقت بھی آیا جب اللہ تعالیٰ
نے انہیں ہلاک ہی کر دیا۔

قحط سالی

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ
البتہ تحقیق ہم نے پکڑا آلِ فرعون کو قحطوں کے ساتھ۔ آلِ فرعون سے
مراد خود فرعون اور اس کے حواری ہیں اور سنین جمع ہے سن کی جس کے معنی
سال ہوتا ہے۔ قحط اس دور یا اس زمانہ کو کہتے ہیں جب بارش بالکل نہیں ہوتی یا ہوئی
تو لوگ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے اور پھر اس کے نتیجے میں فصل اور پھل
وغیرہ پیدا نہیں ہوتے اور اشیائے خوراک کی قلت واقع ہو جاتی ہے۔
چونکہ ایسے سالوں کو تاریخ میں خصوصاً یاد رکھا جاتا ہے، اس لیے یہاں
سنین سے عام سال نہیں بلکہ قحط کے سال مراد لیے گئے ہیں۔ تو فرمایا
ہم نے فرعونیوں کو قحط میں مبتلا کیا وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ اور
پھلوں کی قلت میں مبتلا کیا۔ خشک سالی اور قلت اثمار در اصل ایک
ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ جب خشک سالی کا زمانہ آتا ہے تو ظاہر ہے
پھل بھی پیدا نہیں ہوتے۔ اور اگر ان دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ شمار کیا جائے
تو خشک سالی یا قحط زیادہ تکلیف دہ چیز ہے جس سے انسان اور جانور سب

متاثر ہوتے ہیں اور پھلوں کی قلت اس سے کم درجہ کی تکلیف ہے بعض دفعہ خشک سالی تو نہیں ہوتی مگر درختوں پر پھل ہی نہیں آتا۔ تیز ہواؤں کی وجہ سے بُور ضائع ہو جاتا ہے یا پھلوں کو ایسی بیماری لگ جاتی ہے کہ وہ استعمال کے قابل نہیں رہتے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نشانی کے طور پر آلِ فرعون کو قحط سالی اور قلتِ اثمار میں مبتلا کیا لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو کل نو نشانیاں عطا کیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ (بنی اسرائیل) ان میں سے ایک نشانی یہ ہے۔ دو پہلے بیان ہو چکی ہیں عصا اور ید بیضا پانچ اسی درس میں آ گئے آ رہی ہیں اور ایک نشانی طمس اموال سورۃ یونس میں مذکور ہے

خوشحالی
پر غرور

اللہ نے فرمایا کہ ہماری اس نشانی سے فرعونیوں نے کوئی نصیحت نہ پکڑی بلکہ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ جب ان کے پاس بھلائی آسودگی یا خوشحالی آتی تھی۔ انہیں صحت و تندرستی حاصل ہوتی، اناج اور پھلوں کی فراوانی ہوتی تو کہتے قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ یہ ہمارے لائق ہے، ہمارا حق ہے، ہمیں یہ خوشحالی ہونی چاہیئے۔ عام طور پر ان کی فطرت ایسی ہی ہے اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کا یہی حال بیان کیا ہے۔ جب ان کے اسباب معیشت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رزق کی فراوانی ہوتی ہے تو وہ خدا کو بھول جاتے ہیں اور اپنے علم و ہنر پر اترانے لگتے ہیں خوشحالی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کی بجائے وہ اسے اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی اور اپنی منصوبہ بندی کا مرہونِ منت تصور کرتے ہیں اور جب خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی آفت آتی ہے تو پھر اپنی کوتاہیوں پر نگاہ کرنے کی بجائے خدا کا شکوہ کرنے لگتے ہیں، گویا اللہ نے انہیں ان کی محنت اور علم و ہنر کا بدلہ نہیں دیا۔ اللہ نے فرمایا کہ فرعون اور اس کی قوم کا بھی یہی حال تھا کہ جب آسودگی آتی تو کہتے

یہ ہماری محنت کا پھل ہے اور ہمیں ملنا چاہیئے تھا۔

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچتی تنگدستی میں مبتلا ہو جاتے يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ تو موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ شگون بد لیتے کہ ان کی وجہ سے ہم پر نحوست نازل ہو رہی ہے حالانکہ یہ بالکل بیہودہ بات تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی تو صاحب ایمان تھے ان کی وجہ سے نحوست کیوں پڑتی نحوست تو کفر، شرک اور بغاوت کی وجہ سے پڑتی ہے اور یہ چیزیں فرعونیوں میں پائی جاتی تھیں۔ مگر وہ اپنی اصلاح کرنے کی بجائے اللہ کے نیک بندوں کو مطعون کرتے کہ جب سے انہوں نے وعظ و نصیحت شروع کی ہے اس وقت سے ہم پر نحوست چھا گئی ہے۔ قریش مکہ اور مشرکین عرب بھی حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرامؓ کے متعلق اسی قسم کا شگون بد لیتے تھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے الطِّيَرَةُ شِرْكٌ یعنی شگون بد لینا شرک کی قسموں میں سے ایک قسم کا شرک ہے عرب لوگ پرندوں کو اڑا کر ان سے نیک یا بد شگون لیتے تھے یا اگر سامنے سے کوئی خلاف طبع جانور آجاتا تو اُسے بھی شگون بد پر محمول کرتے۔ البتہ نیک فال لینے کو حضور علیہ السلام نے پسند کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اچھا لفظ یا اچھا نام سن کر انسان کی طبیعت خوش ہو جائے تو اُسے وہ نیک فال سمجھے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن پاک سے یا دیوان حافظ سے یا اسیر وغیرہ سے فال نکالے یہ ناجائز اور بدعت ہے اہل ایمان کو اس سے بچنا چاہیئے۔ اسی طرح نجوم، کہانت، دست شناسی رمل وغیرہ سب ناجائز ہیں اور ان کی کمائی بھی حرام ہے۔

فرمایا وہ لوگ اپنی بدبختی اور تنگدستی کو موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کی نحوست خیال کرتے تھے مگر اللہ نے فرمایا اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ

عِنْدَ اللّٰہِ سنو ! اُن کا شگون تو اللہ کے پاس ہے۔ دراصل یہ شگون وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ تمام کام اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اُس کی قدرت تامہ کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ کسی کی خوشحالی یا تنگدستی میں موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کا کیا تعلق ہے ؟ وہ تو اللہ کے نیک بندے ہیں، نیکی کا راستہ بتاتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں۔ وہ ناصح اور امین ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی کا سلوک کرتے ہیں۔ اِن کی وجہ سے تو اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے اُس کی برکات کا نزول ہوتا ہے، نہ کہ نحوست پیدا ہوتی ہے۔ فرمایا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ مگر ان میں سے اکثر لوگ بے سمجھ ہیں یہ اپنی غلط ذہنیت کی وجہ سے نحوست اور بدشگونی کو نیک لوگوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ایمان لانے سے انکار

ایک تو فرعونی موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا شگون لیتے تھے اور دوسرا یہ بھی کہتے تھے وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا کہ جب تو ہمارے پاس کوئی نشانی لائے گا۔ جس کے ذریعے ہم پر جادو کرے فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ تو ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے اُن کی بدبختی کی انتہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے معجزے کو جادو سے تعبیر کرتے اور کہتے کہ ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ مشرکین مکہ بھی معجزات دیکھ کر اسے جادو کا نام دیتے تھے معجزے کے اثر کا تو انکار نہیں کر سکتے تھے مگر تاویل یہ کرتے تھے کہ جادو کے تحت ایسا ہوا ہے۔ لہٰذا وہ بھی اسی وجہ سے ایمان لانے سے انکار کرتے تھے۔

آزمائش در آزمائش

فرمایا جب فرعون اور اس کے حواری سرکشی میں حد سے بڑھ گئے۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ تو ہم نے اُن پر طوفان بھیج دیا طوفان کا لفظ عام طور پر پانی کی بہتات پر بولا جاتا ہے۔ جب بارش کی کثرت ہو

یا دریا اور ندی نالے کناروں سے بہ نکلیں جس کی وجہ سے لوگ گھروں میں محصور ہو جائیں یا پناہ لینے کے لیے محفوظ جگہوں پہ جانا پڑے۔ تو یہ طوفان کہلاتا ہے۔ تاہم مجاہد کی روایت کے مطابق اموات کی کثرت کو بھی طوفان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ طاعون یا ہیضہ وغیرہ کی وبا پھیل جائے جس سے کثیر تعداد میں اموات واقع ہوں تو ایسے حادثہ کو بھی طوفان سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم عام طور پہ پانی کی کثرت کو طوفان کہا جاتا ہے جیسا کہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں آیا تھا۔

فرمایا ایک تو ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور دوسرا وَالْجَرَادَ ٹڈی دل کی آفت بھی مسلط کر دی۔ جب کسی علاقے میں ٹڈی دل کا حملہ ہوتا ہے تو تمام فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ٹڈی دل سارا سبزہ چٹ کر جاتا ہے۔ اس کے حملے سے بچاؤ کے لیے حکومتی سطح پہ تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں پھر جس طرف ٹڈی دل کا رخ ہو اس طرف کی حکومت کو قبل از وقت مطلع کیا جاتا ہے تاکہ وہ بھی حفاظتی تدابیر اختیار کر لیں۔ تو جہاں ٹڈی دل نازل ہوتا ہے، وہاں بھی قحط واقع ہو جاتا ہے کیونکہ یہ چھوٹے چھوٹے پرندے تمام فصلوں اور پھلوں کو کھا جاتے ہیں۔ ہماری امت کے لیے ٹڈی بغیر ذبح کیے مردہ بھی حلال ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ہمارے لیے دو مردار حلال ہیں اَلسَّمَکُ وَالْجَرَادُ یعنی مچھلی اور ٹڈی اور دو خون حلال ہیں اَلْکَبِدُ وَالطِّحَالُ یعنی جگر اور تلی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام کے ہمراہ ہم نے چھ یا سات غزوات میں ٹڈی دل کھایا۔ اللہ نے فرمایا کہ اس کے علاوہ ہم نے ان پہ وَالْقُمَّلَ بھی ارسال کیا۔ قمل کے مختلف معانی بیان ہوتے ہیں۔ بعض نے اس سے جوئیں مراد لی ہیں جو انسانوں کے جسم میں پیدا ہو جاتی ہیں بعض نے چیچڑیاں کہا ہے جو جانوروں کو چمٹ جاتی ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ اس سے سُسری یا گھن مراد ہے

جو اناج کو کھا جاتا ہے۔ پھر فرمایا وَالضَّفَادِعَ اور ہم نے مینڈک بھیجے وَالدَّمَ اور خون کی مصیبت میں گرفتار کیا۔ فرمایا اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ یہ سب علیحدہ علیحدہ نشانیاں ہیں جو ہم نے فرعون اور اسکی قوم پر بھیجیں تاکہ وہ نصیحت پکڑیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

پے در پے مصائب

حضرت مولانا شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں کہ یہ تمام نشانیاں اللہ تعالےٰ نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے نازل کیں مگر وہ ایسے جرائم پیشہ اور متکبر لوگ تھے کہ کسی نے تسلیم نہ کیا۔ حضرت سعید بن جبیرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا کہ انہیں چھوڑ دو، میں ان کو لے کر مصر سے چلا جاتا ہوں جب فرعون نے یہ مطالبہ نہ مانا تو اللہ تعالیٰ نے بارش کا طوفان بھیج دیا۔ جب مسلسل بارش کی وجہ سے فصلیں اور پھل تباہ ہونے لگے، انسانی اور حیوانی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمیں اس طوفان سے نجات دے اور ساتھ وعدہ بھی کیا کہ اگر طوفان ہٹ جائیگا تو میں بنی اسرائیل کو آزاد کر دونگا موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور بارش ختم ہو گئی اور اللہ نے بارش کی زحمت کو رحمت میں بدل دیا اور خوب غلہ پیدا ہوا مگر فرعون اپنے وعدے پہ قائم نہ رہا۔ اس پہ اللہ نے دوسرا وبال بھیجا۔ جب فصل پک گئی تو اللہ نے ٹڈی دل بھیج دیا جس سے فصلوں اور پھلوں کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ فرعونی اس آفت سے گھبرا کر پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور دعا کی درخواست کی کہ یہ مصیبت بھی ٹل جائے اور وعدہ کیا کہ اب کہ بنی اسرائیل کو ضرور آزاد کر دونگا موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی تو یہ عذاب بھی ٹل گیا مگر فرعون اپنے وعدے کو پھر فراموش کر گیا۔ پھر جب لوگ غلہ اپنے گھروں میں لے آئے تو اسے گھن لگ گیا اور سارا غلہ ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ وہ لوگ پھر موسیٰ علیہ السلام

کے پاس آئے۔ آپ نے دُعا کی اور تکلیف بھی رفع ہوگئی مگر فرعونی اپنے وعدہ کو وفا نہ کرپائے۔ پھر اللہ نے اس کثرت سے مینڈک بھیجے کہ اُن کا کھانا پینا محال ہوگیا۔ ہر برتن میں مینڈک نظر آتے تھے۔ جب کھانا کھانے کے لیے منہ کھولتے تو مینڈک اچھل کر منہ کے اندر چلے جاتے۔ اُن کا کھانا پینا بدمزا ہوجاتا۔ فرعونی پھر پریشان ہوگئے اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلوادیں، ہم ضرور وعدہ پورا کریں گے مگر ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی فرعونی مُکر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک اور عذاب بھیجا۔ جس برتن میں پانی ڈالتے وہ خون بن جاتا۔ برتن میں پڑا ہوا پانی نظر آتا مگر جب اُسے استعمال کرنے لگتے یا پینے کے لیے منہ کی طرف بڑھاتے تو خون بن جاتا۔ اب پیاس کی وجہ سے مرنے لگے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان پر پے در پے عذاب نازل کیے مگر فَاسْتَكْبَرُوا وہ ہمیشہ تکبر ہی کرتے رہے انہوں نے کسی نشانی سے عبرت حاصل نہ کی وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ وہ بڑے گنہگار اور پاپی لوگ تھے۔ اللہ نے ان کا یہ حال بیان کیا، آگے مزید تفصیلات آرہی ہیں۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ (١٣٤) فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (١٣٥) فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ (١٣٦) وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (١٣٧)

ترجمہ:- اور جب واقع ہوا اُن پر عذاب تو وہ کہتے اے موسیٰ (علیہ السلام)! دعا کر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے جو کچھ اُس نے تمہارے ساتھ عہد کر رکھا ہے۔ اگر تو کھول دے گا (دور کردیگا) ہم سے عذاب (تو ہم ضرور ایمان لائیں گے تجھ پر اور ضرور بھیج دیں گے تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو (١٣٤) پھر جب ہم نے اٹھا دیا اُن سے عذاب

کہ ایک مدت تک جس تک وہ پہنچنے والے تھے، تو اچانک
وہ عہد کو توڑتے تھے (۱۳۵) پھر ہم نے انتقام لیا اُن سے
پس ہم نے ان کو غرق کر دیا دریا میں اس وجہ سے
کہ وہ جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو اور تھے وہ اِن آیتوں
سے غفلت برتنے والے (۱۳۶) اور ہم نے وارث کیا ان
لوگوں کو جو کمزور خیال کیے جاتے تھے اُس سرزمین کے
مشرق اور مغرب کے اطراف کا جس زمین میں ہم نے برکتیں
رکھی ہیں، اور پوری ہو گئی بات تیرے رب کی بھلی
بنی اسرائیل پر، اس وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا اور ملیامیٹ
کر دیا ہم نے اُس چیز کو جو فرعون اور اُس کی قوم بناتی تھی
اور جس کو وہ اوپر چڑھاتے تھے (۱۳۷)

ربط آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں گذشتہ دروس میں بیان ہو
چکا ہے کہ آپ نے فرعون اور اس کی قوم کے پاس پہنچ کر اللہ کا پیغام پہنچایا
مگر انہوں نے آپ کی دعوت کا انکار کر دیا۔ پھر جب آپ نے عصا اور ید بیضا
والے معجزات کا اظہار فرمایا تو فرعون نے مقابلے کے لیے ملک بھر کے جادوگر
اکٹھے کیے۔ جادوگروں نے مجمع عام میں اپنا اپنا فن پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کے
حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو جادوگر ناکام ہو گئے اور انہوں نے ایمان
قبول کر لیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا دستور بیان کیا کہ پہلے وہ لوگوں کو تنگی ڈال
کر آزماتا ہے، پھر جب وہ خبردار نہیں ہوتے، بدیوں سے باز نہیں آتے تو اللہ تعالیٰ
انہیں آسودہ حال کر دیتا ہے۔ پھر جب وہ خوشحالی میں بڑھ جاتے ہیں تو اُن پر اچانک
گرفت آجاتی ہے۔ عام طور پر دنیا میں یہی سنت اللہ جاری ہے۔ فرعونیوں کے
ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے دو معجزات پیش کیے تو انہوں نے انکار

کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن پہ عذاب کی صورت میں پے درپے نشانیاں بھیجیں۔ پہلے قحط اور قلتِ ثمرات میں مبتلا کیا، پھر طوفان، ٹڈی دل، جُوئیں مینڈک اور خون کی صورت میں عذاب نازل کیا۔ سورۃ یونس میں طمس اموال یعنی مالوں کے ضیاع کا ذکر بھی آتا ہے۔ مگر اُن لوگوں نے ہمیشہ تکبر کیا اور سخت قسم کے مجرم پاپی اور گنہگار ٹھہرے۔

آلِ فرعون پہ عذاب

یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے آلِ فرعون کے متعلق بتایا ہے کہ جب اُن پہ کوئی اُفتاد آتی بھی تو وہ کیا کرتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ جب اُن پہ کوئی عذاب آتا تھا کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے تھے تو پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس دُعا کے لیے جاتے تھے قرآن پاک میں لفظ رجز کئی ایک معانی میں استعمال ہوا ہے جیسے عذاب تکلیف، اُفتاد، بیماری وغیرہ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طاعون کو بھی رجز فرمایا ہے۔ طاعون کی وبا پہلی قوموں میں پھیلی اور یہ بنی اسرائیل پہ بھی نازل ہوئی۔ ہر وبائی بیماری طاعون، ہیضہ، چیچک وغیرہ پہ رجز کا لفظ بولا جاتا ہے ایسی وبا جس سے غیر معمولی طور پہ اموات کی کثرت ہو جائے اور لوگوں پہ دہشت طاری ہو جائے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک سے لے کر ایک سو تیس سال تک پانچ دفعہ طاعون کی بیماری پھیلنے کا ذکر ملتا ہے۔ عراق میں ایک دفعہ اس شدت کا طاعون پھیلا کہ ایک ایک محلے سے ہر روز ایک ایک ہزار میت اٹھتی تھی۔ تین دن تک یہی کیفیت رہی اور لوگ خوفزدہ ہو کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے کہتے ہیں کہ طاعون ایسی بیماری ہے جو بعض اوقات جھاڑو پھیر دیتی ہے محلوں کے محلے اور بستیوں کی بستیاں صاف کر کے رکھ دیتی ہے۔ رجز گندگی کو بھی کہتے ہیں تاہم یہاں پہ اس سے مراد عذاب ہے جو کسی بھی شکل میں ہو۔ بہرحال فرمایا کہ فرعونیوں پہ جب بھی عذاب آتا یا کسی

دعا کی درخواست

مصیبت میں گرفتار ہوتے تو گھبرا کر موسیٰ علیہ السلام کی طرف دوڑتے۔
قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ کہتے اے موسیٰ (علیہ السلام)
ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ جو اس
نے آپ کے ساتھ عہد کر رکھا ہے۔ آلِ فرعون جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام
اللہ کے نبی ہیں۔ اللہ نے آپ کو معجزات عطا کیے ہیں آپ مقرب الٰہی
ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کی دعا ضرور قبول کریگا۔ چنانچہ تکلیف
میں دعا کے لیے آپ ہی کی طرف رجوع کیا۔ یہاں عہد سے مطلب
یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انعام آپ کو عطا کر رکھا ہے یا دعا کا جو
طریقہ آپ کو سکھلایا اس کے مطابق دعا کریں تاکہ اسے شرف قبولیت
حاصل ہو۔ اور ساتھ یہ بھی وعدہ کیا لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ اگر آپ
ہم سے یہ عذاب دور کر دیں گے لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ تو ہم آپ پر ضرور
ایمان لے آئیں گے۔ یہاں پہ لام تاکیدی اور مستقبل کا ہے اور ساتھ نون
بھی تاکیدی ہے تو معنی یہ بنتا ہے کہ ضرور بہ ضرور ایمان لے آئیں گے
اور ہم آپ کا دیرینہ مطالبہ بھی مان لیں گے وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ
بَنِي إِسْرَائِيلَ اور ہم ضرور بھیج دیں گے آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو
اب یقین دلاتے ہیں کہ اے موسیٰ اللہ سے دعا کر کے ہماری مشکل کو رفع
کرا دیں ہم آپ کے دونوں مطالبات تسلیم کر لیں گے۔ بنی اسرائیل کی آزادی
کا مطالبہ موسیٰ علیہ السلام بار بار کر چکے تھے۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ آپ نے
کہا تھا کہ میں اپنے رب کی طرف سے واضح نشانیاں لے کر آیا ہوں پس
بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ بھیج دیں اس وقت تو فرعون نے
آپ کی بات نہ مانی مگر اب قوم مصیبت میں گرفتار ہوئی تو یہ مطالبہ بھی مان لیا

عہد شکنی

فرعونیوں کی یقین دہانی پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو
اللہ نے ان کی مصیبت کو دور کر دیا۔ تو ارشاد ہوتا ہے فَلَمَّا كَشَفْنَا

عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓی اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ پھر جب ہم نے اٹھا دیا عذاب کو ایک مدت تک جس تک وہ پہنچنے والے تھے اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ اچانک وہ عہد کو توڑنے والے تھے۔ جب تکلیف آتی تو ایمان لانے کا وعدہ بھی کرتے اور بنی اسرائیل کو آزادی کی خوشخبری بھی سناتے مگر جب وہ مصیبت ٹل جاتی تو پھر اُس وعدے کو توڑ دیتے یعنی نہ تو ایمان لاتے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو آزاد کرتے قریش مکہ کے ساتھ بھی ایک موقع پر ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا۔ علاقے میں قحط پیدا ہو گیا۔ انسان اور جانور بھوک اور پیاس سے مرنے لگے تو مکہ والوں نے ابو سفیانؓ کو مدینے بھیجا تاکہ حضور علیہ السلام سے دعا کروائے کہ اللہ تعالےٰ اس قحط کو دُور کر دے۔ انہوں نے بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ قحط دور ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے مگر قحط دور ہونے کے بعد اپنے عہد سے مکر گئے فرعون اور اس کی قوم کے متعلق بھی اللہ نے فرمایا کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تھی تو موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ تسلیم کرنے کا عہد کر لیتے مگر جب تکلیف دُور ہو جاتی تو مُکر جاتے۔

آلِ فرعون سے انتقام

آلِ فرعون کی بار بار عہد شکنی پر اللہ نے فرمایا فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ پھر ہم نے اُن سے انتقام لیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ "یعنی وہ غالب بھی ہے اور انتقام لینے والا بھی۔ مگر اس کا انتقام لینا انسانوں کے انتقام کی طرح نہیں ہوتا جو دوسرے کو ایذاء پہنچا کر اپنے دل کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک خاندان نے دوسرے خاندان کا کوئی آدمی قتل کر دیا تو جب تک یہ بھی قتل نہ کریں اُن کا جذبہ انتقام ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ مگر خدا تعالیٰ بے نیاز اور غنی ہے۔ اُس کو کسی کے برائی کرنے سے نہ تو دکھ ہوتا ہے اور نہ کسی کی اطاعت کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ ہاں جب کوئی انسان خدا تعالیٰ کی قانون شکنی کرتا ہے۔ تو پھر اس کے

نتیجے میں طبعی طور پر اس کو سزا ملتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ملکیت اور بہیمیت دونوں چیزیں رکھی ہیں جن کی آپس میں کشمکش جاری رہتی ہے اور اسی وجہ سے انسان کو مکلف یعنی قانون کا پابند بنایا گیا ہے انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ میں ملکیت کو بہیمیت پر غالب کرے۔ اگر انسان اس میں ناکام ہو جاتا ہے اور بہیمیت غالب آجاتی ہے تو آدمی ناکام ہو جائے گا۔ دنیا میں ہر انسان پر ایک مادی خول چڑھا ہوا ہے۔ جب یہ خول اتر جائیگا تو اصلیت فوراً سامنے آجائے گی۔ جب پتہ چلے گا کہ ملکیت کے تقاضے پورے نہیں ہوئے تو انسان سزا کا حقدار ٹھہرے گا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب انسان ملکیت کی بجائے بہیمیت کی آبیاری کرتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ سزا کی صورت میں نکلتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بخار میں مبتلا ہو، اس کے جسم کے اندر تیز حرارت ہو اور باہر ماحول میں بھی شدید گرمی ہو تو دونوں حرارتیں مل کر تکلیف میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی بہیمیت کا مادہ موجود ہے پھر جب وہ خود بھی ایسے ہی کام انجام دیتا ہے تو اندر اور باہر کی بہیمیت مل کر اس شخص کی بہیمیت میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں اور پھر وہ شخص اللہ تعالیٰ کی سزا یا انتقام کا نشانہ بنتا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی ملکیت کا تقاضا ہے کہ وہ نیکی، طہارت، عدالت اور سماحت وغیرہ کے کام انجام دے تاکہ اس کا اچھا نتیجہ برآمد ہو۔ انسانی فطرت چاہتی ہے کہ وہ نجاست، ظلم اور برائیوں سے اجتناب کرے۔ انسان میں یہ چیز فطرتاً داخل ہے کہ وہ ایسے کام نہ کرے مگر جب وہ باز نہیں آتا تو پھر اللہ تعالیٰ اس پر اسی چیز کو ڈال دیتا ہے یہی اس کا انتقام ہے جو سزا پر منتج ہوتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اے بنی آدم! انما ھی اعمالکم احصیھا

لے حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۹۔ (فیاض)

علیکم یہ تمہارے کارنامے ہیں جنہیں میں نے شمار کر رکھا ہے۔ اگر
ان کا نتیجہ اچھا نکلے تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اور اگر بُرا نتیجہ سامنے آئے
فلا یلومن الا نفسہ تو اسے تم نے خود ہی اکٹھا کر رکھا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے تو انہیں جمع نہیں کیا۔ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے

دریا میں غرقابی

فرمایا پھر ہم نے اُن سے انتقام لیا فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ
پس ڈبو دیا انہیں دریا میں۔ یم دریا کو کہتے ہیں، تاہم فرعون اور اس
کے لشکری دریائے نیل میں نہیں بلکہ بحیرہ قلزم میں غرق ہوئے تھے۔ بارہ
راستے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ وہ بحیرہ قلزم میں ہی بنے تھے۔ حضرت
موسیٰ علیہ السلام چھ لاکھ ستر ہزار افراد کو لے کر مصر سے نکلے تھے۔ اُن کے
بارہ قبائل تھے اللہ نے پانی میں بارہ راستے بنا دیئے، ہر قبیلہ اپنی اپنی سڑک
پر چلا۔ بالقضاء اللہ نے پانی کو اس طرح روک دیا جیسے برف جم گئی ہو یا پہاڑ
کھڑے کر دیئے گئے ہوں تفسیری روایات کے مطابق بارہ لاکھ فرعونیوں
نے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ بحیرہ قلزم پر پہنچے تو بنی اسرائیل کو پانی میں
بنے ہوئے راستوں پر چلتے دیکھا، انہوں نے بھی انہی راستوں پر سفر شروع
کر دیا۔ پھر کیا ہوا؟ جب سب لوگ بحیرہ قلزم میں داخل ہو گئے —
"فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ" (طٰهٰ) پھر دریا نے اُن
کو ڈھانپ لیا۔ نہ پوچھو پھر اُن کا کیا حشر ہوا۔ بنی اسرائیل تو دریا کو عبور کر گئے
مگر تمام مجرم اُن کی نگاہوں کے سامنے غرق کر دیئے گئے۔

فرمایا ہم نے انہیں اس لیے غرق کر دیا بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے۔ انہوں نے معجزات کا انکار
کیا، توحید، ایمان اور احکام الٰہی کی پرواز کی اور من مرضی کرتے رہے۔
آیات الٰہی کو تسلیم کرنے کی بجائے وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ وہ ان
سے غفلت برتنے والے تھے گزشتہ درس میں گزر چکا ہے وَكَانُوْا

قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ" وہ مجرم لوگ تھے۔ مقصد یہ کہ جو بھی مجرم ہوگا۔ آیاتِ الٰہی کا انکار کرے گا اور ان سے غفلت برتے گا۔ وہ اسی طرح سزا کا مستحق ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کو جلدی سزا مل جاتی ہے اور کسی کو دیر سے بعض اوقات زندگی میں بھی تھوڑی بہت سزا مل جاتی ہے۔ مگر آخرت کی سزا تو لازمی ہے، اس سے مفر نہیں ہوگا۔

خلافتِ ارضی کی تبدیلی

فرمایا جس حکومت اور اقتدار پر فرعونی غرور کرتے تھے وہ ان کے کچھ کام نہ آئی وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ اور ہم نے وارث بنا دیا ان لوگوں کو جو کمزور خیال کیے جاتے تھے مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا زمین کے مشرق و مغرب کا الَّتِيْ۔ وہ سرزمین بٰرَكْنَا فِيْهَا جس میں ہم نے برکات رکھی تھیں۔ اس سے شام اور فلسطین کی مبارک سرزمین مراد ہے بعض مفسرین اس میں مصر کو بھی داخل کرتے ہیں۔ بہرحال یہ خلافتِ ارضی بنی اسرائیل کو فوراً نہیں مل گئی تھی۔ ان میں بھی بہت سی کمزوریاں تھیں اور اقتدار کی منتقلی سے پہلے ان میں صلاحیت کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ فرعون کی غرقابی کے بعد پون صدی تک بنی اسرائیل نے خانہ بدوشی کی زندگی گزاری۔ اس کے بعد اللہ نے ان میں مطلوبہ صلاحیت پیدا کی تو پھر انہیں شام و فلسطین کا وارث بنایا اور پھر ایک دور ایسا بھی آیا جب مصر کی خلافت بھی انہی کے حصے میں آئی۔ سورۃ قصص میں بھی اسی طرح کا مضمون بیان ہوا ہے کہ ہم نے چاہا کہ جو لوگ زمین میں کمزور خیال کیے جاتے ہیں ان پر احسان کریں ان کو پیشوا اور زمین کا وارث بنا دیں۔ ان کو زمین میں ٹھکانا مہیا کریں" وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ" ہم فرعون، اس کے وزیر ہامان اور ان کے لشکروں کو دکھا دیں کمزوروں کی طرف سے وہ بات جس سے وہ ڈرتے تھے۔ آلِ فرعون ڈرا کرتے تھے کہ کبھی یہ کمزور سے لوگ ہم پر غالب

بابرکت سرزمین

نہ آیا تھا، ہم نے وہی بات زن کو کر کے دکھا دی۔ فرعون اور اس کے
حواریوں کی سلطنت چھین گئی، لوگ ہلاک ہو گئے اور پوری کی پوری فوج غرق ہو گئی
فرمایا جن کو کمزور خیال کیا جاتا تھا۔ ہم نے انہیں مشرق و مغرب یعنی شام
و فلسطین کا مالک بنا دیا۔ اور یہ وہ سرزمین ہے۔ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا جس
میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ اس سرزمین کو اللہ نے ظاہری اور باطنی تمام
خوبیوں سے مالا مال کیا ہے۔ ظاہری برکت تو یہ ہے کہ یہ علاقہ سرسبز و شاداب
زرخیز اور خوش منظر ہے۔ اس میں نہریں اور چشمے ہیں اور پانی کی فراوانی ہے
جس کی وجہ سے یہ سرزمین خوب آباد اور پر رونق ہے۔ اور اس کی باطنی یا
روحانی برکت یہ ہے کہ یہ سرزمین اللہ کے بیشمار انبیاء کا مدفن ہے۔ اللہ کے
نبیوں نے اس سرزمین کے لیے برکت کی دعا بھی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جہاں
نبی کا وجود ہوگا وہ جگہ مہبط رحمت الٰہی ہوگی وہاں خدا تعالیٰ کی رحمتیں نازل
ہوں گی۔ تو فرمایا اس کا مالک ہم نے بنی اسرائیل کو بنایا۔ اور وَتَمَّتْ
كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ تیرے رب
کی بھلی بات بنی اسرائیل پر پوری ہو گئی۔ خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ
کمزوروں کو اس سرزمین کا وارث بنائے گا۔ یہ وعدہ پورا ہو گیا بِمَا صَبَرُوْا
اس وجہ سے کہ انہوں نے تمام تر تکالیف کے باوجود صبر سے کام لیا۔
یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ جب بنی اسرائیل پر فرعونیوں کی سختیاں بڑھ
گئیں تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی کہ آپ کے آنے سے
پہلے اور بعد اُن کی مشکلات میں کمی نہیں ہوئی۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے
انہیں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے اور صبر کرنے کی تلقین کی کیونکہ ظاہری
اسباب کی عدم موجودگی میں اُن کی مشکلات کا واحد حل یہی تھا۔ امام حسن بصریؒ
فرماتے ہیں کہ جب انسان ظاہری طور پر مقابلے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اُس
کو فرض ہے کہ صبر سے کام لے۔ اگر ایسا کریگا تو خدا تعالیٰ ضرور اُس پر

ہونے والے مظالم کا انتقام لے گا۔ سورۃ یونس میں بھی بنی اسرائیل کی انتہائی تکالیف کا ذکر ہے۔ وہ بیچارے عبادت بھی چھپ کر کرتے تھے۔ بہرحال انہوں نے صبر کیا تو اللہ نے اُن کے دشمن کو مغلوب کیا اور انہیں شام و فلسطین جیسی بابرکت سرزمین کا وارث بنایا۔

قوم فرعون کی تباہی

فرمایا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ جو چیز فرعون اور اس کی قوم بناتے تھے ہم نے اس کو ملیامیٹ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ فرعونی بڑی بڑی عمارات بناتے تھے، محلات تعمیر کرتے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا۔ اللہ نے اُس کو بھی ویران کر دیا وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ جسے وہ اُوپر چڑھاتے تھے اس سے ایک مراد تو اُونچے اُونچے مینار اور عمارات ہیں۔ جیسا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو اونچا مینار تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ اوپر چڑھ کر موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو دیکھ سکیں۔ یہ مینار تعمیر ہوا۔ جسے اللہ نے ملیامیٹ کر دیا یَعْرِشُونَ سے مراد باغات کی وہ بیلیں ہیں جنہیں درختوں پر چڑھایا جاتا ہے یا لکڑی کے فریم بنا کر اُن کے اُوپر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں انگور کی بیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جسے بہتر پھل حاصل کرنے کے لیے زمین سے اُوپر اُٹھا کر رکھنا پڑتا ہے۔ خدا نے یہ باغات بھی تباہ کر دیے۔ فرعونی قوم کی تمام عمارات، مینار اور باغات تباہ ہو کر رہ گئے اور وہ خود بھی ہلاک ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد بنی اسرائیل کو اس سرزمین کا وارث بنایا جس کے بعد اُن کی آزمائش کا دور شروع ہو گیا، اس کا ذکر اسی سورۃ میں آگے آئیگا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿١٣٨﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿١٤١﴾

ترجمہ:- اور ہم نے اتارا بنی اسرائیل کو دریا سے پار ، پس پہنچے وہ ایک قوم کے پاس جو جھکے ہوئے تھے اپنے بتوں پر (بنی اسرائیل نے) کہا ، اے موسیٰ (علیہ السلام)! آپ بنا دیں ہمارے لیے بھی کوئی الٰہ جیسا کہ ان کے لیے الٰہ ہیں ۔ کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) بیشک تم لوگ جاہل ہو (١٣٨) تحقیق یہ لوگ ، تباہ ہونے والی ہے وہ چیز جس میں یہ لگے ہوئے ہیں اور باطل ہے وہ جو یہ عمل کر رہے ہیں (١٣٩) کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) کیا اللہ کے سوا میں تلاش کروں تمہارے لیے کوئی الٰہ حالانکہ اس نے تمہیں فضیلت دی ہے تمام جہان والوں پر (١٤٠) اور وہ

وقت بھی یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو نجات دی آل فرعون
سے ، وہ پہنچاتے تھے تم کو بُرا عذاب ، وہ قتل کرتے تھے
تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو
اور اس بات میں تمہارے لیے آزمائش تھی تمہارے رب کی
جانب سے بہت بڑی (۱۴۱)

بعد از ہلاکت آل فرعون

اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی امتِ دعوت یعنی فرعون اور اُس کی قوم کا کچھ حال بیان ہو چکا ہے۔ اب آج کے درس میں آپ کی امتِ اجابت یعنی بنی اسرائیل کا کچھ تذکرہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے سمندر میں غرق کر دیا، تو موسیٰ علیہ السلام کی اپنی قوم کے متعلق فرمایا وَجٰوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱلْبَحْرَ تو ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا۔ یہاں پہ دریا سے مراد بحیرہ قلزم ہے۔ جن لوگوں نے اس سے دریائے نیل مراد لیا ہے ، وہ درست نہیں ہے جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر بحیرہ قلزم کے کنارے پہ پہنچے تھے تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تھا کہ اپنی لاٹھی کو سمندر پہ ماریں۔ اس کا ذکر اس سورۃ اور دوسری سورتوں میں موجود ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پہ بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں بارہ راستے بنا دیئے جن پر چل کر انہوں نے بحیرہ قلزم کو پار کیا۔ اسی واقعہ کے متعلق اللہ تعالےٰ نے یہاں پہ فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا۔ پھر یہ صحرائے سینا میں پہنچے اور عرصہ تک وہیں اقامت پذیر رہے۔

بُت پرست قوم

بنی اسرائیل قلزم سے پار ہوئے تو ایک مقام پہ پہنچ کر فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ ایک قوم کے پاس آئے۔ یہ کون لوگ تھے جن پہ بنی اسرائیل کا گزر ہوا۔ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ کنعانی یا عمالقہ لوگ تھے اور بعض کی تحقیق ہے کہ عربی قبیلہ بنی لخم کے ساتھ کچھ لوگ تھے تو بنی اسرائیل نے انہیں اس حالت میں پایا يَعْكُفُونَ عَلَىٰٓ أَصْنَامٍ لَّهُمْ کہ وہ اپنے بتوں پہ جھکے ہوئے تھے۔

صنم اُس بت کو کہتے ہیں جو کسی انسانی یا دیگر شکل پہ بنایا گیا ہو اور وثن وہ بت ہوتا ہے جو ان گھڑا ہو اور کسی خاص شکل پہ متشکل نہ کیا گیا ہو بہرحال بنی اسرائیل نے دیکھا کہ وہ لوگ اپنے بت کی پوجا کر رہے تھے۔ عکفٰ کا معنیٰ کسی خاص جگہ بیٹھ کر عبادت و ریاضت کرنا ہے۔ اعتکاف اسی لفظ سے مشتق ہے کہ خاص عرصے کے لیے مسجد میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔ بہرحال وہ اس حالت میں پائے گئے کہ اُن کے بت اُن کے سامنے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ گائے کے مجسمے بنا کر رکھے تھے جن کی پوجا کرتے تھے۔

الٰہ بنانے کی درخواست

بہرحال انہیں پوجا کرتے دیکھ کر بنی اسرائیل نے کہا قَالُوا يٰمُوسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا اے موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے لیے معبود بنا دے كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ جیسا کہ انہوں نے معبود بنا رکھے ہیں۔ تاکہ ہم بھی اسی طرح عبادت کریں جس طرح یہ لوگ اپنے معبودوں کی کر رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام اس فرمائش پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ تم بڑے جاہل لوگ ہو۔ فرمایا یہ تو تم نے بہت ہی بُری بات کی ہے۔ تم بھی مشرکوں کی طرح غیر اللہ کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔ جو شخص خدا تعالیٰ کی توحید کو مانتا ہے۔ خدا کی عظمت تنزیہہ اور تقدیس کا قائل ہے، وہ تو ایسی بات نہیں کر سکتا۔ تم نے تو بالکل جاہلانہ سوال کیا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مدت دراز تک مصری بت پرستوں میں رہنے اور اُن کے ساتھ میل جول کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بھی مشرکانہ تصورات پیدا ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ بھی بت پرستی کی طرف مائل تھے۔ کسی کو بت کے آگے جھکے ہوئے یا سجدہ کرتے دیکھا یا چڑھاوا چڑھاتے دیکھا تو ان کے دل بھی مچلنے لگے کہ ہم بھی ایسا ہی کریں اسی بنا پر

توسل کا غلط تصور

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم تو بڑے ہی جاہل لوگ ہو جو ایسی نادانی کی بات کہتے ہو۔
یہاں پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کیا بنی اسرائیل بھی بتوں کی اسی طرح
عبادت کرنا چاہتے تھے جس طرح مشرک بتوں کی پوجا کرتے تھے؟ نہیں
ایسا نہیں۔ بنی اسرائیل بتوں کی پوجا نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ انہیں خدا تعالیٰ
کی عبادت کا توسل بنانا چاہتے تھے۔ بتوں کو سامنے رکھ کر اُن کے
ذریعے خدا کی عبادت کرنا چاہتے تھے قدیم زمانہ میں مشرکین بھی یہی تصور
رکھتے تھے وہ بھی بتوں کو تو معبود نہیں سمجھتے تھے البتہ انہیں ایک ذریعہ اور
توسل سمجھتے تھے۔ گویا بت کے ذریعے خدا تعالیٰ کا تصور قائم کرتے تھے۔
شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے تفسیری نوٹ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ
مشرکین بتوں کو بالکل خدا نہیں مانتے تھے بلکہ ان کو وسیلہ بناتے تھے شاہ صاحبؒ
لکھتے ہیں کہ "جاہل آدمی نرے بے صورت معبود کی عبادت سے تسکین نہیں پاتا۔
جب تک اس کے سامنے ایک صورت نہ ہو" چنانچہ بنی اسرائیل نے دیکھا
کہ وہ قوم گائے کی صورت پوجتی تھی تو ان کو ایسی ہی خواہش پیدا ہوئی۔ اور پھر
اسی تصور کی بنا پر سامری نے سونے کا بچھڑا بنایا جسے قوم نے پوجا۔ اس کا ذکر بھی
آگے آئے گا۔ بنی اسرائیل نے بھی انہی خیالات کی بنا پر الٰہ بنانے کی التجا کی
جس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بڑی جاہل قوم ہو۔

حنیفی تصورِ عبادت

ملّتِ حنیفیہ کے لوگ اس تصور کو تسلیم نہیں کرتے کہ کسی چیز کا نمونہ سامنے
رکھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ حنیفی لوگ تو اپنے ذہن اور دماغ پر
زور ڈال کر اپنی توجہ بے صورت معبود کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ وہ جہالت
کی شرکیہ رسوم سے مبرا ہیں مگر جاہل لوگ بھی خدا تعالیٰ ہی کی عبادت
کرتے ہیں مگر وہ سامنے کوئی ایسا نمونہ رکھ لیتے ہیں جس کی لگن اُن کے دل
میں موجود ہوتی ہے۔ امام حسینؓ کی تعظیم کرنے والے لوگ یہ تصور تعزیہ بنا کر
کرتے ہیں۔ کسی نے پیر کا تصور دل میں جما لیا اور کسی نے قبر کا تصور قائم کر

لیا اور پھر اللہ کی عبادت کرنے لگے۔ اولیاء اللہ کی قبروں کے قریب
جا کر نماز پڑھنے اور عبادت و ریاضت کرنے کا کیا مطلب ہے؟
کوئی نہ کوئی چیز سامنے ہونی چاہیئے۔ میلادی لوگ بھی جھنڈیاں لگا کر روضہ
نبوی کا ماڈل بنا کر یا اسی قسم کی چیزیں سامنے رکھ کر عبادت کرتے ہیں۔
یہ جاہلوں کا کام ہے۔ کیا اللہ کے نبی کی شان ان چیزوں کے بغیر بیان نہیں
ہو سکتی؟ اسی لیے حنیفی لوگوں کو صابی اور مشرک لوگوں کے طریقے سے منع
کیا گیا ہے۔ انہیں تو دل و دماغ سے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنی
چاہیئے۔ کسی استاد کا نمونہ بھی سامنے رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ملت
حنیفی کے خلاف ہے کہ کوئی تصور قائم کرنے کے لیے کسی چیز کا ماڈل
بنا کر سامنے رکھا جائے۔ ہاں اگر ضرور ہی کچھ کرنا ہے تو یہ کر سکتے ہو کہ اپنے
ذہن میں یہ بات رکھو کہ ہمارے پیر یا استاد اس طریقے سے عبادت کیا
کرتے تھے لہذا ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل کر عبادت کرتے ہیں سامنے
تصویر یا مجسمہ رکھنے کی قطعی اجازت نہیں۔ یہی شرک کی بنیاد ہے۔ انسان سمجھتا
ہے کہ میں عبادت تو خدا تعالیٰ ہی کی کر رہا ہوں اور سامنے کوئی تصویر رکھی ہے
یہ غلط اور شرکیہ طریقہ ہے۔ جب تک جاہل آدمی کے سامنے کوئی چیز نہ ہو
اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ بنی اسرائیل نے بھی اسی قسم کا الٰہ بنانے کے لیے موسیٰ
علیہ السلام سے درخواست کی تھی جس کی وجہ سے آپ نے انہیں جاہل قرار
دیا۔ فرمایا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ تحقیق یہی لوگ ہیں مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ
جس چیز میں یہ ہیں۔ وہ تباہ ہونے والی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ
جس طریقے پر شرکیہ امور انجام دے رہے ہیں، وہ انہیں تباہی کی طرف لے
جا رہا ہے۔ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ اور باطل ہے وہ عمل
جو یہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کے شرکیہ افعال بالکل قابل قبول نہیں بلکہ
سراسر باطل اور مردود ہیں۔

بنی اسرائیل کی فضیلت

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے مزید فرمایا قَالَ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰھًا کیا میں تمہارے لیے خدا کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں؟ کہ تم اس نمونے کو سامنے رکھ کر عبادت کر سکو۔ حالانکہ وَّھُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ اس نے تمام جہان والوں پر تمہیں فضیلت عطا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دور میں بنی اسرائیل کو تمام اقوام عالم پر برتری عطا کی۔ فرمایا جس مالک الملک نے تمہیں عظمت عطا کی ہے۔ اس کے انعامات کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے، نہ کہ اس کی عبادت میں غیروں کو شریک کرنا چاہیئے یہ تو بڑے شرم کی بات ہے کہ اللہ کے ساتھ عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے یا کوئی شخص اُس کے توسل کے ذریعے خدا تعالےٰ کی عبادت کرے اور یہ سمجھے کہ اس کے بغیر عبادت کر ہی نہیں سکتا۔ یہ کتنی غلط بات ہے۔ بت جسے سامنے رکھ کر عبادت کی جاتی ہے وہ تو خود انسان سے کم تر ہے۔ اُسے تو خود انسانی ہاتھوں نے بنایا ہوا ہے وہ انسان سے اعلیٰ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُس سے خود انسان بدرجہا افضل ہے۔ مگر بے وقوفی کی انتہا ہے کہ صاحب فضیلت انسان اپنے سے کم تر چیز کی تعظیم کرتا ہے۔ ایسا عمل کر کے انسان نے اللہ کی نعمت کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے یہی کہا کہ اللہ نے تمہیں فضیلت بخشی ہے مگر تم دوسروں کو اس کے ساتھ شریک بناتے ہو۔ یہ کتنا غلط تصور ہے۔

ذات انواط کا واقعہ

حضرت ابو واقد لیثیؓ حضور علیہ السلام کے ساتھ غزوہ حنین میں ہم سفر تھے راستے میں آپ کا گزر ایک بیری کے درخت پر ہوا۔ مشرک لوگ اس درخت کو مقدس خیال کرتے تھے اور تبرک کے لیے اپنے آلات حرب اس درخت کے ساتھ لٹکاتے تھے، اس درخت کو ذات انواط کہا جاتا تھا۔ اس درخت کو دیکھ کر بعض مسلمانوں نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا اجعل لنا ذات انواط حضور! ہمارے لیے بھی کوئی ذات انواط بنا

دیں جس کے ساتھ ہم اپنی تلواریں وغیرہ لٹکایا کریں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا سُبْحَانَ اللّٰہِ یہ تو وہی بات ہوئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی
قوم نے آپ سے کہی تھی اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ
اٰلِھَۃٌ یہ تو بڑی بے وقوفی اور حماقت کی بات ہے۔ مشرکین تو کسی
مشرکانہ تصور کی بنا پر اس درخت کو مقدس خیال کرتے ہیں مگر تم بھی انہی
کی مشابہت اختیار کرنا چاہتے ہو؟ حضور علیہ السلام نے غصے سے یہ بھی فرمایا
کہ تم بھی پہلے لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرو گے اور پھر آپ نے
یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ فرمایا جس خدا نے تمہیں برتری عطا کی ہے
اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرانا چاہیئے۔ اس کی عظمت اور تقدس
کو پہچاننا چاہیئے۔ اس قسم کے بت یا کوئی دوسرا ماڈل بوقت عبادت سامنے
رکھنا اس کے تقدس کے منافی ہے

احسانات الٰہی کو یاد

فرمایا، اس وقت کو یاد کرو وَاِذْ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ
ابھی زیادہ مدت نہیں گزری کہ ہم نے تمہیں قوم فرعون سے نجات دی۔
فرعونی تمہیں کتنی ذلت ناک سزا دیتے تھے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ
وہ تمہیں بہت بڑا عذاب دیتے تھے۔ اور وہ اس طرح یُقَتِّلُوْنَ
اَبْنَآءَکُمْ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے وَیَسْتَحْیُوْنَ
نِسَآءَکُمْ اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ تاکہ انہیں
لونڈیاں بنا کر ان سے خدمت لے سکیں۔ بچوں کے متعلق خطرہ تھا کہ اگر
ان کی آبادی بڑھ گئی، تو کہیں ہم پر غالب نہ آجائیں اور ہماری سلطنت پر
قبضہ نہ کر لیں۔ اس لیے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے۔ روایات میں آتا ہے
کہ فرعونیوں نے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچے قتل کروا دیے۔ تو فرمایا کہ اللہ
کے احسان کو یاد کرو جس نے قریبی زمانہ میں تمہیں اس عذاب سے نجات
دی ہے تمہیں تو شرکیہ افعال کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے

اپنے منعم کی احسان فراموشی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس نے تمہارے دشمن کو نہ صرف تم سے دور کر دیا بلکہ اُسے ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اب تمہیں اللہ تعالیٰ کا احسان مند ہونا چاہیئے۔

فرمایا وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ

اس بات میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔ بلاء کا معنی آزمائش بھی آتا ہے اور احسان بھی۔ اگر اس کا معنی احسان کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں فرعون سے نجات دینے میں اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان تھا اور اگر بلاء کا معنی ابتلا یا آزمائش کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ فرعون کی طرف سے تمہیں طرح طرح کے مصائب اور آزمائش تھی۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے بچوں کو قتل کر دیا جاتا تھا مگر تم بے بس تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تمہارے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔ اللہ نے تمہیں اس ظلم و ستم سے نجات دی فرعونی قوم نے تمہیں غلام بنا رکھا تھا تم سے بلا معاوضہ محنت و مشقت کا کام لیتے تھے۔ تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنا رکھا تھا مگر تم اُن کے مقابلے میں بے دست و پا تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان مشکلات سے نکالا تو تمہیں اس کا احسان مند ہونا چاہیئے اور اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے نہ کہ کوئی جہالت اور نادانی کی بات کرنی چاہیئے۔ یہ تو سخت جہالت اور نادانی کی بات ہے کہ تم مشرکوں کی طرح اللہ کے علاوہ دوسروں کو معبود بنانے کا مطالبہ کر رہے ہو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو اس طرح بات سمجھائی۔ اور اللہ تعالیٰ کے احسان یاد کرائے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

ترجمہ:- اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا اور پورا کیا ہم نے ان کو دس کے ساتھ۔ پس پوری ہو گئی مدت اس کے پروردگار کی چالیس راتیں اور کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہ تم میرے خلیفہ بن جاؤ میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور نہ پیروی کرنا مفسدوں کے راستے کی ﴿۱۴۲﴾ اور جب آئے موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے وعدے

کے وقت پر اور کلام کیا اُن کے ساتھ اُن کے پروردگار نے تو کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) اے میرے پروردگار! دکھا تو مجھ کو تاکہ میں دیکھوں تیری طرف۔ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) تو ہرگز نہیں دیکھ سکے گا مجھے، لیکن دیکھ پہاڑ کی طرف۔ اگر ٹھہرا رہا وہ اپنی جگہ پر تو پھر تو مجھے دیکھ سکے گا۔ پس جس وقت تجلی فرمائی اس کے پروردگار نے پہاڑ پر تو کر دیا اس کو ریزہ ریزہ اور گر پڑے موسیٰ (علیہ السلام) بیہوش ہو کر۔ جب ہوش میں آئے تو کہا انہوں نے پاک ہے تیری ذات، میں توبہ کرتا ہوں تیرے سامنے اور میں سب سے پہلے یقین لانے والوں میں ہوں (۱۴۳) فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) اے موسیٰ (علیہ السلام)! بیشک میں نے تمہیں منتخب کیا ہے لوگوں پر اپنے پیغام کے ساتھ اور اپنے کلام کے ساتھ۔ پس لے لو جو میں نے تم کو دیا ہے اور ہو جاؤ شکر ادا کرنے والوں میں سے (۱۴۴)

ربطِ آیات

جب فرعون اور اس کا لشکر بحیرہ قلزم میں غرق ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام واپس مصر میں نہیں آئے بلکہ آگے صحرائے سینا کی طرف چلے گئے۔ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب انہوں نے بحیرہ قلزم کو عبور کیا تو اُن کا گذر ایک بستی پر ہوا جس کے لوگ اپنے معبودانِ باطلہ پر جھکے ہوئے تھے یعنی اُن کی پرستش کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کو عبادت کا یہ طریقہ بھلا معلوم ہوا اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اُن کے لیے بھی ایک معبود بنا دیا جائے جسے سامنے رکھ کر وہ عبادت کیا کریں۔ آپ نے قوم کو ڈانٹا اور فرمایا تم بڑے جاہل لوگ ہو۔ جس خدا نے تمہیں فضیلت بخشی اور تم پر احسانات کیے کیا اُسے چھوڑ کر میں تمہارے لیے کوئی دوسرا الٰہ تلاش کروں؟ یہ لوگ تو کفر و شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس کارگذاری کی وجہ سے تباہ ہونے

والے ہیں کیونکہ ان کا مذہب باطل ہے پھر اللہ نے بنی اسرائیل کو اپنے احسان یاد کرائے جب کہ وہ فرعون کی حکومت میں غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے، ان کے بچوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا اور وہ بہت بڑی آزمائش سے گزر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس عذاب سے نجات عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام نے ان پر کیے گئے احسانات یاد دلا کر انہیں شرم دلائی کہ کچھ تو احساس کرو کہ جس اللہ تعالیٰ نے تم پر انعامات کیے اسی کے ساتھ شرک کرنا چاہتے ہو۔

قانون کا مطالبہ

اب یہاں درمیان میں ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ صحرائے سینا میں پیش آیا۔ فرعون کی غلامی سے آزادی کے بعد اللہ تعالیٰ کی مصلحت یہ تھی کہ اب یہ لوگ مصر واپس نہ جائیں۔ فرعون کی غلامی میں رہ کر ان کی ذہنیت خراب ہو چکی تھی اور وہ طرح طرح کی مادی اور اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی اصلاح مطلوب تھی، اس کا منشا یہ تھا کہ بنی اسرائیل صحرائی زندگی اختیار کریں اور یہاں کی آزمائش سے گزریں اور اپنی کھوئی ہوئی مستعدی اور صلاحیت کو پھر سے بحال کریں مصر میں تو وہ فرعون کے قانون کے پابند تھے جس کے ذریعے ان پر طرح طرح کے مظالم روا رکھے جاتے تھے۔ صحرائے سینا میں پہنچ کر انہوں نے آزادی کا سانس لیا۔ اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبر ان کے ساتھ تھے چنانچہ انہوں نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ آپ ہمارے لیے قانون کی کوئی کتاب لائیں جس کی پابندی کر کے ہم اپنی آزادانہ زندگی کو بہتر طور پر گذار سکیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قوم کا مطالبہ پیش کیا تو اللہ نے فرمایا کہ تم کوہ طور پر آکر اعتکاف بیٹھو تو تمہیں کتاب عطا کی جائے گی۔ موسیٰ علیہ السلام قوم کو صحرا میں چھوڑ کر خود اعتکاف کے لیے پہاڑ پر چلے گئے۔ ابتدا میں یہ اعتکاف تیس رات کا تھا مگر بعد

میں دس رات کا اضافہ کر کے چالیس رات کا کر دیا گیا جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اعتکاف کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتاب تورات عطا فرمائی تاکہ بنی اسرائیل اس کے احکام کے مطابق زندگی گزاریں۔

تورات کا لفظی معنی قانون ہوتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل قانون کے خواہشمند تھے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ کتاب عطا کر دی جس کا نام ہی قانون (LAW) رکھا۔ باقی آسمانی کتابوں کے اسماء میں بھی مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسے انجیل کا معنی بشارت ہے اور زبور صحیفہ کو کہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کا معنی پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی۔ موجودہ بائبل کے پہلے چار ابواب تورات پر مشتمل ہیں اگرچہ اس میں یہودیوں اور نصرانیوں کے ہاتھوں بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے تاہم اس وقت جو کچھ بھی موجود ہے، وہ یہی چار باب ہیں جنہیں تورات کا نام دیا جا سکتا ہے اگرچہ یہ متن تحریف شدہ ہے۔

اعتکاف کی مدت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً ہم نے وعدہ کیا موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا یعنی کوہ طور پر تیس رات مسلسل اعتکاف کریں تو آپ کو کتاب دی جائیگی وَاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ اور پورا کیا ہم نے اس کو مزید دس کے ساتھ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً پس پوری ہو گئی مدت اس کے پروردگار کی چالیس راتیں۔ یعنی تیس رات کی بجائے اعتکاف کی مدت چالیس رات کر دی گئی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اعتکاف کی لازمی مدت تو تیس رات ہی تھی تاہم مزید دس راتیں اختیاری تھیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام اگر چاہتے تو دس رات کا اضافہ کر سکتے تھے۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے دوسرے واقعہ میں ملتی ہے جس کا ذکر سورۃ قصص میں موجود ہے۔ جب آپ مدین پہنچے اور وہاں حضرت شعیب علیہ السلام سے ملاقات ہوئی

تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر تم آٹھ سال یہاں رہ کر میری خدمت کرو تو میں اپنی بیٹی کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں گا۔ پھر انہوں نے یہ بھی فرمایا "فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ" اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے ہوگا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اسی طرح کوہِ طور پر اعتکاف بھی تیس رات کے لیے ضروری تھا اور مزید دس رات اختیاری تھا۔

شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ جب تیس رات کا اعتکاف مکمل ہو گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کر لی جس کی وجہ سے ان کے منہ میں روزے اور اعتکاف کی وجہ سے جو بُو پیدا ہو گئی تھی، وہ جاتی رہی۔ اور روزے دار کے منہ کی بُو کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کستوری کی سے بھی زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے اس خوشبو سے فرشتے بھی خوش تھے مگر مسواک کرنے سے وہ بھی محروم ہو گئے، اس لیے حکم ہوا کہ دس دن مزید اعتکاف کرو۔ بہرحال یہ وجہ تھی یا کوئی دوسری، موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر چالیس رات دن کا مجاہدہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے تورات عطا فرمائی۔

چالیس دن کو بعض دوسرے امور میں بھی اہمیت حاصل ہے مثلاً ماں کے پیٹ میں بچے کی پیدائش کے مراحل چالیس چالیس دن کے بعد تبدیل ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے "مَنْ أَخْلَصَ لِلّٰهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا" جو شخص چالیس دن تک خلوصِ نیت کے ساتھ رب تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری فرما دیتا ہے۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن تک روزہ رکھا، اعتکاف کیا، اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت کی تو جیسا کہ اگلی آیتوں میں آرہا ہے، اللہ تعالیٰ نے تختیوں پہ لکھی لکھائی تورات عطا فرمائی۔

موسیٰ علیہ السلام کی جانشینی

ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور عمر میں تین سال بڑے تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے نبوت و رسالت کی ذمہ داریوں کے

بوجھ کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کے بھائی کو بھی نبوت عطا کی جائے تاکہ وہ ان کے فرض منصبی میں اُن کی معاونت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دُعا قبول کر کے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا۔ بلکہ انہیں موسیٰ علیہ السلام کا وزیر بنا دیا۔ اب جب کہ موسیٰ علیہ السلام اعتکاف کے لیے طور پر جا رہے تھے تو قوم کو نگرانی کے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ قرآن پاک میں موجود ہے کہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے تو اُن کے بارہ قبیلے تھے۔ ہر ایک قبیلے کا نقیب (سردار) تھا جو انکی راہنمائی کرتا تھا۔ اور پھر بحیثیت مجموعی وہ سب موسیٰ علیہ السلام کی نگرانی میں تھے۔ تفسیری روایات کے مطابق چھ لاکھ ستر ہزار افراد پر مشتمل اس قوم کی راہنمائی کے لیے نگران کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی چرواہا بھی بکریوں کو بلا نگرانی چھوڑ کر نہیں جا سکتا، وہ بھی کسی کے سپرد کر کے جاتا ہے مگر یہ لاکھوں انسانوں کا مسئلہ تھا خاص طور پر ان حالات میں کہ مسلسل غلامی میں رہنے کی وجہ سے اُن کے قویٰ ضعیف ہو چکے تھے۔ تو موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پہ جانے لگے تو انہوں نے قوم کی راہنمائی کے لیے اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کرنا چاہا۔ یہاں پر اسی بات کو بیان کیا گیا ہے وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا آپ میری قوم میں میرے نائب بن جائیں۔ جب تک میں طور سے واپس آؤں، قوم کی نگرانی کا فریضہ آپ انجام دیتے رہیں۔ آج کی دنیا میں بھی یہ اصول رائج ہے۔ جب کبھی کسی ملک کا سربراہ بیرون ملک جاتا ہے تو وہ اپنا جانشین مقرر کر کے جاتا ہے تاکہ اس کی غیر حاضری میں امور مملکت کی انجام دہی میں رکاوٹ نہ آنے پائے۔ یہ طریقہ دراصل انبیاء کی تعلیم ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ تو اس اصول کے مطابق موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

اسلامی حکومت کی ذمہ داری

اسلامی نظامِ حکومت میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اجتماعیت کے بغیر ملک و ملت کا کوئی کام بطریقِ احسن انجام نہیں دیا جا سکتا خاص طور پر لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے مؤثر نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ امام شاطبیؒ اپنی کتاب موافقات میں رقمطراز ہیں کہ خلیفہ وقت کے ذمے اپنی قوم کی پانچ چیزوں کی حفاظت لازم ہے یعنی جان، مال، دین، عقل اور نسل۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی جان محفوظ ہو اور قتل و غارت گری کا بازار گرم نہ ہو جائے۔ چوروں اور ڈاکوؤں پر مؤثر کنٹرول ہو تاکہ لوگوں کا مال محفوظ رہ سکے۔ دین کی حفاظت اس لیے ضروری ہے کہ لوگ مرتد نہ ہو جائیں۔ اسی طرح ان کی عقل کی حفاظت ہونی چاہیئے تاکہ وہ جہالت میں مبتلا ہو کر رسوماتِ باطلہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور پھر فحاشی اور بدکاری پر بھی مناسب کنٹرول ہونا چاہیئے تاکہ لوگوں کی نسل خراب نہ ہو۔

انگریزی نظامِ حکومت میں اسلام کے ان زریں اصولوں کی قطعاً پرواہ نہیں کی جاتی حتیٰ کہ اسلامی حکومتوں میں بھی دین کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں۔ اس مملکتِ خداداد میں قیامِ پاکستان کے بعد پچاس ساٹھ لاکھ سے زیادہ افراد عیسائی بن چکے ہیں لیکن حکومت نے غور کرنا بھی گوارا نہیں کیا کہ آخر یہ لوگ دینِ اسلام چھوڑنے پر کیوں مجبور ہیں۔ ان کی کون سی ضروریات ہیں جو پوری نہیں ہوئیں اور آخر کار یہ دین چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ کسی مسلمان کا مرتد ہو جانا بہت بڑا حادثہ ہے جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ یہ تو صرف عیسائی ہونے والوں کی تعداد ہے۔ مرزائی اور دہریہ بن جانے والے ان کے علاوہ ہیں۔ حکومت کے وزیروں اور مشیروں کو محض کوٹھیوں میں بیٹھنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں دی ہے تو ان پر ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں انہیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہیئے۔ محض بیان بازی یا کھیل تماشے کی سرپرستی

سے حکومت کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

ہارون علیہ السلام کو وصیت

بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا کہ آپ میرے جانشین بن جائیں وَاَصْلِحْ اور قوم کی اصلاح کی طرف توجہ دینا تاکہ کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو جائے وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ اور فساد کرنے والوں کے راستے پر نہ چلنا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے کردار سے واقف تھے۔ فرعون کی غلامی میں رہ کر ان کی صلاحیتیں بگڑ چکی تھیں، ان میں بہت سے فسادی لوگ بھی موجود تھے، اس لیے اپنے جانشین سے فرمایا کہ قوم کی اصلاح کرنا اور فسادیوں کے پیچھے نہ لگنا۔ غلط کار لوگ قوم میں بگاڑ کا باعث بنیں گے لہٰذا ان کے طریقے سے اجتناب کرنا اور میری نیابت کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

اللہ سے ہم کلامی

فرمایا پروگرام کے مطابق وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا اور جب آئے موسیٰ علیہ السلام ہمارے وعدے کے وقت پر۔ پھر انہوں نے اعتکاف مکمل کیا اور آخر میں وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ان کے رب نے ان سے کلام کیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جس دن موسیٰ علیہ السلام کو اللہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ وہ عرفہ کا دن تھا۔ گویا نو ذی الحج کو اللہ نے آپ سے کلام کیا اور اگلے دن یعنی دس ذی الحج کو تورات عطا فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام کو یہ مرتبہ یکدم حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ آپ بتدریج ترقی کی منازل طے کرتے گئے پہلے مدین سے واپسی پر نبوت عطا ہوئی، فرعون سے بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر کار فرعون اور اس کی قوم غرق ہوئی اور بنی اسرائیل کو آزادی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد اللہ کے حکم سے آپ نے طور پر اعتکاف کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئی اور آخر میں تورات عطا ہوئی۔ بہرحال فرمایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام وعدے کے مطابق طور پر آئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام کیا۔ دوسرے مقام پر آتا ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى

تَكْلِيمًا (النساء) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے تو ہر نبی سے کلام کیا ہے مگر براہِ راست ہم کلامی کا شرف صرف موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ کوئی استعارہ نہیں تھا بلکہ آپ نے ان جسمانی کانوں کے ساتھ کلامِ الٰہی سنا تھا۔ حدیث شریف میں آدم علیہ السلام کے متعلق بھی ذکر آتا ہے۔ جب حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ کیا آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں تو آپ نے فرمایا نَبِیٌّ مُکَلَّمٌ یعنی آپ اللہ کے نبی تھے اور آپ سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا یہ بھی براہِ راست کلام کی مثال ہے۔

رؤیت الٰہی کی درخواست

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ تکلم بخشا تو انہیں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا تاکہ جس ذات باری تعالیٰ سے بات چیت ہوئی ہے اُسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے جذبہ شوق کے ساتھ عرض کیا قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ اے پروردگار! مجھے دکھا اَنْظُرْ اِلَیْكَ تاکہ میں تیری طرف دیکھ سکوں۔ کلام تو سن لیا ہے اب بالمشافہ رویت بھی حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھے گا کیونکہ تیرے اندر وہ استعداد موجود نہیں جس سے مجھ کو دیکھ سکے۔ فرمایا وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ اس پہاڑ کی طرف دیکھو فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہا۔ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ تو ممکن ہے کہ تو مجھے دیکھ سکے۔

مادیت کے اعتبار سے پہاڑ بڑی ٹھوس اور مضبوط چیز ہے اس کے مقابلے میں انسان ایک کمزور سی ہستی ہے۔ اللہ نے فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (النساء) انسان کو جسمانی لحاظ سے کمزور پیدا کیا گیا ہے مگر یہی انسان لطافت اور باطنی قویٰ کے لحاظ سے بہت مضبوط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا بارِ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا مگر کسی نے بھی اس

امانت کو اٹھانے کی جرأت نہ کی۔ اللہ نے فرمایا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ پھر اس کو انسان نے اٹھایا اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب ا) بیشک وہ ظلوم اور جہول تھا۔ تو معلوم ہوا کہ انسان کی باطنی قوت سب سے زیادہ ہے۔ مگر یہاں پر موسیٰ علیہ السلام کا ظاہر جسم مراد ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اگر پہاڑ جیسی مضبوط چیز میری تجلی کو برداشت کر سکی تو پھر سمجھ لینا کہ تم بھی مجھے ان سر کی آنکھوں سے دیکھ سکو گے۔

تجلی اور پہاڑ کی انگشت

فرمایا فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جب آپ کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی ڈالی جَعَلَهٗ دَكًّا تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھوٹی انگلی یعنی چھنگلی کے ذرا سے کنارے کے برابر اپنی تجلی ڈالی مگر پہاڑ اُسے بھی برداشت نہ کر سکا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

تجلی کی تعریف میں امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ اس کائنات کو ظاہر کرنے کے اعتبار سے خدا تعالیٰ کی چار صفات کام کرتی ہیں۔ اللہ کی پہلی صفت ابداع ہے جیسے "بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ ابداع اس ایجاد کو کہتے ہیں جو بغیر کسی مادے اور آلے یا مکان و زمان کے پیدا کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اپنی صفت ابداع کے ذریعے بغیر کسی مادے یا آلے کے پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خلق ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ ایک چیز کو کسی دوسری چیز کے مادے سے تیار کیا جائے جیسے "خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ تُرَابٍ" مٹی موجود تھی اور اس سے آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ تیار کیا۔ اسی طرح جنات کو آگ سے تخلیق کیا۔ خدا تعالیٰ کی تیسری صفت تدبیر ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کسی موجود چیز کو گھٹاتا بڑھاتا ہے اور ترقی و تنزل سے دوچار کرتا ہے مُدَبِّرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ پوری کائنات کا نظام اسی کے

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۴ (فیاض)

دست قدرت میں ہے۔ ہر چیز کی وہی تدبیر کرتا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت تدلّی ہے۔ تدلّی اللہ تعالیٰ کی عرش عظیم پر ہمہ وقت پڑنے والی تجلی اعظم کا خفیف سا عکس ہے۔ جو اس مادی دنیا میں آنے پر ہر شخص کے قلب پر پڑتا ہے۔ یہ تجلی اس وقت نظر نہیں آتی۔ حیب انسان سے یہ مادی خول اتر جائیگا تو وہ تجلی فوراً ظاہر ہو جائیگی۔ یہی تدلّی ہے۔ عرش عظیم کی تجلی اعظم اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے مگر اس مادی دنیا میں رہ کر انسان اپنی ملکیت کو ترقی نہیں دے سکتا۔ اس لیے اس کی کشش پیچھے کی طرف ہوتی ہے۔ اس واسطے تجلی اعظم اور انسان ملکیت و بہیمیت میں کشمکش جاری رہتی ہے۔ بہرحال ہر آدمی کے قلب پر تجلی اعظم کا عکس پڑتا ہے جو تدلّی کہلاتا ہے۔

ذات معہ حجاب

بعض فرماتے ہیں کہ تجلی کا معنیٰ ذات کا معہ حجاب کے ظاہر ہونا ہے یہ حجاب نوری یا ناری کہلاتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اگر ذات سے یہ حجاب اٹھ جائے تو یہ تجلی جس چیز پر پڑے اُسے جلا کر رکھ دے۔ اگر اللہ تعالیٰ حجاب کو ہٹا دے لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَا انْتَهٰى اِلَيْهِ بَصَرُهٗ مِنْ خَلْقِهٖ جہاں تک نگاہ پہنچتی ہے۔ سب چیزیں ہلاک ہو جائیں، کوئی بھی اس تجلی کو برداشت نہ کر سکے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تجلی پردے میں رکھی ہوئی ہے۔ اور پھر یہ ہے کہ ان پردوں کی تعداد بھی بے شمار ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک موقع پر جبریل امین نے کہا کہ آج مجھے خدا تعالیٰ کا بہت ہی قرب حاصل ہوا۔ پوچھا گیا، کس قدر؟ کہا میرے اور رب تعالیٰ کے درمیان صرف ستر ہزار پردے رہ گئے، باقی سب اٹھ گئے۔ ان پردوں کی تعداد کتنی ہے، مخلوق میں سے کوئی نہیں جانتا اور یہ ملکے پردے کبھی نہیں کھلیں گے۔ تجلی کا یہی معنیٰ ہے۔

صوفیائے کرام کی اصطلاح میں تجلی سے مراد ہے ظہور الشیئ فی مرتبۃ الثانیۃ یعنی کسی چیز کا اپنے مرتبے پر موجود ہوتے ہوئے دوسرے مرتبے پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی مثال آئینہ ہے۔ جب انسان اس میں دیکھتا ہے تو وہ اپنی ذات کو بعینہٖ تو نہیں دیکھتا بلکہ وہ ذات کے ظہور کو دوسرے مرتبے میں دیکھتا ہے۔ یہ مرتبہ حقیقت میں نہیں بلکہ عالم اشباہ میں آگیا ہے یہ ایک دوسرا جہان ہے جس میں انسان دیکھ رہا ہے کہ اس کی شکل و صورت کیسی ہے مگر اس کی اصل حیثیت میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات تو اپنی جگہ قائم ہوتی ہے مگر اس کا اظہار کسی تجلی کی صورت میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تجلیات بے حد و بے شمار ہیں جن کا ظہور مختلف عالموں میں مختلف طریقے سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا کہ جب انسان آئینے میں اپنی شکل دیکھتا ہے تو وہ عالم اشباہ میں ہوتا ہے اور وہ جو کچھ دیکھتا ہے وہ اس کی ذات کے مشابہ ہوتا ہے اگرچہ خود ذات نہیں ہوتی۔ اس طرح ایک عالم رؤیا ہے۔ انسان خواب کی حالت میں مختلف اشیاء کو مختلف انداز میں دیکھتا ہے۔ یہ دوسرا جہان ہے۔ اسی طرح عالم برزخ ہے مرنے کے بعد جب انسان اس جہان میں پہنچتا ہے تو وہاں کے معاملات اس کے مطابق پیش آتے ہیں۔ پھر عالم مثال ہے۔ اس جہان میں بھی چیزیں خاص طریقے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کے بعد عالم ارواح اس سے بھی بلند ہے اور اس جہان کا اپنا نظام ہے۔ اور آخر میں عالم جبروت ہے جو بلند تر مقام ہے اور جہاں پر خدا تعالیٰ کی صفات اور اس کے اسمائے پاک کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر عالم لاہوت ہے جو وراء الوراء ہے اور جہاں تک کسی کی رسائی نہیں، وہی ذات خداوندی ہے۔ بہرحال تجلی کا معنی حجاب کے ساتھ ذات کا ظہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چھنگلی کے سرے کے برابر

پہاڑ پر تجلی ڈالی تو وہ برداشت نہ کر سکا اور ریزہ ریزہ ہوگیا ۔

موسیٰ علیہ السلام کی بیہوشی اور افاقہ

وَخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا اور موسیٰ علیہ السلام پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ بیہوش ہو کر گر پڑے ۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ کوہ طور پر تجلی کے ظہور سے پہلے خاص کیفیات پیدا ہوئیں ۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بادل ہوں ۔ اس میں سے فرشتوں کی تسبیح کی آوازیں آرہی تھیں جس کی وجہ سے زبردست گونج تھی اور اس کے بعد ذرا سی چمک پڑی تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام برداشت نہ کر سکے ۔ فَلَمَّا اَفَاقَ پھر جب آپ کو قدرے افاقہ ہوا ، ہوش میں آئے قَالَ سُبْحٰنَكَ عرض کیا پروردگار ! تیری ذات پاک ہے تُبْتُ اِلَيْكَ میں تیرے پاس توبہ کرتا ہوں ۔ مجھے رؤیت کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے تھا ۔ اے مولا کریم ! وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں ۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اس مادی جہان میں انسان خدا تعالیٰ کے دیدار کی صلاحیت نہیں رکھتا ۔

آخرت میں رؤیت الٰہی

معتزلہ ، خوارج اور روافض وغیرہ نے رؤیت الٰہی کا مطلق انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جس طرح اس مادی جہان میں خدا تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں اسی طرح آخرت میں بھی رؤیت نہیں ہو سکتی ۔ ان کے مطابق اگر رؤیت الٰہی تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی کسی جہت یا سمت کو بھی ماننا پڑے گا ۔ مگر خدا تعالیٰ مادیت اور جہت سے پاک ہے ۔ مگر قرآنی نصوص اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اہل ایمان کو جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ یہ دیدار بے کیف ہوگا یعنی اس کی کیفیت انسانی ذہن میں نہیں آسکتی ۔ کیونکہ انسان سمت کے بغیر کسی چیز کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ۔ مگر خدا تعالیٰ چونکہ قادر مطلق ہے ، وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ کسی انسان کو بغیر جہت اور مکان کے کسی چیز کا مشاہدہ کرادے ، یہ تو اس کا کام ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ آخرت

میں اہل ایمان کو رؤیت الٰہی نصیب ہوگی حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے
اِنَّكُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوْا تم مرنے سے پہلے اس
جہان میں اپنے پروردگار کو نہیں دیکھ سکتے۔ جب اگلے جہان میں پہنچ کر
مادیت کم ہو جائیگی روحانیت بہت بڑھ جائے گی اور بکیت غالب
اور بہیمیت کمزور ہوگی۔ تو پھر آج کا ناممکن بھی ممکن ہو جائے گا فَكَشَفْنَا
عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (سورۃ ق) اللہ تعالےٰ
فرمائے گا اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا اور آج تیری نگاہ تیز ہے
اس جہان میں ہم فرشتوں اور جنات کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے مگر
وہاں سب کچھ نظر آئے گا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور دیگر مفسرین فرماتے
ہیں کہ معراج کے موقع پر حضور علیہ السلام کو جو رؤیت الٰہی نصیب ہوئی تھی وہ
اس جہان میں نہیں بلکہ حظیرۃ القدس میں ہوئی تھی جہاں جنت الماویٰ ہے۔
ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت اللہ کا کلام ہے اور حضور علیہ السلام
کی خصوصیت رؤیت الٰہی ہے۔ آخرت کی رؤیت کے متعلق شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جنتی
لوگ تجلی اعظم کو بڑے نمایاں طریقے سے مشاہدہ کر سکیں گے اب بھی
اگر کوئی شخص بالفرض عرش کے نیچے چلا جائے تو وہ تجلی اعظم کو نمایاں طور
پر دیکھ سکیگا کیونکہ وہ وہاں ہر وقت پڑتی رہتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو نصیحت

جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کیا۔
اس کی تقدیس بیان کی اور اس کے سامنے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا
قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ میں نے تمہیں لوگوں
پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے بِرِسٰلٰتِىْ اپنی رسالت کے ساتھ وَبِكَلَامِىْ
اللہ نے فرمایا اے موسیٰ علیہ السلام! میں نے تمہیں رسول بنایا تاکہ میرا پیغام
لوگوں تک پہنچاؤ۔ پھر تجھے شرف تکلم بخشا۔ دوسرے انبیاء کے ساتھ بالواسطہ
کلام کیا جب کہ تیرے ساتھ براہ راست کلام کیا۔ میں نے تمہارے

میا کو یہ احسانات کے فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُكَ پس لے لیں جو میں نے
تجھے دیا ہے ۔ جو کچھ مل گیا ہے اسی پر اکتفا کرو وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ
اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ ۔ میں نے آپ کو اتنا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا
ہے ، لہٰذا آپ کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کریں جو اس مادی جہان میں ممکن
نہیں ۔ یہاں پر مادیت کا غلبہ ہے ، تمہارا ظاہری جسم کمزور اور تمہارے
قویٰ معمولی ہیں ، یہ رؤیت الٰہی کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔ لہٰذا جو چیز مل گئی
ہے ، اسی کو کافی سمجھو اور خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرو ۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا
لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا
بِأَحْسَنِهَا ۚ سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفٰسِقِينَ ﴿١٤٥﴾ سَأَصْرِفُ عَنْ
اٰيٰتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ
وَإِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ وَإِنْ يَّرَوْا
سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ وَإِنْ يَّرَوْا
سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ
كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غٰفِلِينَ ﴿١٤٦﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا
بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۗ هَلْ
يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٧﴾ ع ١٧

ترجمہ :- اور لکھ دی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے
تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت اور تفصیل ہر چیز کے لیے
(اور ہم نے کہا) آپ پکڑیں اِن کو مضبوطی کے ساتھ
اور حکم دیں اپنی قوم کو کہ وہ پکڑیں اس کی بہتر باتوں کو
میں عنقریب دکھا دوں گا تم کو نافرمانوں کا گھر (١٤٥) میں پھیر
دوں گا اپنی آیتوں سے اُن لوگوں کو جو تکبر کرتے ہیں
زمین میں ناحق ۔ اور اگر وہ دیکھیں سب نشانیاں تو ایمان نہیں

راستے اُن کے ساتھ اور اگر دیکھتے ہیں وہ ہدایت کے راستے کو تو نہیں بناتے اس کو راستہ ۔ اور اگر دیکھتے ہیں گمراہی کے راستے کو تو اُس کو پکڑ لیتے ہیں راستہ ۔ یہ بات اس لیے کہ بیشک انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تھے وہ اُن سے غفلت برتنے والے (۱۴۶) اور وہ لوگ جنہوں جھٹلایا ہماری آیتوں اور آخرت کی ملاقات کو تو ضائع ہو گئے اُن کے اعمال نہیں بدلہ دیئے جائیں گے وہ مگر اُسی کا جو وہ عمل کرتے تھے (۱۴۷)

ربط آیات

اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے اور وہاں پر چالیس راتوں کا اعتکاف کیا ، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرف تکلم بخشا اور آپ کو کتاب تورات عطا فرمائی ۔ درمیان میں موسیٰ علیہ السلام کے اس اشتیاق کا ذکر ہوا جب آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔ اللہ نے فرمایا ۔ اس مادی جہان میں میری رؤیت ممکن نہیں ۔ نیز فرمایا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) میں نے تمہیں اپنی رسالت اور کلام کے ساتھ لوگوں میں ممتاز فرمایا ہے ، لہٰذا جو چیز میں عطا کروں اس کو لے لو اور میرا شکر ادا کرو ، جس چیز کا موقع اور محل نہیں ہے ، اس کے متعلق سوال نہ کرو ۔ اب آج کے درس میں اللہ جل شانہ نے تورات کی کچھ تفصیل بیان کی ہے اور اس کے متعلق بعض ہدایات دی ہیں ۔

تورات بطور نصیحت

ارشاد ہوتا ہے وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً ہم نے لکھ دی موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت یعنی جو تورات ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو عطا فرمائی وہ نصیحت و موعظت کا مجموعہ تھی پوری تورات تختیوں کی دونوں طرف لکھی ہوئی تھی ۔ باقی رہی یہ بات کہ کل کتنی تختیاں تھیں تھیں ، اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ مفسرین کے مختلف اقوال ہیں ۔

دس یا کم و بیش تختیوں کا ذکر بھی آتا ہے تختیوں کی ساخت کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں کہ یہ لکڑی کی تھیں از مرد کی یا کسی دوسری دھات کے تھے، پتھر وغیرہ کی بنی ہوئی تھیں۔ تاہم اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان تختیوں پہ ہر قسم کی نصیحت کندہ کر دی نصیحت سے وہ باتیں مراد ہیں جن کو سن کر انسان کے عقائد کی اصلاح ہوتی ہے عمل کی قوت بڑھتی ہے اور کوتاہیاں دور ہوتی ہیں۔ نصیحت تمام کتب سماویہ کا موضوع ہے وعظ و نصیحت اعلیٰ درجے کی چیز ہے مگر بعض لوگ اسے محض ثواب کی نیت سے سنتے ہیں کہ کوئی اچھی بات سن لی تو اس سے ثواب حاصل ہو جائے گا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ تو اصلاح کا پروگرام ہے جس پہ عمل کرنے سے ہی انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ وعظ کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں قمع المدارک الظلمانیۃ بانوار المعارف القدسانیۃ (الخیر الکثیر ص) انسان میں علوم کے اعتبار سے جو تاریک باتیں ہوتی ہیں انہیں معرفت کے مقدس انوار کے ساتھ مٹانا۔ انسان کی فکر سے ظلمات کو دور کرنا یہ چاروں آسمانی کتابوں کا موضوع ہے۔ قرآن پاک کے متعلق سورۃ یونس میں موجود ہے "قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت کی بات آچکی ہے تو فرمایا کہ ہم نے تورات میں ہر قسم کی نصیحت لکھ دی۔

ہر چیز کی تفصیل

فرمایا تورات میں ایک تو نصیحت تھی اور دوسری چیز وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہر چیز کی تفصیل بھی موجود ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں قرآن پاک کے متعلق آتا ہے "وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا" یعنی اس میں ہر چیز کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے تفصیل سے مراد ہر قسم کی جزئیات نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے

مطابق لِکُلِّ شَیْءٍ سے حلال حرام اور جائز و ناجائز سے متعلق احکام
ہیں۔ انسانی عقل و تجربہ سے حاصل ہونے والے امور صنعت و حرفت
یا مختلف قسم کے فنون کی تفصیل بیان نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر کوئی
شخص چاہے کہ صابن بنانے کا فارمولا اسے کتاب میں سے مل جائے
تو اس کا مطالبہ درست نہیں ہے۔ یا کوئی شخص خراد کا کام سیکھنا چاہے
اور قرآن پاک کی ورق گردانی کرنے لگے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ انسانی
عقل و ہنر اور محنت و مشقت کا کام ہے جس کے لیے متعلقہ تربیت
ہی حاصل کرنا ہوگی۔ البتہ جو چیزیں عقائد و اعمال سے تعلق رکھتی ہیں اور
اس کے لیے ہی نوع انسان ہدایت الٰہی کے محتاج ہوتے ہیں، ان کی
راہنمائی اللہ کی کتاب سے ضرور ہوگی۔ ایسی ہر چیز کی تفصیل آپ کو میسر آئے گی
اور یہی اس آیت کا مفہوم ہے اور کُلِّ شَیْءٍ سے ایسی ہی چیزیں مراد ہیں۔

اس قسم کی مثال قرآن پاک میں شہد کی مکھیوں سے متعلقہ آیت کریمہ
میں بھی ملتی ہے۔ اللہ نے شہد کی مکھی کو حکم دیا ہے "ثُمَّ کُلِیْ مِنْ
کُلِّ الثَّمَرٰتِ" پھر تم ہر قسم کے پھل کھاؤ تاکہ تمہارے پیٹ میں شہد
تیار ہو۔ اب ہر قسم کے پھلوں سے یہ مراد نہیں کہ دنیا میں جتنے بھی پھل
اور پھول ہیں سب کو کھانا اور ان کا رس چوسنا مکھی کے لیے لازم ہے
بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پھل کھاؤ جو تمہاری فطرت کے ساتھ
مناسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً مکھی کھجور یا انگور یا میٹھے گنے کا رس تو چوس
سکتی ہے مگر اخروٹ یا بادام کو توڑ کر نہیں کھا سکتی۔ اسی طرح بے شمار
ایسے پھل ہیں جن سے شہد کی مکھی مستفید نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ اس کے مناسب حال
نہیں۔ تو اس کے لیے کل سے مراد وہی پھل اور پھول ہوں گے جنہیں
وہ کھا سکتی ہے اور جن کا رس چوس سکتی ہے۔ اسی طرح یہاں کل شیء سے
وہی چیزیں مراد ہیں جن کی انسان کو ضرورت ہے مگر وہ اپنی عقل سے

حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ تورات ایک جامع کتاب تھی۔ اس میں احکام
حدود، مواعظ، تاریخ وغیرہ موجود تھیں جس طرح قرآن پاک میں احکام،
حدود، زواجر، عبادات، اخلاقیات اور معاملات موجود ہیں۔ اسی طرح
تورات میں بھی تھے اور انہی کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ ہم نے تختیوں
پر ہر شے کی تفصیل لکھ دی تھی۔

تمسک بالکتاب

اللہ تعالیٰ نے کتاب کے مندرجات بیان کرنے کے بعد
موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ ان کو مضبوطی سے پکڑ لو۔
یعنی اس میں موجود احکام پر سختی سے عمل کرو اور قوم سے کراؤ۔ مطلب
یہ کہ ان احکام کو دلجمعی سے پکڑیں۔ دل کی محبت اور توجہ کے ساتھ انہیں
سیکھیں سکھائیں اور ان پر عمل کریں۔ اگر ایسا کرو گے تو راسخ ہو جاؤ گے
اور اس کا تمہیں فائدہ ہوگا اور اگر یہ چیز پیدا نہ ہوئی تو کتاب سے تعلق
پختہ نہیں ہوگا، انسانی سوسائٹی میں بھی راسخ نہیں کیا جا سکے گا۔ قرآن پاک
اور دیگر کتب سماویہ کے متعلق بھی یہی حکم ہے۔

فرمایا وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا اے موسیٰ (علیہ السلام)!
اپنی قوم کو حکم دیں کہ وہ اس کتاب کی اچھی باتوں کو لے لیں۔ احسن اسم تفضیل
کا صیغہ ہے کتب سماویہ تو ساری کی ساری احسن ہی ہوتی ہیں، تو پھر صرف
اچھی چیزیں ہی لینے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس میں کوئی ایسی چیزیں بھی ہیں
جو اچھی نہیں ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر احسن کا صیغہ ہی مناسب
حال ہے کیونکہ احکام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض احکام عزیمت سے
تعلق رکھتے ہیں اور بعض کا تعلق رخصت سے ہوتا ہے۔ عزیمت
والے احکام درجہ اول کے احکام ہوتے ہیں اور رخصت دوسرے درجے
میں آتی ہے۔ جب کوئی شخص عزیمت والے احکام پر بوجوہ عمل کرنے
سے قاصر ہوتا ہے تو اسے رخصت کی اجازت ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی

شخص کسی تکلیف کی وجہ سے رمضان المبارک میں روزے نہیں رکھ سکتا تو اُسے افطار کرنے کی رخصت ہے، وہ بعد میں قضا کر لے گا۔ اور اگر بڑھاپے یا لمبی بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنے کی صلاحیت واپس آنے کا امکان نظر نہیں آتا تو ایسا شخص روزے کے بدلے میں فدیہ بھی دے سکتا ہے تو گویا روزہ رکھنا عزیمت کا کام ہے اور قضا کرنا یا فدیہ ادا کر دینا رخصت ہے۔ تو یہاں پر احسن سے مراد یہ ہے کہ عزیمت کے کام کرو۔ بعض فرماتے ہیں کہ جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ احسن ہیں اور جن سے منع کیا گیا ہے وہ غیر احسن ہیں۔ ان سے بچنے کی ضرورت ہے اور احسن امور کو انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

نافرمانوں کا گھر

فرمایا اپنی قوم کو احسن کام کرنے کا حکم دو سَأُرِيكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ میں عنقریب تمہیں فاسقوں کا گھر دکھا دوں گا۔ فاسقوں اور نافرمانوں کے گھر سے جہنم بھی مراد ہو سکتی ہے کیونکہ نافرمان لوگ بالآخر وہیں پہنچیں گے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ دنیا میں فاسقوں کا گھر ذلت اور رسوائی ہے کیونکہ وہ گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں اس لیے وہ ذلیل خوار ہوتے ہیں اور آخرت میں ان کے لیے جہنم تو بہرحال مقرر ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ دار الفاسقین سے مراد وہ سرزمین ہے جس پہ عمالقہ قابض تھے اور پھر اللہ نے وہ سرزمین بنی اسرائیل کو عطا کی یہ وہی فلسطین و شام کا علاقہ ہے جو اللہ نے عمالقہ کے قبضے سے نکال کر بنی اسرائیل کو عطا کیا۔ تو اللہ نے خوشخبری دی کہ بالآخر اس سرزمین پر تمہارا تسلط قائم ہو جائے گا۔

آیاتِ الٰہی سے محرومی

آگے اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات بھی بیان فرمائی ہے سَأَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان لوگوں کو جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں یعنی میری آیات تک مغرور لوگوں کی رسائی نہیں ہو گی اور انہیں وہی

لوگ حاصل کر سکیں گے جن کا عقیدہ اور ایمان درست ہوگا اور جو انہیں اپنا
دستور العمل بنا لیں گے۔ امام سفیان ابن عیینہؒ امام ابو حنیفہؒ کے ہم عصر اور ان
کے شاگرد تھے۔ آپ اپنے زمانے کے بڑے محدث امام ہیں۔ وہ
فرماتے ہیں کہ آیات سے پھیر دینے کا مطلب یہ ہے کہ متکبر لوگ قرآن فہمی
سے عاری ہوں گے۔ ان کو قرآن کی سمجھ ہی نہیں آئے گی۔ امام ابن کثیرؒ
فرماتے ہیں کہ امام ابن عیینہؒ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ کلام تو موسیٰ علیہ السلام
کی کتاب تورات کے ضمن میں ہو رہا ہے مگر تمام آسمانی کتابوں کا یہی حکم
ہے کہ جو لوگ زمین میں ناحق تکبر کریں گے وہ اللہ کی آیات سے مستفید
نہیں ہوں گے۔ جیسے بھی سلف صالحین کا قول ہے لن ینال العلم
حییٌّ ولا مستکبر یعنی شرمانے والا اور تکبر کرنے والا آدمی علم کو نہیں
پا سکتا۔ علم میں شرمانے کی بات روا نہیں ہے علم حاصل کرنے کے لیے سوال
تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر اپنی مشکلات کا اظہار نہیں کرے گا تو علم کیسے حاصل
کرے گا۔ صحیحین کی حدیث میں آتا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ
نے انصار مدینہ کی عورتوں کی تعریف فرمائی ہے نعم نساء الانصار
لم یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین یعنی انصار مدینہ کی
عورتیں بہت اچھی ہیں دین کی سمجھ حاصل کرنے میں ان کو شرم مانع نہیں ہے
جو بات ان کو معلوم نہیں ہوتی وہ بلا تکلف دریافت کر لیتی ہیں۔ حیا ہر
معاملے میں محمود ہے مگر حصول علم کے لیے نامعلوم کے متعلق ضرور
دریافت کر لینا چاہیے۔ سلف کا یہ بھی مقولہ ہے کہ جو شخص ایک گھڑی
بھر سیکھنے کی ذلت برداشت نہیں کرتا یعنی علم حاصل کرنے کے لیے
شاگردی اختیار نہیں کرتا اور استاد سے سوال کرنے سے جھجکتا ہے
وہ ہمیشہ کے لیے جہالت کی ذلت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بزرگان دین
فرماتے ہیں کہ تکبر بہت بڑی بیماری ہے۔ روحانی بیماریوں میں یہ سب سے

شدید ہے اور باقی بیماریوں کے مقابلے میں سب سے آخر میں بڑی محنت کے بعد دور ہوتی ہے۔

بہرحال فرمایا کہ کتب سماویہ کے فہم میں تکبر بہت بڑی رکاوٹ ہے مغرور آدمی کتاب الٰہی کو نہیں سمجھ سکے گا، اسی لیے فرمایا کہ میں اپنی آیات کو ایسے لوگوں سے پھیر دوں گا۔

صحیح راستے کا انتخاب

ارشاد ہوتا ہے کہ اس قسم کے مغرور لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وَاِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا کہ اگر ہر قسم کی نشانی دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ جب بھی نشانی دیکھتے تھے۔ اُسے جادو کہہ کر انکار کر دیتے تھے اور ایمان نہیں لاتے تھے اُن کی طبائع میں بھی غرور تکبر راسخ ہو چکا تھا۔ فرمایا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ اور اگر یہ مغرور لوگ ہدایت کا راستہ دیکھتے ہیں لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا تو اسے راستہ ہی نہیں پکڑتے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو راستہ کتب الٰہی کے ذریعے واضح کرتے ہیں، وہ ہدایت ہی کا راستہ ہوتا ہے مگر ان لوگوں کی ذہنیت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ راستے کو راستہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ فرمایا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ اور اگر وہ گمراہی کے راستے کو دیکھیں يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا تو اُس کو راستہ بناتے ہیں یعنی وہ لوگ عیاشی، فحاشی، برائی، کھیل تماشہ، نام نمود اور رسومات باطلہ کے کاموں کو دیکھتے ہیں تو فوراً اس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔ افراد کے علاوہ موجودہ زمانے کی اکثر حکومتوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی ہدایت کے راستے کو اختیار کرنے کی بجائے گمراہی کے راستے کو پسند کرتے ہیں اور وہ اسی میں اپنا کمال سمجھتے ہیں۔

اللہ نے فرمایا کہ مغرور لوگ ہدایت کی بجائے گمراہی کا راستہ اس لیے پکڑتے ہیں فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا یہ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات

کو جھٹلایا۔ آیات میں صرف معجزات ہی نہیں بلکہ تمام احکام اور شرائع شامل ہیں۔ لہذا احکامِ الٰہی کو جھٹلانے کی وجہ سے یہ لوگ گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ فرمایا اس کی دوسری وجہ یہ ہے وَكَانُوا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ کہ ان لوگوں نے آیاتِ الٰہی سے بالکل غفلت برتی یعنی اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی اپنی آیات تک رسائی ممنوع قرار دیدی تاکہ وہ اس کے فہم تک نہ پہنچ سکیں۔ جب آیات کا فہم نہیں ہوگا تو ان پر عمل کیسے ہو سکے گا۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم انہیں اپنی آیات سے پھیر دیں گے۔

اعمال کا ضیاع

فرمایا وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا۔ نہ تو اس دنیا میں ہمارے احکام و شرائع کو تسلیم کیا اور نہ ہی بعث بعد الموت پر یقین کیا کہ مرنے کے بعد اعمال کی جوابدہی بھی کرنی ہے ان کے متعلق فرمایا حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ان کے اعمال ضائع ہو گئے اول تو انہوں نے نیک اعمال کیے ہی نہیں۔ اور اگر کوئی ہوگا بھی تو وہ ضائع ہو جائے گا۔ اُن کا کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اگر کوئی نیکی کی ہوگی تو رائیگاں جائیگی۔ اعمال کی قبولیت تو جب ہوگی جب ان اعمال کے پیچھے ایمان کی بنیاد موجود ہوگی۔ اگر ایمان ہی نہیں ہے۔ قیامت کے دن اور محاسبے پر یقین ہی نہیں ہے تو نیکی کس کام آئیگی؟ وہ تو ایسا عمل کریں گے جسے اپنی عقل کے مطابق صحیح سمجھیں گے مگر وہ ان کے لیے قطعاً مفید نہیں ہوگا اور بالآخر انہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا۔

فرمایا هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وہ نہیں بدلہ دیئے جائیں گے۔ مگر ان اعمال کا جو وہ انجام دیتے ہیں۔ انہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کیا، آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی، عیاشی اور فحاشی کو معمول

بنائے رکھا، کھیل تماشے میں مصروف رہے، رشد و ہدایت کی باتوں کو قبول نہ کیا، تو پھر انہیں ان اعمال کا بدلہ بھی ایسا ہی ملیگا، انہیں کسی اچھے بدلے کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ڮ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

ترجمہ:- اور بنا لیا موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اُن کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا۔ وہ ایک جسم تھا جس کے لیے گائے کی آواز تھی۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ بیشک وہ نہیں کلام کرتا اُن سے اور نہ اُن کی راہنمائی کرتا ہے۔ انہوں نے اُس کو معبود بنا لیا اور تھے وہ ظلم کرنے والے (۱۴۸) اور جب وہ لوگ نادم

ہوئے اور دیکھا انہوں نے کہ بیشک وہ گمراہ ہو چکے ہیں ،
تو کہنے لگے ، اگر نہیں رحم کریگا ہم پر ہمارا پروردگار اور اگر
ہمیں نہیں بخشے گا تو البتہ ہو جائیں گے ہم نقصان اٹھانے والوں
میں (۱۴۹) اور جب لوٹے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے پاس
غصے میں اور غمزدہ ، تو کہنے لگے ، بہت بری خلافت کی ہے
تم نے میرے بعد ۔ کیا تم نے جلدبازی کی اپنے رب کے حکم
سے ۔ اور ڈال دیا موسیٰ علیہ السلام نے تختیوں کو اور پکڑ لیا اپنے
بھائی کے سر کو ، اس کو اپنی طرف کھینچنے لگے ۔ تو کہا اس نے
اے میری ماں کے بیٹے ، بیشک قوم نے مجھے کمزور خیال کیا اور
قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالتے ، پس نہ خوش کر تو میرے
ساتھ دشمنوں کو اور نہ ٹھہرا تو مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ (۱۵۰)
موسیٰ علیہ السلام نے کہا ، اے پروردگار ! معاف کر دے مجھے اور
میرے بھائی کو اور داخل کر ہمیں اپنی رحمت میں ۔ اور تو
سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے (۱۵۱)

ربطِ آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت اجابت کا ذکر ہو رہا ہے ۔ گذشتہ درس میں
بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل آپ کی راہنمائی میں مصر سے نکلے تھے انہوں نے
بحیرہ قلزم کو پار کیا ۔ دشمن ہلاک ہو چکا تھا صحرائے سینا میں پہنچ کر خود قانون کا مطالبہ کیا ۔
موسیٰ علیہ السلام نے کتاب کے لیے دعا کی تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ کوہ طور پر اعتکاف
بیٹھیں تو مقررہ مدت کے بعد آپ کو کتاب کی صورت میں ہدایت عطا کیا جائے گا ۔
طور پہ چلتے وقت آپ نے اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کیا
تاکہ ان کی عدم موجودگی میں قوم کی قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں ، اعتکاف کی تکمیل پر
موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے اپنی رویت کی خواہش کا اظہار کیا تو

اللہ نے فرمایا کہ اس جہان میں ایسا ممکن نہیں ہے اللہ نے نصیحت فرمائی کہ ایسی خواہش نہ کریں جو ممکن نہیں۔ اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت و نبوت کا جو بلند مقام عطا فرمایا ہے آپ اس پہ اکتفا کریں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

سونے کا بچھڑا

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پہ چلے گئے تو پیچھے قوم کے اکثر لوگ گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنۡ بَعۡدِهٖ مِنۡ حُلِیِّهِمۡ عِجۡلًا اور بنا لیا موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ کے جانے کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا۔ دوسری سورتوں میں تفصیل موجود ہے کہ سامری نامی شخص نے یہ بچھڑا بنایا (اور تفسیری روایتوں میں ہے کہ) پھر اس میں جبرائیل علیہ السلام کے نقش پا کی خاک ڈالی تو کرشمے کے طور پہ وہ بولنے لگا۔ یہ بچھڑا کیا تھا؟ فرمایا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ سونے کو ڈھال کر بنایا گیا ایک جسم تھا جس کے اندر سے گائے کی آواز آتی تھی۔ خوار گائے کی آواز کو کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بچھڑا اپنی مخصوص آواز میں بول رہا ہے جن زیورات کو ڈھال کر بچھڑا بنایا گیا تھا وہ اصلاً بنی اسرائیل کے لوگوں کی ملکیت نہ تھے بلکہ مصر سے چلتے وقت انہوں نے قبطیوں سے عاریتاً حاصل کیے تھے تورات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل نے قبطیوں سے کہا کہ وہ اپنے ایک مذہبی میلہ میں جا رہے ہیں لہذا آپ انہیں کچھ زیورات ادھار دے دیں۔ قبطیوں نے یہ زیورات خوشی سے ان کو دے دیے جنہیں لے کر وہ بحیرہ قلزم سے ہوتے ہوئے صحرائے سینا میں پہنچ گئے۔ فرعونی تو سمندر میں غرق ہو چکے تھے اب یہ زیورات انہی کے قبضے میں تھے لہذا سامری کے کہنے پہ انہوں نے وہ سارے زیورات اکٹھے کیے اور انہیں پگھلا کر ایک بچھڑا بنا لیا جس سے بولنے کی آواز بھی آتی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ بچھڑے کے منہ میں کرشمے والی مٹی ڈالنے سے وہ گوشت پوست

کا بچھڑا بن کر بولنے لگا تھا، مگر زیادہ تر خیال یہی ہے کہ وہ سونے کا بچھڑا تھا۔
تاہم اس سے آواز آتی تھی۔

زیورات کی اہمیت

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ جن زیورات سے بچھڑے کا مجسمہ بنایا گیا تھا، وہ ان کی اپنی ملکیت نہ تھے بلکہ وہ قبطیوں سے عاریۃً لے کر گئے تھے مگر یہاں پہ اللہ نے حُلِیِّهِمْ یعنی ان کے زیورات فرمایا ہے۔ مفسرین اس سے یہ مسئلہ نکالتے ہیں کہ حربی کافروں کا مال مسلمانوں کے لیے مباح ہے اور مسلمانوں کا مال ان کے لیے جائز ہے۔ مالِ غنیمت اور مالِ فے اسی اصول کے تحت جائز قرار پایا ہے۔ جب کوئی کافر قوم مسلمانوں سے برسرِپیکار ہو تو ان کا مال خواہ جنگ کے نتیجے میں حاصل ہو یا بغیر لڑائی کے وہ مسلمانوں کے لیے مباح ہوتا ہے۔ قبطی چونکہ کافر تھے اور بنی اسرائیل پر مظالم بھی ڈھاتے تھے، اس لیے ان سے حاصل کردہ زیورات مسلمانوں کی ملکیت بن چکے تھے اللہ نے اسی لیے حُلِیِّهِمْ کہا ہے۔

سورۂ حشر میں مالِ فے کے متعلق آتا ہے لِلْفُقَرَاءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ یعنی ان فقرا اور مہاجرین کے لیے ہے جنہیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا۔ مکے سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آنے والے سارے فقرا ہی تو نہیں تھے بلکہ ان میں تو صاحبِ مال لوگ بھی تھے، مگر ہجرت کے بعد ان کے مال پر کفارِ مکہ نے قبضہ کر لیا لہٰذا یہ محتاج ہو گئے۔ جب ایک دفعہ یہ مال کفار کے قبضہ میں چلا گیا تو پھر اس پر کافروں کا حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا اور مسلمانوں نے فتح مکہ کے بعد بھی لے واپس نہیں لیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جب حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ کل آپ کہاں ٹھہریں گے۔ سوال کرنے کا مقصد یہ جاننا تھا کہ کیا آپ اپنے چھوڑے ہوئے آبائی مکان میں قیام فرمائیں گے، تو

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی جو ابھی اسلام
نہیں لائے تھے) نے ہمارے لیے کوئی مکان چھوڑا بھی ہے، جہاں ہم
قیام کر سکیں؟ مطلب یہ تھا کہ ہجرت کے بعد آپ کا مکان بھی وہ لوگ
بیچ کر کھا گئے۔ اب وہ ہمارا مکان نہیں رہا۔ غرضیکہ جس طرح حربی کافروں
کی جائیداد مسلمانوں کے لیے مباح ہے، اس طرح مسلمانوں کا مال کافروں
کے لیے مباح ہے۔ چونکہ قبطیوں کے زیورات بنی اسرائیل کے قبضہ
میں آچکے تھے، اس لیے اللہ نے ان زیورات کو انہی کے زیورات
کہا ہے، یعنی وہ ان کے مالک بن چکے تھے۔

بچھڑے کی پرستش

جب سونے کا بچھڑا تیار ہو کر بولنے لگا تو سامری نے بنی اسرائیل کو
ورغلایا کہ دیکھو! خدا تو یہ ہے، اس کی پرستش کرو۔ موسیٰ علیہ السلام تو فضول
کوہ طور پر گئے ہیں، تمہارے لیے یہی معبود کافی ہے۔ چنانچہ بچھڑے کے
سامنے سجدے کرنے لگے اور اس کی نذر و نیاز شروع ہو گئی۔ تو اللہ نے
فرمایا کہ یہ کتنے بیوقوف لوگ ہیں اور کیسی حرکتیں کر رہے ہیں اَلَمْ یَرَوْا
اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ کیا یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بچھڑا تو ان سے بات بھی نہیں
کر سکتا۔ محض ایک بے معنی آواز نکل رہی ہے جس کی وجہ سے اسے الوہیت
کا درجہ دے دیا گیا ہے وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا اور نہ ہی ان کی
راہنمائی کرتا ہے۔ وہ تو بیچارہ خود عاجز ہے۔ یہ کیسے معبود ہو سکتا ہے۔
فرمایا اِتَّخَذُوْهُ انہوں نے اس کو معبود بنا لیا۔ یہ مجسمہ سامری نے
بنایا تھا۔ وہ خود گمراہ تھا اور اس نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ مفسرین کرام
فرماتے ہیں کہ سامری بنی اسرائیل کا فرد نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق سمیری قوم سے
تھا مگر منافقوں کی طرح بنی اسرائیل میں شامل ہو چکا تھا اور انہی میں شمار ہوتا
تھا۔ بعض فرماتے ہیں کہ تھا تو اسرائیلی مگر اس میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ منافق
تھا اور اس کا دل ایمان سے خالی تھا۔ اسی کے ورغلانے پر اسرائیلیوں نے

بچھڑے کو معبود بنا لیا وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ اور وہ بڑے بے انصاف
تھے۔ یہ ان کی غائت درجے کی حماقت تھی کہ خود ساختہ مجسمے کو معبود بنا لیا
محض بے جان ڈھانچے سے آواز نکلتی سُن کر گمراہ ہو گئے اور خدا تعالیٰ کی شان
اور عظمت کو فراموش کر دیا۔ جب انسان کا ذہن خراب ہونے پہ آتا ہے
تو پھر ایسی ہی بیوقوفی کی باتیں کرتا ہے سانپ جیسے موذی کیڑے کی پرستش
کرنے والے ناگ پنچھی بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ انسانوں، پتھروں،
پانی، بلیوں، گائے، بیل، سورج، چاند اور ستاروں کے پرستار بھی موجود
ہیں۔ اسرائیلیوں نے بھی یہی کیا کہ ایک بے جان بچھڑے کی پوجا کرنے
لگے، اسی لیے اللہ نے فرمایا یہ بڑے بے انصاف لوگ تھے جو حق تعالیٰ
کی پرستش کرنے کی بجائے خود ساختہ چیز کے سامنے جھک گئے۔ سورۃ طٰہٰ
میں موجود ہے کہ اللہ کے نبی نے انہیں بڑا سمجھایا مگر انہوں نے آپ کی بات
نہ مانی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سارے اسرائیل اس قباحت میں مبتلا نہیں
ہوئے تھے۔ ان میں اکثر توحید پر قائم رہے تھے تاہم بیس پچیس ہزار کے قریب
ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے بچھڑے کو پوجنا شروع کر دیا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام
واپس آئے اور انہوں نے سمجھایا تو اسرائیلیوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں
نے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کی۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے
توبہ کی قبولیت کے لیے بہت بڑی شرط لگائی اور وہ یہ تھی کہ پوجا نہ کرنے
والے بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں۔ وہاں پہ
"فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" کے الفاظ آتے ہیں پھر انہوں نے ایک
دوسرے کو قتل کیا۔ باپ نے بیٹے کو قتل کیا، بھائی نے بھائی کو مار ڈالا، تو
جب جا کر ان کی توبہ قبول ہوئی "فَتَابَ عَلَيْكُمْ"

قوم کی ندامت

آگے ارشاد ہوتا ہے وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ اور جب
بنی اسرائیل نادم ہوئے سُقِطَ مجہول کا صیغہ ہے اور اس کا لفظی معنی ہے

کہ جب وہ گرائے گئے اپنے ہاتھوں میں مطلب یہ ہے کہ غلط کام کرنے
کی وجہ سے خود اپنی نظروں میں گر گئے۔ جب کوئی آدمی نادم اور پشیمان ہوتا
ہے تو اپنی گردن کو جھکا دیتا ہے یا اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے چباتا ہے
کفِ افسوس ملتا ہے۔ یہی حالت بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی تھی جنہوں
نے بچھڑے کی پوجا کی تھی جب وہ نادم ہوئے وَرَاَوْا اَنَّهُمْ
قَدْ ضَلُّوْا اور انہوں نے دیکھ لیا یعنی سمجھ گئے کہ وہ تو گمراہ ہو چکے ہیں۔
قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا کہنے لگے اگر ہمارا پروردگار
ہم پر رحم نہیں فرمائیگا۔ وَيَغْفِرْ لَنَا اور ہمیں معاف نہیں کرے لَنَكُوْنَنَّ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے۔
اس طرح گویا انہوں نے اپنی جہالت اور گمراہی کا اقرار کیا اور اللہ تعالیٰ سے
معافی مانگی۔

موسیٰ علیہ السلام کی واپسی

اب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طور سے واپسی کا حال بھی بیان فرمایا
ہے۔ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا
اور جب واپس آئے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غصے میں اور غمزدہ۔
اسف کو غضبان کی صفت بنایا جائے تو معنی ہوگا شدید غصے میں کیونکہ غضبان
صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور اسفاً غم سے بھرے ہوئے یعنی سخت غمزدہ۔
موسیٰ علیہ السلام کو سخت افسوس اور غم ہوا کہ دیکھو چند دن کی بات تھی میں اپنے
پیچھے نائب بھی چھوڑ کر گیا تھا مگر یہ لوگ پھر بھی شرک سے باز نہ آئے۔ آپ
نے نہایت افسوس کا اظہار کیا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْ بَعْدِيْ
فرمایا میرے بعد تم نے میری نیابت بہت برے طریقے سے انجام دی
اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ کیا تم نے جلد بازی کی اپنے رب کے حکم سے
اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ تھا کہ چالیس رات کا اعتکاف بیٹھو تو تمہیں کتاب
دوں گا مگر تم نے اتنے دن تک بھی انتظار نہ کیا اور بچھڑے کو معبود بنا لیا۔

موسیٰ علیہ السلام نے غصے سے وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ تورات کی تختیاں پھینک دیں وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔ آپ نے غصے سے بے قابو ہو کر تختیاں بھی پھینک دیں اور سرزنش کے طور پر بھائی کے سر کو پکڑ کر کھینچا۔ یہ دونوں کام اللہ کے نبی نے کیے جو کہ بظاہر نامناسب معلوم ہوتے ہیں۔ بعض کام گناہ معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ گناہ نہیں ہوتے۔ اللہ کا نبی قوم کی طرف سے شرک کے ارتکاب پر بے قابو ہو گیا جس کی وجہ سے اُن سے یہ دونوں کام سرزد ہوئے۔ آپ نے اپنے بھائی کی توہین کی نیت سے ایسا نہیں کیا، تاہم چونکہ آپ کی طبیعت جلالی تھی، ہارون علیہ السلام امور نبوت میں آپ کے وزیر تھے، اس لیے انہوں نے آپ کی موجودگی میں شرک کے ارتکاب پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ مطلب یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کا مقصد بھائی کو تقصیر پر تنبیہ کرنا تھا۔ اُن کی توہین مقصود نہ تھی۔

بعض فرماتے ہیں کہ قوم کی گمراہی کی خبر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر ہی دے دی تھی کہ اس طرح سامری نے قوم کو شرک میں ملوث کر دیا ہے۔ اُس وقت تختیاں بھی آپ کے پاس تھیں مگر وہاں آپ کو اتنا غصہ نہیں آیا کہ تختیاں وہیں پھینک دیتے۔ مسند احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ یعنی سننے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں برابر نہیں ہیں۔ فارسی والے بھی کہتے ہیں۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" بہرحال وہاں تو آپ کو اتنا غصہ نہیں آیا مگر جب واپس آ کر دیکھا کہ قوم بچھڑے کے گرد جمع ہے تو پھر آپ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ آپ نے تختیاں پھینک دیں اور بھائی کو بھی سخت سرزنش کی۔

ہارون علیہ السلام متحمل مزاج تھے۔ اپنے بھائی کی طرف سے سختی کا

ہارون علیہ السلام کی سرزنش

ہارون علیہ السلام کی وضاحت

جواب اس طرح دیا قَالَ ابْنَ اُمَّ کہا اے میری ماں کے بیٹے۔ آپ نے
برادرانہ محبت و شفقت کے ساتھ نہایت نرمی سے خطاب کیا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سگے بھائی تھے۔ آپ کی
والدہ کا نام یوخابذ یا یوخانذ تھا۔ آپ بڑی ایماندار خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ
نے قرآن پاک میں ان کی تعریف بیان کی ہے۔ تو آپ نے نہایت ترحم
کے لہجے میں کہا، اے میری ماں زادے! میں نے قوم کو تبلیغ کرنے میں
کوئی کوتاہی نہیں کی بلکہ حتی الامکان ان کو شرک سے باز رکھنے کی کوشش
کی ہے۔ مگر بات یہ ہے اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ میری قوم
نے مجھے کمزور خیال کیا اور میری بات نہ مانی۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ حضرت
ہارون علیہ السلام نے کہا اے لوگو! خدا کا خوف کھاؤ، تم کس گندگی میں مبتلا
ہو گئے ہو، میری بات سنو۔ پروردگار تو وہی رحمان ورحیم ہے، تم کس
کو معبود بنائے ہو؟ کچھ غور وفکر کرو، مگر قوم نے ایک نہ سنی۔ وَکَادُوْا
یَقْتُلُوْنَنِیْ اور قریب تھا کہ وہ مجھے جان سے مار ڈالتے۔ میں نے اپنی
طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ یہ سب کچھ ان کا اپنا کیا دھرا ہے۔ دوسری
جگہ موجود ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھائی سے کہا کہ جب تم نے دیکھا کہ یہ
شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں تو آپ ان سے علیحدگی اختیار کر لیتے، تو ہارون علیہ السلام
نے جواب دیا کہ میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ واپس آکر آپ یوں
نہ کہہ دیں "فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ" ظالم کہ تم نے بنی اسرائیل
میں تفریق ڈال دی تھی۔ ان کی دو پارٹیاں بنادی ہیں فرمایا میں نے اس
مصلحت کے تحت مخلص اہل ایمان کو شرک کرنے والوں سے علیحدہ نہیں کیا۔

ہارون علیہ السلام نے مزید عرض کیا فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ
مجھے سرزنش کرکے تو دشمنوں کو خوش نہ کر۔ لوگ دیکھیں گے تو عجب جگ ہنسائی ہو
گی کہ دونوں بھائی لڑ پڑے ہیں۔ آپ ایسی بات نہ کریں، قوم کی گمراہی میں

مجھے مورد الزام نہ ٹھہرائیں وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ اور مجھے ظالموں میں شامل نہ کریں۔ اگر میں نے کوئی تقصیر کی ہوتی تو ان کے ساتھ شامل ہو جاتا مگر اس معاملے میں ان کا ہرگز ساتھی نہیں رہا ہوں، میں نے تو تبلیغ کا پورا پورا حق ادا کر دیا مگر انہوں نے مجھے کمزور خیال کیا اور مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دیں، سارا قصور انہی کا ہے، میں اس معاملے میں بے قصور ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام کی دعا

جب موسیٰ علیہ السلام کی تسلی ہو گئی کہ قوم کی گمراہی میں ہارون علیہ السلام کا کسی طرح بھی قصور نہیں ہے تو آپ نے فوراً اللہ رب العزت کی طرف رجوع کیا۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِي عرض کیا اے پروردگار! مجھے معاف کر دے وَلِاَخِيْ اور میرے بھائی کو بھی معاف فرمانے میں جان گیا ہوں کہ اس نے قصداً کوئی کوتاہی نہیں کی لہٰذا اُسے بھی معاف کر دے۔ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر لے وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ کا نبی شرک کے معاملہ میں کتنا حساس ہوتا ہے اُسے کفر اور شرک سے کس قدر نفرت ہوتی ہے، یہ معاملہ پیش آیا تو موسیٰ علیہ السلام برداشت نہ کر سکے۔ تورات کی تختیاں پھینک دیں اور بھائی کو سرزنش کی، جب معاملہ صاف ہو گیا تو اپنے لیے اور بھائی کے لیے اللہ سے معافی کی درخواست کی۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿١٥٤﴾

ترجمہ :- بیشک وہ لوگ جنہوں نے بنا لیا بچھڑے کو معبود یقیناً پہنچے گا اُن کو غضب اُن کے رب کی طرف سے اور ذلّت دنیا کی زندگی میں ۔ اور اسی طریقے سے ہم سزا دیتے ہیں افترا کرنے والوں کو (۱۵۲) اور وہ لوگ جنہوں نے بُرے کام کیے پھر توبہ کی انہوں نے اُس کے بعد اور ایمان لائے ، بیشک تیرا پروردگار اُس کے بعد البتہ بخشش کرنے والا اور مہربان ہے (۱۵۳) اور جب تھم گیا موسیٰ علیہ السلام سے غصہ تو پکڑ لیں انہوں نے تختیوں کو اور اِن تختیوں میں لکھی ہوئی تھی ہدایت اور رحمت اُن لوگوں کے لیے جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں (۱۵۴)

سورۃ الاعراف پر ایک نظر

یہ سورۃ الاعراف ہے اس کی ابتداء میں قرآن کریم کی طرف دعوت دی گئی ۔ اس کے بعد آدم علیہ السلام اور خلافت ارضی کا ذکر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء

کی تاریخ بیان فرمائی ہے۔ اس ضمن میں انبیاء کی دعوت، طریقہ تبلیغ، اُن کی قوموں کا جواب اور پھر اُن کا انجام بھی بیان فرمایا ہے۔ گزشتہ چند رکوعات سے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اللہ نے دو انبیاء کی بعثت کا ذکر فرمایا وہ خدا کا پیغام لیکر فرعون اور اسکی قوم کے پاس گئے، قوم سخت بدسلوکی سے پیش آئی اور اللہ کے نبیوں کو طرح طرح کی تکالیف دیں اور آخر کار فرعون اور اسکی قوم کی سزا کا وقت بھی آگیا۔ اللہ کی گرفت آئی اور خود فرعون اور اسکے لشکری بحیرۂ قلزم میں غرق ہوگئے اور موسیٰ علیہ السلام اور آپکی قوم بنی اسرائیل دریا کو عبور کرکے صحرائے سینا میں پہنچ گئے۔ جب انہیں فرعون کے مظالم سے نجات حاصل ہوگئی اور وہ آزاد فضا میں سانس لینے لگے تو موسیٰ علیہ السلام سے خود مطالبہ کیا کہ ان کے لیے قانون کی کتاب ہونی چاہیئے۔ جس پر وہ عمل کر سکیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تو حکم ہوا کہ کوہ طور پہ آکر چالیس دن اعتکاف بیٹھو۔ اس دوران عبادت ریاضت میں مشغول رہو تو اس کے بعد کتاب عطا کی جائے گی۔ جب الحکم موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنایا اور خود طور پر تشریف لے گئے۔

اسرائیلیوں کے پاس وہ زیورات موجود تھے جو انہوں نے مصر سے چلتے وقت فرعونیوں سے عاریتاً حاصل کیے تھے۔ سامری نے وہ زیورات حاصل کیے۔ انہیں ڈھال کر سونے کا بچھڑا بنایا اور پھر اس کے منہ میں جبرائیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدموں کی مٹی ڈالی تو بچھڑا بولنے لگا۔ سامری نے بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام تو خواہ مخواہ طور پہ گئے ہیں۔ خدا تو یہ ہے۔ چنانچہ اسرائیلیوں کی ایک معتدبہ تعداد نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور اس کی پوجا کرنے لگے ادھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی خبر دے دی کہ آپ کی قوم فتنے میں مبتلا ہو چکی ہے۔ چنانچہ جب آپ واپس آئے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگ بچھڑے کے گرد جمع ہوکر اس کی پوجا کر رہے ہیں۔ آپ کو سخت غصہ آیا اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو سر کے بالوں سے

پکڑ کر گھسیٹا کہ تیری موجودگی میں قوم کیسے گمراہ ہو گئی۔ انہوں نے بھائی کو قصوروار سمجھا مگر ہارون علیہ السلام نے وضاحت کی کہ اس معاملہ میں ان کا کچھ قصور نہیں، قوم ہی ان کے قتل کے درپے ہو گئی تھی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ میں نے ان کو خوب اچھی طرح سے سمجھایا تھا مگر انہوں نے میری بات نہ مانی۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کا عذر قبول کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کوتاہی کی معافی مانگی کہ مولا کریم مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر لے۔ کہ تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ابھی مزید چل رہا ہے۔ اس کے بعد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ اور اسلام کی دعوتِ عامہ کا ذکر ہے۔ پھر آخر میں قرآن حکیم کے متعلق ذکر ہے غرضیکہ اس سورۃ مبارک میں کئی اہم مضامین بیان ہوئے ہیں۔

انسان کی انتہائی پستی

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام تو اللہ کے پاک نبی تھے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے لغزش کی معافی بھی طلب کر لی۔ اب اللہ تعالیٰ نے باقی قوم کا حال بیان فرمایا ہے جو بچھڑے کی پوجا میں ملوث ہو گئی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ بیشک وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا۔ انسان کی ذہنی پستی ملاحظہ کریں کہ سونے سے بنے ہوئے بچھڑے میں ذرا سا کرشمہ دیکھا تو فوراً اس کی پوجا شروع کر دی انسان جب ماننے پر آجاتا ہے تو حقیر سے حقیر چیز کو الٰہ بنا لیتا ہے دیکھ لیں ناگ پنچمی والے ہندو سانپ کی پوجا کرتے ہیں۔ گائے کی پوجا کرنے والے کتنے لوگ موجود ہیں۔ نہ صرف گائے بلکہ اس کے گوبر اور پیشاب کو بھی پوتر (پاک) تصور کرتے ہیں۔ کوئی چیز برتن وغیرہ ناپاک ہو جائے تو اسے گائے کے پیشاب سے پاک کرتے ہیں مگر یہی حضرت انسان جب انکار کرنے

پیدا ہوتا ہے تو اللہ وحدہٗ لاشریک کی توحید کا انکار کر دیتا ہے۔ اس کی بھیجی ہوئی کتابوں کو تسلیم نہیں کرتا حتی کہ اس کے مقدس پیغمبروں کو پتھر مار کر ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ انسان کی ذہنی پستی کی انتہا ہے۔

دنیا میں ذلت

فرمایا جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ عنقریب انہیں ان کے رب کی طرف سے غضب پہنچے گا۔ اللہ کے نبی ان میں موجود ہیں اور سمجھا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو قبول کر لو اور بچھڑے کی پوجا چھوڑ دو ورنہ عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہاں پر غضب سے مراد عذاب ہے۔ فرمایا ایک تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں عذاب ہو گا وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا اور دوسرے انہیں دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی اٹھانا پڑے گی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ بچھڑے کے پجاریوں کی توبہ اس شرط کے ساتھ قبول ہوئی تھی کہ نہ پوجنے والے پوجنے والوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں چنانچہ ایسا ہی ہوا، ان کے اس قتل کو ہی ذلت شمار کیا گیا ہے جو انہیں اسی دنیا میں حاصل ہوئی۔ جو لوگ اس طریقے سے قتل ہو گئے اللہ نے ان کی توبہ قبول فرما لی اور وہ آخرت کے مواخذہ سے بچ گئے اور جنہوں نے اس طریقے سے توبہ نہ کی ان کے متعلق فرمایا کہ وہ عنقریب آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

اور پھر سزا کے ذکر کے ساتھ اللہ نے یہ بھی فرمایا وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ہم افترا باندھنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ظاہر ہے کہ جس نے شرک کا ارتکاب کیا اس نے گویا اللہ پر افتراء باندھا۔ اور اس قسم کے مفتریوں کے لیے سزا بھی ایسی ہی مقرر ہے۔

مرتد کی سزا

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس جملے سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ مرتد کے لیے موت کی سزا مقرر ہے۔ بچھڑے کے پجاری جلی شرک

میں مبتلا ہو گئے انہوں نے عاقل بالغ ہو کر دین حق کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا تھا لہذا اللہ نے ان کے لیے قتل کیے جانے کی سزا مقرر کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی بھی ہے مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ جس نے اپنا دین تبدیل کر لیا اس کو قتل کر دو۔ البتہ سزائے موت پر عملدرآمد سے پہلے استتابہ ضروری ہے اگر اس کے ذہن میں دین اسلام کے متعلق کوئی شک شبہ پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر مرتد ہوا تو پھر اس کے شکوک رفع کرنے کا بندوبست کیا جائیگا۔ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اس کام کے لیے علماء کرام کی خدمات حاصل کی جائیں اور مرتد شخص کی ہر طرح سے تسلی کی جائے۔ اگر پھر بھی وہ اپنے دین پر واپس نہیں آتا تو اس کی سزائے موت پر عملدرآمد کر دیا جائیگا۔ ایسا شخص باغی تصور ہوتا ہے اور باغی کی سزا آج کی دنیا میں بھی یہی ہے۔ روسی قانون میں باغی کی سزا واضح طور پر موت ہے بیریا پچیس سال تک پولیس کمشنری کے عہدے پر فائز رہا مگر بعد میں غداری کا مقدمہ بنا اور اسے سزائے موت ہوئی ارتداد دین کے ساتھ کھلی بغاوت ہے لہذا ایسا شخص واجب القتل ہے

توبہ کی قبولیت

اللہ تعالیٰ نے جہاں بڑے بڑے جرائم کے لیے سخت سزائیں رکھی ہیں وہاں اس کی رحمت بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے اور بغاوت سے نادم ہونے والے کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ وہ لوگ جنہوں نے برے کام کیے ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا پھر اس کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور ایمان لائے۔ فرمایا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بیشک تیرا پروردگار اس کے بعد البتہ بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اس بات کی وضاحت فرما دی ہے کہ جرم کتنا ہی سنگین ہو حتیٰ کہ کفر اور شرک کے ارتکاب کے بعد بھی اگر کوئی شخص تائب

ہو جائے اور مرنے سے پہلے پہلے اللہ کے حضور گڑگڑا کر معافی مانگ
لے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں تابوا کے ساتھ
وَاَصۡلَحُوۡا کا لفظ بھی آتا ہے یعنی انہوں نے معافی مانگنے کے ساتھ
ساتھ اپنی اصلاح بھی کر لی۔ گویا ایسی سچی توبہ کی کہ پھر اس جرم کے کبھی قریب
نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

البتہ ایک بات یاد رہے کہ حقوق العباد توبہ سے بھی معاف نہیں
ہوتے اگر کسی کا حق غصب کیا ہے، کسی کو ایذا پہنچائی ہے تو جب تک متعلقہ
شخص معاف نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ بھی ایسے جرم کو نہیں بخشے گا۔ حقوق اللہ
توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں مگر حقوق العباد کے لیے اس کے پاس
جانا ہوگا جس کا حق ضائع ہوا ہے۔ اگر اس دنیا میں کسی کا غصب شدہ حق
واپس نہیں کیا تو آخرت میں لازماً ادا کرنا پڑے گا، مگر وہاں مال تو نہیں
ہوگا، لہٰذا اس حق کے بدلے میں نیکیاں دینا ہوں گی اور اگر کسی غاصب
کے پاس نیکیاں بھی نہ ہوں گی تو حقدار کی برائیاں غاصب کے سر پہ ڈال دی
جائیں گی۔ مقصد یہ کہ حقوق العباد کا مؤاخذہ لازمی ہے لہٰذا اس کی تلافی اسی دنیا
میں کر دینی چاہیے۔

تختیوں کی شکستگی

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ قوم کو شرک میں مبتلا دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام
کو سخت غصہ آیا اور آپ نے تورات کی تختیاں بھی ہاتھ سے پھینک دیں
اور اپنے بھائی کی سرزنش کی۔ جب ہارون علیہ السلام نے معذرت کی تو پھر
آپ نے اپنے لیے اور اپنے بھائی کے لیے اللہ رب العزت سے
معافی کی درخواست کی۔ اب اسی بات کو آگے چلایا گیا ہے۔ وَلَمَّا
سَکَتَ عَنۡ مُّوۡسَی الۡغَضَبُ جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ختم ہو گیا
اَخَذَ الۡاَلۡوَاحَ تو آپ نے تورات کی تختیاں اٹھا لیں۔ مسند احمد، طبرانی
اور مستدرک حاکم میں یہ روایت موجود ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے غصے میں

اگر تختیاں زمین پر ڈال دی تھیں تو اس وقت اُن میں سے کوئی تختی ٹوٹ
بھی گئی تھی لیکن بالکل چُورا چُورا نہیں ہوئی تھی کہ اُس کے مندرجات پڑھے
ہی نہ جا سکیں۔ بعض اوقات اس قسم کی چیز اگر دو ٹکڑے بھی ہو جائے تو
اُن ٹکڑوں کو جوڑ کر اُس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی جا سکتی ہے۔ تورات
میں تختی کے بالکل چورا چورا ہو جانے کا ذکر ہے جو کہ درست نہیں۔ اس
آیت سے بھی واضح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پھینکی ہوئی وہ تختیاں دوبارہ
اٹھا لیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی تختی بالکل ناکارہ نہیں
ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ معمولی ٹھیس آئی ہو، کانچ کی طرح ٹوٹ کر بالکل ریزہ
ریزہ نہیں ہوئی تھی۔

ہدایت کی ضرورت

اب آگے اللہ تعالیٰ نے تختیوں کے متن کے متعلق فرمایا ہے۔
وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ اور ان تختیوں پر جو چیز لکھی ہوئی
تھی وہ ہدایت اور رحمت تھی۔ گزشتہ سے پیوستہ رکوع میں یہ بھی گزر چکا ہے
وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً
وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی ان تختیوں میں ہم نے ہر قسم کی نصیحت
اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی تھی۔ تمام ضروری باتیں جن کی قوم کو ضرورت تھی
وہ اس میں لکھ دی گئی تھیں فرمایا اس میں ایک چیز تو ہدایت تھی۔ سورۃ مائدہ
میں موجود ہے "ہم نے تورات نازل کی فِيهَا هُدًى وَّنُورٌ جس
میں ہدایت اور روشنی تھی" اسی طرح قرآن پاک کے متعلق اللہ نے فرمایا أَنْزَلْنَا
إِلَيْكَ نُورًا مُّبِينًا ہم نے قرآن کی شکل میں آپ کی طرف واضح روشنی
نازل کی ہے۔ اللہ نے تورات، انجیل اور قرآن پاک کو بھی نور فرمایا ہے
مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ بینات اور ہدایت میں تھوڑا سا فرق ہے
بینات ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو معمولی توجہ سے بھی انسان کی سمجھ میں آجاتی
ہیں۔ مثلاً توحید، صبر، ذکر، شکر، خدا تعالیٰ کی عبادت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو

آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اور ہدایت وہ چیز ہے جو خود بخود معمولی طریقے سے ذہن نشین نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے استاذ سے سیکھنا پڑتا ہے جیسے تعظیم شعائر اللہ اور دیگر باریک باتیں۔ اس جہان میں انسان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہدایت ہے اور اس کا اولین ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ہدایت کے حصول کے لیے تلقین فرمائی ہے "فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" اگر کسی چیز کو تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے دریافت کر لیا کرو۔ وہ تمہیں سمجھا دیں گے۔ ہدایت کا سلسلہ اسی طرح چلتا ہے کہ اللہ کا نبی وحی الٰہی کے ذریعے حاصل کر کے امت تک پہنچاتا ہے اور امت کے اہل علم آگے آنے والی نسلوں تک پہنچاتے ہیں اور اس طرح یہ چیز نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ہدایت اتنی ضروری چیز ہے جسے ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں طلب کرتے ہیں "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اے مولا کریم ہمیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت نصیب فرما۔ معلوم ہوا کہ عبادات ہوں یا معاملات، سیاسیات ہوں یا معاشیات یا اخلاقیات ہر معاملے میں انسان ہدایت کا محتاج ہے۔ اپنے اپنے دور میں زبور، تورات اور انجیل ذریعہ ہدایت تھیں۔ اسی لیے فرمایا کہ تورات میں ہدایت تھی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ" تم میں سے ہر شخص بھٹکا ہوا ہے مگر جسے اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے لہٰذا ہدایت ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنی چاہیئے۔

رحمت الٰہی کا نزول

جب کوئی شخص ہدایت الٰہی حاصل کر کے اس کے اصولوں کے مطابق عمل کرتا ہے تو پھر اس کے نتیجے میں رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسے شخص کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ اللہ کی مہربانی اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ بہرحال فرمایا کہ تورات کی تختیوں میں جو

چیز لکھی ہوئی تھی وہ ہدایت اور رحمت تھی مگر کن لوگوں کے لیے؟ لِلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ اُن کے لیے جو اپنے رب تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ہدایت پر وہی شخص عمل پیرا ہو سکتا ہے جس میں خوفِ خدا موجود ہوگا ۔ جو شخص اس چیز سے عاری ہے ، وہ ہدایت پر عمل نہیں کریگا اور نہ ہی اس کے حق میں رحمتِ الٰہی کا نزول ہوگا سورۃ البقرۃ کی ابتدا میں "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کا یہی مطلب ہے ۔ قرآن پاک سراپا ہدایت ہے مگر متقین کے لیے ۔ جن لوگوں میں تقویٰ اور خوفِ خدا ہوگا اس ہدایت ربانی سے وہی فائدہ اٹھا سکیں گے ۔ جو اس کی طرف توجہ ہی نہیں کریگا اسے کیا فائدہ پہنچے گا ؟ تو یہاں پر تورات کے متعلق بھی فرمایا کہ اس میں ہدایت اور رحمت لکھی ہوئی ہے مگر اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکیں گے جن کے دل میں خوفِ خدا جاگزیں ہوگا ۔

قرآن پاک کی واضح ہدایت ہے مگر اس سے اعراض کرنے والے اس سے محروم ہیں ۔ جو اس کی طرف توجہ ہی نہیں کریگا وہ سمجھے گا کیسے اور اس پر عمل کیسے کریگا ؟ اور ہدایت سے محرومی کی یہی وجہ ہے ۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن پاک منافقوں کے لیے نجاست میں اضافہ کرتا ہے ، وہ لوگ یا تو شک میں مبتلا ہوتے ہیں یا بالکل انکار ہی کر دیتے ہیں لہٰذا عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عقیدے کی نجاست میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ بہر حال فرمایا کہ تورات میں ہدایت اور رحمت ہے مگر رب تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے ۔

وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

ترجمہ:۔ اور منتخب کیے موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے وعدے کے وقت پر لانے کے لیے۔ پس جب پکڑا اُن کو زلزلے نے تو کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اے پروردگار۔ اگر تو چاہتا تو ان کو ہلاک کر دیتا اس سے پہلے ہی اور مجھے بھی۔ کیا تو ہلاک کرتا ہے ہمیں اس چیز کے ساتھ جو کی ہے ہم میں سے بعض بیوقوفوں نے۔ نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش۔ تو گمراہ کرتا ہے اس کے ساتھ جس کو چاہے اور تو راست دکھاتا ہے جس کو چاہے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے پس بخش دے ہمیں اور رحم فرما ہم پر۔ اور تو سب سے بہتر بخشش کرنے والا ہے ﴿۱۵۵﴾

ربطِ آیات: گذشتہ آیات میں اُن لوگوں کا بیان تھا جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تعلق رکھتے تھے مگر بچھڑے کی پوجا میں ملوث ہو گئے۔ تب اللہ نے انہیں اُسی وقت آگاہ

کر دیا تھا کہ انہیں خدا تعالیٰ کا غضب پہنچنے والا ہے اور یہ کہ انہیں دنیا کی زندگی میں بھی ذلت کا سامنا ہو گا۔ یہ کیا کم ذلت تھی کہ انہیں اپنے ہی عزیزوں کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ ان کی توبہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں۔ اللہ نے فرمایا، ہم افتراء کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ امام سفیان ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ کل صاحب بدعۃ ذلیل یعنی ہر بدعتی شخص ذلیل ہے جو دین میں نئی بات ایجاد کرتا ہے، وہ اچھا آدمی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ تھم گیا تو انہوں نے تورات کی تختیاں اٹھالیں ان میں ہدایت بھی ہوئی تھی جس پر عملدرآمد کا نتیجہ رحمتِ الٰہی کی صورت میں برآمد ہوتا۔

غضبِ الٰہی کے متعلق گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ کی ناراضگی مخلوق کی ناراضگی کی طرح نہیں ہوتی جس سے جذبہ انتقام کو ٹھنڈا کرنا مقصود ہو۔ بلکہ اس غضب کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق نے جو عمل اس دنیا میں انجام دیا ہے، اُس کا طبعی نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آجائے چونکہ بُرے آدمی کے عقائد، اعمال اور اخلاق ناپسندیدہ ہوتے ہیں اس لیے اُس کے اعمال کا نتیجہ بھی خراب ہی نکلتا ہے اور اسی پر غضب کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

ملکیت اور بہیمیت

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ملکیت اور بہیمیت دو ایسی چیزیں رکھی ہیں جو اس سے کسی وقت بھی علیحدہ نہیں ہوتیں۔ البتہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ ایسے افعال انجام دو جن سے ملکیت میں اضافہ ہوتا ہے اور بہیمیت مغلوب ہے۔ اس کے برخلاف اگر بہیمیت کو غلبہ حاصل ہو گیا تو انسان ناکام ہو جائے گا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی رُوح کے دو رُخ ہیں، ایک عالمِ بالا یا حظیرۃ القدس کی طرف اور دوسرا اس مادی جہان (PHYSICAL WORLD) کی طرف۔ عالمِ بالا سے آنیوالی اچھائی کی تمام باتیں اُس رُخ سے انسان میں داخل ہوتی

لہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۷ (فیاض)

ہیں، جو عالمِ بالا کی طرف ہے اس کی مثال روشندان کی سی ہے جس کے ذریعے روشنی اندر داخل ہوتی ہے اسی رُخ کو ملکیت سے تعبیر کیا گیا ہے انسان کی روح کا دوسرا رُخ جو اس مادی جہان کی طرف ہے وہ بہیمیت کہلاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص طہارتؔ پاکیزگی والے امور انجام دیتا ہے، اللہ کے سامنے اخباتؔ یعنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے خسیس اغراض سے علیحدہ رہتا ہے اور عدل و انصاف کو قائم کرتا ہے تو اس کے باطن میں موجود ملکیت کو بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے اور انسان کا مزاج بالکل درست رہتا ہے اس کے برخلاف اگر کسی شخص نے اس دُنیا میں نجاست اور گندگی والے امور انجام دیئے، کفر و شرک کی دلدل میں پھنس گیا، بدعات میں ملوث ہوگیا، ظلم و زیادتی اور حق تلفی کا مرتکب ہوا، تو اس سے اس کی بہیمیت میں اضافہ ہوگا اور اس کا مزاج بگڑ جائیگا۔ پھر جب جزائے عمل کا وقت آئے گا تو ایسا شخص ناکام ہو جائے گا۔ اسی چیز کو اللہ کے غضب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

شاہ صاحبؒ انسانی مزاج کی مثال گدا من خور جانور کے ساتھ دیتے ہیں حلال جانور جب تک گھاس چرتا رہے گا، اس کا مزاج درست رہیگا۔ اور اگر یہی جانور گائے بکری وغیرہ گوشت کھانے لگے تو اس کا مزاج بگڑ جائے گا .... اور اس کے گوشت سے بو آنے لگے گی جس کی وجہ سے وہ کھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اسی طرح جلالہ (گندگی کھانے والا) جانور کے گندگی کھانے کی وجہ سے اس کے گوشت سے بدبو آنے لگتی ہے اور اس کا گوشت کھانا جائز نہیں رہتا، وجہ وہی ہے کہ اس نے اپنی فطرت کے خلاف کام کیا جس کی وجہ سے اس کا مزاج بگڑ گیا۔ اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جلالہ جانور اگر کاٹنا ہے تو اس کو دس دن تک باندھ کر رکھو، اسے پاکیزہ چارہ کھلاؤ اور اس کے

بعد ذبح کرو پھر اس کا گوشت صحیح ہوگا۔ اور اگر کوئی مرغی گندگی کھاتی ہے تو اس کو کم از کم تین دن تک گھر میں بند رکھو اور پھر اس کے بعد ذبح کرو۔ اس عمل کے بغیر جلالہ جانور کا گوشت کھانا مکروہ تحریمی میں داخل ہے۔

ستر آدمیوں کا انتخاب

گزشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام تورات لیکر پہاڑ سے واپس آئے تو قوم کو شرک میں مبتلا پایا۔ آپ نے غصے سے تورات کی تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی سرزنش بھی کی، پھر بھائی کی وضاحت پر آپ کا غصہ فرو ہوا تو آپ نے تورات کی تختیاں دوبارہ اٹھالیں جس میں ہدایت اور رحمت لکھی ہوئی تھی۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے وہ تورات قوم پر پیش کی اور اس پر عملدرآمد کا حکم دیا مگر قوم اس پر تیار نہ ہوئی۔ آج کے درس میں ان ستر آدمیوں کا ذکر کیا جنہیں آپ طور پر لے گئے تھے۔ اور پھر وہاں پر وہ ہلاک ہو گئے۔ اس ضمن میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر بھی ہے

ارشاد ہوتا ہے وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا اور انتخاب کیا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے ستر آدمیوں کا ہمارے وعدے کے وقت پر لانے کا۔ یہاں پر قَوْمَهُ سے پہلے لفظ مِنْ محذوف ہے۔ اور مطلب یہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل میں سے ہی ستر آدمیوں کا انتخاب کیا۔ بنی اسرائیل کے کل بارہ قبائل تھے اور یہ ستر آدمی انہی میں سے چھ چھ آدمی تھے۔ لِمِيقَاتِنَا کا مطلب یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے مقررہ وقت پر ان آدمیوں کو لانے کا حکم دیا تھا۔

ستر آدمیوں کے انتخاب کے متعلق مفسرین کی مختلف توجیہات ہیں بعض فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی اپنی فرمائش پر جب اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمائی اور موسیٰ علیہ السلام نے اسے قوم پر پیش کیا اور اس کے احکام پر عملدرآمد کا حکم دیا، تو وہ بگڑ گئے۔ انہوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے شروع کر دیے۔ کہنے لگے کہ اس کتاب کے احکام تو بہت مشکل ہیں، ہم سے

ان پر عمل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کتاب کے احکام الٰہی ہونے پر شبہ کا اظہار کیا کہنے لگے پتہ نہیں کہ واقعی یہ اللہ کا کلام ہے یا موسیٰ علیہ السلام خود بنا کر سے آئے ہیں۔ امام سفیان ثوریؒ نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے جس کے مطابق لوگوں نے کہا کہ ہم سے تورات پر عمل نہیں ہوتا بلکہ ہمارا اس پر یقین ہی نہیں ہے سورۃ بقرہ اور دوسرے مقامات میں موجود ہے کہ اس قوم کا مزاج ہی ایسا تھا، اس وجہ سے یہ قوم لعنت کی مستحق ٹھہری اب دیکھیں کہ اللہ کے نبی سے خود ہی کتاب کا مطالبہ کیا، اس پر اعتماد کیا مگر جب کتاب آگئی تو بے اعتمادی کا اظہار کیا اور اس کے منزل من اللہ ہونے پر ہی شبہ کا اظہار کر دیا۔ نیز موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود آپ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا دوسری جگہ موجود ہے کہ انہوں نے تورات سن کر کہا "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" یعنی ہم نے سن لیا مگر انکار کر دیا کہ ہم سے اس پر عملدرآمد نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ بڑے مشکل احکام ہیں۔ ان حالات میں موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے مولا کریم! اس ناہنجار قوم کا کیا علاج کروں تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کر کے طور پر لاؤ، ہم کلام کریں گے جسے یہ لوگ خود اپنے کانوں سے سن لیں اور پھر واپس قوم کے پاس جا کر شہادت دیں کہ ہم نے اللہ کا کلام خود سنا ہے، تورات کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں، لہذا اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل میں موسیٰ علیہ السلام نے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا۔

بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل کے بعض لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی تو اللہ تعالیٰ اس قبیح حرکت سے سخت ناراض ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کے ستر سرکردہ آدمیوں کو طور پر

لائیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور معافی کی درخواست کریں ۔ اس حکم کی تعمیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسے آدمیوں کو منتخب کیا جنہوں نے خود تو بچھڑے کی پوجا نہیں کی تھی مگر انہوں نے شدومد سے دوسروں کو منع بھی نہیں کیا تھا ۔ مفسرین کا تیسرا قول یہ ہے کہ جب ہارون علیہ السلام کا آخری وقت قریب آگیا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خاندان کے دیگر لوگ ایک پہاڑ کے دامن میں اقامت پذیر تھے جب ہارون علیہ السلام فوت ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس واپس آئے اور انہیں بھائی کی وفات کی خبر دی ۔ قوم نے کہا کہ ہارون علیہ السلام آپ کے مقابلے میں بڑے نرم مزاج تھے ۔ وہ ہم پر بڑے مہربان تھے جب کہ آپ سختی سے پیش آتے ہیں ۔ ہمیں شبہ ہے کہ آپ نے ہارون علیہ السلام کو خود قتل کر دیا ہے ۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر واپس اپنے مقام پر آئے جہاں ہارون علیہ السلام کا جسم مبارک رکھا ہوا تھا ۔ ان لوگوں کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے ہارون علیہ السلام سے خطاب کیا کہ آپ کو کس نے قتل کیا ہے ۔ تو ہارون علیہ السلام نے بول کر کہا کہ مجھے کسی نے قتل نہیں کیا ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے طبعی وفات دی ہے ۔ یہ بات اپنے کانوں سے سن کر بھی وہ لوگ مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے حیلہ بازی کی جس کی وجہ سے اگلے واقعات پیش آئے ۔ گویا بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ستر آدمیوں کا انتخاب اس مقصد کے لیے کیا تھا ۔ تاہم معذرت والی بات زیادہ قرین قیاس ہے ۔

بہر حال ستر آدمیوں کے انتخاب کا جو بھی مصداق ہے ۔ موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر کوہ طور پر گئے تاکہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو سکیں ۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب یہ لوگ طور پر پہنچے تو ابر چھا گیا ، پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جسے بنی اسرائیل نے خود سنا مگر پھر بھی ایمان نہ لائے اور کہنے

لگے کہ ہمیں کیا معلوم ہے کہ آپ کے ساتھ واقعی اللہ تعالیٰ ہم کلام تھا نیز
یہ بھی کہا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (البقرۃ)
ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں
سے نہ دیکھ لیں۔ یہ اُن کا بیا مطالبہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں دیکھنا چاہتے
تھے جو کہ ممکن نہیں ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ خود موسیٰ علیہ السلام نے بھی رؤیتِ الٰہی
کی خواہش ظاہر کی تھی مگر اللہ نے فرمایا لَنْ تَرٰىنِيْ کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ
سکتے۔ پھر اللہ نے کوہِ طور پر اپنی ذراسی تجلی ڈالی تو پہاڑ ریزے ریزے ہو
گیا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔

پریشانی اور دعا

بہرحال جب قوم کے ستر آدمیوں نے اللہ کا کلام سن کر بھی اللہ کو
آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کر دیا تو اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا فَلَمَّآ
اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پھر جب پکڑا اُن کو زلزلے نے سورۃ بقرہ
میں آتا ہے فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ پھر تمہیں بجلی نے پکڑ لیا۔
گذشتہ دروس میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ ان لوگوں پر اوپر سے بجلی پڑی
اور نیچے سے زلزلہ آیا اور یہ ستر کے ستر آدمی وہیں ہلاک ہو گئے بعض مفسرین
فرماتے ہیں کہ وہ لوگ بے ہوش ہو کر نیم مردہ حالت میں ہو گئے اور بعض
کہتے ہیں کہ فی الحقیقت اُن پر موت طاری ہو گئی۔ اب موسیٰ علیہ السلام پریشان
ہو گئے کہ یہ لوگ تو اپنی گستاخی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے ہیں میں واپس
جا کر قوم کو کیا جواب دوں گا۔ وہ کہیں گے کہ تم نے ہمارے آدمی ساتھ لے
جا کر مروا دیے ہیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور نہایت
عاجزی کے ساتھ دعا کی قَالَ رَبِّ عرض کیا اے پروردگار! لَوْ شِئْتَ
اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ اگر تو چاہتا تو ان کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔
جب دوسرے فرعونی دشمنوں کو ہلاک کیا تھا تو اُن کو بھی کر دیتا۔ مگر تو نے
اب تک اُن کو مہلت دی۔ تو قادرِ مطلق ہے۔ اِن کے علاوہ وَاِيَّايَ

تو مجھے بھی اس سے پہلے ہلاک کرنے پر قادر تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس حد تک عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا کہ خود کو بھی ہلاکت میں شامل کر دیا اور عرض کیا، اے پروردگار! اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا کیا تو ہمیں اس لیے ہلاک کرتا ہے کہ ہم میں سے بعض بیوقوفوں نے یہ غلطی کی ہے۔ سارے لوگ تو اس کے مرتکب نہیں ہوئے، مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔

یکے از قوم چوں بے دانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

کہ قوم میں سے چند آدمی بیوقوفی کرتے ہیں مگر اس کا وبال ساری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ نہ چھوٹے کا کوئی مقام رہتا ہے اور نہ بڑے کا۔ قوموں کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ چند آدمیوں نے کوئی بری حرکت کی تو ساری قوم اس کی لپیٹ میں آگئی۔ ملک و قوم کے غدار چند آدمی ہوتے ہیں مگر ان کی ملک دشمن حرکات کی وجہ سے سارا ملک تباہی کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ کے حضور عرض کیا، کہ مولا کریم! کیا ان چند بیوقوفوں کی گستاخی کی وجہ سے تو ساری قوم کو ہلاک کرتا ہے۔

ابتلاء من جانب اللہ

مزید عرض کیا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ نہیں ہے یہ ہلاکت مگر تیری آزمائش ستر آدمیوں کی ہلاکت تیری طرف سے امتحان ہے، مگر اس امتحان میں کامیابی بھی تیری توفیق سے ہی ہو سکتی ہے کیونکہ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ تو جس کو چاہے اس کے ساتھ بھٹکا دے۔ وَتَهْدِيْ بِهَا مَنْ تَشَآءُ اور جس کو چاہے راہ راست دکھا دے، مطلب یہ کہ آزمائش میں کامیابی یا ناکامی تیرے ہی دست قدرت میں ہے۔ پھر آپ نے یہ بھی عرض کیا۔ اَنْتَ وَلِيُّنَا تو ہی ہمارا کارساز ہے، تیرے بغیر بگڑی بنانے والا کوئی نہیں

فَاغْفِرْ لَنَا پس ہمیں معاف کر دے۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ چند آدمیوں نے گستاخی کا ارتکاب کیا مگر مولا کریم اب تو ہمیں معاف کر دے وَارْحَمْنَا ہم پر رحم فرما کہ ہم تیری رحمت کے طلبگار ہیں وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ اور سب سے بہتر بخشش کرنے والی تیری ذات ہی ہے۔ تیرے بغیر کوئی نہیں جو ہم پر مہربانی کر سکے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا اللہ نے قبول فرمائی اس کا ذکر سورۃ بقرہ میں موجود ہے ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اللہ نے فرمایا پھر ہم نے تمہیں اٹھا دیا مر جانے کے بعد تاکہ تم خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو اور آئندہ ایسی گستاخی نہ کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ان ستر آدمیوں کو پھر زندہ کر دیا۔

اگلی آیت میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا بقیہ حصہ آ رہا ہے پھر اس کے بعد اسلام کی دعوت عامہ اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا تذکرہ آئیگا۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

ترجمہ :۔ اور لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا کی زندگی میں بھلائی اور آخرت کی زندگی میں بھی ، بیشک ہم نے رجوع کیا ہے تیری طرف ۔ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) میرا عذاب پہنچاتا ہوں میں اُس کو جس کو چاہوں ۔ اور میری رحمت وسیع ہے ہر چیز پر پس میں لکھ دوں گا اس (رحمت) کو اُن لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں ﴿۱۵۶﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور انہیں لے کر طور پہاڑ پر گئے تاکہ وہ معصیت کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ سے معذرت کریں ۔ وہاں پر ان لوگوں نے کلامِ الٰہی سُنا مگر ایمان لانے کی بجائے حیل و حجت کرنے لگے اور اس کے کلامِ الٰہی ہونے پر شک کا اظہار کیا ۔ طرح طرح کی نقطہ چینی اور اعتراضات کیے اس پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہوئی ۔ نیچے سے زلزلہ آیا اور اوپر سے بجلی گری اور اُن لوگوں پر موت طاری ہو گئی ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں نہایت عاجزی اور انکساری کے

ساتھ دعا کی کہ پروردگار! اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے بھی انہیں ہلاک کر سکتا تھا اور ساتھ ہی مجھے بھی ہلاک کر سکتا تھا، تو کیا ہم میں سے بعض بیوقوفوں کی وجہ سے تو ہمیں ہلاک کرے گا۔ یہ تیری آزمائش ہے جس کے ساتھ تو بہکاتا ہے اور سیدھے راستے پر ڈالتا ہے جسے چاہتا ہے۔ ہمارا کارساز تو ہی ہے۔ ہماری عاجزانہ درخواست ہے کہ ہمیں معاف کر دے اور بخش دے۔ ان لوگوں سے غلطی ہوئی ہے جس کا اثر باقی قوم پر بھی پڑے گا۔ ہم کو معاف کر دے اور ہم پر رحم فرما۔ اور تو سب سے بہتر بخشش کرنے والا ہے۔ اب آج کے درس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا باقی حصہ آ رہا ہے

موسیٰ علیہ السلام کی دعا

آپ نے بارگاہ رب العزت میں یہ بھی عرض کیا وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ اے اللہ! لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا کی زندگی میں بھلائی اور آخرت میں بھی إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ بے شک ہم نے رجوع کیا تیری طرف۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پہلی دعا معصیت کے ارتکاب پر معافی کے لیے تھی اور اب یہ دعا دنیا و آخرت میں بھلائی کے حصول کے لیے ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اپنی امت کے حق میں دنیا و آخرت کی بھلائی سے مراد یہ ہے کہ ان کی امت دنیا و آخرت میں تمام امتوں پر مقدم رہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کو باقی ساری امتوں پر برتری عطا فرما دے۔ مگر اللہ نے جواب میں فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی خاص فرقہ یا گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عذاب دے دے اور اس کی رحمت عامہ ساری مخلوق کو شامل ہے۔ البتہ جس رحمت خاصہ کا مطالبہ تم کر رہے ہو۔ وہ تو ان لوگوں کو حاصل ہو گی جن میں خوف خدا پایا جائے، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور جو اللہ کی تمام باتوں پر یقین رکھتے ہوں اور یہ تینوں صفات نبی آخر الزمان علیہ السلام کی امت میں پائی جائیں گی۔ اس کے حقدار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

امت کے وہ لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کے آخری نبی اور اُس کی کتاب
پر ایمان لے آئیں گے۔ اور جو لوگ آخری امت کا جزو نہیں بن سکیں گے
پیغمبر آخر الزمان پر ایمان نہیں لائیں گے وہ اس دُعا کا مصداق نہیں بن سکینگے۔
الغرض موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح دُعا کی۔
کہ اے اللہ! ہمارے لیے اس دُنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت
میں بھی، بیشک ہم نے تیری ہی طرف رجوع کیا ہے۔ قرآن پاک میں یہی دُعا
ان الفاظ میں بھی آئی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا
فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ
(البقرہ) اے اللہ ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہمیں
دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اس کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یوں دُعا
کرتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً (البقرہ) اے اللہ!
ہمیں اس دنیا میں بھلائی عطا فرما۔ دوسرے مقام پر آتا ہے رَبَّنَا عَجِّلْ
لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ اے اللہ! ہمیں جو کچھ دینا ہے
قیامت سے پہلے پہلے یہیں دے دے گویا ہم آخرت کو نہیں جانتے۔
اللہ نے فرمایا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرہ) ایسے لوگوں
کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ دنیا و آخرت دونوں مقامات
کے لیے بھلائی طلب کرنی چاہیئے۔ یہی دُعا درست اور پسندیدہ ہے
دنیا اور آخرت کی بھلائی کی دُعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی اور یہ
ہماری امت کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ | دنیا و آخرت کی بھلائی
حَسَنَةً یعنی بھلائی اپنے اندر بڑا وسیع مفہوم رکھتی ہے مثلاً انسان غلطی
کرنے کے بعد اگر تائب ہو جائے تو یہ اس کے لیے بمنزلہ بھلائی کے
ہے۔ توبہ کی توفیق حاصل ہو جانا بہت بڑی سعادت ہے جس کو توبہ
کی توفیق نہیں ملتی وہ شخص شقی اور بدبخت ہوتا ہے۔ اور بھلائی یہ ہے کہ

انسان کو نیکی کی توفیق مل جائے، رزق حلال نصیب ہو، اطاعت کی توفیق
ملے اور دنیا میں نیک نیتی اور سچائی حاصل ہو۔ صدق مقال بھی بہت بڑی
نعمت ہے، جسے حاصل ہو جائے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کہتے ہیں ؎

سرِ دیں اکلِ حلال صدقِ مقال خلوت و جلوت تماشائے جمال

دین کا راز اس بات میں ہے کہ انسان کو حلال روزی اور سچی بات نصیب
ہو اور خلوت و جلوت میں خدا کے جمال کا مشاہدہ ہو اگر خلوت اور جلوت
کی حالتیں مختلف ہیں تو یہ نفاق کی علامت ہے۔ حضرت علیؓ کا قول
ہے کہ نیک بیوی نصیب ہو جانا بھلائی ہے۔ سعدی صاحبؒ کا قول بھی ہے

زنِ بد در سرائے مردِ نکو ہم دریں عالم است دوزخ او

یعنی نیک آدمی کے گھر میں بری عورت دنیا میں دوزخ کے مترادف ہے
تو حسنہ میں یہ بھی داخل ہے کہ اچھی عورت نصیب ہو۔ مستدرک حاکم میں
حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد موجود ہے کہ جس آدمی کو تین چیزیں نصیب ہو
جائیں وہ دنیاوی لحاظ سے سعادت مند ہے یعنی اچھی بیوی اچھی سواری
اور مناسب مکان۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا اگر اچھی بیوی میسر نہیں تو دنیا میں
ہی دوزخ ہے۔ اگر سواری بہتر نہیں تو پھر بھی نقل و حمل میں تکلیف کا باعث
ہے اور اگر مکان مناسب حال نہ ہو، گرمی سردی سے بچاؤ نہ کر سکے۔
یا مناسب ہوا دار نہ ہو تو یہ بھی شقاوت کی نشانی ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ حسنہ سے مراد محض مال و جاہ
ساز و سامان، صحت و عافیت وغیرہ ہی نہیں۔ کاروباری برتری، فارغ البالی
اچھا مکان، اچھی بیوی اور اچھی سواری ہی سعادت کی علامت نہیں۔ صرف
اچھی اولاد کا ہونا بھی کسی شخص کے لیے بھلائی کی نشانی نہیں بلکہ حسنہ سے مراد
وہ حالت ہے جو اللہ کے نزدیک اچھی ہو۔ انسان دولت مند ہو یا
فقیر، صحت مند ہو یا بیمار، اس کی اچھی حالت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ

کو پسندیدہ ہے۔ جاہ و مال کا حامل آدمی شقی ہو سکتا ہے مگر ایک تکلیف زدہ مزدور اللہ کے ہاں سعادت مند ہو سکتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سے دُنیا میں ایسی بھلائی کی درخواست کرنی چاہیے جو اُس کے نزدیک بہتر ہے اور آخرت میں اچھی حالت سے یہ مراد ہے کہ انسان کو نجات حاصل ہو جائے گناہوں کی معافی مل جائے اور خدا تعالیٰ کی رضا نصیب ہو جائے اور پھر بھلائی کا آخری درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو جائے۔ اگر آخرت میں خدا کی رضا اور نجات حاصل نہ ہوئی تو یہ آخرت کی بدبختی ہے اسی لیے اللہ کے نیک بندوں کی دُعا ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ مولا کریم! ہمیں دُنیا میں بھلائی نصیب فرما اور آخرت میں بھلائی حاصل ہو وقنا عذاب النار اور دوزخ کے عذاب سے ہمیں بچا لے۔

یہود کی وجہ تسمیہ

موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کے آخری الفاظ یہ ہیں اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ اے مولا کریم! بیشک ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے یعنی دنیا و آخرت کی بھلائی کے حصول کے لیے تیرے ہی دروازے پہ دستک دی ہے اور تیرے ہی سامنے ہاتھ پھیلائے ہیں۔ مفسرین کرام نے لفظ هُدْنَا کے کئی ایک معانی بیان کیے ہیں اگر یہ هَادَ، يَهُوْدُ، هَوْدًا ہو تو اس کا معنیٰ رجوع کرنا ہے۔ اس کا مادہ يَهِيْدُ بھی آتا ہے اور هَادَ يَهِيْدُ کا معنیٰ مائل کرنا آتا ہے۔ اگر یہ معنیٰ لیا جائے تو مراد ہو گا کہ ہم نے اپنے دلوں کو توبہ کے لیے تیری طرف مائل کر دیا ہے۔

اسی هدنا کے لفظ سے یہودیوں کا لقب یہودی بھی بنا ہے۔ تاہم بعض فرماتے ہیں کہ یہود کا لقب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا کے نام پہ رکھا گیا ہے یہودی مذہب چونکہ نسلی مذہب سمجھا جاتا ہے اس لیے وہ اولاد اسرائیل ہی کو ہدایت پہ سمجھتے ہیں، چنانچہ یہودا کی اولاد یہودی کہلائی۔

بہر حال یہاں پر ھدنا کا معنی رجوع کرنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کے آخر میں عرض کیا کہ بیشک ہم نے تیری ہی طرف رجوع کیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا پہلا حصہ قبول ہو گیا جس میں انہوں نے ستر آدمیوں کی دوبارہ زندگی کی درخواست کی تھی مگر یہ دوسرا حصہ دعا جس میں آپ بنی اسرائیل کی اقوام عالم پر برتری چاہتے تھے، قبول نہ ہوا، اللہ نے فرمایا یہ سعادت اُن لوگوں کو نصیب ہوگی جن میں وہ باتیں پائی جائیں گی جن کا ذکر اس آیت کے آخری حصہ میں آرہا ہے یعنی تقویٰ، ادائے زکوٰۃ اور آیات الٰہی پر ایمان۔

عذابِ الٰہی اور رحمت

موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَالَ عَذَابِیٓ اُصِیۡبُ بِهٖ مَنۡ اَشَآءُ میں اپنا عذاب جس کو چاہوں پہنچاتا ہوں یعنی سزا اس کو ملتی ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔ کسی شخص کو بلاوجہ سزا میں مبتلا نہیں کیا جاتا۔ البتہ وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَیۡءٍ میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دو حصے ہیں ایک عام اور ایک خاص۔ اس کے لیے قرآن پاک میں دونوں لفظ آتے ہیں۔ اَلرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ رحمان کا معنی عام رحمت ہے جو مومن و کافر سب کے لیے ہے اور رحیم کی صفت خاص مومنوں کے لیے ہے۔ خصوصی رحمت صرف ایمان والوں کو نصیب ہوگی۔ اس میں نافرمانوں کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں ایک رحمت اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ مطلقہ ہے۔ یہ عام ہے حدیث شریف میں آتا ہے رَحۡمَتِیۡ سَبَقَتۡ غَضَبِیۡ میری رحمت میرے غضب سے سبقت کرتی ہے۔ یہ بہت وسیع ہے اور ہر ایک کو نصیب ہے۔ البتہ دوسری قسم کی رحمت خاصہ جو صرف خواص کے لیے ہوگی، موسیٰ علیہ السلام نے اسی رحمت خاصہ کی دعا کی تھی مگر اللہ نے فرمایا یہ اُن خاص لوگوں کے لیے ہے جن میں مذکرہ تین صفات پائی

جائیں گی۔ رحمت واسعہ کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے
کہ اللہ نے رحمت کے سو حصے بنائے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ
دنیا میں تقسیم کیا ہے۔ یہ اسی رحمت کا تقاضا ہے کہ ایک جانور بھی پاؤں
زمین پر رکھنے سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ اس کا بچہ کہیں اس کے پاؤں
کے نیچے نہ آ جائے۔ وہ اپنی اولاد سے اتنا رحم اور شفقت کرتا ہے فرمایا
رحمت کے باقی ننانوے حصے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں
جو آخرت میں صرف ایمان والوں پر تقسیم کیے جائیں گے۔ اس میں
کافروں کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ یہ رحمت خاصہ ہے۔

رحمت خاصہ کے مستحقین

اس رحمت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَسَاَكْتُبُهَا
پس میں لکھ دوں گا اس کو لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے
ہیں۔ تقویٰ کا معنی سنبھل کر قدم رکھنا معصیت کے کانٹوں کے درمیان
پھونک پھونک کر قدم رکھنا کہ کہیں دامن نہ الجھ جائے۔ نیز کفر، شرک
معصیت اور تمام برائیوں سے بچتے رہنا۔ اللہ نے فرمایا میری رحمت
خاصہ ان لوگوں کے لیے ہے جو بچتے ہیں یعنی تقویٰ اختیار کرتے
ہیں۔ شیخ عبداللہ ہراتیؒ اپنی کتاب صد میدان میں لکھتے ہیں کہ تقویٰ کا ادنیٰ درجہ
یہ ہے کہ انسان توحید کے ساتھ شرک کی آمیزش نہ کرے، عبادت کے
ساتھ بدعت کو نہ ملائے، اخلاص کے ساتھ نفاق کو نہ جوڑے اور خدمت
میں ریا کی ملاوٹ نہ کرے۔ اور پھر اعلیٰ درجے کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان
نعمت کے ساتھ خدا تعالیٰ کا شکوہ نہ کرے۔

فرمایا رحمت خاصہ کے مستحقین کا دوسرا گروہ وہ ہے وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ یعنی اگر اللہ نے مال عطا کیا ہے اور وہ
نصاب کو پہنچ گیا ہے تو اس میں سے خدا تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا حصہ مستحقین
کو ادا کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے مال کا تزکیہ ہو جاتا ہے ابوداؤد شریف

ہیں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اللہ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے تاکہ انسان کا باقی ماندہ مال پاک ہو جائے اگر کوئی شخص زکوٰۃ نہیں نکالتا تو اس کا سارا مال ناپاک رہتا ہے۔ ایسا مال کھائے گا تو اس سے ناپاک خون پیدا ہوگا۔ اس کے جذبات اور احساسات بھی ناپاک ہوں گے حتیٰ کہ ارادے اور عزائم بھی ناپاک ہوں گے اور پھر ناپاکی کا یہ سلسلہ دور تک چلا جائے گا۔ بعض یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ کا معنیٰ کرتے ہیں "جو تزکیہ نفس کرتے ہیں"۔ یعنی نفس کو کفر، شرک، نفاق اور معصیت کی آلائشوں سے پاک کرتے ہیں اللہ کی رحمت خاصہ ان لوگوں کے لیے جو اس معیار پر پورا اتریں گے۔ یہ نفس کی زکوٰۃ ہے سورۃ الشمس میں ہے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا" بیشک وہ فلاح پا گیا جس نے نفس کو پاک کر لیا۔ غرضیکہ زکوٰۃ سے مراد مال اور نفس دونوں کی زکوٰۃ ہے۔

رحمت خاصہ کے مستحق تیسرے طبقے کے متعلق فرمایا وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ وہ لوگ جو ہماری ساری باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور یہی صفت ہے جو نبی آخر الزمان علیہ السلام کی امت کو رحمت خاصہ کے لیے خاص کرتی ہے۔ سورۃ البقرہ کی ابتدا میں ہے "وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ" یعنی وہ لوگ جو اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوئی گویا امت آخر الزمان کا تمام آسمانی کتب پر ایمان ہے۔ وہ خدا کی تمام باتوں کی تصدیق کرنے والے ہیں، لہٰذا اللہ کی رحمت خاصہ کے مستحق ہیں۔ برخلاف اس کے دیگر مذاہب والے صرف اپنی اپنی کتابوں تورات، انجیل، زبور پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی آخری کتاب قرآن حکیم کا انکار کرتے ہیں اس لیے وہ تمام باتوں پر ایمان لانے والوں میں شامل نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت خاصہ

سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بہرحال فرمایا دُنیا و آخرت میں تمام امتوں پہ بہتری ان لوگوں کو نصیب ہوگی جن میں یہ تین صفات پائی جائیں گی۔ یعنی تقویٰ، زکوٰۃ اور مجموعی ایمان۔ اس کے بعد چوتھی صفت کا ذکر آگے آرہا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ

ترجمہ :- وہ لوگ جو اتباع کرتے ہیں اُس رسول کا جو نبی امی ہے ، وہ جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں اور وہ حکم دیتا ہے ان کو معروف کا اور منع کرتا ہے اُن کو منکر سے

ربط آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی امت کے حق میں دعا کی تھی وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ "اے مولا کریم! لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا کی زندگی میں بھی بھلائی اور آخرت کی زندگی میں بھی ! بیشک ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ "یہ میرا عذاب ہے جسے میں چاہوں پہنچاتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔ فرمایا میں وہ خاص رحمت اُن لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں ، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہماری باتوں پر ایمان رکھتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی امت کے حق میں موسیٰ علیہ السلام کی بہتری کی دعا قبول نہ فرمائی بلکہ اُس چیز کو اُن لوگوں کے لیے خاص کر دیا۔ جن میں مذکورہ تین صفات پائی جائیں گی ۔

اتباع نبی امی

اب اللہ تعالیٰ نے رحمتِ خاصہ کے مستحقین کی چوتھی صفت یہ بیان فرمائی ہے اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اُس رسول کی النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ جو کہ نبی امی ہے ۔ فرمایا میں اپنی رحمتِ خاصہ ایسے ہی لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جنکی

جب سے انہیں اس دُنیا میں بھی باقی امتوں پہ فوقیت حاصل ہو گی اور آخرت
میں بھی برتری حاصل ہو گی ۔ اَلَّذِیْ اور نبی امی وہ ذات ہے ۔ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ جسے وہ لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس تورات اور انجیل
میں ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کے اتباع کو رحمتِ خاصہ کے حصول کے
لیے چوتھی صفت کے طور پہ بیان فرمایا ۔ اب یہ نبی امی کون ہیں ؟
اللہ تعالیٰ نے اُن کی چھ صفات بیان کی ہیں ۔ ان میں سے دو اس درس
میں مذکور ہیں ۔ اور باقی چار کا ذکر اگلے درس میں آئے گا ۔ یہ چھ صفات
دراصل پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت کا پروگرام ہے ۔

نبی اور رسول

اس آیتِ کریمہ میں جس ذات کے اتباع کو لازم قرار دیا گیا ... ہے
اس کے لیے نبی اور رسول دونوں الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ۔ دونوں
میں فرق یہ ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے جس پہ وحی آتی ہے اور احکام نازل
ہوتے ہیں اور رسول وہ ہوتا ہے جس پہ وحی تو بہر حال نازل ہوتی ہے
اور اس کے ساتھ مستقل کتاب یا صحیفہ اور مستقل شریعت بھی نازل ہوتی
ہے حضرت ابو ذر غفاری رضی کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام
سے دریافت کیا کہ حضرت ! انبیاء علیہم السلام میں سب سے پہلا نبی کون ہے
اور سب سے آخری کون ؟ حضور علیہ السلام نے فرمایا ، سب سے پہلے نبی حضرت
آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں انہوں
نے پھر عرض کیا حضور ! ان میں رسول کتنے ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا تین سو پندرہ
رسول ہیں اور باقی کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب جملہ نبی ہیں ۔
محقق دوانی نے نبی کی تعریف یہ لکھی ہے ۔ هُوَ اِنْسَانٌ بَعَثَهُ اللّٰهُ
لِتَبْلِيْغِ مَا اَوْحٰى اللّٰهُ اِلَيْهِ کہ نبی انسان ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ
اس پہ کی گئی وحی کے احکام آگے پہنچانے پہ مامور کرتا ہے ۔ اور رسول
صاحبِ رسالت ، خدا کا پیغام پہنچانے والا ۔ تو الرَّسُوْل سے مراد عظیم الشان

رسول ہے۔ جیسا کہ پہلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ "ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ (آل عمران)
پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آگیا جو تصدیق کرنے والا ہوگا اُس چیز کی جو تمہارے پاس ہے۔ تو تم اُس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ عہد لیا جس کا سب نے اقرار کیا کہ ہاں اگر ہم نے اُس رسول کو اپنے زمانے میں پایا تو اس پر ایمان بھی لائیں گے اور اُس کی مدد بھی کریں گے، بہرحال یہاں پر جس رسول کے اتباع کو رحمت خاصہ کے لیے شرط قرار دیا جا رہا ہے وہ یہی عظیم الشان رسول ہیں۔

لفظ امی کا مفہوم

آپ کی ایک صفت یہ ہے کہ آپ اَلْاُمِّیّ ہیں۔ اس لفظ کے متعدد معانی ہو سکتے ہیں، عربی زبان میں اُم ماں کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اصل ہوتی ہے اور اُس سے کوئی دوسری چیز نکلتی ہے جب کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو اُس وقت بالکل ناخواندہ ہوتا ہے اُسے پڑھنے لکھنے کا موقع کہیں بعد میں جا کر ملتا ہے۔ اس لحاظ سے نوزائیدہ بچے کو امی کہہ سکتے ہیں جس نے ابھی تک کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا ہوتا۔ چونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی کسی شخص سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا، اس لیے آپ کا لقب امی ہے، پوری عرب قوم کا لقب بھی امی ہے اور خود حضور علیہ السلام کی قوم کو امیین کہا گیا ہے۔
"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (الجمعة)
وہ وہی ذات ہے جس نے اُمیوں میں انہی میں سے عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا۔ شعیب علیہ السلام کے صحیفے میں بھی موجود ہے إِنِّي أَبْعَثُ أُمِّيًّا فِي الْأُمِّيِّينَ اللہ نے فرمایا کہ میں اُمیوں میں ایک امی رسول بھیجوں گا۔ اسی طرح کی پیشین گوئیاں تورات، انجیل اور دیگر کتب میں بھی موجود تھیں حتیٰ کہ آج کی محرف شدہ بائبل، تورات اور انجیل میں بھی نبی امی

کے متعلق پیشین گوئیاں موجود ہیں حضور خاتم النبیین کا اُمّی لقب اس لحاظ سے بھی ہے کہ آپ نے اپنی امت کے متعلق فرمایا إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ یعنی ہم تو امی امت ہیں، ہم نہ تو لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب کرنا۔ چنانچہ دو ہزار سال تک عربوں میں دفتری کاروبار بالکل نہیں ملتا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ مبارک سے پہلے عربوں کی شرح خواندگی تین چار فیصد سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ عربوں کے علاوہ باقی اقوام نوشت و خواند سے واقف تھیں۔ وہ دفتری کاروبار سے بھی واقف تھے۔ ایرانی، رومی، مصری، اطالوی اور یورپی اقوام لکھنا پڑھنا جانتے تھے یہود و نصاریٰ بھی اہل کتاب کہلاتے تھے اور پڑھے لکھے شمار ہوتے تھے۔ صرف عرب ایسے تھے جو لکھنے پڑھنے سے عاری تھے۔ ان کا تمام کاروبار زبانی یادداشت پہ ہوتا ہے اُن لوگوں کا حافظہ بڑا زبردست تھا شعرا کا سارا کلام لوگوں کو ازبر ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نوشت و خواندگی کی کسر حافظے میں پوری کر دی تھی اُن کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ جب چاہو سن لو کہ فلاں شاعر نے فلاں مقام پر یہ قصیدہ پڑھا تھا۔ انہیں اس حد تک یاد ہوتا تھا کہ ہم فلاں پانی پہ جانور چرا رہے تھے۔ وہاں فلاں شاعر آیا اور اس نے یہ کلام سنایا۔

زبان کی حفاظت

نزول قرآن کے زمانے میں دیہات کے رہنے والے بدو اپنی زبان کی بڑی حفاظت کرتے تھے اور وہ زبان کے معاملہ میں معیار سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے لوگ اپنے بچوں کو ابتدائی عمر میں دیہات میں بھیج دیتے تھے۔ ایک تو باہر کھلی آب و ہوا شہروں کی نسبت اچھی سمجھی جاتی تھی اور دوسرا یہ کہ دیہات میں رہ کر بچوں کی زبان ٹھیک تربیت پاتی تھی۔ شہری ماحول میں دوسرے ممالک سے بھی لوگ آتے جاتے تھے جس کی وجہ سے وہاں کی زبان دوسری زبانوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی البتہ دیہات

کی زبان اس خلط ملط سے محفوظ رہتی تھی لہٰذا دیہاتی زبان ہی خالص اور بہتر سمجھی جاتی تھی۔ خود حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابتدائی چار سال دیار بنی بکر میں گزارے اور آپ کی ابتدائی پرورش دیہاتی ماحول میں ہوئی۔ غرضیکہ نبی امی کا معنیٰ یہ ہے جو ناخواندہ تھے اور جنہوں نے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا۔ البتہ عطائے نبوت کے بعد آپ نے معجزے کے طور پر خاص اوقات میں لکھا بھی اور پڑھا بھی۔ ورنہ آپ نے عام حالات میں کسی معلم سے لکھنے پڑھنے کا درس نہیں لیا۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

نگار من بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت

بغمزہ مسئلہ آموخت صد مدرس شد

یعنی میرا نگار (معشوق) عجیب ہستی ہے کہ نہ وہ کسی مدرسے میں گیا اور نہ نوشت و خواند کا درس لیا مگر عجیب بات ہے کہ وہ اشارے سے سب کچھ سیکھ کر صد مدرس بن گیا۔ یہ بات حضور علیہ السلام پر بھی صادق آتی ہے آپ کا منبع علم وحی الٰہی ہے اور وحی کا معنیٰ مخفی اشارہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ کو سب کچھ سکھایا۔ چنانچہ اس لحاظ سے بھی آپکا امی لقب درست ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے قرآن پاک نے پوری عرب قوم کو امی کا لقب عطا کیا ہے۔

حضور علیہ السلام کا امی لقب

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا امی لقب اس لحاظ سے بھی درست ہے کہ آپ ام القریٰ کے رہنے والے ہیں اور آپکے فرائض منصبی میں داخل ہے لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا کہ آپ ام القریٰ اور اس کے اردگرد والوں کو ڈرائیں۔ سورۃ انعام ہی میں ہے کہ آپ کہہ دیں کہ یہ قرآن پاک میری طرف اس لیے وحی کیا گیا ہے لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی اور ان سب کو ڈراؤں جن تک یہ کتاب پہنچے۔ حضور علیہ السلام کا مولد مکہ مکرمہ ہے

جسے ام القریٰ بھی کہا گیا ہے۔ لہٰذا آپ کے امی لقب کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا قیامت والے دن سارے نبیوں کو نور کے منبروں پہ بٹھایا جائے گا اور ایک منبر سب سے بلند اور سب سے زیادہ نورانی ہو گا۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔ تمام نبیوں میں امی نبی کون ہیں۔ اس پہ تمام انبیاء کہیں گے ہم امی نبی ہیں کیونکہ ہم سب کی اپنی اپنی امت تھی۔ جس طرح مکہ اور مدینہ کی طرف نسبت کر کے کسی کو مکی یا مدنی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح تمام انبیاء اپنی اپنی امت کی نسبت سے اپنے آپ کو بطور امی پیش کریں گے اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ وہ امی نبی کون ہیں جو عربی ہیں اور جو احمد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر میں اپنے آپ کو پیش کروں گا تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیگا کہ آپ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ میں دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور وہ کھولا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس طرح اللہ تعالیٰ سب سے پہلے مجھ پہ تجلی فرمائے گا۔ میں اس تجلی کو دیکھ کر سجدہ ریز ہو جاؤں گا اور جب تک خدا کو منظور ہوا سجدہ میں پڑا رہوں گا۔ پھر حکم ہو گا، آپ سر اٹھائیں اور سوال کریں، آپ کی بات مانی جائے گی۔ آپ سفارش کریں، آپ کی سفارش قبول کی جائے گی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سجدے کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی ایسی تعریف کروں گا جو اس سے پہلے کسی نے نہ کی ہو گی بلکہ اس تعریف کے الفاظ آج بھی معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی وقت القا کرے گا اور میں ادا کروں گا۔ بہرحال اس حدیث میں بھی نبی امی سے مراد امت والا نبی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن حضور علیہ السلام کی امت تعداد میں تمام امتوں سے زیادہ ہو گی۔ تو بایں معنی بھی آپ

امی نبی ہیں کہ آپ عظیم الشان امت کے نبی ہیں۔ بہرحال امی کے یہ تین معانی ہو سکتے ہیں۔ ایک ناخواندہ، دوسرے ام القریٰ کے رہنے والے اور تیسرے امت کی نسبت سے امی۔ تاہم زیادہ مشہور معنی یہی ہے کہ آپ ناخواندہ تھے آپ نے نوشت وخواند کسی سے نہیں سیکھا تھا۔

فرمایا کہ وہ نبی امی جس کو اہل کتاب تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ آپ کا یہ لقب سابقہ کتب سماویہ میں بھی موجود تھا جسے یہود و نصاریٰ نے تبدیل کر دیا حضور علیہ السلام کے متعلق تورات اور انجیل میں یہ پیشین گوئی پچھلی صدی تک موجود تھی کہ وہ فاران کی چوٹیوں سے دس ہزار قدسیوں کی جماعت کے ساتھ جلوہ گر ہوگا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی اور وہ دنیا کی اقوام سے محبت کرنے والا ہوگا۔ دنیا کی یہ اقوام اس کے قدموں میں اکٹھی کی جائیں گی۔

جب یہود و نصاریٰ کو پتہ چلا کہ نبی آخر الزمان دس ہزار صحابہ کی جماعت کے ساتھ فتح مکہ کے دن مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تھے تو سمجھ گئے کہ اس سے تو آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق ہوتی ہے مگر وہ انکار کر چکے تھے، لہٰذا انہوں نے دس ہزار کے الفاظ تبدیل کر کے ان کی جگہ لاکھوں قدسیوں کے الفاظ لکھ دیے اور اس طرح کتاب الٰہی میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا ہے۔ "یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ" (النساء) جس عبارت سے اسلام کی صداقت ظاہر ہوتی تھی۔ یہ ظالم اس عبارت کو ہی تبدیل کر دیتے تھے۔ علاوہ ازیں انجیل میں یہ پیشین گوئی بھی موجود تھی کہ میرے بعد فارقلیط آئے گا۔ یہ عبرانی اور سریانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ستودہ جہان ہے۔ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ احمد ہے، چنانچہ قرآن میں یہی لفظ آیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے

کہا کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں تصدیق کرنے والا ہوں اُس چیز کی جو اس سے پہلے تورات میں ہے وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آنے والا ہے اِسْمُہٗٓ اَحْمَدُ (سورۃ صف) جس کا نام نامی احمد ہوگا۔ فارقلیط کا لفظ پچھلی صدی تک انجیل میں موجود تھا مگر اس صدی کی شائع شدہ انجیلوں میں اس کی بجائے مددگار کا لفظ لگا دیا گیا ہے کسی نسخے میں شفیع ہے اور کسی میں مددگار۔ تحریف کی یہ بھی ایک زندہ مثال ہے۔ اب تک ایسی ہزاروں تحریفیں ہو چکی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اسلام اور پیغمبر آخر الزمان کی حقانیت کو چھپایا جا سکے مگر اس کے باوجود تحریف شدہ نسخوں میں بھی کوئی نہ کوئی چیز ایسی نکل آتی ہے جو اسلام کی حقانیت پر واضح دلیل بن جاتی ہے۔ یہ تو قرآن پاک اور اسلام کی صداقت اور معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی صورت میں اسے ظاہر کر دیتا ہے۔ وگرنہ یہ معکوس ذہنیت کے لوگ ہیں اور آج تک قرآن پاک کی صداقت کے قائل نہیں ہوئے ان عناری لوگوں نے مسیح علیہ السلام کو دجال کہہ کر سولی پر لٹکانے کی کوشش کی اور جب دجال ظاہر ہوگا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اصفہان کے ستر ہزار یہودی لمبے لمبے چغے پہنے دجال کو مسیح سمجھتے ہوئے اس کے لشکر میں شریک ہوں گے اور اس کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ تورات و انجیل میں نبی امی کی پیشن گوئیاں لکھی ہوئی پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت خاصہ کے مستحقین کی چوتھی صفت یہ ہے کہ نبی امی کا اتباع کرنے والے ہوں گے۔

قریب المرگ بچے کی حق گوئی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک صحابی ابوصخر عقیلیؓ ہوتے ہیں جو دیہات کے رہنے والے تھے مگر کاروبار کے سلسلے میں شہر میں بھی آمد و رفت

تھی۔ پہلی دفعہ مدینے آئے تو حضور علیہ السلام سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی کیونکہ وہ آپ کی تعریف سن چکے تھے وہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور بعض دیگر صحابہؓ کے ہمراہ ایک یہودی کے گھر اس کے بیمار لڑکے کی عیادت کے لیے جا رہے تھے ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ یہودی لڑکا آپ کی خدمت بجا لایا کرتا تھا۔ بہرحال آپ وہاں تشریف لے گئے۔ لڑکا قریب المرگ تھا اور اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا تورات پڑھ رہا تھا حضور علیہ السلام نے اس کے باپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تجھے قسم دلا کر پوچھتا ہوں کہ تم میرے متعلق اور میری ہجرت کے متعلق تورات میں لکھا ہوا پاتے ہو یا نہیں اس کے جواب میں یہودی نے ایسی کسی پیشین گوئی کا انکار کر دیا۔ اس پر وہ قریب المرگ لڑکا بول اٹھا اور کہنے لگا، یا رسول اللہ میرا باپ غلط کہتا ہے۔ خدا کی قسم ہم تورات میں آپ کی صفت اور آپ کی ہجرت کے متعلق لکھا ہوا پاتے ہیں اور پھر اس نے کلمۂ شہادت پڑھ دیا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اس کے بعد لڑکا فوت ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اب اس بچے کا اس کے باپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اس کی لاش کو سنبھال لو اور اس کا کفن دفن کرو یہ مسلمان ہو چکا تھا اور اسی حالت میں فوت ہوا۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے خود اس بچے کے کفن دفن کا انتظام کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سابقہ کتب میں

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت میں آتا ہے کہ پہلی کتابوں کے عالم کعب احبار وغیرہ کا بیان موجود ہے کہ حضور کی بعض صفات جو تورات میں موجود تھیں وہ قرآن پاک میں بھی آئی ہیں مثلاً قرآن پاک میں مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا کی صفات ہیں اور یہی صفات تورات میں بھی پائی

جاتی تھیں کہ آپ مبشر اور نذیر ہوں گے تورات میں آپ کی یہ صفت بھی موجود تھی کہ آپ بازاروں میں شور و شر کرنے والے نہیں ہوں گے جس طرح قرآن پاک میں ہے کہ اگر آپ "فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ" (آل عمران) یعنی سخت مزاج اور تنگ دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد جمع نہ ہوتے اسی طرح تورات میں بھی تھا لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيظٍ یعنی آپ نہ سخت مزاج ہیں اور نہ تنگ دل تورات میں آپ کے متعلق حِرْزًا لِلْأُمِّيِّينَ کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ امیوں کی پناہ گاہ ہیں۔ آپ کی یہ بھی صفت ہے لَا يَجْزِي السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ یعنی آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔ نیز یہ بھی يَعْفُو وَيَصْفَحُ آپ درگزر فرماتے ہیں اور معاف کر دیتے ہیں تورات میں مذکور ان میں سے بعض صفات قرآن پاک اور بعض احادیث میں موجود ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

فرمایا وہ نبی امی جس کی صفات تورات اور انجیل میں موجود ہیں، وہ یہ امور انجام دیتے ہیں پہلی بات یہ کہ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ یعنی جو لوگ نبی امی کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے معروف اس نیکی اور اچھے کام کو کہتے ہیں جسے شریعت اور عقل سلیم دونوں اچھا سمجھیں اس میں ایمان، توحید، نیکی، اخلاق حسنہ، والدین کی خدمت اور صلہ رحمی وغیرہ شامل ہیں یہ ایسی چیزیں ہیں جو شریعت اور عقل سلیم دونوں کی کسوٹی پر پورا اترتی ہیں البتہ اس معاملہ میں شریعت معیار ہے گویا معروف یا نیکی وہ ہو گی جسے شریعت معروف کہے اور عقل سلیم اس کی تائید کرے۔

فرمایا وہ نبی امی ایک تو نیکی کا حکم دیتا ہے اور دوسرا وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ اور ان کو برائی سے منع کرتا ہے۔ برائی کی تعریف بھی ویسی ہی ہے جیسی نیکی کی یعنی برائی وہ ہے جسے شریعت اور عقل سلیم

برائی کہیں۔ کسی کام کے بُرا ہونے کا فیصلہ بھی شریعت کرتی ہے اور عقلِ سلیم اُس کی تائید کرتی ہے۔ منکرات میں کفر، شرک، ظلم، زیادتی، بدعت، نفاق، قطع رحمی، والدین کی نافرمانی، حق تلفی وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح چوری، ڈاکہ، زنا، حرام خوری اور دیگر تمام بُری باتیں منکرات کی تعریف میں آتی ہیں۔

الغرض معروف اور منکر دو حقیقتیں ہیں جو قیامت کے دن سامنے آئیں گی۔ اچھی باتوں کا حکم کرنا اور بُری باتوں سے روکنا تمام بنی نوع انسان کے لیے اجتماعی پروگرام ہے۔ اس پر عملدرآمد سے دنیا میں امن و سکون قائم رہ سکتا ہے۔ حضور علیہ السلام کی صفات کے ضمن میں یہ پروگرام بتا دیا گیا ہے اور پھر آپ کے اتباع میں آپ کی امت کے لوگ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ قرآن پاک کے متعدد مقامات پر اہلِ ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں ——— یہ کام کبھی زبان سے کیا جاتا ہے، کبھی ہاتھ سے، کبھی قانون سے اور کبھی طاقت سے جس مقام پر جونسی چیز کارآمد ہو اُسی کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ انفرادی طور پر ایک دوسرے کو زبان اور ہاتھ سے نیکی کا حکم یا برائی سے روکا جاتا ہے اگر یہ چیز انفرادی قوت سے باہر ہو تو پھر قانون کے ذریعے اچھائی کو پھیلایا جاتا ہے اور بُرائی کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اگر قانون پر عملدرآمد نہ ہو تو پھر اس کام کے لیے ریاست کی طاقت استعمال کی جاتی ہے۔ بہرحال یہاں پر نبی امی کی یہ دو صفات بیان کی گئی ہیں اور باقی چار صفات اسی آیت میں آگے آ رہی ہیں۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ ع ۱۹/۹

ترجمہ:- اور وہ حلال قرار دیتا ہے اُن کے لیے پاک چیزوں کو، اور حرام قرار دیتا ہے ان پر ناپاک چیزوں کو۔ اور اتارتا ہے ان سے اُن کے بوجھ اور طوق جو ان پر پڑے ہوئے ہیں پس جو لوگ ایمان لائے اس نبی پر اور اُس کی تائید کی اور اُس کی مدد کی اور اُس نور کا اتباع کیا جو اُس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے ﴿۱۵۷﴾

ربط آیات

اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاصہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لیے اس رحمت کی دُعا کی تھی مگر اللہ نے فرمایا کہ اس کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کی ساری باتوں پر یقین رکھتے ہیں نیز فرمایا کہ رحمتِ خاصہ اُن لوگوں کا حق ہے جو اُس نبی اُمی کا اتباع کرتے ہیں جسے وہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ اور پھر اُس نبی کی دو صفات کا ذکر پچھلے درس میں ہو چکا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیتا ہے اور بُرائی سے منع کرتا ہے۔ اب اس درس میں نبی کی باقی چار صفات کا ذکر آ رہا ہے۔ اس عظیم المرتبت نبی کے اُمی ہونے کی وجہ تسمیہ میں نے کل عرض کر دی تھی کہ یا تو اس وجہ سے اُن کا لقب اُمی ہے کہ وہ اُم القریٰ یعنی مکہ مکرمہ

کے سننے والے تھے یا اس وجہ سے کہ آپ عظیم المرتبت امت کے
نبی ہیں۔ اور یا اس وجہ سے کہ آپ نوزائیدہ بچے کی طرح بالکل ناخواندہ
تھے۔ آپ نے کسی معلم یا استاد سے نوشت وخواند کا درس نہیں لیا تھا

حلت و حرمت کا قانون

آپ آج کے درس میں نبی امی کی تیسری اور چوتھی صفت کے متعلق
فرمایا وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وہ ان کے لیے پاک چیزوں کو
حلال قرار دیتا ہے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ اور ان پر
خبیث یا ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حلت وحرمت
کا قانون قرآن پاک میں متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے یہ ایک اہم قانون
ہے جس کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ
كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ وَّلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (البقرہ) اے لوگو! زمین میں اللہ کی پیدا کردہ
حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو اس کا مطلب
یہ ہے کہ جو شخص حلت وحرمت اور پاک اور ناپاک کی تمیز نہیں کرتا وہ
اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل نہیں کرتا اور شیطان کے نقش قدم پر چلتا
ہے یا خواہشات نفسانیہ کی پیروی کرتا ہے۔ ایسا شخص کامیابی سے
ہمکنار نہیں ہو سکتا کیونکہ فلاح، ترقی اور سربلندی اسی صورت میں حاصل
ہوگی جب کہ حلال وحرام کے قانون کی پابندی کی جائے۔ یہ بڑا ضروری
قانون ہے جسے طیبات اور خبائث کے نام سے بیان کیا گیا ہے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح بھی بیان کی ہے۔

اس آیت کریمہ میں حلت وحرمت کے فعل کو نبی علیہ السلام کی
کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں
کو حرام قرار دیتا ہے۔ یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ
کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا درحقیقت اللہ تعالیٰ کا کام ہے یہ

اُس کی تکوینی صفت ہے۔ نبی خود کسی چیز کو حلال یا حرام قرار نہیں دیتا بلکہ وہ اللہ کی حرام یا حلال کردہ چیز کو بتلانے والا ہوتا ہے اور نبی کا بتلانا اس بات کی قطعی علامت ہوتا ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ چیز حرام ہے۔

پاکیزہ چیزوں کی حلت

فرمایا وہ نبی اُن کے لیے پاک چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور پھر اُن کی وضاحت بھی فرماتا ہے کہ پاک چیزوں کی علامت کیا ہے اور پھر اُسے استعمال کرنے کا طریقہ کونسا ہے؟ پچھلی سورۃ انعام میں بہیمۃ الانعام کا قانون بیان ہو چکا ہے۔ یہ ایسے جانور ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے ان کی علامت یہ ہے کہ گھاس کھاتے ہیں اور جگالی کرتے ہیں یہ آٹھ قسم کے جانور ہیں جن کی تفصیل سورۃ انعام میں گزر چکی ہے یعنی اونٹ گائے، بھیڑ اور بکری یہ اور ان سے ملتے جلتے جانوروں کے نر اور مادہ دونوں حلال ہیں۔ ان کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ یہ جانور انسانوں سے مانوس ہوتے ہیں اور اکثر گھروں میں پالے جاتے ہیں۔ ان کا گوشت دودھ اور چمڑا سب حلال ہیں، البتہ اُن کو شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ذبح کرنا یعنی بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر گلے پر چھری چلانا ضروری ہے۔ اسی طرح پرندوں میں مرغ، کبوتر وغیرہ قسم کے جانور بھی حلال ہیں ان کی علامت یہ ہے کہ یہ پنجہ مار کر شکار نہیں کرتے۔ اُن کو بھی مسنون طریقہ سے ذبح کر کے کھایا جاتا ہے ان جانوروں اور پرندوں کا گوشت انسانی مزاج کے عین مطابق ہے۔ یہ انسانی جسم کے تمام قویٰ کے لیے مفید ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُسے اہل ایمان کے لیے حلال قرار دیا ہے

خبیث چیزوں کی حرمت

اللہ تعالیٰ نے اُن چیزوں کو اہل ایمان کے لیے حرام قرار دیا ہے جن کے کھانے سے انسانی اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے انہی چیزوں کو خبائث یعنی ناپاک کا نام دیا گیا ہے۔ انسان کے بنیادی اخلاق طہارت، سماحت، اخبات اور عدالت ہیں۔ غذا کا اثر ان اخلاق پر براہ راست پڑتا ہے چنانچہ

اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں کھانے سے یا تو انسان کا جسمانی نقصان ہوتا ہے یا روحانی نقصان، مثلاً محرمات اربعہ میں سے پہلا نمبر مردار کا ہے "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ" (البقرۃ) اللہ نے تم پر مردار کو حرام قرار دیا ہے۔ مردار تمام ملتوں میں بالاتفاق حرام ہے۔ مردار جانور کا گوشت کھانے سے انسانی جسم میں کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح دمِ مسفوح (خون) کے استعمال سے جسمانی بیماریوں کے علاوہ سنگدلی جیسی روحانی بیماری بھی پیدا ہوتی ہے۔ شیر اور چیتا وغیرہ خون پینے والے جانور ہیں لہٰذا اللہ نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔ بلی، کتا، گیدڑ، وغیرہ بھی اسی قبیل سے ہیں لہٰذا حرام ہیں۔ اس کے علاوہ گندگی کھانے والے کیڑے مکوڑے بھی انسانی جسم کے لیے غیر مفید بلکہ مضر ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔

خنزیر کا گوشت بھی محرمات اربعہ میں شمار ہوتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء نے لوگوں کو بتلایا ہے کہ خنزیر کا گوشت قطعی حرام ہے اس کی حرمت کی بھی کئی وجوہات ہیں مثلاً یہ نجاست خور اور بے غیرت جانور ہے۔ اس کا گوشت کھانے والے بھی گندگی اور بے غیرتی کا شکار ہوتے ہیں۔ آج دنیا میں خنزیر کا گوشت کھانے والے لوگ ان بیماریوں میں مبتلا نظر آتے ہیں خنزیر کی قطعی حرمت کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ قرب قیامت میں جب مسیح علیہ السلام اس زمین پر نزول فرمائیں گے تو خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو توڑیں گے مسیح علیہ السلام کا ایسا کرنے سے یہ تبلانا مقصود ہے کہ جس جانور کو تمام انبیاء کی شرائع میں حرام قرار دیا گیا، عیسائیوں نے اسے بھی کھانا شروع کر دیا نیز یہ بھی کہ عیسائیوں نے یہ شرکیہ عقیدہ قائم کر لیا کہ مسیح علیہ السلام کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ حالانکہ آپ زندہ

موجود ہیں۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ سولی کا ماڈل بنا کر اپنے گلے میں لٹکا لیا اور اسے مقدس صلیب تصور کیا۔ غرضیکہ نصاریٰ کے غلط تصورات کی تردید کے لیے مسیح علیہ السلام خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو توڑیں گے۔ جس سے معلوم ہوا کہ خنزیر قیامت تک کے لیے حرام ہے اس کے کھانے سے جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

چوتھی حرام چیز نذر لغیر اللہ ہے "وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" (البقرہ) اللہ تعالیٰ کے علاوہ غیر کے نام پر نامزد کی ہوئی ہر چیز خواہ جانور ہو یا غلہ، دودھ ہو یا مٹھائی، قطعی حرام ہے۔ اس چیز میں ظاہری جسم کے لیے تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر اس کے کھانے سے انسان میں روحانی نجاست پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لینا ضروری ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ" (الانعام) جس جانور پر بوقت ذبح اللہ کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ۔ جس جانور کو شرعی طریقہ سے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے اس میں پاکیزگی آجاتی ہے اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اور مسنون طریقہ سے ذبح نہ کیا جائے، وہ مردار کی مانند ہوتی ہے۔ نذر لغیر اللہ میں روحانی نجاست ہوتی ہے جس سے انسان کی روح ناپاک ہو جاتی ہے۔ غیر اللہ کی نذر شرک ہے اور شرک کرنے والا نجس ہے اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (توبہ) مشرکوں کی روح ناپاک ہوتی ہے اگرچہ ان کے ظاہری اجسام میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔

طائف سے مشرکین کا ایک وفد حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے ان کا خیمہ مسجد کے ایک کونے میں لگوا دیا۔ صحابہ نے عرض کیا، حضور! یہ مشرک لوگ تو ناپاک ہیں، یہ مسجد میں کیسے ٹھہرائے گئے ہیں؟ آپ نے فرمایا ان کے ظاہری جسموں میں تو کوئی نجاست

نہیں ہے اللہ اِنَّمَا انجاسُ النَّاسِ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ ان کی
نجاست ان کی جانوں پر پڑی ہوئی ہے۔ یہ روحانی طور پر نجس لوگ ہیں
ان کے قلب، روح اور دل و دماغ پلید ہیں۔ تو بہر حال معلوم ہوا کہ بعض
آدمیوں کی روح پلید ہوتی ہے چنانچہ نذر لغیر اللہ کے کھانے والوں کی
روح ناپاک ہو جاتی ہے اس لیے اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ملت ابراہیمیہ
کے تمام آئمہ اس بات پر متفق ہیں کہ نذر لغیر اللہ حرام ہے اور اس کے
کھانے سے خاص قسم کی معنوی نجاست پیدا ہوتی ہے۔

دوائے خبیث کی ممانعت

جسمانی یا روحانی نقصان کی وجہ سے بعض چیزوں کی حرمت کی مثال
ترمذی شریف کی ایک روایت سے بھی ملتی ہے حضور علیہ السلام نے نَهٰی
عَنْ دَوَآءِ الْخَبِيْثِ خبیث دوائی سے منع فرمایا ہے۔ خبیث
دوا سے مراد مضر جسم چیز ہے مثلاً سنکھیا یا کوئی دوسرا زہر اگرچہ ناپاک نہیں
ہے محض ایک زہر ملا پتھر ہے مگر آپ نے اسے کچا کھانے سے اس
لیے منع فرمادیا ہے کہ یہ انسانی جسم میں جا کر معدے جگر اور گردوں کی حالت
کو تباہ کر دیتا ہے اور انسان کے جسم سے خون جاری ہو کر ہلاکت کا باعث
بنتا ہے اس کا استعمال اس صورت میں جائز ہے جب کہ اس کو کشتہ
بنا کر طبیب کی ہدایت کے مطابق استعمال کیا جائے۔ غرضیکہ مسئلہ حلت و حرمت
میں یہ بنیادی اصول کار فرما ہے کہ جو چیز انسانی جسم و روح کے لیے مفید ہے
وہ طیب ہے اور حلال ہے اور جو چیز جسم و روح کے لیے مضر ہے
وہ خبیث ہے اور حرام ہے۔ اب رزق حلال طیبات میں شامل ہے
جب کہ سود، رشوت، فراڈ، چوری اور ڈاکے کا مال خبائث کا حصہ ہے
سینما، تھیٹر، رقص و سرود شراب وغیرہ کی کمائی بھی ناپاک ہے اور اسی
لیے حرام ہے۔ ایسی چیزوں سے حاصل کردہ مال کے استعمال سے انسان
کی روح اور دل ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور ناپاک دل میں پاکیزہ جذبات

لہ ترمذی صـ ۸ ج ۱۷ (فیاض)

واحساسات پیدا نہیں ہو سکتے۔ ایسے قلب میں اللہ کی معرفت نہیں آئیگی
بلکہ شیطانی وسوسے ہی داخل ہوں گے غرضیکہ اللہ کا نبی تمام حلال اور پاکیزہ
چیزوں کو استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے اور ناپاک چیزوں سے روکتا
ہے۔ یہ اس کی تیسری اور چوتھی صفت ہو گئی۔

سخت احکام کا بوجھ

اللہ کے نبی امی کی پانچویں صفت یہ بیان فرمائی ہے وَيَضَعُ
عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وہ لوگوں کے بوجھ اتارتا ہے۔ یہاں پر بوجھ
سے مراد وہ مشکل احکام ہیں جو اللہ نے بعض سابقہ امتوں پر ڈالے تھے۔
مثلاً بنی اسرائیل کو اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے بہت سے مشکل احکام
پر عمل کرنا پڑا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی
پوجا کی غلطی کی تھی۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کرنے کے لیے یہ شرط لگائی
کہ انہیں قتل کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تاہم ہماری امت کیلئے
اللہ تعالیٰ نے آسانی پیدا فرمائی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے
بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ تمہیں اللہ نے آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے
اسی لیے ہماری امت کے گنہگاروں کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ انسان سچے
دل سے نادم ہو جائے اور معافی مانگ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول
کر لیتا ہے۔ البتہ اگر کسی کی حق تلفی کی ہے تو اس کی ادائیگی ضروری ہے
کپڑے کی نجاست کو دور کرنے کے لیے ہماری امت کے لیے حکم
یہ ہے کہ پانی سے تین دفعہ دھو لیا جائے تو نجاست دور ہو کر کپڑا
پاک ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے بنی اسرائیل کے لیے نجاست
والے کپڑے کو پاک کرنے کے لیے نجاست شدہ حصے کو قینچی سے
کاٹنا پڑتا ہے تب جا کر باقی کپڑا پاک ہوتا تھا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے
کے لیے قتل کی سزا صرف قصاص تھی۔ یعنی قاتل کو قتل کے بدلے میں
قتل ہی کرنا پڑتا تھا جب کہ ہمارے لیے دیت اور معافی کی گنجائش بھی

موجود ہے۔ بنی اسرائیل ہفتہ کے روز کوئی کام نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ کھانا پکانا تک منع تھا مگر ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ صرف جمعہ کے روز جمعہ کی پہلی اذان سے لیکر نماز جمعہ کے اختتام تک کاروبار بند رکھنا ضروری ہے۔ نماز کے بعد کاروبار دوبارہ شروع ہو سکتا ہے۔ اللہ کا حکم کہ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعۃ) تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق کی تلاش میں لگ جاؤ۔ بنی اسرائیل صرف مقررہ عبادت خانے میں ہی عبادت کر سکتے تھے جب کہ آخری امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کو مسجد بنا دیا ہے۔ کوئی شخص کہیں بھی ہو وقت ہونے پر نماز ادا کر سکتا ہے۔ البتہ بعض ناپاک مقامات پر نماز نہیں ادا کی جا سکتی مثلاً جانوروں کا باڑہ، کوڑا خانہ، عام شاہراہ، قبرستان وغیرہ میں نماز ادا نہیں کی جا سکتی اس کے علاوہ خشکی تری ہر جگہ نماز پڑھی جا سکتی ہے

رسومات کا طوق

اللہ نے اپنے نبی کی چھٹی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگوں سے اتارتا ہے وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ وہ طوق جو ان پر پڑے ہوئے ہیں۔ اغلال، غُل کی جمع ہے جس کا معنی طوق ہوتا ہے اور یہاں پر اس سے مراد فاسد رسومات ہیں جن میں بنی اسرائیل پھنسے ہوئے تھے۔ اور جن سے نبی آخر الزمان نے آکر ان کو چھڑایا۔ تو معنی یہ ہوگا کہ وہ نبی امی جو باطل رسومات کو ان سے موقوف کرتا ہے غلط قسم کی رسمیں انسانوں کے گلے میں طوق کی طرح پڑ جاتی ہیں جن سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ قباحت اب آخری امت میں بھی سرایت کر چکی ہے شرک، بدعت اور رسم و رواج کی رسومات وبال جان بن چکی ہیں شادی کا موقع ہو یا غمی کا۔ لوگ فضول رسومات کی ادائیگی میں ہی عزت سمجھتے حالانکہ اللہ کا نبی تو انہیں مٹانے کے لیے آیا تھا۔ اللہ نے اپنے نبی کی تعریف

بیان کی ہے کہ وہ باطل رسومات کو مٹاتا ہے غرضیکہ سخت احکام اور رسم و رواج لوگوں کی گردنوں کا طوق بن جاتے ہیں جنہیں ہٹانا نبی کے فرائض میں داخل ہے ۔ یہ نبی کی چھٹی صفت بھی بیان ہو گئی ۔

کامیابی کا راز

آگے ارشاد ہوتا ہے فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهٖ جو لوگ اس نبی پر ایمان لے آئے وَعَزَّرُوهُ اور آپ کی رفاقت اور تائید کی ۔ وَنَصَرُوهُ اور اس کی مدد کی یعنی تبلیغ دین کے معاملہ میں نبی کی معاونت کی ۔ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ اور اُس نور کا اتباع کیا جو نبی کے ساتھ اتارا گیا ہے ۔ یعنی نبی نے جو کتاب پیش کی ہے اُس کے احکام پر عمل کیا ۔ قرآن پاک کو بھی نور کہا گیا ہے اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ہم نے تمہاری طرف واضح نور نازل کیا ۔ اس نور سے مراد ہدایت کی روشنی ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی راہنمائی کرتی ہے ۔ انسان کو کوئی بھی مشکل درپیش ہو، قرآن پاک وہ روشنی ہے جس کے ذریعے تمام مسائل حل ہوتے ہیں ۔ اسی لیے فرمایا جس نے نبی کے ہمراہ نازل ہونے والی روشنی یعنی کتاب کا اتباع کیا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ۔

اتباع کے سلسلے میں قرآن کے ساتھ ساتھ سنت پر بھی عملدرآمد ضروری ہے ۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ سنت قرآن کے اصولوں کی تشریح کرتی ہے ۔ گویا قرآن متن ہے تو سنت تشریح ہے اس لیے جب تک سنت پر عمل نہیں ہوگا، قرآن پاک پر کماحقہٗ عمل نہیں ہو سکتا ۔ تو فرمایا جو لوگ نبی امی پر ایمان لائے اُس کی تائید کی اس کی مدد کی اور اُس پر نازل ہونے والی کتاب اور خود اُس کی سنت کا اتباع کیا تو یہی لوگ کامیابی کی منازل طے کرنے والے ہیں اور یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت خاصہ کے مستحق ہیں ۔ اگر یہود و نصاریٰ بھی نبی امی کا دامن

پکڑ لیں تو وہ بھی مستحقین کی فہرست میں شامل ہو جائیں گے ورنہ وہ محروم رہ جائیں گے۔ اُن کے حق میں موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول نہیں ہو گی کامیابی کا راز اس آیت میں بیان کر دیا گیا ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا
الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي
وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾
وَمِن قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٩﴾

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے، اے لوگو! بیشک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف، وہ اللہ جس کے لیے ہے حکومت آسمانوں اور زمین کی۔ اُس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر جو نبی اُمی ہے وہ خود بھی ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اُس کے تمام کلمات پر۔ اور اُس کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ (۱۵۸) اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے ایک امت ایسی ہے جو راہنمائی کرتے ہیں حق کے ساتھ، اور اسی حق کے ساتھ انصاف کرتے ہیں (۱۵۹)

ربطِ آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایک تو بنی اسرائیل کی معافی کی دعا کی تھی اور دوسرے اپنی امت کے لیے تمام اقوامِ عالم کے مقابلے میں برتری کی درخواست کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی دعا تو قبول فرمالی اور بنی اسرائیل کی خطا کو معاف کر دیا۔ مگر دوسری دعا کی قبولیت کو بعض شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا اور فرمایا کہ میری رحمتِ خاصہ

ان لوگوں کے لیے ہوگی، جو تقوے اختیار کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری تمام باتوں پہ ایمان لائیں گے۔ نیز یہ بھی کہ جو اس عظیم الشان رسول کا اتباع کریں گے جو نبی امی ہے اور جس کے اوصاف یہ ہیں کہ وہ نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے منع کرتا ہے، پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، مشکل احکام کا بوجھ اتارتا ہے اور رسم و رواج کے طوق گردنوں سے اتار پھینکتا ہے۔ فرمایا جو لوگ اس نبی پہ ایمان لائیں گے، اس کی تائید کریں گے، اس کی مدد کریں گے اور اس پہ نازل ہونے والے نور کا اتباع کریں گے، تو فلاح و کامیابی انہی کے حصے میں آئیگی۔ وہی لوگ رحمت خاصہ کے مستحق ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں وہ دنیا میں بھی سرخرو ہوں گے اور باقی اقوام کے مقابلے میں انہیں آخرت میں بھی برتری حاصل ہوگی۔ اگر یہود و نصاریٰ بھی ان شرائط پر پورے اتریں گے تو وہ بھی اس فضیلت میں شامل ہو جائیں گے اور کامیابی سے ہمکنار ہوں گے اور جو لوگ اس نبی امی پہ ایمان نہیں لائیں گے وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوں گے۔

تاریخ نبوت و رسالت

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کی تاریخ بھی بیان فرمائی ہے۔ خلافت ارضی کے سلسلہ میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر فرمایا اور پھر آپ کے بعد آنے والے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کا ایک حصہ بیان فرمایا۔ اس ضمن میں حضرات نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب اور بنی اسرائیل کے دو عظیم الشان رسول موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا اور اب اس آیت میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عامہ کا اعلان فرمایا ہے۔ سابقہ انبیاء کی نبوت خاص خاص اقوام تک محدود تھی، جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا "وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ"

(آل عمران) یعنی آپ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کو قبطیوں اور بنی اسرائیل دونوں اقوام کی طرف مبعوث کیا گیا لوط علیہ السلام کو شرق اردن اور سدوم والوں کی طرف بھیجا گیا، ہود علیہ السلام کو قوم عاد کی طرف مبعوث کیا گیا، صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا اور اسی طرح دیگر انبیاء کو ان کی اپنی اپنی قوموں کے پاس بھیجا گیا۔ البتہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" (البقرۃ) کہ آپ کی امامت عامۃ الناس کے لیے تھی۔

آج کی آیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت عامہ کے اعلان کے ساتھ ساتھ طریقہ تبلیغ بھی بیان ہو گیا ہے اور اس طرح تاریخ انبیاء کا یہ بھی حصہ بن گیا۔ اس آیت سے تمام انبیاء علیہم السلام پر حضور خاتم النبیین ﷺ کی برتری اور فضیلت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور دین کا بنیادی عقیدہ بھی اس آیت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی بعض مزید خرابیوں کا ذکر آئیگا اور آخر میں قرآن کریم کی طرف دعوت عامہ کا بیان ہو گا۔ بہر حال یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی نبوت کو نبوت عامہ کے طور پر پیش کیا ہے جس کا دائرہ کار تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے خواہ وہ کسی مقام اور کسی زمان میں ہوں۔

مختلف اقوام سے خطاب

گذشتہ مختلف سورتوں میں مختلف اقوام کو خطاب کیا گیا تھا۔ سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل کو خاص طور پر خطاب تھا جیسے فرمایا یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ اس سورۃ میں خاص طور پر یہودیوں کی اصلاح مطلوب تھی یعنی اے اولاد اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو اور اپنی اصلاح کرلو اسی طرح سورۃ آل عمران میں زیادہ تر روئے سخن نصاریٰ کی طرف تھا۔ اس میں ان کے غلط عقائد اور باطل نظریات کا رد ہے جو عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپکی والدہ حضرت مریم رضی

کے متعلق قائم کر لیے تھے۔ اللہ نے اُن کی اصلاح کا پروگرام بھی دیا۔ پھر سورۃ النساء اور سورۃ مائدہ خاص طور پر عربوں کی اصلاح کے لیے نازل ہوئیں۔ عربوں کے دیرینہ رسم و رواج، عقائد اور عادات و خصائل کا ذکر کر کے ان کو ترغیب دی کہ وہ بھی اپنی اصلاح کر لیں۔ اس کے بعد سورۃ انعام میں مجوسیوں کو خطاب کیا گیا۔ اِن کا مرکز ایران تھا اور نزول قرآن کے زمانہ میں آدھی دنیا اِن کے زیر نگیں تھی۔ مجوسیوں کے ضمن میں تمام صابی اقوام کا ذکر بھی آ گیا کیونکہ مجوسی بھی صابی ملت میں ہی شمار ہوتے ہیں ان کی زیادہ تر آبادی منگولیا، چین، ہندوستان اور برما وغیرہ میں ہے اللہ تعالےٰ نے انہیں فرمایا کہ وہ خدا تعالیٰ کی توحید کو سمجھیں اور غلط عقائد کو ترک کر دیں۔ چنانچہ اس سورۃ میں اللہ تعالےٰ نے ہر قسم کے شرک کا رد فرمایا ہے

اب اس سورۃ مبارک میں قرآن پاک کی دعوتِ عامہ اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نبوتِ عامہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اگلی دو سورتوں انفال اور توبہ میں جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن پاک کے پروگرام کو ماننے والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس پروگرام کے مخالفین کے خلاف طاقت استعمال کریں، چنانچہ یہ دونوں سورتیں جہاد کے احکام پر مشتمل ہیں یہ سب دعوتِ قرآنی کی ترتیب ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عامہ

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے آج کے درس میں حضور علیہ السلام کی نبوتِ عامہ کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اے لوگو! یعنی عرب و عجم کے باشندو! یہ گویا تمام بنی نوع انسان سے خطاب ہے۔ خواہ وہ مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب میں شمال کے باشندے ہوں یا جنوب، متمدن دنیا کے لوگ ہوں یا جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے والے، سب کو خطاب کیا گیا۔ ناس آدم علیہ السلام کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ ناس نسیان سے ماخوذ ہے۔ یہ آدم علیہ السلام کا لقب

ہے کیونکہ اَوَّلُ النَّاسِ اٰدَمُ نَاسِی یعنی سب سے پہلا انسان سب سے پہلا
بھولنے والا تھا۔ تو یہاں پر تمام اولادِ آدم کو خطاب ہے۔ ہمارا یہ دورِ آدمیت
کا دور ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا۔ اس سے پہلے
ادوار کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیسے تھے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے
بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ یعنی میں تمام سرخ اور سیاہ
رنگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں حام
سام اور یافث کی حقیقی بھی اولاد دنیا میں پائی جاتی ہے خواہ وہ کسی خطے اور
کسی رنگ سے تعلق رکھتی ہے۔ حضور نے فرمایا میں سب کی طرف
رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ میں نہ تو اوتار ہوں اور نہ خدا کا بیٹا اور نہ ہی میں
عین اللہ ہوں بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوں اِنِّیْ رَسُوْلُ
اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں
میری نبوت و رسالت سے کوئی ملک خواہ وہ دنیا کے کسی خطے میں
ہو، یا کوئی آدمی خواہ وہ کسی رنگ اور نسل کا ہو مستثنیٰ نہیں ہے۔ میں سب
کا رسول برحق ہوں۔

قومی اور بین الاقوامی نبی

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ حضور خاتم النبیین علیہ السلام
کی دو حیثیتیں ہیں۔ آپ قومی نبی بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ قومی نبوت
کے متعلق سورۃ ابراہیم میں ارشادِ خداوندی ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ
رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ ہم نے ہر رسول کو اس کی اپنی قومی
زبان میں مبعوث فرمایا۔ حضور علیہ السلام جس قوم میں پیدا ہوئے اور نشوونما
پائی، وہ عرب اور قریش تھے۔ اللہ تعالیٰ کو اس قوم کی سعادت منظور
تھی۔ لہٰذا اللہ نے انہی کی زبان میں اپنی کتاب نازل فرمائی۔ حضور علیہ السلام
بھی اسی زبان میں گفتگو کرتے اور دعوتِ ایمان دیتے۔ چونکہ آپ کے
اولین مخاطبین عرب ہی ہیں، اس لحاظ سے آپ قومی نبی ہیں اور بین الاقوامی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۸۳ ج۱ و تفہیمات الٰہیہ ص۲۹۶ ج۲ (ریاض)

نبی اس لحاظ سے کہ آپ تمام بنی نوع انسان کے لیے نبی مبعوث ہوئے
اور آپ کی دعوت بالواسطہ پوری دنیا میں پھیلی ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے
اے لوگو! ہم نے تمہیں امت وسط بنایا "لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى
النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" شاہ عبدالقادرؒ
شہید کا معنی معلم کرتے ہیں اور آیت کا معنی اس طرح بناتے ہیں کہ اے
عرب کے لوگو! رسول تمہارا معلم ہے اور تم آگے باقی لوگوں کے معلم ہو۔
اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری پروگرام قرآن پاک عربی زبان میں نازل فرمایا "اِنَّآ
اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" (یوسف)
ہم نے قرآن پاک عربی زبان میں نازل فرمایا تاکہ پہلے تم اسے اچھی طرح
سمجھو اور پھر اسے آگے دوسروں تک پہنچاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا صحابہ کرامؓ
اس پروگرام کو لے کر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گئے حتیٰ کہ صفین
کے واقعہ تک صرف پچاس سال کے عرصہ میں آدھی دنیا پر اسلام کا
غلبہ ہو چکا تھا اور باقی نصف دنیا اُن کے تابع تھی۔ دنیا کی کوئی بڑی سے
بڑی طاقت بھی مسلمانوں کے ساتھ ٹکر لینے کے قابل نہ تھی حضور علیہ السلام
کا ارشاد مبارک ہے ما من یھودی ولا نصرانی یسمع بی ثم
لم یؤمن بی الا دخل النار کوئی یہودی ہو یا نصرانی، وہ
میرے بارے میں سُن لے کہ میرا دور آگیا ہے، پھر مجھ پر ایمان نہ لائے
تو وہ جہنم میں جائے گا۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی
معرفت اور قرب کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں اور صرف ایک راستہ
کھلا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہو کر جاتا ہے، لہٰذا اگر
اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے تو حضور علیہ السلام کا اتباع کرنا ہوگا
کیونکہ ان کی نبوت صرف عرب تک محدود نہیں بلکہ "وَمَنْ بَلَغَ"
کے مصداق اللہ کا پیغام جہاں تک پہنچے آپ کی نبوت کا دائرہ کار

وہاں تک ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے قرآن پاک کا پروگرام اپنے اولین مخاطبین اہل عرب کو پہنچایا اور انہوں نے آگے ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ پوری نوع انسانی کے لیے نبی اور رسول مبعوث ہوئے اور آپ کی نبوت قیامت تک قائم رہے گی۔

صفاتِ باری تعالیٰ

فرمایا میں اس مالک الملک کا فرستادہ ہوں اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ وہ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اس کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی نظریہ ہے (IDIOLOGY) ہے جس کی دعوت سارے نبی دیتے آئے ہیں۔ یہ عقیدہ تمام انبیاء کی قدر مشترک ہے۔ انبیاء کی اس دعوت کی حقانیت لازماً ظاہر ہوگی، لہٰذا ہر انسان کا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا بھی اسی طرح برحق ہے جس طرح اُس مالک الملک کے علاوہ لائق عبادت کوئی نہیں۔ حشر میں ہر چیز کھل کر سامنے آجائیگی اور اُس وقت معلوم ہوگا کہ انبیاء کرام جو دعوت دیتے رہے وہ بالکل صحیح تھی۔ فرمایا جس اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اُس کی ایک صفت یہ بھی ہے یُحْیٖ وَیُمِیْتُ زندگی بھی وہی دیتا ہے اور موت بھی وہی طاری کرتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا کس طرح انکار کرتے ہو حالانکہ "کُنْتُمْ اَمْوَاتًا" تم بے جان نطفہ تھے "فَاَحْیَاکُمْ" اللہ نے تمہیں زندگی بخشی یعنی تمہیں نیست سے ہست میں لایا "ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ" پھر تم پر موت وارد کریگا، تم اپنی طبعی عمر گزار کر مر جاؤ گے "ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ" قیامت کو وہ پھر تمہیں زندہ کریگا "ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" پھر تمہیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا، حساب کتاب کی منزل آئیگی اور تمہیں اعمال کی جزا یا سزا کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات بھی بیان ہو گئیں۔

اللہ اور رسول پر ایمان

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا

کہ جو ان صفات کی حامل ہستیاں ہیں فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ پس
ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اب فلاح کا یہی ایک راستہ باقی ہے
کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور خاتم النبیین کی رسالت کو تسلیم کر لو۔ وہ رسول النَّبِيِّ
الْاُمِّيِّ جو کہ نبی امی ہے۔ اس کی پیش گوئیاں اسی نام کے ساتھ پہلی کتابوں
میں بھی آچکی ہیں اور خود اس نبی کی کیفیت یہ ہے الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
کہ وہ بھی اس اللہ پر اسی طرح ایمان رکھتا ہے جس طرح دوسروں کو دعوت
دیتا ہے۔ وہ نہ صرف اس کی ذات پر ایمان رکھتا ہے بلکہ وَكَلِمٰتِهٖ
اس کے تمام کلاموں پر بھی یقین رکھتا ہے۔ کلمات سے مراد تمام آسمانی
کتابیں اور صحیفے ہیں۔ زبور، تورات، انجیل، قرآن پاک اور دیگر صحائف
پر اس کا یکساں ایمان ہے کہ یہ سب منزل من اللہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے
جو کچھ بھی نازل فرمایا ہے، وہ برحق ہے، لہٰذا وَاتَّبِعُوْهُ اس نبی کا اتباع
کرو۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ اب ہدایت کا
واحد راستہ یہی ہے جو اللہ کا نبی بتلاتا ہے یعنی اللہ کی وحدانیت
پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے رسول کا اتباع کرو، اسی میں تمہاری کامیابی ہے

حق پرست لوگ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں آپ کی قوم کی کئی ایک
خرابیاں بیان ہو چکی ہیں۔ یہ الٹی ذہنیت کے لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے
ان کے متعلق فرمایا اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں۔
تاہم ان میں بعض اچھے لوگ بھی ہیں۔ سورۃ آل عمران میں بھی گزر چکا ہے
"لَيْسُوْا سَوَآءً" ان میں سارے برابر نہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جو حق کو
پہچانتے ہیں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے زمانہ مبارک میں مدینے کے دس
یہودی علماء میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو ایمان
کی توفیق بخشی۔ ایسے لوگ ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں اور آج بھی موجود
ہیں۔ جرمنی کا محمد اسد آج بھی زندہ سلامت ہے۔ یہودی تھا ایمان قبول

کیا اور پھر تبلیغ اسلام میں دن رات ایک کر دیا۔ اُس نے
(ISLAM AT THE CROSS ROAD) (اسلام چوراہے پر) نامی بڑی
عمدہ کتاب لکھی ہے۔ پاکستان میں رسالہ "عرفات" کا ایڈیٹر بڑا ہی
صحیح الخیال انسان ہے۔ اسلام کی بڑی خدمت کر رہا ہے آج کل فرانس
میں مقیم ہے۔ اسی طرح مارما ڈیوک پکتھال عیسائی تھا۔ انگریزوں نے جاسوسی
کے لیے ترکی میں بھیجا۔ وہاں کے شیخ الاسلام کی مجلس میں جاتا رہا اور آخرکار
اسلام قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے علم سے نوازا۔ انہوں نے قرآن
پاک کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو بڑا مقبول ہے۔ ترجمہ مکمل کرنے
کے بعد مصر کے علماء کے سامنے پیش کیا تاکہ اگر کوئی غلطی ہو تو اصلاح کی جا
سکے۔ یہ اُس کی حق پرستی کی علامت تھی آخر علماء کی تصدیق کے بعد ترجمہ
شائع کیا جو ساری دنیا میں معیاری تسلیم کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی تاج کمپنی
نے شائع کیا ہے۔

یہاں بھی اسی بات کو بیان فرمایا ہے وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ
اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک امت ایسی ہے يَهْدُونَ
بِالْحَقِّ جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں۔ وَبِهِ يَعْدِلُونَ اور اسی
حق کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بالکل قلیل ہے تاہم
ایسے لوگ ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں۔ البتہ یہود و نصاریٰ کی اکثریت
اسلام دشمنی میں پیش پیش رہی ہے۔ یہودی ہمیشہ اندرونی سازشیں کرتے
ہیں اور عیسائی طاقت کے بل پر اسلام کو مغلوب کرنے میں ہمہ تن مصروف
رہتے ہیں۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

ترجمہ :- اور ہم نے جُدا جُدا کر دیا اُن کو بارہ قبیلوں اور جماعتوں میں - اور وحی کی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف جب کہ آپ سے پانی مانگا آپ کی قوم نے ، کہ مارو اپنی لاٹھی کے ساتھ پتھر پر - پس پھوٹ پڑے اُس سے بارہ چشمے - تحقیق پہچان لیا ہر ایک قبیلے نے اپنے گھاٹ کو اور ہم نے سایہ کیا اُن پر بادلوں کا اور اتارا ہم نے اُن پر من اور سلویٰ ، اور ہم نے کہا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے رزق دی ہیں تم کو اور انہوں نے نہیں ظلم کیا ہم پر ، لیکن تھے وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ﴿۱۶۰﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بعض منصف مزاج لوگوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اگرچہ ایسے لوگوں کی تعداد بالکل قلیل ہے مگر ان کی صفت یہ ہے کہ وہ حق کے مطابق راہنمائی کرتے ہیں اور اُسی کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں ۔

جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو یہ لوگ فوراً ایمان نے آئے۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ نے دعا کا ایک حصہ قبول کر کے بنی اسرائیل کو معاف فرما دیا تاہم دوسرے حصے کے متعلق فرمایا کہ میری رحمت خاص ان لوگوں کو پہنچے گی جن میں مذکورہ اوصاف پائے جائیں گے۔ پھر حضور علیہ السلام کی نبوت عامہ کا ذکر ہوا، قرآن پاک اور حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کی بات ہوئی۔

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے جو بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں پیش آیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے میں جب یہ لوگ مصر میں داخل ہوئے تھے تو ان کی کل نفری اسی ۸۰ تھی چار پانچ صدیاں وہاں گزار کر جب یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ صدیوں تک فرعونیوں کی غلامی میں رہنے کی وجہ سے ان میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی منشا یہ تھی کہ سرزمین شام و فلسطین کی طرف پیشقدمی کرنے سے پہلے انہیں وہاں کی طاقتور قوم سے مقابلہ کے لیے تیار کیا جائے چنانچہ انہیں چالیس سال کا عرصہ صحرا نوردی میں گزارنا پڑا۔ پھر جب اس قوم میں آزادی کی لہر اور جفاکشی پیدا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں شام کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ آج کی آیت میں بیان ہونے والا واقعہ بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں قیام کے دوران پیش آیا۔

بنی اسرائیل کے بارہ قبائل

ارشاد باری تعالیٰ ہے وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا بارہ قبیلے اور جماعتوں میں سبط دراصل اولاد کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق قبیلے اور جماعت پر بھی ہوتا ہے ترمذی شریف کی حدیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے حسین سبط من

(من الاسباط یعنی امام حسینؓ جماعتوں میں سے ایک جماعت جب آپ کی نسل کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ واقعہ کربلا کے بعد ایک بیٹا زندہ بچا جو اُس وقت بیمار تھا، مگر آج اُن کی اولاد دنیا میں اس قدر پھیل چکی ہے کہ شمار سے باہر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات بھی ایسے ہی تھے مشرکین آپ کے قتل کے درپے تھے، اس وقت آپ کی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی مگر اللہ نے فرمایا۔ ابراہیم! میں تیری اولاد کو دنیا میں ریت کے ذروں کی طرح پھیلا دوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ حرف بحرف پورا ہوا۔ غرضیکہ اسباط کا لفظ گروہ، قبیلے اور جماعت کے لیے آتا ہے۔ تاہم یہاں پر بارہ قبیلے مراد ہیں اور امم توامت کی جمع ہے جس کا معنی بھی جماعت ہی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں یا بارہ جماعتوں میں تقسیم کر دیا۔ بائبل کے بیان کے مطابق پوری قوم بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے دس اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹوں کی اولاد تھی اور اس طرح یہ بارہ قبیلے بن گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے ہر قبیلے کا ایک ایک نقیب یا سردار مقرر کر دیا اس کا ذکر سورۃ مائدہ میں موجود ہے "وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا" ہم نے اُن میں بارہ سردار مقرر کر دیئے۔ یہ قوم کی انتظامی لحاظ سے تقسیم تھی تاکہ اگر کسی فرد کو موسیٰ علیہ السلام تک کوئی بات پہنچانا مقصود ہو تو وہ اپنے نقیب کی وساطت سے ایسا کر سکے کیونکہ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قوم کے ہر فرد کی رسائی اپنے نبی اور بادشاہ موسیٰ علیہ السلام تک ممکن نہ تھی، لہٰذا اُن کو بارہ قبائل میں تقسیم کر کے ہر ایک کا ایک ایک سردار مقرر کر دیا گیا جو ہر قبیلے سے متعلقہ امور کو نمٹانے کا ذمہ دار تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو بھی اجتماعیت کے امور کے لیے افراد کی ضرورت پڑتی تھی تو آپ انہی نقیبوں کی معرفت تمام کام انجام دیتے تھے اس طرح یہ تقسیم خالصتاً انتظامی نوعیت کی تقسیم تھی۔

بنی اسرائیل کی پراگندگی

قَطَّعْنَا کے لفظ سے مفسرین کرام یہ مراد بھی لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ لوگ تخریبی کارروائیاں کرتے تھے نافرمان تھے، ان میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جس کی وجہ سے یہ مغضوب علیہ ٹھہری، ایسی مصلحت کے تحت اللہ تعالیٰ نے ان کی اجتماعیت کو ختم کر دیا اور پوری دنیا میں کہیں بھی انہیں چین کی زندگی نصیب نہ ہو سکی۔ گذشتہ دو اڑھائی ہزار سال کی تاریخ شاہد ہے کہ یہودیوں کو کہیں بھی تسلط حاصل نہیں ہو سکا، یہ ہمیشہ پراگندہ حال ہی رہے ہیں۔ ان کے کچھ افراد کسی ملک میں اور کچھ کسی ملک میں غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے ہیں۔ کبھی کسی طاقت کا تختۂ مشق بنے اور کبھی کسی ملک نے ان کی سرکوبی کی۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دور آیا تو انہوں نے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے بھی شدید رد عمل کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ ملک بدر کر دیئے گئے اور یہ لوگ اپنی فطری شرارت پسندی کی وجہ سے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے ہیں۔ اس سورۃ میں آگے آ رہا ہے اور بعض دوسری سورتوں میں بھی اشارات ملتے ہیں کہ یہ لوگ قیامت تک سزا کا مزا چکھتے رہیں گے۔

موجودہ زمانے میں بظاہر یہودیوں کو ایک ٹھکانا میسر آ گیا ہے اور یہ اسرائیل نامی سلطنت قائم کر کے اس چھوٹے سے خطے میں مجتمع ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خطہ ارضی میں بھی اسرائیل کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک دھوکہ ہے۔ بڑی طاقتوں نے اسے اپنا فوجی اڈا بنا رکھا ہے جسے اپنی مصلحت کے تحت استعمال کر رہی ہیں۔ برطانیہ برصغیر پر قابض تھا۔ انہیں نہر سویز کے ذریعے آمد و رفت کی ضرورت تھی

چنانچہ انہوں نے اس نہر پر تسلط حاصل کرنے کے لیے اسرائیل کا اڈا مضبوط کیا۔ ان کے ساتھ روس اور فرانس بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں جب انگریز کمزور ہو گئے تو امریکہ نے ان تینوں طاقتوں کو بے دخل کر کے اسرائیل پر خود تسلط جما لیا اب اسرائیل کی مکمل پشت پناہی امریکہ کے ذمہ ہے اگر یہ چاروں طاقتیں اسرائیل سے اپنا سایہ اٹھا لیں تو یہ دو دن بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ حقیقت میں یہ اسرائیل کی اپنی سلطنت نہیں بلکہ بڑی طاقتوں کا اڈا ہے جسے اپنے مخصوص مفادات کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن پاک اور مسلمان قوم کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا ہے کہ دنیا میں یہودی سلطنت کبھی قائم نہیں ہو گی۔ ایسے لوگ دھوکے میں ہیں اسرائیل ہرگز یہودیوں کی سلطنت نہیں بلکہ امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس کی حکومت ہے۔ لہٰذا اس سلطنت کے قیام سے قرآن پاک کا یہ دعویٰ غلط ثابت نہیں ہوتا کہ یہودی قیامت تک سزا میں مبتلا رہیں گے۔ قرآن پاک کا تو یہی دعویٰ ہے کہ یہودیوں پر ہمیشہ ذلت مسلط رہے گی۔ البتہ اس ذلت سے اگر انہیں کبھی افاقہ ہو گا تو دو وجوہ سے "اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" (آل عمران) یا تو اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑ لیں یعنی قرآن پاک پر ایمان لے آئیں اور یا پھر لوگوں کی رسی کو پکڑ لیں اور ان کے زیر سایہ اور پشت پناہی میں رہ کر ذلت و رسوائی سے قدرے باہر نکل سکتے ہیں آج کل یہ لوگ حبل من الناس کے سائے میں ہیں، انہوں نے امریکہ کی رسی کو پکڑ رکھا ہے اور ایک چھوٹے سے علاقے میں اپنی اجتماعیت قائم کیے بیٹھے ہیں۔ جونہی امریکہ کی سرپرستی ڈھیلی پڑے گی۔ یہ لوگ پھر اسی ذلت و مسکنت کا شکار ہو جائیں گے۔

بنی اسرائیل کی اجتماعیت کی ایک باطنی وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ قرب قیامت تک ان کا اکٹھا ہونا بھی ضروری ہے جب مسیح علیہ السلام

کا نزول ہوگا تو عیسائی لوگ تو آپ پر ایمان لا کر امت محمدیہ کا حصہ بن جائیں
گے مگر یہودی اپنے عناد پہ قائم رہتے ہوئے دجال کے پیچھے چلیں گے
دجال کے ساتھ مقابلہ کے وقت یہودیوں کو چن چن کر ختم کر دیا جائیگا۔
حتیٰ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کوئی درخت اور کوئی پتھر بھی کسی یہودی
کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ پتھر اور درخت بول کر کہیں گے
کہ مسلمان! یہ دیکھو میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے اور پھر اُسے تہ تیغ
کر دیا جائے گا۔ تل ابیب سے ۲۶ میل دور لد کا ہوائی اڈا وہی جگہ ہے
جس کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ اس جگہ پر مسیح علیہ السلام
کے ہاتھوں دجال قتل ہوگا۔ لہذا قرب قیامت میں یہودیوں کا ایک
جگہ اکٹھا ہونا تکوینی طور پر بھی ضروری ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا حصہ ہے

اجتماعیت کی اہمیت

دنیا میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جو قومیں متحد و متفق
رہتی ہیں، ترقی کی منازل طے کرتی ہیں اور کوئی اُن کی طرف نظر بد سے
نہیں دیکھ سکتا۔ برخلاف اس کے جو قومیں انتشار و افتراق کا شکار ہوتی
ہیں، وہ دوسروں کی مغلوب و مقہور ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت دنیا میں
جہاں کہیں بھی مسلمان اقلیت اور پراگندگی کی حالت میں ہیں سخت تکالیف
اٹھا رہے ہیں۔ قبرص میں ترک اقلیت میں تھے، مختلف علاقوں میں بٹے
ہوئے تھے اور اکثریت کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے، پچھلی ربع
صدی میں چالیس ہزار قبرصی ترک مارے گئے۔ پھر وہ جزیرے کے ایک
حصے میں اکٹھے ہو گئے اور اس طرح انہوں نے اس علاقہ میں اپنی
اجتماعیت قائم کر لی۔ اب یہ لوگ سکون میں ہیں مگر امریکہ انگریز اور
اُن کی اب بھی خواہش ہے کہ قبرصی مسلمانوں کو پھر سے منتشر کر کے کمزور
کر دیا جائے مگر ترک اپنی اجتماعیت پہ ڈٹے ہوئے ہیں۔ فلپائن کے
مسلمانوں کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ قلیل تعداد میں ہونے کی وجہ سے اکثریت

کا ظلم وستم برداشت کر رہے ہیں۔ عیسائی حکمران ان کے خلاف جھوٹا پراپیگنڈا کر کے انہیں ہوروز مسلمان یعنی قذاق اور ڈاکو کا نام دیتے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ مسلمان ہیں اور پراگندہ حالت میں ہیں ہوزتے تنگ کے زمانے میں چین کے صوبہ سنکیانگ میں مسلمانوں کی آبادی چھ سات کروڑ افراد پر مشتمل تھی مگر حکومت نے انہیں منتشر کر دیا تا کہ یہ اپنی اجتماعی قوت قائم نہ کر سکیں اب وہاں ایک کروڑ مسلمان بھی نہیں ہیں۔ غیر مسلم اقوام مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کا ہتھیار استعمال کرتی رہی ہیں اور اب بھی کر رہی ہیں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ابتدا میں تو یہ تنظیمی تقسیم تھی لیکن بعد میں ان کی شرارت پسندی کی وجہ سے ان کو تقسیم کر دینا ہی بہتر تھا تا کہ یہ اکٹھے ہو کر کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ نہ بن جائیں۔

صحرائے سینا میں سرگردانی

مصر سے نکل کر بحیرہ قلزم عبور کیا اور بنی اسرائیل صحرائے سینا میں پہنچ گئے۔ فرعون کی غرقابی کے باوجود انہیں واپس مصر جانے کا حکم نہیں تھا کیونکہ وہاں بہر حال اسی کی قوم آباد تھی۔ اور یہ لوگ اپنے اصل وطن شام و فلسطین میں داخل ہونے کے ابھی اہل نہیں تھے صدیوں غلامی میں رہنے کی وجہ سے ان کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے محنت و مشقت سے عاری ہو چکے تھے اور شام و فلسطین کی فتح کے لیے جس جذبہ جہاد کی ضرورت تھی اس سے یہ عاری تھے۔ چنانچہ سورۃ مائدہ میں گزر چکا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ، اللہ نے اسے تمہارے مقدر میں کر دیا ہے تم ہمت تو کرو، تو کہنے لگے وہاں تو بڑی جنگجو قوم آباد ہے، ہم ان کی موجودگی میں وہاں نہیں جا سکتے، اے موسیٰ علیہ السلام! تم اور تمہارا خدا جا کر ان

سے مقابلہ کرو "اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ" ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔ اس جواب
سے موسیٰ علیہ السلام بڑے رنجیدہ خاطر ہوئے اور رب العزت سے عرض
کیا "رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ" مولا کریم! میں تو اپنی ذات
اور بھائی کا مالک ہوں جو میری بات مانتا ہے، اس کے علاوہ قوم کا
کوئی فرد ہماری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کی طرف سے
بزدلی کے اس مظاہرے پر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا کہ عرصہ تک انہیں
اسی صحرائے سینا میں سرگرداں رکھا جائے تاکہ بیاباں کی تکالیف برداشت
کرکے جفاکش بن جائیں اور شام و فلسطین کو فتح کر سکیں چنانچہ ایسا ہی ہوا
"فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ
فِی الْاَرْضِ" ارض مقدس ان پر حرام کر دی گئی اور چالیس سال تک یہ
اسی صحرائے سینا میں سرگرداں پھرتے رہے پھر اخراج مصر سے ستر چھتر
سال بعد جا کر ان سے غلامی کا اثر ختم ہوا۔ نئی خوراک کھانے سے نیا
خون پیدا ہوا، آزادی کی لہر پیدا ہوئی اور پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے
جانشین حضرت یوشع اور قالب کی قیادت میں ملک شام و فلسطین
کو فتح کیا اور وہاں آباد ہوئے۔

انسان کی بنیادی ضروریات

الغرض! بنی اسرائیل ابتدائی طور پر صحرائے سینا میں مقیم ہوئے۔ یہ
ایک لمبا چوڑا تپتا ہوا صحرا ہے جس میں ضروریاتِ زندگی کی کوئی چیز مہیا
نہیں۔ اس خطہ کی آبادی کا یہ حال ہے کہ آج بیسویں صدی میں بھی وہاں
چند ہزار نفوس سے زیادہ لوگ آباد نہیں جو کہ مختلف حیثیتوں میں وہاں رہتے
ہیں ظاہر ہے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے وہاں کتنے لوگ ہوں گے
اور ان کی معیشت کا کیا انتظام ہو۔ اس لق و دق صحرا میں یکایک چھ سات
لاکھ نفوس کے لیے ضروریاتِ زندگی کہاں سے مہیا ہو سکتی تھیں۔ وہاں
تو پینے کے لیے پانی جیسی اہم ترین چیز بھی میسر نہیں تھی حالانکہ یہ انسان کی

چھ بنیادی ضروریات، میں شامل ہے انسان کے بنیادی حقوق کا دعویدار آج اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ یونیسکو بنا ہوا ہے حالانکہ سب سے پہلے اس کی تعلیم حضور علیہ السلام نے دی تھی انسان کے چھ بنیادی حقوق (BASIC RIGHTS) کا ذکر قرآن و سنت میں موجود ہے۔ ان میں پانی، خوراک، لباس، مکان، صحت اور تعلیم شامل ہیں۔ انسانی زندگی کے لیے سب سے پہلی ضرورت آکسیجن یعنی صاف ہوا ہے۔ اس کے بغیر انسان نہ سانس لے سکتا ہے اور نہ اپنی زندگی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد انسانی زندگی کا انحصار خوراک پر ہے جس میں پانی کو اولیت حاصل ہے۔ خوراک بھی جیسی کیسی انسان کو ملنی چاہیئے۔ اس زمین پہ کوئی بھوکوں نہیں مرنا چاہیئے۔ سر چھپانے کے لیے جھونپڑی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو چھوٹا موٹا مکان ضرور حاصل ہونا چاہیئے۔ جس کے ذریعے وہ گرمی سردی اور دیگر آفات سے بچاؤ کر سکے متمدن زندگی کے لیے انسان کے لیے لباس بھی اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ کوئی شخص ننگا نہیں رہنا چاہیئے۔ یہ بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد تعلیم اور صحت ہے جہالت کی تاریکی کو دور کرنے اور خدا تعالیٰ کی معرفت اور زندگی کو احسن طریقے سے بسر کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے۔ اور اگر انسان بیمار پڑ جائے تو اس کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے لہٰذا یہ بھی اس کا بنیادی حق ہے کہ صحت کو برقرار رکھنے کے لیے اُسے تمام ضروری وسائل مہیا ہوں۔

بنی اسرائیل کے لیے بارہ چشمے

صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کو پہلی بنیادی ضرورت ہوا تو اللہ نے وافر مقدار میں فری مہیا کر رکھی تھی، تاہم خوراک کے سلسلے میں اُن کی اولین ضرورت پانی کی بہم رسانی تھی۔ ہوا کے بعد انسانی جسم کو پانی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر انسان زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا انسانی جسم میں دوڑنے والے خون کا اسی فیصد حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔

بلکہ سطح ارضی پر موجود ہر چیز کا انحصار پانی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" (انبیاء) اسی لیے پانی پر ٹیکس کو ظالمانہ کہا گیا ہے۔ تو بنی اسرائیل کے لیے بھی صحرائے سینا میں سب سے پہلا مسئلہ پانی کا پیدا ہوا اور قوم نے اس کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف رجوع کیا کہ جس لیے آب و گیاہ زمین میں انہیں لے آئے ہیں وہاں پانی کا انتظام بھی کریں۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کو بیان کیا ہے۔ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ جب آپ کی قوم نے آپ سے پانی طلب کیا أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ کہ اپنی لاٹھی پتھر پر ماریں۔ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قوم کی درخواست پیش کی تو اللہ نے پانی کی معجزانہ طور پر بہم رسانی کے لیے اپنی معجزے والی لاٹھی کو چٹان پر مارنے کا حکم دیا۔ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا پس پھوٹ پڑے اس سے بارہ چشمے۔ انبجاس کا معنی ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا پانی رسنا اور انفجار کا معنی پوری طرح پانی بہ جانا ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے مفسرین کرام یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ ابتداء میں تھوڑا تھوڑا پانی نکلا ہوگا مگر بعد میں اس میں اضافہ ہوگیا اور چشمہ پوری طرح بہنے لگا۔ تو فرمایا اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ہر قبیلے نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ چنانچہ ہر ایک کو حکم ہوا کہ وہ اپنے اپنے مقررہ چشمے سے پانی حاصل کریں اور ایک دوسرے کے گھاٹ میں مداخلت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اس نے معجزانہ طریقے سے بنی اسرائیل کے لیے پانی کا انتظام کر دیا۔ ہر صاحب عقل سلیم اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعتراف کرتا ہے۔ تاہم

سرسید، پرویز اور دیگر نیچری قسم کے لوگ معجزات کا بھی انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے معجزات کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے نبی کے ہاتھ پر اسی طرح کرامت بھی خدا تعالیٰ اپنے کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے پانی کے بارہ چشمے جاری فرما کر بنی اسرائیل کے لیے پانی کا بندوبست کر دیا۔

گرمی اور سایہ

صحرائے سینا میں شدید گرمی پڑتی ہے جس سے بچاؤ کے لیے نہ کوئی مکان تھا، نہ خیمہ اور نہ کوئی درخت۔ عرب سمیت پورا مشرق وسطیٰ بہت گرم علاقہ ہے۔ عرب میں یہاں پنجاب کی نسبت چار گنا زیادہ گرمی پڑتی ہے جب کہ صحرائے سینا میں چھ گنا زیادہ ہے۔ عرب لوگوں کے سر پر رومال باندھنے میں یہی حکمت ہے کہ وہ لُو سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگر گردن کو لُو لگ جائے تو ضربہ شمسیہ (SUN STROKE) ہو جاتا ہے۔ پٹھے مرجھا جاتے ہیں اور انسان ہلاک ہو جاتا ہے، لہٰذا گردن کو تپش سے محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ابو کبیر ہذلی کہتا ہے ؎

ولقد صبرت علی السموم یکننی

قرد علی اللیتین غیر مرجل

میں تو بڑا صابر ہوں جس نے لُو کو برداشت کیا ہے جب کہ میرے پراگندہ بالوں کے سوا سر پر سایہ کرنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ افضل صدقہ کون سا ہے تو آپ نے فرمایا ظِلُّ فُسْطَاطٍ یعنی خیمہ کا سایہ۔ کسی گرم علاقے میں گرمی سے بچاؤ کے لیے خیمہ مہیا کر دینا بہت بڑا صدقہ ہے بہرحال بنی اسرائیل کو اس تپتے ہوئے صحرا میں سایہ کی ضرورت تھی اللہ نے فرمایا، وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ ہم نے اُن پر بادلوں

کا سایہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عرصہ تک صحرا میں رکھ کر ان کی کمزوریاں دور کرنا چاہتا تھا، لہذا ان کے لیے بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام بھی فرما دیا۔

من اور سلویٰ کی خوراک

پانی کے بعد اگلی ضرورت خوراک کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا بندوبست بھی معجزانہ طریقے سے کیا وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ہم نے ان پر من اور سلویٰ نازل فرمایا۔ من کا لغوی معنی احسان ہے۔ جو چیز مفت مل جائے وہ احسان ہوتا ہے۔ تو اس کو من اس لیے بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنی اسرائیل پر خاص احسان تھا۔ بعض کے نزدیک من سے مراد ترنجبین کی قسم کی سفید شکر ہے جو بنی اسرائیل کے قیام کے مقام پر شبنم کی طرح گرتی تھی اور جسے وہ اکٹھا کر لیتے تھے۔ یہ خوش ذائقہ طاقتور اور زود ہضم خوراک تھی جسے بنی اسرائیل استعمال کرتے تھے۔ حدیث شریف خود رو کھنبیوں کو بھی من کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے الکمأة من المن وماءها شفاء للعين۔ کھنبیاں من میں سے ہیں جن کا پانی آنکھوں کے لیے باعث شفا ہے۔ جیسے دیکھی آنکھوں میں سرمہ میں ملا کر یا ویسے ہی ڈال دیا جائے تو نہایت مفید ہوتا ہے۔

بہرحال خوراک کے لیے ایک تو اللہ نے من دیا اور دوسرا سلویٰ یہ بٹیر کی طرح کا پرندہ تھا۔ ان کو ہوا اڑا کر بنی اسرائیل کے خیموں کے پاس لے آتی جنہیں وہ آسانی سے پکڑ لیتے اور ذبح کر کے اس کا گوشت استعمال کرتے جو نہایت ہی لذیذ ہوتا۔ من میں شکر اور نشاستے کے اجزا پائے جاتے تھے جب کہ پروٹین کے لیے اللہ نے پرندوں کا گوشت مہیا کر دیا اور اس طرح بنی اسرائیل کی خوراک کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اللہ نے فرمایا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ کھاؤ جو ہم نے تمہیں پاک روزی عطا کی ہے۔ طیبات سے مراد پاک روزی جو ملتی بھی مفت تھی مگر اللہ کی

اس عظیم نعمت پر بھی وہ لوگ مطمئن نہ ہوئے اور جیسا کہ سورۃ البقرہ میں ہے کہنے لگے "لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ" روزانہ ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے کھاتے ہمارے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا ہے لہٰذا ہمارے لیے اپنے رب سے سبزی ترکاری، دال، لہسن، پیاز وغیرہ کا سوال کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے سمجھایا اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ کیا تم من وسلویٰ جیسی اعلیٰ چیزوں کی بجائے ساگ پات جیسی ادنیٰ چیزیں چاہتے ہو؟ مگر وہ قوم اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس کے بعد کا بیان اگلی آیت میں آرہا ہے۔ اللہ نے فرمایا وَمَا ظَلَمُوْنَا انہوں نے نافرمانی کرکے ہم پر ظلم نہیں کیا یعنی ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، اللہ تعالیٰ تو غنی اور صمد ہے کسی کی غلط کاروائی کا اس پر کیا اثر ہو سکتا ہے وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اپنے پیغمبر کی بار بار نافرمانی کرکے انہوں نے خود اپنا ہی نقصان کیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا کیا نقصان ہوسکتا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ پر ہی ظلم اور زیادتی کی۔

روشنی کا انتظام

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے پہلے پانی کا انتظام کیا اور ان کے لیے بارہ چشمے جاری کر دیے۔ پھر خوراک کے لیے من جیسی میٹھی چیز اور سلویٰ جیسا تازہ اور لذیذ گوشت فراہم کیا۔ دھوپ میں سایہ کے لیے بادل بھیج دیے۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ دن کو بادلوں کا سایہ ہوتا تھا اور رات کے وقت اللہ تعالیٰ روشنی کے بڑے بڑے مینار کھڑے کر دیتا تھا۔ اللہ جل شانہ نے بغیر ستونوں کے روشنی کے بڑے بڑے راڈ بنا دیے جن سے معجزانہ طور پر روشنی نکلتی تھی۔ یہ بھی بنی اسرائیل کے لیے ایک اضافی سہولت تھی۔ اس کا ذکر قرآن وسنت میں تو کہیں نہیں آتا، صرف تفسیری روایات میں ذکر آتا ہے جس کی حتمی طور پر تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ بایں ہمہ جو مالک الملک پتھر سے بارہ چشمے جاری کر سکتا

ہے ، دھوپ میں بادلوں کا سایہ مہیا کر سکتا ، خوراک کے لیے من و سلویٰ نازل کر سکتا ہے اس کے لیے کیا بعید ہے کہ وہ روشنی کا انتظام بھی کر دے۔ یہ تمام چیزیں اللہ نے انعام کے طور پہ عطا فرمائیں مگر اُس قوم نے اُن کی قدر نہ کی۔ آپ آگے بنی اسرائیل کا بستی میں اترنے کا واقعہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔

وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ ۚ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿١٦٢﴾ ع ۲۰

ترجمہ :- اور (اس واقعہ کو یاد کرو) جب کہا گیا اُن (بنی اسرائیل) سے کہ رہائش پذیر ہو اس بستی میں اور کھاؤ اس سے جہاں چاہو تم اور کہو حِطَّةٌ (معافی) اور داخل ہو دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے، ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں اور ضرور زیادہ کریں گے ہم نیکی کرنے والوں کے لیے ﴿۱۶۱﴾ پس تبدیل کر دی اُن لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا ان میں سے بات کو اس کے سوا جو اُن کو کہی گئی تھی۔ پس بھیجا ہم نے ان پر عذاب آسمان سے، اس وجہ سے کہ تھے وہ ظلم کرتے ﴿۱۶۲﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو انتظامی حیثیت سے بارہ قبیلوں میں تقسیم کیا۔ صحرائے سینا میں پہنچ کر بنی اسرائیل کے لیے پانی کا مسئلہ پیدا ہوا، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ نے فرمایا اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارو۔ ایسا کرنے سے اُس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے

ہر قبیلے نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا اور پانی سے سیراب ہونے لگے۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اللہ نے بادلوں کا سایہ کر دیا اور خوراک کے طور پر من اور سلویٰ نازل فرمایا۔ اور ساتھ ہی حکم دیا کہ ہماری عطا کردہ روزی میں سے پاک چیزیں کھاؤ نیز یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا۔ البتہ وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے تھے۔

مصر سے نکلنے کے بعد چالیس سال تک صحرائے سینا میں سرگرداں رہنے کا واقعہ سورۃ مائدہ میں بیان ہو چکا ہے۔ جب بنی اسرائیل نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر انہیں صحرا میں سرگرداں رکھا۔ سورۃ بقرہ میں صحرائے سینا کا یہ واقعہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل من و سلویٰ جیسی اعلیٰ غذا کھاتے کھاتے تنگ آ گئے اور پھر انہوں نے اس کے بجائے سبزی ترکاری، دال، لہسن، پیاز کا مطالبہ شروع کر دیا، کہنے لگے۔ کہ ہم ایک ہی کھانے پر اکتفا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہمارے لیے دوسری چیزیں مہیا کی جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ تم اعلیٰ خوراک کو چھوڑ کر ادنیٰ خوراک کو پسند کر رہے ہو مگر وہ اپنے مطالبے پر اڑے رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم اس بستی میں داخل ہو جاؤ، وہاں جا کر کاشت کرو، اپنی من پسند سبزیاں وغیرہ اگاؤ اور استعمال کرو۔ اب تمہیں کوئی چیز مفت نہیں ملے گی بلکہ تمہیں اس کے لیے محنت و مشقت کرنا پڑے گی۔ بستی میں داخلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعض شرائط بھی عاید کیں جن کا ذکر آج کے درس میں آ رہا ہے۔

عربی زبان میں بادیہ بالکل معمولی گاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ قریہ یعنی بستی کا اطلاق قصبات سے لے کر بڑے بڑے شہروں پر ہوتا ہے قرآن پاک میں سورۃ یوسف میں خود مصر کے لیے بھی قریہ کا لفظ آیا ہے وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا قرآن پاک

میں مکہ مکرمہ اور طائف کو قَرْیَتَیْنِ یعنی دو بستیاں کہا گیا ہے ، یہ دونوں بھی بڑے شہر ہیں ۔ بہرحال اللہ نے فرمایا ، اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ جب بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اس بستی میں سکونت اختیار کرو۔ یہ واقعہ پیش آنے کے زمانے کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا مذکورہ بستی میں داخلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی پیش آیا تاہم اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا۔ یہ بستی کونسی تھی جس میں داخلے کا حکم ہوا ؟ اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ اریحا نامی بستی تھی جو کہ دشمن قوم کنعانیوں کے قبضے میں تھی۔ بعض نے ستیم کی بستی کا ذکر کیا ہے جو یروشلم سے تیس میل کے فاصلے پر تھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ کوئی بستی تھی جو یردن کی مشرق جانب آٹھ دس میل کی مسافت پر تھی۔ بہرحال اکثر والے اریحا نامی بستی کے حق میں ہے۔ اس بستی کے باشندوں سے جنگ کر کے اس پر قابض ہونا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ، بائبل کی روایت کے مطابق وہاں پر زبردست لڑائی کے بعد شہر فتح ہوا تو بنی اسرائیل اس میں داخل ہوئے

لبستی میں داخلہ

اللہ نے فرمایا ، اب تم اس بستی میں رہو ، کھیتی باڑی کرو ، غلہ اور سبزیاں اگاؤ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ اور جہاں چاہو اسمیں سے کھاؤ ، تمہارے لیے کوئی روک رکاوٹ نہیں ۔ البتہ اس بستی میں داخلے کے لیے دو شرائط پوری کرنا ہوں گی ۔ پہلی بات یہ ہے وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ شہر میں داخل ہوتے وقت حطۃ کہو۔ عربی زبان میں اس لفظ کا معنی اگرا دینا یا اتار دینا آتا ہے۔ اور یہاں پر معافی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ یعنی اے اللہ ہمارے گناہوں کو گرا دے اور ہمیں معاف کر دے ، اگر یہ لفظ عبرانی یا سریانی زبان کا ہے تو معنی پھر بھی یہی ہے کہ اے اللہ ! ہم

سے بڑی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ہمیں معاف فرمائیے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو استغفار کرنے کا حکم دیا۔ ظاہر ہے کہ معافی مانگنا، عاجزی اور انکساری کی علامت ہے اور معافی مانگنے والا شخص آئندہ ایسی غلطی کے عدم اعادہ کا وعدہ کرتا ہے۔ فرمایا استغفار کرتے ہوئے بستی میں داخل ہونا اور زبان سے کوئی بے ہودہ کلمہ نہ ادا کرنا کیونکہ ایسا کرنا غیر اسلامی اور غیر متمدن فعل ہے۔ جب غیر اسلامی تمدن والے لوگ کسی بستی کو فتح کرتے ہیں تو شان و شوکت سے تکبر و تجبر کا اظہار کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں، بینڈ باجے اور نعرہ بازی کے ساتھ داخلہ ہوتا ہے۔ ترانے گائے جاتے اور جشن منایا جاتا ہے۔ فرمایا یہ سب کافرانہ تمدن کی باتیں ہیں تم ایسا نہ کرنا بلکہ اپنی خطاؤں کی معافی طلب کرتے ہوئے داخل ہونا اس ضمن میں ہمارے لیے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ مشعل راہ ہے۔ جب آپ مکہ میں بحیثیت فاتح داخل ہوئے تو آپ کے سر مبارک پر خود پہنا ہوا تھا اور آپ کی گردن جھکی ہوئی تھی پھر جب آپ نے نزول فرمایا تو خود اتار دیا۔ آپ نے اپنی چچا زاد بہن ام ہانی کے ہاں قیام فرمایا، پھر غسل کیا اور آٹھ رکعت نماز ادا فرمائی۔ بہرحال بنی اسرائیل کو اللہ نے فرمایا کہ پہلی بات یہ ہے کہ استغفار کرتے ہوئے بستی میں داخل ہونا۔

داخلہ بحالت سجدہ

اور دوسری بات یہ ہے کہ وَادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا اور دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔ مفسرین نے یہاں پر سجدہ کے دو معنی کیے ہیں یعنی مکمل سجدہ یا صرف جھک جانا۔ سجدہ اور رکوع دونوں عاجزی کی علامت ہیں اور دونوں چیزیں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے روا ہیں۔ تو سجدہ کرنے سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ عاجزی کے ساتھ گردن کو جھکائے ہوئے داخل ہونا۔

اور غرور و تکبر کا اظہار نہ کرنا اور اگر سجدہ سے مراد سجدہ لیا تو معنی ہوگا کہ شکرانے کے نفل ادا کر کے بستی میں داخل ہونا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ابو جہل کے قتل پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو رکعت نماز نفل شکرانہ ادا فرمائے تھے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس امت کا فرعون واصل جہنم ہوا۔

فرمایا تعمیل حکم میں اگر یہ دونوں کام کر لوگے تو نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ہم تمہاری خطاؤں کو معاف کر دیں گے وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ اور نیکی کرنے والوں کو مزید انعام عطا فرمائیں گے۔ یہ س تاکید کے لیے ہوتا ہے کہ ہم ضرور بضرور ایسا کر دیں گے اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اب جب کہ یہ شہر تمہارے قبضے میں آگیا ہے تو اب اگر یہاں اللہ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے نیکی کا راستہ اختیار کرو گے تو مزید علاقے تمہارے تسلط میں آجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ عام قانون بھی ہے کہ اگر تم شکر کرو گے لَاَزِيْدَنَّكُمْ تو میں تمہیں مزید عطا کروں گا اور اگر ناشکری کرو گے اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے

بنی اسرائیل کی نافرمانی

فرمایا بنی اسرائیل نے ہمارے حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ان میں سے جو ظالم لوگ تھے انہوں نے بدل دیا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی، یہ مفسد ذہن کے لوگ تھے، یہ ہمیشہ الٹے چلتے تھے اللہ نے تو فرمایا تھا کہ شہر میں داخل ہوتے وقت حِطَّةٌ کہنا یعنی اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا۔ مگر بخاری شریف کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل نے حِطَّةٌ کی بجائے حِنْطَةٌ فِيْ شَعِيْرَةٍ کے الفاظ کہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پیٹے کے اندر گندم ہونی چاہیے ایسی

الٹ پلٹ باتیں کیں۔ اللہ نے دوسرا حکم یہ دیا تھا کہ سجدہ کرتے ہوئے یعنی عاجزی اور انکساری کے ساتھ گردن کو جھکائے ہوئے شہر میں داخل ہونا مگر حدیث شریف میں آتا ہے کہ ان لوگوں نے اکڑ دکھائی اور گردن کو جھکانے کی بجائے چوتڑوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اس طرح انہوں نے حکم عدولی کرتے ہوئے اللہ کے دونوں احکام کو تبدیل کر دیا۔

عذاب الٰہی

بنی اسرائیل کی نافرمانی کا نتیجہ یہ نکلا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح سے ہمکنار کرنے کا یقین دلایا مگر انہوں نے اس کی عائد کردہ شرائط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے کلمات کو تبدیل کر دیا۔ عذاب کی نوعیت کے بارے میں تورات کے باب گنتی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون کی وبا مسلط کر دی جس سے بکثرت اموات واقع ہونے لگیں جب طاعون پھیلتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے بستیوں کی بستیاں صاف ہو جاتی ہیں اور پھر اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو بلا وجہ سزا میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ بنی اسرائیل کو ان کے ظلم اور نافرمانی کی وجہ سے سزا ملی تھی۔ دوسرے مقام پر "يَفْسُقُوْنَ" کا لفظ بھی آتا ہے۔ کہ انہوں نے اللہ کی حکم عدولی کی تھی جو شخص بھی خدائی قانون تبدیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ اور یہ قانون صرف بنی اسرائیل ہی کے لیے نہیں بلکہ اللہ نے فرمایا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ "ہم ہر ناشکر گزار کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

سزا کی مختلف صورتیں

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ طاعون یا کوئی دیگر وبائی بیماری ہی سزا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے نافرمانوں کو سزا میں مبتلا

کرتا ہے۔ مثلاً یہ بھی اللہ کی طرف سے سزا ہے کہ کسی کی نیکی کرنے کی قوت ہی سلب کر لے۔ انسان کو علم بھی نہیں ہوتا مگر اس پر سزا وارد ہو چکی ہوتی تھی۔ غلامی میں مبتلا کر دینا، کفار کو غالب کر دینا، اور سیاسی یا اقتصادی طور پر مغلوب کر دینا بھی سزا کی ایک قسم ہے۔ آج کی اسلامی دنیا پر نظر ڈالیں تو کسی کو امریکہ نے جکڑا ہوا ہے اور کوئی روس کی غلامی میں مبتلا ہے۔ نہ ان کی اپنی سیاست ہے اور نہ معیشت۔ بڑی طاقتوں کے دست نگر ہیں، یہی تو سزا ہے۔ "رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ" "اے اللہ ہمیں ظالم قوم کے ہاتھ سے آزمائش میں نہ ڈالنا۔ برصغیر کے لوگ دو سو سال تک انگریز کی غلامی میں رہے مگر احساس تک نہیں ہوا ذلّت اٹھائی اور غلامی کو غلامی نہیں سمجھا۔ غلامی میں ذہن معکوس ہو جاتے ہیں یہ بھی سزا کی ایک صورت ہے اس وقت دنیا میں پچاس اسلامی ریاستیں ہیں اور سب کے سب غلام ہیں یا نیم غلام غلطی پر غلطی کر رہے ہیں مگر حق کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہاری ذلت کو اس وقت تک دور نہیں کریگا۔ حَتّٰى تَرْجِعُوْا اِلٰى دِيْنِكُمْ یہاں تک کہ تم دین کی طرف واپس نہ آجاؤ۔ جب تک دین سے دور رہو گے خدا تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا رہو گے۔ غلامی اقتصادی ہو یا سیاسی، جہالت مسلط ہو یا نیکی کی طاقت سلب ہو جائے یہ سزا ہی کی صورتیں ہیں، بہر حال اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو وبا کی صورت میں سزا دی۔

اب بھی جو کوئی من مانی کریگا، خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا، قانون خداوندی کے مطابق سزا میں مبتلا ہوگا، شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے، لا یترک عاصیا وہ کسی مجرم کو چھوڑتا نہیں اور انہیں اسباب کے دوران ہی سزا دیدی جاتی ہے دنیا میں تو ایسی سزا ملتی ہے اور آخرت میں تو تمام اسباب بھی معطل ہو جائیں گے اور پھر قطعی طور پر سزا ملیگی۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

ترجمہ :- اور پوچھیے آپ ان سے اُس بستی کا حال جو دریا کے کنارے پر تھی جب کہ یہ لوگ تعدی کرتے تھے ہفتے کے دن ۔ آتی تھیں ان کے پاس اُن کی مچھلیاں جس دن وہ ہفتہ کرتے تھے پانی کے اوپر تیرتی ہوئی اور جس دن ہفتہ نہیں کرتے تھے ، مچھلیاں نہیں آتی تھیں ان کے پاس اسی طرح ہم نے آزمایا اُن کو اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۱۶۳﴾

ربط آیات

بنی اسرائیل کے حوالے سے ایک بستی کا ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے جب انہوں نے اعلیٰ درجے کی نعمتوں کو چھوڑ کر ادنیٰ درجے کی چیزوں کا مطالبہ کیا تھا تو اللہ نے حکم دیا تھا کہ اریحا نامی بستی کے اصل باشندوں کے ساتھ جہاد کرو ، جب وہ فتح ہو جائے تو اس میں داخل ہو جاؤ ۔ وہاں کاشتکاری کرو تو تمہاری مطلوبہ اشیاء سبزی ، ترکاری ، دال ، پیاز لہسن وغیرہ میسر آجائیں گے ۔ مگر یہ لوگ جنگ کے لیے تیار نہ ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑائی کرو ، ہم یہیں بیٹھتے ہیں ۔ جب فتح حاصل ہو جائے تو ہمیں بتا دینا ، ہم اس بستی میں داخل ہو جائیں گے ۔ اس نافرمانی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انہیں چالیس سال تک صحرائے سینا میں سرگرداں رکھا ۔ پھر پرانے لوگ ختم ہو گئے اور نئی نسل آئی ۔ اس دوران اُن کی غلامی کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو گئیں اور آخر کار حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں انہوں نے جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔

یہ تو اریحا نامی بستی کا ذکر تھا۔ اب آج کے درس میں ایک دوسری بستی کا ذکر ہے۔ اس بستی سے متعلقہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف بستیوں کا ذکر کر کے بنی اسرائیل کی فاسد ذہنیت کو بیان کیا ہے کہ یہ لوگ جہاں بھی گئے، خرابیاں ہی کرتے رہے۔ صحرائی زندگی میں خرابیاں کیں تو وہاں سزا ملی۔ پھر بستی میں داخل ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو شرائط عاید کی تھیں، انہیں پورا نہ کیا جس کی وجہ سے خدا کی ناراضگی آئی، طاعون کی وبا پھیلی اور بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔ جس بستی کا اب ذکر ہو رہا ہے، وہاں بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی۔ مختلف حیلوں بہانوں سے اللہ کے احکام کو تبدیل کیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب آیا اور قوم کا ایک معتدبہ حصہ ہلاک ہو گیا۔

ایلہ کی بستی

ارشاد ہوتا ہے وَاسْـَٔلْهُمْ اے پیغمبر! آپ بنی اسرائیل سے دریافت کریں عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اس بستی کے متعلق جو سمندر کے کنارے پر تھی۔ حاضرۃ کے معنی سامنے ہوتا ہے اسی لیے حاضرۃ البلد شہر کے قریب شاملات وغیرہ کو کہتے ہیں۔ تو جس بستی کا ذکر ہو رہا ہے یہ بحیرہ قلزم کے کنارے پر واقع تھی۔ تورات میں اس کا نام ایلات اور تاریخ میں ایلہ آتا ہے۔ آج کل اسے عقبہ کہتے ہیں جس کے نام پر خلیج عقبہ مشہور ہے اسی نام پر بندرگاہ بھی ہے۔ چونکہ یہ ساحلی مقام ہے، یہاں کے اکثر باشندوں کا پیشہ ماہی گیری تھا، سمندروں اور دریاؤں کے کناروں پر آباد لوگوں کی گزران عموماً مچھلی کے شکار پر ہوتی ہے۔ آج بھی ساری دنیا کی آبادی کا چوتھا یا پانچواں حصہ ایسا

ہے جس کی معیشت کا دارومدار خشکی یا سمندری شکار پر ہے۔ ساحلی علاقوں کے رہنے والے لوگ مچھلیاں پکڑتے ہیں جب کہ جنگلوں اور صحراؤں کے باشندے عموماً جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ چنانچہ اس وسیع کاروبار کی مناسبت سے اسلام نے شکار کے احکام صادر کیے ہیں اور حلال و حرام کی تمیز سکھائی ہے، جانوروں کے شکار کی شرائط اور ذبح کا طریقہ بھی بیان کیا ہے اور پھر شکار کے متعلق حدود بھی بیان فرمائے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے شکار کا زیادہ تعاقب کرنے سے منع فرمایا ہے، فرمایا جو زیادہ تعاقب کرے گا، غافل بن جائیگا۔ اس قسم کے انہماک کی وجہ سے بعض اوقات نماز اور دیگر فرائض ضائع ہو جاتے ہیں، اس لیے اس معاملہ میں بھی میانہ روی ہی اختیار کرنی چاہیئے۔ بہرحال اس بستی کے لوگ بھی شکار پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بنگال کے لوگ عام طور پر مچھلی اور چاول پر گزارہ کرتے ہیں۔

ہفتے کے دن کا تقدس

مختلف اقوام کے نزدیک ہفتے کے مختلف ایام کو تقدس حاصل ہے مسلمانوں کے نزدیک جمعہ سید الایام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے باقی تمام ایام پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس دن جمعہ کی نماز خاص اہتمام کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے، تاہم دنیا کے دیگر کاروبار بھی نماز کے وقت کے علاوہ بدستور انجام دیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ جمعہ میں فرمایا گیا کہ جب جمعہ کی نماز ہو جائے فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ تو زمین میں پھیل جاؤ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ اور اللہ کا فضل یعنی روزی تلاش کرو۔ گویا اہل ایمان کے لیے اس مقدس دن میں مکمل طور پر کاروبار بند کرنا ضروری نہیں۔ اسی طرح نصاریٰ کے ہاں اتوار کا دن مقدس ہے جس دن وہ خصوصی عبادت کرتے ہیں۔ یہودیوں نے مقدس دن کے طور پر ہفتہ کو اختیار کیا اور ان کے

سیلئے حکم یہ تھا کہ اُس دن صرف عبادت کریں اور کوئی دوسرا کام نہ کریں۔ بلکہ یہودی لٹریچر میں تو یہ بھی ملتا ہے کہ اس دن یہودی کھانے بھی نہیں پکاتے تھے اور اُن کے چولہے ٹھنڈے پڑے رہتے تھے۔

بنی اسرائیل کی آزمائش

اب یہی مقدس دن یہودیوں کے لیے آزمائش کا سبب بن گیا۔ ایلہ کے لوگوں کا عمومی پیشہ ماہی گیری تھا مگر ان کے لیے حکم یہ تھا کہ ہفتے کے دن وہ مچھلیاں نہیں پکڑ سکتے تھے۔ کچھ دیر تک تو انہوں نے اس حکم پر عمل کیا مگر آہستہ آہستہ حیلے بہانے سے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ اس آیت کریمہ میں یہودیوں کی اسی نافرمانی کا بیان ہے۔

اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے پیغمبر! ذرا آپ ان سے اُس بستی کا حال دریافت کریں جب کہ یہ لوگ ہفتے کے دن میں تعدی کرتے تھے حکم تو یہ تھا کہ ہفتے کے دن مچھلی کا شکار بھی نہ کرو مگر انہوں نے اس کے لیے یہ حیلہ کیا اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا جب آتی تھیں ان کے پاس اُن کی مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی کے اوپر تیرتی ہوئیں۔ شُرَّعًا شَارِعٌ کی جمع ہے جس کا معنی پانی پر تیرنا، اچھلنا، سامنے آنا، نمایاں ہونا یا اوپر آنا ہوتا ہے ہفتہ کے دن مچھلیاں کثرت سے پانی کی سطح کے اوپر آ جاتی تھیں۔ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش تھی کہ یہ لوگ ہفتہ کے دن کا کس قدر احترام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آزمانا چاہتے تھے کہ کیا یہ اس دن شکار سے باز رہتے ہیں یا نہیں۔ تو ہفتے کے دن تو مچھلیاں کثرت سے آتی تھیں وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ اور جس دن ہفتہ نہیں ہوتا تھا یعنی ہفتے کے علاوہ باقی ایام میں اُن کے پاس مچھلیاں نہیں آتی تھیں یعنی بہت کم تعداد میں آتیں اور وہ بہت کم شکار کر پاتے گویا

ہفتے کے روز مچھلیوں کی کثرت ہوتی اور اگلے ہی دن غائب ہو جاتیں فرمایا کَذٰلِكَ نَبْلُوهُمْ ہم اس طرح ان کو آزماتے تھے بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ اس لیے کہ یہ لوگ نافرمانی کرتے تھے تو اللہ نے انہیں آزمائش میں ڈال دیا۔

بنی اسرائیل کی حیلہ سازی

ہفتہ کے دن مچھلیوں کی کثرت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اہل بستی نے یہ حیلہ کیا کہ سمندر کے کنارے بڑے بڑے حوض بنائے اور انہیں نالیوں کے ذریعے سمندر سے ملا دیا۔ ہفتے کے دن جب مچھلیاں کثرت سے سطح آب پر نمودار ہوتیں تو سمندر کا پانی نالیوں کے ذریعے حوضوں پر چھوڑ دیتے جس کے ساتھ بہت سی مچھلیاں بھی بہہ کر حوضوں میں جمع ہو جائیں۔ اس کے بعد پیچھے بند لگا دیتے تاکہ مچھلیاں واپس سمندر میں نہ چلی جائیں۔ پھر جب اگلا دن یعنی اتوار کا دن آتا تو ان مچھلیوں کو آسانی سے حوضوں سے پکڑ لیتے۔ اس طرح وہ ہفتے کے دن مچھلیوں کو جمع کرتے اور اتوار کے دن انہیں پکڑ لیتے۔ اس طرح وہ اللہ کے حکم کی عملی طور پر خلاف ورزی کرتے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اے میری امت کے لوگو! لَا تَرْتَكِبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ فَتَسْتَحِلُّوا مَحَارِمَ اللّٰهِ بِأَدْنَى الْحِيَلِ اس چیز کا ارتکاب نہ کرنا جس کا یہودیوں نے کیا کہ اس طرح تم بھی معمولی حیلوں سے اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھنے لگ جاؤ۔ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُودَ کہ یہودیوں پر اللہ کی لعنت ہو کہ انہوں نے حرام چیز کو حیلے کے ساتھ حلال قرار دیا۔ اللہ نے ان کے لیے چربی حرام کی تھی مگر وہ چربی کو خود تو نہیں کھاتے تھے مگر اس کو بیچ کر اس کے پیسے کھا جاتے تھے۔ یہ بھی ان کی غلط حیلہ سازی تھی۔ اس واقعہ

میں یہودیوں نے حیلے سے ہفتے کے دن کے تقدس کو پامال کیا۔ اس قسم کی حیلہ سازی اس زمانے میں پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال کا بیشتر حصہ مالِ نصاب اپنی ملکیت میں رکھتے ہیں اور سال کے آخر میں یہی مال بیوی کے نام ہبہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایسے مال پر کسی ایک فرد کی ملکیت میں سال پورا نہیں ہو پاتا اور ان میں سے کوئی بھی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ اس قسم کی حیلہ سازی بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ ایسا شخص زکوٰۃ کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

امام ابو یوسفؒ کا زہد

بعض لوگ اس قسم کی حیلہ سازی کو امام ابو یوسفؒ کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں حالانکہ آپ تو متقی اور خوفِ خدا رکھنے والے تھے آپ تو ہمیشہ حق بات پر ڈٹ جایا کرتے تھے اور رعب یا لالچ آپ کے راستے میں کبھی حائل نہیں ہوا تھا۔ آپ ہارون الرشید کے زمانہ میں قاضی القضاۃ (CHIEF JUSTICE) بھی رہے ہیں۔ آپ نے انتظامِ حکومت کے متعلق ہارون الرشید کو بڑا واضح خط لکھا اور اس میں ذرا رُو رعایت نہ کی۔ آپ کی زہد و عبادت کا یہ حال تھا کہ چوبیس گھنٹے میں دو سو رکعت نفل ادا کرتے حالانکہ آپ کو عدلیہ کی اہم ذمہ داری بھی پوری کرنا ہوتی تھی۔ امام احمد بن حنبلؒ کے متعلق "شرح ثلاثیات" میں ہے کہ ہر روز ساڑھے تین سو رکعت نفل ادا کرتے تھے پھر جب ضعیف ہو گئے تو نوافل کی تعداد کم کر کے اڑھائی سو کر دی۔ بہر حال اس قسم کے عابد و زاہد لوگوں کے متعلق گمان کرنا کہ وہ کسی غلط بات کو جائز قرار دیتے ہوں، ہرگز درست نہیں ہے۔ البتہ یہودیوں نے مچھلی کے متعلق جو حیلہ اختیار کیا، وہ قطعاً ناجائز تھا بلکہ احکامِ الٰہی کا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔

جائز حیلہ

غرضیکہ ایسا حیلہ حرام ہے جس کے کرنے سے کوئی فرض ضائع ہوتا ہو۔ البتہ ایسا حیلہ کرنا جائز ہے جس کے کرنے سے انسان کسی حرام چیز

سے بچ جائے۔ اس قسم کے حیلہ کا جواز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے
بھی ثابت ہے۔ مثلاً ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں
بڑی اعلیٰ درجے کی کھجوریں بطور تحفہ پیش کیں۔ آپ نے دریافت کیا،
کیا تمہارے ہاں ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں، تو اس نے عرض کیا کہ
ہم ادنیٰ قسم کی کھجوریں زیادہ مقدار میں ادا کر کے اس کے بدلے میں اعلیٰ
قسم کی کم کھجوریں حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح اعلیٰ قسم کی کھجوریں آپ
کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ آپ نے فرمایا ذٰلِكَ عَيْنُ الرِّبٰوا یہ
تو سود ہے۔ جنس کا تبادلہ جنس کے ساتھ برابری کی بنیاد پر ہونا چاہیئے
تھوڑی چیز کے بدلے زیادہ حاصل کرنا تو سود کے مترادف ہے لہذا
ایسا نہ کیا کرو۔ بلکہ اس کا جائز طریقہ یہ ہے کہ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ
اپنی کھجوروں کو درہموں کے بدلے مناسب قیمت پر بیچ دو اور اس
نقدی سے اعلیٰ درجے کی کھجوریں خرید و۔ اس طرح تم سود کے لین دین
سے بچ جاؤ گے۔ اس قسم کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی
بیان فرمائی ہے۔ سورۃ یوسف میں موجود ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام
اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس مصر میں روک لینا چاہتے تھے مگر ملکی
قانون کے تحت ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اللہ نے فرمایا كَذٰلِكَ كِدْنَا
لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ ہم
نے یوسف علیہ السلام کو تدبیر بتلائی کیونکہ مصری قانون کے تحت وہ
بھائی کو نہیں روک سکتے تھے۔ تدبیر یہ تھی کہ غلہ ماپنے کا پیمانہ بھائی
کے سامان میں رکھ دیا جو تلاش کرنے پر برآمد ہو گیا۔ مصر بھائیوں سے
پوچھا کہ تمہارے ہاں چوری کی سزا کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ جس
پر چوری ثابت ہو جائے اُسے سال بھر مالک کی غلامی میں رہنا پڑتا ہے
چنانچہ اس بہانے سے یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو مصر میں روک لیا

اِس قسم کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام کو بھی بتلائی تھی۔ بیماری کی حالت میں اپنی بیوی سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور قسم اٹھائی کہ تندرست ہونے پر اسے سو چھڑیاں ماروں گا۔ بیوی بڑی نیک، پارسا اور خدمت گزار تھی مگر ناراضگی کی کوئی وجہ پیدا ہو گئی، اور آپ نے قسم اٹھالی۔ پھر جب تندرست ہو گئے اور قسم پورا کرنے کا وقت آیا تو اللہ نے یہ حیلہ بتایا کہ سو تنکے جوڑ کر ایک چھڑی بنا لو اور پھر ایک ہی دفعہ مارنے سے تمہاری قسم بھی پوری ہو جائیگی اور بیوی کو زیادہ مشقت بھی برداشت نہیں کرنا پڑیگی۔

بنی اسرائیل کا حیلہ ایسا نہیں تھا بلکہ یہ تو حکمِ الٰہی کی صریح خلاف ورزی تھی۔ انہوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کو حوضوں میں بند کر کے غلط حیلہ بازی کی اور خدا کے غضب کا شکار ہوئے۔ اب آگے واقعہ کی مزید تفصیلات اور بنی اسرائیل کی سزا کا ذکر آرہا ہے۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٤﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿١٦٦﴾

ترجمہ: اور جب کہا ایک امت نے اُن میں سے کیوں نصیحت کرتے ہو تم اِن لوگوں کو کہ اللہ اُن کو ہلاک کرنا چاہتا ہے یا اُن کو سزا دینا چاہتا ہے سخت سزا۔ تو انہوں نے کہا کہ الزام اتارنے کے لیے تمہارے پروردگار کے سامنے اور شاید کہ یہ ڈر جائیں ﴿١٦٤﴾ جب کہ اُنہوں نے فراموش کر دیا اس بات کو جس کے ساتھ اُن کو نصیحت کی گئی تھی، تو ہم نے نجات دی اُن لوگوں کو جو منع کرتے تھے برائی سے، اور پکڑ لیا ہم نے اُن لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا سخت عذاب میں، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿١٦٥﴾ پھر جب وہ سرکشی میں بڑھ گئے جس سے اُن کو منع کیا گیا تھا تو ہم نے کہا اُن کو ہو جاؤ بندر ذلیل ﴿١٦٦﴾

ربط آیات — مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل صحرائے سینا میں آباد ہوئے اس صحرا میں

اللہ تعالیٰ نے اُن پر طرح طرح کے انعامات کیے۔ پینے کے لیے معجزانہ طور پر پانی کا انتظام کیا، سائے کے لیے بادلوں کو بھیج دیا۔ اور من و سلویٰ جیسی اعلیٰ خوراک مفت فراہم کی مگر ان لوگوں نے انعامات الٰہی کی قدر نہ کی اور اعلیٰ درجے کے کھانے کے بجائے ساگ پات، دال، لہسن اور پیاز وغیرہ کا مطالبہ کیا۔ اللہ نے فرمایا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں کے باشندوں سے جہاد کر کے بستی پر قابض ہو جاؤ تو وہاں تمہیں مطلوب اشیاء کاشتکاری کے ذریعے حاصل ہو سکیں گی۔ ان لوگوں نے جہاد کرنے سے انکار کیا جس کی وجہ سے اللہ کی ناراضگی آئی اور یہ چالیس سال تک اسی صحرا میں سرگرداں رہے بنی اسرائیل کی تاریخ کے دوران ایک اور بستی ایلہ کا واقعہ بھی پیش آیا۔ ان لوگوں کی معیشت مچھلی کے شکار پر تھی سمندر کے کنارے ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگ ماہی گیری کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے حکم دے رکھا تھا کہ ہفتے کے چھ دن خوب شکار کرو مگر ساتواں دن یعنی ہفتہ صرف عبادت کے لیے مخصوص کر دو۔ اس دن کوئی کاروبار نہ کرو۔ پھر اللہ نے اسی بات میں ان پر آزمائش ڈالی مگر یہ لوگ اس آزمائش میں پورے نہ اترے اور حیلے بہانے سے ہفتہ کے دن بھی شکار کرنے لگے۔ یہ بیان گذشتہ درس میں گزر چکا ہے اور اب آج کے درس میں ان اچھے لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے ہفتے کے دن شکار کرنے والوں کو روکنا چاہا۔ اور پھر جب وہ باز نہ آئے تو ان پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوا۔ ان کی شکلیں تبدیل ہو گئیں اور آخر کار تین دن بعد ہلاک ہو گئے۔

بنی اسرائیل کے تین گروہ

جب بنی اسرائیل حکم خداوندی کے خلاف حیلے بہانے سے ہفتے کے دن بھی شکار کرنے لگے تو ان کے تین گروہ بن گئے۔ پہلا گروہ ان لوگوں کا تھا جو دھڑلے کے ساتھ ہفتہ کو شکار کرتے تھے اور منع کرنے

کے باوجود باز نہیں آتے تھے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو تعدی کرنے والوں کو حکم خداوندی سے آگاہ کرتے تھے۔ انہیں خوف دلاتے تھے اور اُس دن شکار کرنے سے منع کرتے تھے۔ گویا یہ وہ لوگ تھے۔ جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو خود تو ہفتے کے دن شکار نہیں کرتے تھے، مگر شکار کرنیوالوں کو منع بھی نہیں کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے ایک چوتھے گروہ کا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے تعدی کرنے والوں کو ابتداء میں منع کیا۔ مگر جب وہ باز نہ آئے تو انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ تاہم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق پہلے تین گروہ ہی زیادہ مشہور ہیں۔ یعنی (۱) شکار کرنے والے (۲) روکنے والے اور (۳) خاموشی اختیار کرنیوالے

روکنے والے اور خاموشی اختیار کرنیوالے

اب یہاں پر شکار سے روکنے اور خاموشی اختیار کرنے والوں کے درمیان مکالمے کا ذکر ہو رہا ہے۔ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ اور جب اُن میں سے ایک گروہ یعنی خاموشی اختیار کرنے والوں نے روکنے والوں سے کہا لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو۔ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرنا چاہتا ہے یا سخت عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ اس پر نہی عن المنکر کرنے والوں نے جواب دیا قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ ہم اس لیے انہیں منع کرتے ہیں تاکہ تمہارے پروردگار کے سامنے پیش کر سکیں۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ ہمیں پوچھے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے غلط کام ہوتا تھا تو تم نے روکا کیوں نہ، تو ہم کہہ سکیں کہ پروردگار! ہم نے تو ان کو بہت سمجھایا مگر انہوں نے ہماری بات پر کان نہ دھرا۔ کسی کو برائی سے روکنے کے تین ہی طریقے ہیں۔ اعلیٰ طریقہ تو یہ ہے کہ برائی کو طاقت کے ساتھ

دبا دیا جائے۔ اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کی جائے اگر کوئی شخص زبان سے روکنے کی ہمت بھی نہیں پاتا تو نہی عن المنکر کا ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ اس برائی کو دل سے برا جانے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جب بعض لوگ دیکھیں کہ ان کے درمیان برائی کا ارتکاب ہو رہا ہے اور وہ منع نہ کریں تو خطرہ ہے کہ سارے کے سارے ہی ہلاک نہ ہو جائیں۔ سورۃ مائدہ میں گزر چکا ہے "کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ" کہ اہل علم لوگ اپنے سامنے برائی ہوتی دیکھتے تھے مگر منع نہیں کرتے تھے۔ تو یہ برائی ان میں مسلسل آرہی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ میں بھی ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو خود تو خاموش تھے۔ برائی سے نہیں روکتے تھے مگر روکنے والوں کو بھی کہتے تھے کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں منع کرتے ہو۔ تو منع کرنے والوں نے روکنے کی پہلی وجہ یہ بیان کی تاکہ وہ اللہ کے سامنے عذر پیش کر سکیں اور دوسری وجہ یہ کہ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ شاید یہ ڈر جائیں اور ہفتہ کے دن شکار کرنے سے باز آجائیں اور اس طرح عذاب الٰہی سے بچ سکیں۔

آخر دم تک تبلیغ

اصلاح کے پروگرام کو ہمیشہ جاری رکھنا چاہیئے اور اگر کوئی نہیں مانتا تو اس سے مایوس ہو کر پروگرام کو ترک نہیں کرنا چاہیئے بلکہ آخر دم تک اصلاح کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ البتہ مفسر قرآن حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ اگر پوری کوشش کے بعد مبلغ کو یقین ہو جائے کہ اس کی بات اثر انداز نہیں ہو رہی ہے تو پھر نہی عن المنکر واجب تو نہیں رہتا۔ البتہ عالی ہمتی اسی میں ہے کہ برائی سے منع کرتا رہے۔ اور جہاں امید باقی ہو کہ شاید یہ سمجھ جائیں گے تو وہاں منع کرنا واجب ہوتا ہے۔ انبیاء اور ان کے متبعین کی یہ صفت ہے کہ وہ آخر دم تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا

فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ یہ قابلِ قدر کام ہے اور اہلِ حق نے اس کی پاداش میں بڑے بڑے مصائب برداشت کیے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ بعض بزرگوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہا۔ چوتھی پانچویں صدی کے امام شمس الدین سرخسیؒ بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ مبسوط آپ کی بڑی مشہور و معروف کتاب ہے۔ حاکمِ وقت نے طلاق کے مسئلہ میں غلطی کی۔ آپ نے ہر چند سمجھایا کہ عدت گزرنے کے بعد نکاح کرو مگر بادشاہ نہ مانا بلکہ آپ کو گرفتار کر کے پندرہ سال تک کے لیے اندھے کنوئیں میں قید کر دیا۔ یہ کتاب آپ نے اسی قید کے زمانے میں لکھی۔ آپ کے شاگرد کنوئیں میں آ کر بیٹھ جاتے تھے آپ کنوئیں میں سے لکھاتے جاتے اور شاگرد لکھتے جاتے۔ اس طرح یہ ضخیم کتاب تالیف ہوئی جو فقہ کی معتبر کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

تاریخ میں کئی بزرگوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو جابر حاکموں کا تختۂ مشق بنے ایسے ہی ایک اہلِ حق کا واقعہ ہے کہ بادشاہِ وقت کو کسی برائی سے منع کیا تو وہ طیش میں آ گیا۔ جلادوں کو حکم دیا کہ اس کے دانت اکھاڑ کر اس کے سر پر ٹھونک دو۔ سزا دی گئی مگر ایمان والے کا ایمان متزلزل نہ ہوا اور وہ حق کا اعلان کرتا رہا۔ جب تک امت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ باقی رہا۔ امت زندہ رہی اور جب یہ جذبہ کمزور پڑ گیا تو امت بھی کمزور ہو گئی۔ بہرحال حق کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہنا چاہیے اور اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن بعض انبیاء اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تن تنہا پیش ہوں گے۔ ساری عمر فریضہ تبلیغ ادا کرنے کے باوجود ایک بھی امتی پیدا نہ کر سکے ہوں گے تاہم چونکہ انہوں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ اس لیے امتی نہ ہونے کا ان پر کوئی عذر نہیں ہوگا۔

ظالموں کے لیے سزا

آگے اللہ تعالیٰ نے منع کرنے والوں کی جزا اور نافرمانی کرنے والوں کی سزا کا ذکر کیا ہے۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ جب انہوں نے فراموش کر دیا اُس چیز کو جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی یعنی نافرمان لوگوں نے ناصحین کی نصیحت پر کوئی توجہ نہ دی، تو فرمایا اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ برائی سے منع کرنے والوں کو ہم نے نجات دیدی وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِیْسٍ اور ظلم کرنے والوں کو ہم نے سخت سزا میں پکڑ لیا۔ وجہ ظاہر ہے بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ کہ وہ نافرمان تھے۔ فاسق کا معنیٰ قانون کو توڑ کر اس سے باہر نکلنے والا۔ یہ فاسق تھے، سمجھانے والے سمجھاتے رہے برائی سے منع کرتے رہے مگر انہوں نے پرواہ نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سزا میں مبتلا ہوئے جس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ پھر جب وہ سرکشی میں بڑھ گئے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا تو ہم نے کہا ہو جاؤ بندر ذلیل

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جب ناصحین کی نصیحت کے باوجود وہ لوگ ہفتے کے دن شکار کرنے سے باز نہ آئے تو انہوں نے شکار کرنے والوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ درمیان میں دیوار کھڑی کر دی آنے جانے کا راستہ تھا مگر بحیثیت مجموعی انہوں نے نافرمانوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ میل جول رکھنے سے کہیں وہ بھی ان کے ساتھ گرفتار بلا ہو جائیں۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ صبح اٹھے تو نافرمانوں کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ دیوار پر سے جھانک کر دیکھا تو ہر گھر میں انسانوں کی بجائے بندر تھے۔ مرد عورتیں سب بندروں کی شکل میں تبدیل ہو چکے تھے۔ تاریخی روایات میں ان لوگوں کی تعداد بیس ہزار سے ستر ہزار تک بیان کی گئی ہے۔ سورۃ مائدہ میں بندروں کے ساتھ خنزیروں کا ذکر بھی ملتا ہے "وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ" یعنی ہم نے انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا۔ بعض مفسرین

فرماتے ہیں کہ ان میں سے بڑے بوڑھوں کو خنزیر کی شکل میں اور جوانوں کو بندر کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر مسخ شدہ شکلوں والے خنزیر اور بندر اپنے منع کرنے والے رشتہ داروں کو پہچان کر ان کے پاؤں پر اپنے سر رکھتے تھے، آہ وزاری کرتے تھے اور اپنے جرم پر پشیمان ہوتے تھے۔ مگر خدا کا عذاب وارد ہو چکا تھا۔ صرف تین دن زندہ رہنے کے بعد سب ہلاک ہو گئے۔ سورۃ بقرہ میں آتا ہے "فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا" ہم نے اس واقعہ کو موجود لوگوں اور آئندہ آنے والوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا۔ اور متقین کے لیے نصیحت بنا دیا کہ خدا کا عذاب اس صورت میں بھی آ جاتا ہے کہ نافرمانوں کی شکلیں ہی تبدیل کر دی جائیں۔

خنزیر اور بندر معلون ہیں

خنزیر اور بندر دونوں ملعون ہیں۔ اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر انسانوں کی شکلیں جن جانوروں کی شکلوں میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ جانور ملعون اور قطعی حرام ہوتے ہیں۔ خنزیر نجس اور ناپاک جانور ہے اور یہ تمام شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ بندر نقال قسم کا بد وضع جانور ہے اور اس میں غیر فطری افعال بھی پائے جاتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ بندر کے سوا کسی دوسرے جانور میں ہم جنسی کی بیماری نہیں پائی جاتی۔ انسانوں میں یہ لعنت لوط علیہ السلام کے زمانے میں شروع ہوئی اور اب ساری دنیا میں پھیل چکی ہے بلکہ انگریزوں نے تو اسے قانوناً جائز قرار دے دیا ہے حالانکہ یہ ایسا غیر فطری فعل ہے جو عام جانوروں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ صرف بندر میں یہ چیز پائی جاتی ہے جسے اللہ نے ذلیل قرار دیا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ وہ تمام جانور حرام ہیں جن کی شکلوں میں انسانوں کو تبدیل کیا گیا۔ ان میں خنزیر، بندر، چوہے اور گوہ وغیرہ شامل ہیں۔ اگرچہ مسخ شدہ شکلوں والے لوگ تین دن سے زیادہ زندہ

نہیں ہے تاہم اُس شکل و صورت کے جانور انسان کے لیے قطعی حرام ہیں کیونکہ یہ انسانی مزاج کے خلاف ہیں اور اس شکل میں خدا کی لعنت پائی جاتی ہے ۔ جو انسان ایسے جانور کا گوشت کھائے گا وہ بھی لعنتی ہوگا ۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اُن قانون شکن لوگوں کو سزا دی کیونکہ انہوں نے ہفتے کے دن شکار کیا تھا ۔ اس اصول کی بنیاد پر بلا عذر شرعی روزہ نہ رکھنے والا بھی ملعون ہے کیونکہ اس نے قانون خداوندی کو توڑا ہے

قرب قیامت میں تشریح ثالث

خدا کا قانون ہے کہ ظلم اور نافرمانی کرنے والوں کو سزا ضرور ملتی ہے خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو ۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا دور تشریح ثانی کا دور ہے ۔ اس میں سزا کے طور پر ظاہری شکلیں تو تبدیل نہیں ہوتیں البتہ بہت سے انسانوں کے باطن خنزیروں ، بندروں اور کتوں جیسے ہو جاتے ہیں ۔ پھر جب قرب قیامت میں تشریح ثالث کا ظہور ہوگا تو پھر سزا کے طور پر کہیں کہیں شکلیں بھی تبدیل ہوتی نظر آئیں گی سزا کے طور پر بعض لوگ زمین میں دھنسا دیے جائیں گے اور بعض دوسرے ظاہری عذاب میں بھی آئیں گے مگر ایسے عذاب مجموعی طور پر نہیں آئیں گے بلکہ کہیں کہیں ایسے واقعات پیش آئیں گے اور اکا دکا لوگوں کی کبھی شکل بھی مسخ ہوگی ۔ کبھی اوپر سے پتھر برسیں گے اور کبھی زمین میں دھنسا دیے جائیں گے ۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ؗ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

ترجمہ: اور (اس وقت کو دھیان میں لاؤ) جب خبردار کیا تیرے پروردگار نے کہ وہ ضرور بھیجے گا اُن (یہود) پر قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو جو اُن کو سزا دیں گے بُرے طریقے سے ۔ بیشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا اور بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے (۱۶۷) اور ہم نے جُدا جُدا کر دیا اُن کو زمین میں مختلف فرقوں میں ۔ بعض اُن میں سے نیک ہیں اور بعض اُن میں سے اس کے سوا (دوسری طرح) ہیں ۔ اور ہم نے آزمایا اُن کو نیکیوں کے ساتھ اور برائیوں کے ساتھ تاکہ یہ لوگ واپس لوٹ آئیں (۱۶۸)

ربط آیات

گزشتہ درس میں یہودیوں کے اُس گروہ کی سزا کا ذکر تھا جو ہفتے کے دن تعدی کرتے تھے اور منع کرنے والوں کی نصیحت پر بھی عمل نہیں کرتے تھے ۔ بالآخر جب وہ سرکشی میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو بندروں کی شکل میں تبدیل کر دیا ۔ اور تین دن کے بعد صفحۂ ہستی سے بالکل ناپید ہو گئے ۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ

کو موجودہ اور آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے باعثِ عبرت بنا دیا۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی بعض دوسری نافرمانیوں کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ صحرائے سینا میں من اور سلویٰ کھاتے کھاتے جب تنگ آ گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے سبزی ترکاری کا سوال کیا۔ اللہ نے فرمایا کہ اس بستی کے رہنے والوں سے جہاد کرکے بستی پر قابض ہو جاؤ تو وہاں تمہیں تمہاری مطلوبہ اشیاء میسر ہوں گی۔ ان لوگوں نے جہاد سے انکار کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی ناراضگی کی وجہ سے چالیس برس تک اسی صحرا میں سرگرداں پھرتے رہے پھر موسیٰ علیہ السلام کے جانشین یوشع علیہ السلام کے زمانے میں نئی پود آئی تو وہ آمادۂ جہاد ہوئی۔ اللہ نے بستی میں داخلے کے لیے دو شرائط عائد کیں۔ ایک یہ کہ معافی مانگتے ہوئے عاجزی کے ساتھ داخل ہونا اور دوسرا یہ کہ زبان سے کوئی بیہودہ بات نہ کرنا، مگر ان لوگوں نے دونوں شرائط کی خلاف ورزی کی، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون کی بیماری مسلط کی جس سے ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے، جیسا کہ سورۃ مائدہ میں ذکر آتا ہے، بنی اسرائیل کی ایسی ہی نافرمانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر حضرت داؤد علیہ السلام اور پھر آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لعنت بھیجی اور اللہ نے یہود کو بحیثیت مجموعی مغضوب اور ملعون قرار دیا۔

بنی اسرائیل کو نوٹس

اب آج کے درس میں یہودیوں پر ہونے والی لعنت اور غضب کے نتیجے میں ان پر جو افتاد آئی، اس کا ذکر ہو رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے خبردار کیا یعنی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نوٹس دیا کہ تمہاری ان پے در پے خرابیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے تم پر مستقل ذلت مسلط کی جا رہی ہے جس میں تم قیامت تک مبتلا رہو گے۔ فرمایا تمہارے پروردگار نے انہیں خبردار کر دیا لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ کہ ضرور بھیجے گا ان پر إِلَىٰ يَوْمِ

الْقِيٰمَةِ قیامت کے دن تک کے لیے مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ایسے لوگوں کو جو انہیں بُرے طریقے سے سزا دیں گے۔ یہاں پہ قیامت کے دن سے مراد وہی دن نہیں جب قیامت فی الواقع برپا ہو جائے گی۔ بلکہ اس سے قربِ قیامت مراد ہے۔ قربِ قیامت میں جب مسیح علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ تمام یہودیوں کو قتل کر دیں گے حتیٰ کہ ان کا سردار دجال بھی آپ کے ہاتھوں قتل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں پہ ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے اس وقت یعنی قربِ قیامت تک مختلف ذرائع سے ذلت مسلط رہے گی۔

اذان کا مفہوم

یہاں پر تَاَذَّنَ کا لفظ غور طلب ہے جس کا معنی خبردار کرنا یا اعلان کرنا ہے۔ یہ لفظ سورۃ توبہ میں بھی آیا ہے وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ حج کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بیزار ہے۔ چنانچہ اس سال کے بعد مشرکین کا مکہ معظمہ میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ نماز کے لیے جو اعلان کیا جاتا ہے، لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اس کو بھی اذان ہی کہا جاتا ہے۔ تاہم اب اذان کا لفظ مخصوص اصطلاح بن گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خاص الفاظ کے ساتھ نماز کا اعلان کیا جائے۔ یہ مخصوص اذان نماز کے علاوہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کسی جگہ سے شیاطین کو بھگانے کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے اذان کہنا درست نہیں ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس مقدس اذان کو اب سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا ہے بعض سیاسی لیڈر لوگوں کو ترغیب دے رہے ہیں کہ حکومت کی تبدیلی کے لیے گلی کوچوں میں اذانیں دو۔ اذان تو نماز کے لیے مخصوص ہے۔ نماز کے وقت کے علاوہ اذان دینا تو بدعت

میں شمار ہوگا، مگر لوگ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟ بھائی! بدعات انجام دینے والے اکثر یہی کہتے ہیں کہ حرج کیا ہے؟ اگر بدعات ہی انجام دینا ہے تو پھر دین کدھر گیا؟ دین کے اصول و ضوابط کہاں گئے؟ بدعت تو ایسا دبندرہ ہے اور اس کے لیے سخت وعید آئی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سامنے اعلان کر دیا یعنی ان کو خبردار کر دیا کہ میں قیامت تک کے لیے ان پر ایسے لوگ مسلط کر دوں گا جو انہیں سخت سزا میں مبتلا رکھیں گے۔

یہودیوں کی دائمی ذلت

مچھلی کے شکار والا واقعہ مسیح علیہ السلام سے تقریباً سات سو سال پہلے پیش آیا۔ اس وقت سے لیکر یہودیوں پر مسلسل ذلت مسلط رہی ہے اور بقرب قیامت تک اسی طرح رہیگی۔ یہ لوگ کبھی بخت نصر کی غلامی میں رہے اور کبھی رومیوں اور کلدانیوں کے تسلط میں پستے رہے اور ان کے مظالم برداشت کرتے رہے۔ پھر حضور علیہ السلام کے زمانے میں بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے یہودیوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بڑی سازشیں کیں جس کی وجہ سے یہاں کے یہودی کچھ تہ تیغ کر دیئے گئے اور کچھ جلاوطن ہوئے۔ جب یہودیوں کا گڑھ خیبر فتح ہو گیا تو انہوں نے اپنی نصف پیداوار کے عوض وہیں آباد رہنے کی درخواست کی۔ حضور علیہ السلام نے اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی کہ ہم جب چاہیں گے تمہیں یہاں سے بے دخل کر دیں گے۔ چنانچہ آپ کی خصوصی وصیتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ میرے بعد تمام یہودیوں کو جزیرہ نما عرب سے نکال دینا، اس سرزمین پر کوئی غیر مذہب جزیرہ نہیں رہ سکے گا۔ مرکز اسلام میں صرف مسلمان ہی رہیں گے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں یہودیوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔

یہودی آج تک پوری دنیا میں محکوم ہی رہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم

میں ساٹھ ہزار یہودیوں کو سخت ترین سزائیں دے کر ہلاک کیا گیا۔ ہٹلر کیلئے
ثابت ہوگیا تھا کہ یہ بڑے سازشی لوگ ہیں۔ ان کے پیٹوں میں ہوا بھر کر
ڈنڈا پٹا کر مارا گیا حتیٰ کہ ساری دنیا میں اُن کے حق میں جذبہ ترحم پیدا ہوگیا۔
یہ مغضوب قوم ہے، دُنیا میں کہیں بھی ان کی آزاد حکومت نہ کہیں پہلے
رہی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ ہاں یہ لوگ ذلت سے اسی صورت میں بچ
سکتے ہیں "إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ"
(آل عمران) کہ یا تو اللہ کی رسی کو پکڑ لیں یعنی ایمان لے آئیں یا لوگوں کی
رسی کو تھام لیں۔ آج انہوں نے امریکہ کی رسی کو پکڑا ہوا ہے اور اسی
کے سہارے پر زندہ ہیں۔ اگر امریکہ آج ان کے سر سے ہاتھ اٹھا لے
تو یہ دو دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اسرائیلی ریاست کا قیام دراصل
ان کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخفی تدبیر ہے
یہی وہ علاقہ ہے جہاں قرب قیامت میں مسیح علیہ السلام تمام یہودیوں
اور ان کے سرغنہ دجال کو قتل کریں گے۔ تل ابیب سے چھتیس میل دور
لد کا مقام ہے جہاں پہ دجال قتل ہوگا۔ روایات میں آتا ہے کہ اُس
وقت کسی یہودی کو کہیں پناہ نہیں ملیگی، حتیٰ کہ پتھر اور درخت بھی بول
کر کہیں گے کہ اے مسلمان! میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے، اس
کا کام تمام کردو۔ اس لحاظ سے ان کی موجودہ اسرائیلی سلطنت ان کو ایک
جگہ اکٹھا کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی ہے تاکہ مقررہ وقت پہ ان کا خاتمہ
کیا جاسکے۔ بہرحال یہودی ایک ذلیل قوم ہیں اور قرب قیامت تک
ذلت ان پر مسلط رہیگی، چنانچہ گذشتہ اڑھائی ہزار سالہ تاریخ اس بات
کی شاہد ہے یہ لوگ دولتمند ضرور ہیں۔ موجودہ بینکاری کا نظام انہی کی
ایجاد ہے۔ یہ دولت پہ سانپ بن کر تو بیٹھ سکتے ہیں مگر ان کے
مقدر میں جو ذلت اور رسوائی آچکی ہے اُس سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔

حتیٰ کہ مسیح علیہ السلام کے زمانے میں سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ لوگ کہتے
ہیں کہ اب ان کی اسرائیلی ریاست قائم ہو چکی ہے۔ اس کے متعلق میں
نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ تو روس، برطانیہ، امریکہ، فرانس اور جرمنی کی فوجی
چھاؤنی ہے، اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اب اس پہ مکمل طور
پر امریکہ کا تسلط ہے۔ یہ تو بڑی طاقتوں نے اپنے مفاد کے لئے اسرائیل
کو کھڑا کر رکھا ہے، ورنہ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ پھر
کوئی وقت آئیگا جب یہ یہاں بھی ذلیل و خوار ہوں گے۔

اللہ کی گرفت اور بخشش

تو فرمایا اس بات کو دھیان میں لاؤ جب کہ تمہارے پروردگار
نے خبردار کر دیا کہ وہ یہودیوں پر قیامت تک کے لیے ایسے لوگ
مسلط کرے گا۔ جو ان کو بہت بری سزائیں دیتے رہیں گے۔ فرمایا
إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ بیشک تیرا رب جلد سزا دینے
والا ہے۔ بعض اوقات مجرموں کو فوراً سزا دے دیتا ہے جیسا کہ پہلے بھی
مثالیں گزر چکی ہیں کہ جونہی کسی نے حد سے تجاوز کیا کسی کو زلزلے نے
آپکڑا، کسی پہ چیخ مسلط کی گئی اور کسی کی شکلیں تبدیل کر دی گئیں۔ اور ساتھ
ساتھ رب العزت کی صفت یہ بھی ہے وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ
کہ وہ بہت بخشش کرنیوالا اور از حد مہربان بھی ہے۔ وہ گنہگاروں
کو مہلت بھی دیتا ہے، انہیں سنبھلنے کا موقع دیتا ہے مگر جب
وہ برائی سے باز نہیں آتے تو پکڑ لیتا ہے۔

نہ تو مشو مغرور بر حلم خدا
دیر گیرد سخت گیرد مر ترا (رومی)

خدا تعالیٰ کی بردباری پر کسی کو مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی وہ دیر
سے پکڑتا ہے مگر سخت گرفت کرتا ہے۔ غرضیکہ یہ اللہ تعالیٰ کی
رحمت عام ہے کہ لوگ گناہ بھی کرتے رہتے ہیں اور زمین پر چلتے

پھرتے کبھی نظر آتے ہیں۔ قرآن پاک میں موجود ہے کہ اگر خدا گناہوں کی وجہ سے پکڑنا چاہتا تو سب کو فوراً پکڑ لیتا اور ہر غلط کار انسان اور جانور کو نیست و نابود کر دیتا مگر وہ صفت غفور کی وجہ سے مہلت ضرور دیتا ہے اور مجرموں کو سزا دیئے بغیر چھوڑتا نہیں۔ وہ جلد یا بدیر پکڑے جاتے ہیں۔

فرقہ بندی کی سزا

فرمایا وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا اور ہم نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ان کو زمین میں مختلف فرقوں میں۔ بنی اسرائیل میں بہتر مذہبی فرقے بن گئے جو آپس میں دست و گریباں رہتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ میں یہ فرقے پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی ہیں۔ عقیدے، اعمال اور بدعات کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ فرقے بنے ہوئے ہیں جو کہ سزا ہی کی ایک صورت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل بہتر ۷۲ فرقوں میں منقسم ہوئے تو میری امت کے لوگ تہتر ۷۳ فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ ان میں سے صرف ایک کے سوا باقی سارے جہنمی ہوں گے اور ناجی فرقہ وہی ہوگا مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ جو میرے اور میرے صحابہ کے راستے پر گامزن ہوگا۔ فرمایا لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ تم بھی پہلے لوگوں کے نقش قدم پر ہی چلو گے اور لڑائی جھگڑے، جنگ و قتال، پارٹی بازی، فرقہ بندی تمہارے اندر بھی آجائے گی اور یہ سزا ہوگی۔ اتفاق و اتحاد خدا تعالیٰ کی رحمت ہے، اس نے اجتماعیت کا حکم دیا ہے۔ جب سے مسلمانوں میں فرقہ بندی کی وبا آئی ہے، ذلت ان کا مقدر بن گئی ہے۔ گذشتہ آٹھ سو سال سے مسلمان غلامی کی سزا میں مبتلا ہیں۔ تاتاریوں کے فتنے کے بعد دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کے قدم جم نہیں سکے، دن بدن مصائب میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ یہ سب فرقہ بندی کی سزا ہے۔ اگر یہود تورات کے احکام کی

لہ ترمذی ص۳۶۹ ج۲ ، بخاری ص۴۹ ج۱ و مسلم ص۳۳۹ ج۲ و مستدرک ص۲۹ ج۱ و ترمذی ص۳۱۷ (فیاض)

خلاف ورزی کرکے ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتے ہیں، فرقہ بندی کی لعنت
میں گرفتار ہو کر مغضوب و مقہور قرار دیے جا سکتے ہیں تو ہماری امت
کے لوگ بھی قرآن پاک کے احکام کو پس پشت ڈال کر اس سزا سے
کیسے بچ سکتے ہیں؟ خدا کا قانون تو سب کے لیے یکساں ہے اللہ تعالیٰ
فاسق اور ظالم کو معاف نہیں کرتا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح
فرماتے ہیں کہ جب برے لوگوں کی تکریم کی جا رہی ہو اور اچھے لوگوں
کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو تو امن کیسے ہو سکتا ہے؟ حضور
علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جب اُکْرِمَ الرَّجُلُ
مَخَافَۃَ شَرِّہٖ کسی کی عزت اس کے شر کے خوف کی وجہ سے ہو
گی کہ اگر اس کو سلام نہ کیا، اس کی چاپلوسی نہ کی تو نقصان پہنچائے گا۔
یہ علاقے کا با اثر آدمی ہے، کہیں غنڈے پیچھے نہ لگا دے یا جائداد
پہ قبضہ نہ کرلے۔ اس کی عزت محض اس خوف کی وجہ سے کی جائیگی
حالانکہ وہ فاسق و فاجر ہے۔ نہ نماز کی پرواہ ہے۔ نہ روزے کی اور
دین اسلام کی کچھ خبر ہے۔ امن تو اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب
اچھے آدمی کی عزت ہو اور برے آدمی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے
جب حضرت عثمان غنی رض کے مکان کا محاصرہ کر لیا گیا تو آپ نے اپنے
مخالفین کے ساتھ سختی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اپنے ساتھیوں کو
تلوار اٹھانے سے منع کر دیا بلکہ آپ کی دعا یہ تھی: اللھم اجمع
امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اے مولا کریم! امت
محمدیہ کو اکٹھا کر دے۔ ان میں اتفاق و اتحاد کا جذبہ پیدا فرما۔ کہیں یہ
تفریق کا شکار نہ ہو جائیں۔ اکٹھا ہونا خدا تعالیٰ کی رحمت ہے جب کہ
گروہوں میں بٹ جانا عذاب الٰہی ہے۔ اپنے گرد و پیش میں نظر اٹھا کر
دیکھ لیں۔ کوئی سیاسی پارٹی ہو یا مذہبی فرقہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون

کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوتے۔ سارے فساد کی جڑ خود یہ پارٹیاں ہیں جو دوسروں کو زیر کرنے کے لیے اذانوں کا سہارا تو لیتے ہیں مگر اپنی اصلاح کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ ہر جماعت کو صرف اور صرف اقتدار کی ہوس ہے، ہر وقت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے نظر آتے ہیں۔ آج تک اسلام کے لیے کیا گیا ہے؟ جب بھی ہوا احکام الٰہی سے اعراض ہی ہوا ہے۔ انہوں نے غیر مسلم اقوام کے نظریات تو تسلیم کیے ہیں مگر دین کو اپنا نظریہ حیات (AIM) کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اب دن رات جمہوریت کے گیت گائے جا رہے ہیں حالانکہ یہ بھی مغرب کا لعنتی نظام ہے جس طرح ڈکٹیٹر شپ لعنت ہے۔ اسی طرح مغربی جمہوریت بھی فتنہ ہے۔ بھائی! اگر دنیا میں امن و امان چاہتے ہو تو اسلام کی طرف آؤ، اس کا پیش کردہ نظام اپناؤ۔ تمہارے دکھوں کا مداوا نہ کسی سوشلزم میں ہے اور نہ کیپٹلزم میں ہے۔ اگر نجات چاہتے ہو تو اسلام کا سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام اپنا لو اور وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اگر اس اصول کو ترک کر دو گے تو یہودیوں کی طرح فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہو کر عذاب الٰہی میں مبتلا رہو گے۔

حق پرست لوگ

فرمایا ہم نے یہودیوں کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ مگر وہ سب کے سب ایک جیسے نہیں۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ ان میں کچھ نیک لوگ بھی ہیں۔ اگرچہ اکثریت گنہگاروں کی ہے۔ مگر لوگوں کی ایک قلیل تعداد قیامت تک نیکی کی طرف بھی مائل رہیگی۔ ہندوؤں، عیسائیوں اور ہر قوم میں کچھ نہ کچھ اچھے لوگ بھی موجود رہے ہیں جو قرآن پاک کے پروگرام کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ حضور کے زمانہ مبارک میں یہودی عالم عبداللہ بن سلامؓ پہلے

ہی دن اسلام سے آئے ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں برطانوی بیرسٹر کوئلیم نے مسلمانوں کو وضو کرتے دیکھا تو کایا پلٹ گئی کہنے لگا مسلمانوں کی ہر چیز معیاری ہے۔ اس نے نہ صرف خود اسلام قبول کیا بلکہ اپنے خاندان کے چالیس دیگر افراد کو بھی حلقہ بگوش اسلام کیا۔ ان کا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا۔ غرضیکہ لَيْسُوْا سَوَآءً کے مصداق کسی قوم میں سارے کے سارے بُرے لوگ نہیں ہوتے بلکہ بعض حق پرست بھی ہوتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی قلیل ہو۔ سلیم الفطرت ہر دور میں ہوئے ہیں جنہوں نے فوراً اسلام قبول کیا۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کتنی بڑی شخصیتیں ہوئی ہیں۔ اللہ نے اسلام کی دولت عطا کی اور پھر اسلام کی خدمت کی توفیق بھی عطا فرمائی۔ ڈاکٹر اقبال کہا کرتے تھے کہ جو کام پنجاب کے بڑے بڑے لیڈر اور قریشی خاندان انجام نہ دے سکے۔ وہ کام اللہ نے بوٹا سنگھ کو عبید اللہ بنا کر لے لیا۔ فرمایا کہ یہودیوں میں کچھ اچھے لوگ بھی ہیں وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ مگر اکثریت دوسری طرف ہی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ان کی اکثریت نافرمان ہی ہے۔

فرمایا وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ ہم نے آزمایا اُن کو خوبیوں سے اور برائیوں سے کبھی صحت، تندرستی، اولاد اور مال و دولت دے کر آزمایا اور کبھی بیماری، تنگدستی اور غلامی میں مبتلا کر کے آزمایا۔ اور اس کا مقصد یہ تھا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ تاکہ یہ لوگ حق کی طرف واپس لوٹ آئیں۔ اللہ نے ہر طریقے سے آزمایا اور دیکھا کہ کیا یہ راحت میں شکر اور تکلیف میں صبر کرتے ہیں یا نہیں مگر ان کی اکثریت ناشکر گزار ہی نکلی۔ اللہ نے فرمایا کہ میں قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کروں گا جو ان کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھیں گے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع

ترجمہ:- پھر آئے اُن کے پیچھے نالائق جو وارث ہوئے کتاب کے۔ لیتے ہیں اس حقیر دنیا کا سامان اور کہتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر آئیں ان کے پاس اسباب (سامان) اس جیسے تو اُس کو لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے پختہ عہد نہیں لیا گیا تھا کتاب میں کہ نہ کہیں اللہ پر کوئی بات مگر جو سچ ہو۔ اور پڑھا انہوں نے جو کچھ اس میں لکھا تھا اور آخرت کا گھر بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے (۱۶۹) اور وہ لوگ جو مضبوطی سے پکڑتے

ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، بیشک ہم نہیں ضائع کرتے
نیکی (اصلاح) کرنے والوں کا اجر (۱۷۰) اور (اس واقعہ کو بھی
یاد کرو) جب ہم نے اکھاڑا پہاڑ کو ان کے اوپر گویا کہ وہ سائبان
ہی اور گمان کیا انہوں نے کہ وہ ان پر پڑنے والا ہے (اور ان
سے کہا گیا کہ) پکڑ لو جو چیز ہم نے تمہیں دی ہے مضبوطی سے اور
یاد کرو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم بچ جاؤ (۱۷۱)

ربطِ آیات

گذشتہ کئی دروس سے یہودیوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے حضرت یوشع علیہ السلام
کے زمانے کا واقعہ بیان ہوا۔ آپ نے یہودیوں کو جہاد کے لیے تیار کیا اور بستی پر حملے
کا حکم دیا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ بستی میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ داخل ہونا اور منہ سے
کوئی غلط بات نہ کہنا۔ یہودیوں نے دونوں احکام کی خلاف ورزی کی۔ عاجزی کی بجائے
غرور وتکبر کے ساتھ داخل ہوئے اور منہ سے استغفار کرنے کے بجائے گندم کا مطالبہ
کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب آیا، قوم پر طاعون کی وبا مسلط ہوئی اور ہزاروں آدمی ہلاک
ہوگئے۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں مچھلی کے شکار والا واقعہ پیش آیا۔
یہودیوں کو حکم تھا کہ ہفتہ کے دن صرف عبادت کرنا ہے شکار یا اور کوئی کام نہیں کرنا
ان لوگوں نے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی اور حیلے بہانے سے ہفتے کے دن مچھلی
کا شکار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مجرمین بندروں کی شکل میں تبدیل ہوگئے اور پھر تین دن تک
زندہ رہنے کے بعد ہلاک ہوگئے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ یہودیوں پر اس وقت سے
ذلت مسلط کردی گئی تھی۔ پھر آگے فرمایا کہ ہم نے انہیں مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا، کچھ ان
میں سے نیک بھی ہیں اور کچھ اس کے علاوہ بھی۔ فرمایا ہم نے انہیں بھلائی اور برائی ہر طریقے
سے آزمایا تاکہ راہِ راست پر آجائیں۔

دنیا کا حقیر مال

پہلے زمانے کے یہودیوں کے مختلف حالات بیان کرنے کے بعد اللہ
نے بعد میں آنے والوں کا حال اس طرح بیان فرمایا ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ

پھر آئے ان کے بعد نالائق لوگ عربی زبان میں خَلْف کا معنی پیچھے
آتا ہے اور خَلْف یا خَلْفٌ کا اطلاق نالائق پر ہوتا ہے اور اگر لام
کی فتح کے ساتھ خَلَفٌ ہو تو اس کا معنی لائق ہوگا۔ بہر حال یہاں پر یہ لفظ
نالائق جانشین کے معانی میں آیا ہے۔ جس طرح اردو میں سپوت
اچھے بیٹے کو اور کپوت نالائق بیٹے کو کہتے ہیں، اسی طرح عربی میں
خَلَفٌ لائق کے لیے اور خَلْفٌ نالائق کے لیے آتا ہے۔ تو فرمایا
کہ بعد میں نالائق لوگ وَرِثُوا الْكِتٰبَ جو کتاب کے وارث بنے۔
کتاب سے مراد تورات ہے۔ گویا بعد میں آنے والے حاملین تورات
نالائق لوگ تھے اور ان کا حال یہ تھا يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا
الْاَدْنٰى کہ وہ اس دنیا کا حقیر مال لیتے تھے۔ ادنیٰ کا لفظ قریب اور حقیر
دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ عرض کا معنی ناپائیدار ہے، اور
اس کے مقابل میں جوہر آتا ہے جس کا معنی پائیدار اور ٹھوس چیز ہوتا ہے
دنیا کا مال و متاع چونکہ عارضی اور ناپائیدار ہوتا ہے اس لیے یہاں پر عرض
کا معنی سامان کیا گیا ہے کہ یہ جلدی فنا ہو جانے والا ہے دوسری جگہ
ارشاد ہے "مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ" جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ وہ
ختم ہونے والا ہے "وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ" اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس
ہے، وہ پائیدار اور باقی رہنے والا ہے۔ آخرت کے متعلق بھی فرمایا
"وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى" (سورۃ اعلیٰ) یعنی آخرت بہتر بھی ہے اور
دیرپا بھی۔ یہ دنیا فانی اور عارضی ہے، یہاں کی کسی چیز میں استقلال نہیں
ہر چیز میں جلد ہی تغیر و تبدل پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی ایمان اور اعمال
صالحہ کی دولت حاصل کرے تو انہیں کا اثر دیرپا ہوگا۔

معانی کا
خود ساختہ
ترجمہ

فرمایا پھر ان کے بعد تورات کے وارث نالائق لوگ ہوئے جنہوں
نے اس کتاب کے بدلے دنیا کا حقیر مال حاصل کیا۔ کتاب الٰہی کے

احکام میں تحریف کی اور لوگوں سے رشوت لے کر اُن کو غلط فتوے دیے مگر جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایسا کرکے تم گنہگار ہو رہے ہو اور خدا تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا تو کہتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (المائدہ) ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، وہ ہم سے مؤاخذہ نہیں کرے گا اور ہم کچھ بھی کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ضرور معاف کرے گا۔ حضور علیہ السلام کے زمانے کے یہودی بھی کہتے تھے۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (آل عمران) ان اعرابیوں کا مال کھا لینے میں ہم پر کوئی حرج نہیں، گویا یہ ہمارے لیے بالکل جائز ہے، یہ لوگ اس قسم کے باطل زعم میں مبتلا تھے۔ انہوں نے تورات میں مقرر کی گئی سزاؤں کو بھی تبدیل کر دیا۔ چنانچہ زنا اور چوری کی سزاؤں کو دیدہ دانستہ بدل دیا۔ ان کے قاضیوں اور مفتیوں نے رشوت لے کر غلط فیصلے اور غلط فتوے جاری کیے، دنیا کا حقیر سامان اکٹھا کیا، اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہم پر ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ ہم تو بخشے ہوئے لوگ ہیں۔

حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت یعنی عقلمند اور دانا انسان وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے کچھ سامان پیدا کرتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ عاجز انسان وہ ہے۔ من اتبع نفسه هواه وتمنى على الله جو خواہش کے پیچھے چلتا ہے اور اللہ سے بڑی بڑی آرزوئیں رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہم تو بخشے ہوئے ہیں۔ ہمیں فلاں بزرگ بچا لیں گے یا فلاں نبی کی سفارش کام آجائے گی۔ لہذا

ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ ایسے شخص کو حضور علیہ السلام نے کمزور
اور عاجز فرمایا۔

حقوق العباد پر افترا

ارشاد ہوتا ہے وَاِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یَاْخُذُوْهُ
اور اگر دُنیا کا سامان اُن کے سامنے بار بار آئے تو اُسے لے لیتے ہیں
اور فلسفہ یہ بنا رکھا ہے کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں ہم سے کوئی مواخذہ
نہیں ہوگا۔ فرمایا اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْکِتٰبِ
کیا اُن سے کتاب میں پختہ عہد نہیں لیا گیا اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ
اِلَّا الْحَقَّ کہ وہ اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہیں کہیں گے
یعنی اللہ کی طرف صرف سچی بات منسوب کریں گے اور کوئی غلط بات
کہ کہ اُسے اللہ کی بات نہیں بتائیں گے۔ یہ لوگ اکثر مسائل کو بدل
دیتے تھے۔ رشوت لے کر غلط فتوے جاری کرتے تھے اور کہتے
یہ تھے کہ اللہ کا یہی حکم ہے حالانکہ وہ اللہ کا حکم نہیں ہوتا تھا۔ اسی
بات کے متعلق فرمایا کہ اُن سے یہ پختہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ
پر کوئی افترا نہیں باندھیں گے یعنی اس کی طرف کوئی غلط بات
منسوب نہیں کریں گے۔ مگر پھر بھی یہ لوگ اپنے عہد پر قائم نہ رہے اور
کتاب میں تحریف کے مرتکب ہوئے اور لوگوں کو غلط مسائل بتاتے
فرمایا یہ عہد ایسا نہیں جو ان کی نظروں سے کسی وقت بھی اوجھل ہوا ہو بلکہ
وَدَرَسُوْا مَا فِیْهِ انہوں نے خود اُسے پڑھا جو کچھ اس میں لکھا
تھا اور اس کے باوجود وہ اس پختہ عہد کی پاسداری نہ کر سکے۔ اور دُنیا
کے اس حقیر مال کو آخرت پر ترجیح دی مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ نادان
نہیں جانتے کہ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اور آخرت
اُن لوگوں کے لئے بہتر ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور
اس کی نافرمانی، کفر، شرک اور معصیت سے بچتے ہیں۔ فرمایا

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ کیا تم اتنی بھی سمجھ نہیں رکھتے۔ کہ اس عارضی دُنیا کا مفاد بہتر ہے یا آخرت کی دائمی زندگی کا مفاد قابلِ ترجیح ہے تم کس دھوکے میں پڑے ہوئے ہو کہ دنیا کے سامان کے بدلے دین اور ایمان جیسی قیمتی متاع کو ضائع کر رہے ہو۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آخرت میں راحت کے لیے سامان پیدا کیا جاتا مگر تم اس دُنیا کا مال اکٹھا کر رہے ہو جو اسی دُنیا تک کام دے گا اور پھر آخرت میں کچھ میسر نہ ہوگا۔

آجر کے مستحقین

آگے ارشاد ہوتا ہے۔ یاد رکھو! وَالَّذِیۡنَ یُمَسِّکُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ اور جو لوگ اس کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اور نماز کو قائم کرتے ہیں۔ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ ؕ ہم اصلاح کرنے والوں اور نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے یعنی ہم ایسے لوگوں کو ضرور بہتر اجر عطا کریں گے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے کہ جو یہ دو کام کرتے ہیں وہ اجر کے مستحق ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بہتر بدلہ پائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ ان کاموں سے اعراض کریں گے، وہ سزا کے مستحق ہوں گے چنانچہ آگے آرہا ہے کہ بعد میں آنے والے ناخلف لوگوں نے اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑنے کی بجائے اسے بیچ ڈالا اور اس کے بدلے دُنیا کا حقیر مال حاصل کیا۔ غلط فتوے جاری کیے، کتاب الٰہی کی غلط تاویلیں کیں، اس کے احکام کو چھپایا اور ایسا کرنے کے لیے رشوت حاصل کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے نمازوں کی پرواہ بھی نہ کی بلکہ انہیں ضائع کیا تو ایسے لوگ اللہ کے غضب کا نشانہ ہی بن سکتے ہیں

تمسک بالکتاب

تمسک بالکتاب کا مطلب یہ ہے کہ اُسے پڑھا جائے، سمجھا جائے اور پھر اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ برخلاف اس کے یہودی اپنی کتاب تورات کو محض ادب اور آداب تک ہی محدود رکھتے تھے

زبانی کلامی اُس کو اللہ کا کلام بھی سمجھتے تھے - اُس کو غلافوں میں بند کرکے
اونچی جگہ پر رکھتے تھے - اس کو بوسہ بھی لیتے تھے مگر جب عمل کرنے
کا وقت آتا تھا تو پھر خود ساختہ مسائل پر عمل کرتے تھے اور احکام الٰہی
کو پشت کے پیچھے ڈال دیتے تھے - اب یہ بیماری ہماری امت میں
بھی آچکی ہے - ہمارے ہاں بھی قرآن پاک محض زبانی ادب اور ریشمی
غلاف تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے - اوّل تو پڑھتے ہی نہیں، اگر
ناظرہ پڑھتے بھی ہیں تو محض ثواب کے لیے - اسے سمجھنے کی کوشش
ہی نہیں کرتے - مسئلہ دریافت کرنا ہو تو مولوی صاحب کے پاس
چلے جاتے ہیں جو سائل کے مناسب حال مسئلہ بنا دیتے ہیں اور اس
سلسلے میں اُن کی خدمت بھی کر دی جاتی ہے اگر خدانخواستہ قرآن پاک
ہاتھ سے گر جائے تو فوراً اس کا ہدیہ ادا کرتے ہیں مگر اس کے احکام کو
کوئی نہیں پوچھتا - آخر اتنی متبرک کتاب محض قسم اُٹھانے کے لیے رہ گئی ہے
عمل تو سو فیصدی اس کے خلاف ہے - اس کے پاکیزہ اصولوں کو پامال
کیا جاتا ہے - جب تک عقیدہ، عمل اور اخلاق اس کے مطابق نہیں ہوگا
تمسک بالکتاب نہیں ہوگا -

اقامتِ صلوٰۃ

نماز اُمّ[1] العبادات المقربات ہے - یہ اللہ کا قرب دلانے
والی عبادات کی بنیاد ہے - نماز سے مومن کو ہزاروں فوائد حاصل ہوتے
ہیں وقت کی پابندی، نظم و ضبط، پاکیزگی، مساوات، اجتماعیت، توحید، ایمان
وغیرہ بے شمار روحانی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں - جو شخص نماز کی حیثیت
کو سمجھے گا اور اسے قائم کرے گا، وہ یقیناً مصلح ہوگا اور اللہ کے ہاں اجر
کا مستحق ہوگا -

فرمایا جو کوئی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے
ہیں ہم ان کا اجر ضائع نہیں کریں گے - یہ بات تو یہود کی مذمت کے

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۳ ج ۱

سلسلے میں بیان فرمائی ہے مگر یہ ہمارے لیے بھی یکساں قانون ہے جو کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لیگا۔ اسے ضرور اجر ملے گا۔

پہاڑ کا معلق ہونا

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات بھی یاد کرائی وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ جب ہم نے اکھاڑا پہاڑ کو ان کے اوپر كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ گویا کہ وہ سائبان تھا پہاڑ کو زمین سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے سروں پہ معلق کر دیا جیسے سائبان کھڑا کر دیا جاتا ہے وَظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ ان پہ گرنے والا ہے۔ اللہ نے اس حالت میں بنی اسرائیل سے فرمایا خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ پکڑ لو جو کچھ ہم نے دیا ہے مضبوطی کے ساتھ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ اور یاد کرو جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سروں پہ پہاڑ معلق کر کے ان سے عہد لینا زبردستی ہے، حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہودیوں نے اللہ سے بار بار عہد کیا اور ہر بار اسے توڑتے رہے بالآخر اللہ نے انہیں خوف دلانے کے لیے پہاڑ کو سروں پہ معلق کر دیا تاکہ آئندہ عہد کو نہ توڑیں اور انہیں ڈر ہو کہ اگر پھر عہد شکنی کی تو یہ وبال دوبارہ آسکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پہاڑ کو بنی اسرائیل کے سروں کے اوپر نہیں اٹھایا گیا تھا بلکہ ان لوگوں کو کسی جھکے ہوئے پہاڑ کے دامن میں کھڑا کیا گیا تھا۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ نتق کا معنی اکھاڑنا ہوتا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے اکھاڑ کر اوپر معلق کر دیا گیا۔ محض کسی پہاڑ کے دامن میں کھڑا کرنے سے وہ خوف پیدا نہیں ہو سکتا جو پہاڑ کو اکھاڑ کر اوپر معلق کرنے سے ہوتا ہے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا ذکر کیا ہے ایک یہ کہ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسرا یہ کہ اس کے نوشتہ کو یاد کرو۔

کسی چیز کی یادداشت پڑھنے پڑھانے اور اس کی تشہیر سے قائم رہتی ہے اسی لیے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ کتاب الٰہی کی یادآوری کے لیے اس کی تشریح و تشہیر بھی ضروری ہے۔ فرماتے ہیں کہ اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کے کارندے اسلامی قوانین پر خود بھی عمل پیرا ہوں اور رعایا کو بھی اس کی تعلیم دیں۔ اسلامی قوانین کی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے جتنی کوئی شخص خود اپنے بچوں کی تعلیم کو ضروری سمجھتا ہے۔ پہلے اسلامی قوانین کی تشریح اشاعت کرو، ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کی تشہیر کرو۔ اور اس کے بعد لوگوں سے توقع رکھو کہ وہ اس پر عملدرآمد کریں۔ ہر آدمی کو علم ہونا چاہیئے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں اسلام کس طرح راہنمائی کرتا ہے معاملہ تجارت کا ہو یا زراعت کا، سیاست ہو یا معیشت، صلح ہو یا جنگ، قومی مسئلہ ہو یا بین الاقوامی ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارا دین ہمیں کیا سکھاتا ہے۔ جب اسلامی قوانین کی اچھی طرح تشہیر ہو جائے تو پھر اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تادیبی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ اب قانون شکنی کرنے والے بھی دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں اگر کوئی شخص انفرادی طور پر قانون کے خلاف کرتا ہے تو وہ تعزیر کا مستحق ہے کہ وہ ایمان لانے کے باوجود خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور اگر جماعت سے باہر کا کوئی آدمی قانون کو توڑتا ہے تو وہ مفسد اور باغی ہے۔ اس کے ساتھ جنگ کرنا ہوگی۔ بہرحال قانون پر عملدرآمد کے لیے اس کی وسیع پیمانے پر تشہیر بھی ضروری ہے۔ تاکہ ہر مسلمان جان لے کہ اس کے حقوق و فرائض کیا ہیں اس کو یاد کرنے کا یہی مطلب ہے۔

فرمایا اللہ نے ان سے عہد لیا کہ جو کچھ ہم دیں اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور اس کو یاد کرو لعلکم تتقون تاکہ تم متقی

تاکہ تم بچ جاؤ، مگر اللہ کی کتاب کو پڑھتے پڑھاتے رہو گے اس
پر عمل پیرا رہو گے تو دنیا میں برائی سے بچ جاؤ گے اور آخرت
میں عذاب سے مامون ہو جاؤ گے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا۟ بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَآ ۛ أَن تَقُولُوا۟ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَٰفِلِينَ ﴿١٧٢﴾ أَوْ تَقُولُوٓا۟ إِنَّمَآ أَشْرَكَ ءَابَآؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۢ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ ٱلْمُبْطِلُونَ ﴿١٧٣﴾ وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ ٱلْءَايَٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٧٤﴾

ترجمہ :- اور (اس وقت کو دھیان میں لاؤ) جب کہ نکالا تیرے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو اور اُن کو گواہ بنایا اُن کی جانوں پر (اور یہ فرمایا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا پروردگار ؟ تو انہوں نے کہا کیوں نہیں ، ہم گواہی دیتے ہیں (یہ عہد اس لیے لیا) کہ تم یہ نہ کہو قیامت کے دن بیشک تھے ہم اس سے غافل ﴿۱۷۲﴾ یا یہ نہ کہو کہ بیشک شرک کیا ہے ہمارے آباؤاجداد نے اس سے پہلے اور ہم تو تھے اُن کی اولاد بعد میں آنے والے ۔ تو کیا تُو ہمیں ہلاک کرے گا اس کے بدلے میں جو کیا باطل پرستوں نے ﴿۱۷۳﴾ اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ یہ لوگ باز آجائیں ﴿۱۷۴﴾

ربطِ آیات گذشتہ آیات میں بنی اسرائیل سے لیے گئے عہد و پیمان کا ذکر تھا ۔ وہ خاص

عہد اللہ نے اس بات کا لیا تھا کہ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑنا اور
اس پر عمل کرنا۔ مگر بنی اسرائیل اس عہد پر قائم نہ رہے بلکہ وہ ہمیشہ عہد و پیمان
کی خلاف ورزی ہی کرتے رہے۔ یہ عہدِ خاص تھا۔ اب آج کے درس
میں عہدِ عام کا ذکر ہے جو تمام بنی نوعِ انسان سے لیا گیا تھا۔ یہ عہد
عہدِ الست اور عالمِ ارواح کا عہد بھی کہلاتا ہے جو کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق
کے بعد مگر باقی اولاد کی تخلیق سے پہلے لیا گیا۔ دراصل یہ عہد تمام بنی نوع
انسان کے قلوب میں اللہ تعالیٰ کی توحید، اُس کی پہچان اور اس کی ربوبیت
کا بیج ہے جو اُن کی پیدائش سے پہلے ہی بو دیا گیا۔ بہرحال گذشتہ آیات
کے ساتھ ربط یہی ہے کہ پہلی آیات میں عہدِ خاص کا ذکر تھا اور اب
عہدِ عام کا بیان ہو رہا ہے۔

تین جہان
تین عہد

ایک عام انسان کے لیے تین ادوار میں تین عہد کا ذکر ملتا ہے
پہلا عہدِ الست ہے جس کا تفصیلی ذکر اس درس میں ہو رہا ہے۔ اس
عہد کا تعلق انسان کی اس دنیا میں آمد سے پہلے عالمِ ارواح سے ہے
اس جہان میں آنے کے بعد بھی انسان کے ساتھ ایک عہد و پیمان ہوا
جس کا ذکر پچھلی سورۃ انعام میں ہو چکا ہے وہاں فرمایا تھا قُلْ تَعَالَوْا
اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ "اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ
آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کون کونسی چیزیں حرام کی ہیں"
اُس مقام پر اللہ تعالیٰ نے تیرہ چیزوں کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ یہی میرا
سیدھا راستہ ہے، اسی پر چلو اور متفرق راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اصل
راستے سے جدا کر دیں گے۔ فرمایا تمہیں اس بات کی وصیت کی جاتی
ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ یہ تو اس مادی جہان کا پروگرام اللہ نے
دیا۔ اور تیسری بات وہ ہے جس کا تعلق اگلے جہان سے ہے اور
جس کا ذکر سورۃ الحاقہ میں ہے فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ

وَّاحِدَۃٌ "جب یکدم صور پھونک دیا جائے گا۔ قیامت برپا ہو جائیگی اور پھر جو جو واقعات پیش آئیں گے، حساب کتاب کی منزل آئیگی اور پھر لوگوں کے فیصلے ہوں گے۔ اس ساری بات کا ذکر کیا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ نے تینوں جہانوں سے متعلقہ تینوں باتوں کا ذکر کر دیا ہے تاکہ زندگی کے ہر مرحلے پر انسان کو یاد دہانی کرائی جاتی رہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے اور کون سا پروگرام ہے کہ اللہ نے اسے پیدا فرمایا ہے۔

عہد الست سے متعلق احادیث مبارکہ میں بڑی تفصیلات آئی ہیں۔ یہاں پر اللہ نے اس واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا۔ یہاں بنی آدم کا ذکر ہے جب کہ حدیث شریف میں آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالنے کا ذکر ہے۔ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور اس میں کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا جہاں براہ راست آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا ذکر ہے تو اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو براہ راست آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور بنی آدم سے مراد وہ لوگ ہیں جو آدم علیہ السلام کی اولاد کی اولاد ہیں اور اس میں نسلاً بعد نسلٍ قیامت تک آنے والے تمام لوگ شامل ہیں۔ مقصد بہر حال یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا ہونے والے لوگوں کی ارواح سے یہ عہد لیا تھا۔ حدیث میں ذر کا لفظ بھی آتا ہے ذر چھوٹی سی چیونٹی کو کہتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح نکالا اور سب

یہ عہد لیا۔ حدیث میں اس کو عالم ذر اور عہد ذریت سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔
ایک اور روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی دائیں
طرف سے ارواح کو نکالا اور فرمایا هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَلَا اُبَالِیْ
یہ لوگ جنت میں جائیں گے اور مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ پھر خداوند تعالیٰ
نے آدم علیہ السلام کی بائیں طرف سے ارواح کو نکالا اور فرمایا هٰؤُلَاءِ
فِی النَّارِ وَلَا اُبَالِیْ یہ لوگ جہنم میں جائیں گے اور مجھے کچھ پرواہ نہیں۔
باقی رہی یہ بات کہ عہد الست کا واقعہ کہاں پیش آیا۔ تو اس
سلسلے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ مکہ معظمہ کے قریب میدان عرفات
کی وادی نعمان میں یہ واقعہ پیش آیا۔ یہ عرفات کا وہی میدان ہے
جہاں بڑے بڑے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں
جنت سے نکلنے کے بعد آدم علیہ السلام کی معافی کی دعا قبول ہوئی
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی نبی آخر الزمان کی بعثت کی یہیں دعا کی
جو کہ قبول ہوئی۔ یہی وہ میدان عرفات ہے جہاں ہر سال لاکھوں
حاجی جمع ہو کر فریضہ حج ادا کرتے ہیں، بہر حال عہد الست کا واقعہ اسی
مقام میں وادی نعمان میں پیش آیا۔ اس عہد سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے۔ عالم ارواح کے اس عمومی عہد کے علاوہ
اسی دربار کے ایک خاص عہد کا ذکر بھی قرآن و سنت میں آتا ہے
جو صرف انبیاء کرام کی ارواح سے لیا گیا اور اسے میثاق النبیین کے
لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں اس عہد کا ذکر اس طرح
آتا ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ جب اللہ تعالیٰ
نے تمام انبیاء سے عہد لیا تھا اور کہا تھا کہ میں نے کتاب و حکمت
سے جو تمہیں عطا کیا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب میرا آخری نبی
تمہارے پاس آئے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

فرمایا اُس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن
کی اولادوں کو نکالا وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اور ان کو اپنی
جانوں پر گواہ بنا کر پوچھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں
ہوں؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان پتھر کی طرح
کسی بے جان چیز سے نہیں کیا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت تامہ
اور حکمت بالغہ کے ساتھ تمام ارواح کو فہم، شعور اور عقل عطا فرمائی جس
کی بنا پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوال کا جواب یوں دیا قَالُوْا بَلٰى
کیوں نہیں، مولا کریم! بیشک تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ شَهِدْنَا
ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ بلیٰ حرف ایجاب ہے جو اثبات کے
معنوں میں آتا ہے، یعنی اے پروردگار! تو ہی ہمارا رب ہے، ہم
اس بات پر گواہ ہیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ ربوبیت کا اقرار کرایا ہے
جس کا معنی کسی چیز کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ اسی صفت
کا خاصہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو پیدائش سے لے کر اپنی قدرت تامہ
کے ساتھ بامِ عروج تک پہنچاتا ہے یعنی انشاء الشیء حالاً فحالاً
الیٰ حد الکمال۔ جب اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا اقرار
ہو گیا تو پھر اس کے مبدع، خالق، مدبر اور الٰہ ہونے کا اقرار بھی خود بخود ہو گیا

عدم یادداشت کا عذر

اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لینے کی وجہ بھی خود ہی بیان فرمائی ہے
اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ کہ
قیامت کے دن تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں تو اس بات کا علم ہی نہیں تھا۔
اللہ نے تمہیں دنیا میں ایک خاص پروگرام دے کر بھیجا ہے اور ایسا
نہ کرو کہ یہاں کے لوازمات میں مصروف ہو کر تم اس پروگرام کو ہی
بھول جاؤ، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی میں اپنی ربوبیت کا اقرار کرا لیا

کہ دُنیا میں جاکر خالق، مالک، رب، عالم الغیب اور قادرِ مطلق مجھے
ہی تسلیم کرنا، کسی مخلوق کو یہ مرتبہ نہ دے دینا۔ اور پھر اس عہد کی یاد آوری
کے لیے اُس نے پے در پے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور کتابیں نازل
فرمائیں۔ تمام انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو یہ عہد یاد دلایا اور اس پہ کاربند
رہنے کی تلقین فرمائی۔ لہذا اب کوئی شخص اس عہد کا انکار نہیں کر سکتا۔
باقی رہی یہ بات کہ اِس دُنیا میں آکر انسان کو وہ عہد یاد نہیں رہا، تو یہ عذر
قابلِ قبول نہیں ہے اور نہ اس سے اُس عہد کی ذمہ داری ساقط ہوتی
ہے۔ یہ تو عالم ارواح کی بات ہے جو دوسرا جہان تھا، خود اس جہاں
میں آکر بھی انسان بعض چیزوں کو بھول جاتے ہیں جو اُن کے ساتھ پیش
آچکی ہوتی ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام اپنے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ اس
بات کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا پروفیسر، مقرر
یا انشاء پرداز ہو جس کی قابلیت کا ڈنکا لوگ مانتے ہوں، ذرا اس سے
یہ تو پوچھو کہ اس دُنیا میں آکر تم نے سب سے پہلا لفظ کہاں اور کس سے
سیکھا تھا، حتیٰ کہ وہ لفظ کون سا تھا جو اس نے سب سے پہلے ادا کیا تھا،
تو وہ کچھ نہیں بتا سکے گا۔ جب اس دُنیا کا یہ حال ہے جہاں انسان
اپنے اِس جسم اور قویٰ کے ساتھ موجود ہے تو عالم ارواح کو بھول جانا
کونسا بعید از قیاس ہے۔ لہذا اس قسم کا اعتراض محض جہالت کی بنا پہ
ہے اور قابلِ قبول نہیں ہے۔

ہاں پھر اس دُنیا میں ایسے لوگوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جنہوں نے
اقرار کیا کہ عہدِ الست انہیں بالکل یاد ہے حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ
اور صاحبِ روح المعانی سید محمود آلوسی بغدادیؒ نے ایسے بزرگان کا
تذکرہ کیا ہے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ کے متعلق خاص طور پہ ذکر آتا ہے
کہ جب اُن سے اس عہد و پیمان کے متعلق دریافت کیا گیا آپ نے کہ وہ

کیا آپ کو وہ عہد یاد ہے ؟ تو فرمایا ، ہاں مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے کان ابھی تک اس عہد کو سن رہے ہیں ۔ بعض بزرگانِ دین سے متعلق یہ بھی آتا ہے کہ جب اُن سے عہد الست کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے تو یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے بہر حال اس عہد کی یادداشت اکثر لوگوں کے دلوں سے محو ہو چکی ہے ۔ مگر اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ضرور ہیں ، جنہیں اس دنیا میں آکر بھی شعور رہتا ہے ۔

شاہ عبدالقادرؒ اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے تمام اولادِ آدم کی ارواح کو آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا اور پھر اُن کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور اُن سے عہد لیا جس میں اللہ تعالےٰ کی ربوبیت کا اقرار تھا اور بطور ربوبیت کے اقرار میں بالواسطہ تمام صفاتِ الٰہی بشمول صفتِ الوہیت بھی آجاتی ، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنے میں خود ذمہ دار ہے اور اب اس کا یہ عذر قبول نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے باپ کی تقلید میں شرک کا مرتکب ہوا ، بلکہ وہ خود ذمہ دار ہے کیونکہ عہد الست ہر فرد نے انفرادی طور پر اللہ کے ساتھ کر رکھا ہے ۔ دراصل اللہ تعالےٰ نے اپنی وحدانیت کا بیج ہر انسان کے قلب میں ابتداء ہی میں رکھ دیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان اپنے ارد گرد واقع دلائلِ قدرت کو دیکھ کر ہی اس کی وحدانیت پر ایمان لانے پر مجبور ہے ، اور پھر یہ بھی ہے کہ اس عہد کا تذکرہ ہر زبان پر موجود ہے ۔ آپ کسی شخص سے پوچھ کر دیکھ لیں ، وہ کہے گا کہ ہاں عہد الست ہوا تھا کسی فرقے اور کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو ، وہ خدا تعالیٰ کو ہر چیز کا خالق تسلیم کرے گا ۔ اور اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ

کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے تو یہ اُس کی اپنی عقل کا قصور ہے وگرنہ دلائل
قدرت تو اس قدر عام ہیں اور اگر کسی شخص کے پاس کوئی نبی کوئی مبلغ اور
کوئی پیغام نہ بھی پہنچے تو وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی خالقیت
کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر انکار کریگا تو عند اللہ ماخوذ ہوگا۔ کیونکہ
وحدانیت کا بیج اُس کے دل میں موجود ہے جس سے اُس نے
فائدہ نہیں اٹھایا۔

آباؤ اجداد کا بہانہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عہد لینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کل کو
یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں اس کا علم نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اَوْ تَقُوْلُوْٓا
اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ یا تم یہ عذر نہ پیش کر دو
کہ شرک تو ہمارے آباؤ اجداد نے اس سے پہلے کیا تھا وَكُنَّا ذُرِّيَّةً
مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اور ہم تو بعد میں آنے والی اُن کی اولاد
ہیں۔ شرک کا ارتکاب انہوں نے کیا غلط رسومات اور باطل اعتقادات
انہوں نے ایجاد کیے، ہم تو اُن کی دیکھا دیکھی تمام افعال انجام دیتے
رہے ہیں لہٰذا ہم سے مؤاخذہ نہیں ہونا چاہیئے اللہ نے فرمایا کہ عذر
قبول نہیں کیا جائے گا۔ ہر بُری رسم اور بدعت کا مرتکب یہی عذر
پیش کرتا ہے کہ یہ کام ہماری قوم، برادری اور آباؤ اجداد کرتے آئے
ہیں۔ اُن کے آباؤ و اجداد کرتے آئے ہیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہم بھی کر رہے
ہیں۔ ہم بھی اُسی راستے پر چل رہے ہیں، فرمایا ہر شخص عہد الست کا
خود ذمہ دار ہے عقیدہ توحید انسان کی فطرت میں داخل ہے لہٰذا
ہر شخص کی فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم
کرے جس انسان تک اسلام کے احکام منجملہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ
وغیرہ نہیں پہنچے اور اُس نے یہ فرائض انجام نہیں دیئے، اُس کو تو
معافی مل سکتی ہے مگر عقیدہ توحید چونکہ انسان کی نیچر میں داخل ہے۔

اگر اس کے خلاف کرے گا، تو پکڑا جائے گا۔

فرمایا عہدِ الست کی یاد دہانی اسی لیے کرائی ہے تاکہ تم یہ نہ کہ سکو کہ ہماری بداعمالی کے ذمہ دار ہمارے آباؤ اجداد ہیں اور یہ سوال بھی پیش نہ کر سکو اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ کہ اے اللہ! کیا تو ہمیں باطل پرستوں کی وجہ سے ہلاک کرے گا۔ یعنی باطل پرست تو ہمارے باپ دادا تھے اور ان کے جرم کی پاداش میں ہمیں کیوں سزا دی جا رہی ہے۔ فرمایا اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے بداعمال کے ذمہ دار تمہارے آباؤ اجداد نہیں بلکہ تم خود ہو۔ یہ بات ہم نے واضح کر دی ہے کہ عہد الست ہر شخص نے کر رکھا ہے اور وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔

دلائل قدرت کا ظہور

فرمایا وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ اور اسی طرح ہم اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آیات کا اطلاق احکام، دلائل اور معجزات سب پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام احکام متعلقہ حلت، حرمت، اوامر و نواہی اور جائز ناجائز تفصیل کے ساتھ اپنے انبیاء اور کتب کے ذریعے نازل فرمائے ہیں۔ اپنی وحدانیت، خلقیت اور ربوبیت کے تمام دلائل بھی انسان کے اردگرد بکھیر دیئے ہیں۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، رات، دن، گرمی، سردی، بارش اور ہوا وغیرہ سب کے سب اس کی قدرت کے دلائل ہیں جن سے کوئی بھی انسان صرف نظر نہیں کر سکتا۔ پھر انسان کی مزید تسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ہاتھوں پر مختلف معجزات کا اظہار فرمایا۔ بعض معجزات تو ایسے بھی تھے جنہیں امتوں نے خود طلب کیا مگر ان کی اکثریت پھر بھی ایمان نہ لائی اور بعض معجزات ایسے تھے جو اہل ایمان کی تقویت کا باعث بنے۔ تو فرمایا، اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو کھول کر بیان کرتے

ہیں وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ اور تاکہ یہ لوگ لوٹ کر آجائیں یعنی کفر، شرک اور معصیت کو ترک کر کے حقیقت کی طرف واپس آجائیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بھی اُن کے عہد و پیمان یاد دلانے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اُن کو خبردار کیا اور اصل دین کی طرف رجوع کرنے کی وصیت کی اور تمام بنی نوع انسان کو خبردار کیا کہ تم نے اللہ سے پختہ عہد کر رکھا ہے جس کے گواہ موجود ہیں۔ خود ان کا اپنا ضمیر، دل اور فطرت اس بات پہ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے اس کے سوا کوئی رب اور معبود نہیں۔ اس کے باوجود جو شخص کفر اور شرک میں مبتلا ہوگا وہ قیامت کو پکڑا جائیگا اور اس دن اس کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

ترجمہ :- (اے پیغمبر!) اور آپ پڑھ کر سنائیں ان لوگوں کو خبر اس شخص کی جس کو دی تھی ہم نے اپنی آیتیں، پس وہ ان آیتوں سے نکل گیا۔ اور اس کا پیچھا کیا شیطان نے، پس ہو گیا وہ گمراہوں میں سے ﴿۱۷۵﴾ اور اگر ہم چاہتے تو البتہ اس کو بلند کرتے ان آیتوں کی بدولت، لیکن وہ تو جھک گیا زمین کی طرف اور پیروی کی اس نے اپنی خواہش کی، پس اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اگر تو اس پر حملہ کرے (ڈانٹے

ہلائے) تو وہ ہانپتا ہے یا اگر چھوڑ دے اس کو، تب بھی ہانپتا
ہے۔ یہ ہے مثال اُن لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو
پس آپ بیان کر دیں حالات تاکہ یہ لوگ غور و فکر کریں (۱۷۶)
بُری ہے مثال اُس قوم کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور
جو اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے تھے (۱۷۷) جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت
دے، پس وہی ہدایت پانے والا ہے؛ اور جس کو اللہ تعالیٰ
گمراہ کر دے، پس یہی لوگ ہیں نقصان اٹھانے والے (۱۷۸)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں عہد و پیمان کا تذکرہ ہو چکا ہے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُس خاص عہد کا ذکر کیا جو بنی اسرائیل سے اس بات پر لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ اس کے بعد عہدِ عمومی کا ذکر تھا جو عالمِ ارواح میں تمام بنی نوع انسان سے لیا گیا اور جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ عامہ کا اقرار کیا۔ اِس عہد کا بیج ہر انسان کے قلب میں موجود ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اُس کی ربوبیت اور اُس کی خالقیت کو ماننا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان کو توڑنے والے لوگوں کے حال اور بُرے انجام کا ذکر کیا ہے اور اُسے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِىْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا اے پیغمبر! آپ ان کو پڑھ کر سنائیں اُس شخص کی خبر جسے ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، وہ شخص کون تھا اور کس امت سے تعلق رکھتا تھا، اس سلسلے میں تین اشخاص کے نام تفاسیر میں ملتے ہیں۔ اِن میں سے پہلا شخص بلعم بن باعور ہے، جس کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ اور دو اشخاص ابوعامر صیفی اور امیہ بن ابی صلت جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں ہوئے ہیں۔

بلعم بن باعور

اکثر مفسرین جن میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ اور مجاہدؒ شامل

ہیں، فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں جس شخص کا ذکر کیا ہے اور پھر اس کی مثال بیان فرمائی ہے، وہ بنی اسرائیل یا کنعانی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور توراۃ میں اس کا نام بلعام یا بلعم ابن باعور مذکور ہے نام کے تلفظ میں قدرے فرق زبان کے ادل بدل سے واقع ہوجاتا ہے جیسے عربی میں ابراہیم ہے اور عبرانی زبان میں اسے ابراہام کہتے ہیں بلعام اور بلعم میں بھی غالباً اسی قسم کا تفاوت پایا جاتا ہے۔ بہر حال یہ شخص اپنے زمانے میں نہایت نیک، عبادت گزار اور صاحب کرامت آدمی تھا۔ اس کی مشہور کرامت یہ تھی کہ یہ مستجاب الدعوۃ تھا اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا تھا اور لوگ اپنی حاجات میں اس سے دعائیں کراتے تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر اس علاقے میں پہنچے جہاں یہ شخص رہتا تھا تو وہاں کا بادشاہ خوفزدہ ہوگیا کہ کہیں بنی اسرائیل ان پر حملہ آور ہوکر انہیں مغلوب نہ کرلیں۔ اس نے بلعم بن باعور کو بلا بھیجا کہ یہاں آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بددعا کرو تاکہ وہ کامیاب نہ ہوسکیں۔ وہ شخص جانتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں اور ان کے مقابلے میں بددعا کرنا بدبختوں کا کام ہے لہٰذا اس شخص نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ اب بادشاہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور بلعم بن باعور کو پیسے اور عورت کا لالچ دیا تو وہ بددعا کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

دنیا میں اکثر یہی دو چیزیں ایمان کو ضائع کرنے والی ہیں انگریز نے یہی حربہ اختیار کرکے بہت سے لوگوں کے ایمان کو خراب کیا۔ مرزائیوں نے بھی نوکری اور چھوکری کا لالچ دے کر بہت سے مسلمانوں کو مرزائی بنالیا۔ سر ظفر اللہ جب اسمبلی کا ممبر اور ریلوے کا وزیر تھا تو اس نے لوگوں کو نوکری دے کر ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا بلکہ

عورتیں دے کر بھی سرزائی بنایا۔ دنیا میں ایسے لوگ ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ جن کا باطن گندا ہوتا ہے اور وہ لالچ میں آکر ایمان بھی فروخت کر دیتے ہیں۔

بہرحال بلعم بن باعور بھی لالچ میں آگیا۔ اُس نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کے لیے پہاڑی پر کھڑا ہو کر ہاتھ پھیلا دیے مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کا سارا کمال سلب کر لیا اور اُس کے منہ سے اُلٹے الفاظ نکلنے لگے۔ وہ شخص موسیٰ علیہ السلام کے لیے بددعا کرنا چاہتا تو اس کے منہ سے دعائیہ الفاظ ادا ہوتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے یہ سزا دی کہ اُس کی زبان کتے کی طرح لٹک گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ مثال بیان فرما کر نہ صرف بنی اسرائیل کو وعید سنائی ہے بلکہ اس آخری امت کے لوگوں کو بھی بات سمجھائی ہے کہ عہد و پیمان توڑنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔

ابو عامر صیفی

دوسرا شخص جو ان آیات کا مصداق سمجھا جاتا ہے، وہ مدینہ کا رہنے والا ابو عامر صیفی تھا۔ یہ بڑا عبادت گزار اور راہب تھا، ٹاٹ پہنتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حق کا متلاشی ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس کے کہنے پر منافقین نے مسجد ضرار تعمیر کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ مدینہ طیبہ میں آئے تو کسی کے گھر میں ٹھہرنے کی بجائے مسجد میں ٹھہرے۔ اللہ نے اس مسجد کو گرانے کا حکم دیا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جنگ احد میں یہ کفار کے ساتھ تھا اور اس نے میدان جنگ میں بہت سے گڑھے بھی کھدوائے تھے تاکہ مسلمان ان میں گر کر نقصان اٹھائیں، چنانچہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ایک گڑھے میں گر گئے اور آپ کو بڑی چوٹیں آئی تھیں۔ یہ شخص پیغمبر اسلام اور مسلمانوں سے سخت بغض رکھتا تھا البتہ اس کا بیٹا عبدالرحمان بڑا مخلص اور کامل الایمان صحابی تھا۔

امیہ ابن ابی صلت

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ان آیات کا مصداق قبیلہ ثقیف کا

امیہ ابن ابی صلت، یہ بہت بڑا شاعر اور جہاں گشت آدمی تھا۔ یہ روم اور شام وغیرہ کے علاقوں میں گھومتا رہا، تورات اور انجیل پڑھ چکا تھا اور سچے مذہب کا متلاشی تھا، مگر جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو حسد کی آگ میں جل گیا، یہ خود نبوت کا خواہشمند تھا۔ لہٰذا حضور علیہ السلام کا سخت مخالف ہو گیا۔ جنگ بدر کے واقعہ کے بعد اس شخص کی اسلام دشمنی بہت بڑھ گئی۔ جنگ بدر میں امراء الکفر مارے گئے تو کہنے لگا، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہوتے تو اپنی قوم کے خلاف کیوں صف آرا ہوتے اور ان کو کیوں قتل کرتے۔ اس نے بدر کے کافروں کا مرثیہ بھی لکھا تھا۔

یہ مختلف آراء ہیں۔ تاہم مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ اس مثال کا مصداق بلعم بن باعور کو مانتے ہیں۔ اس نے خدا کے عہد و پیمان کو توڑا۔ اور لالچ میں آکر اہل ایمان کے واسطے بدعا کرنے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا پھر اس دنیا میں بھی ذلت کی زندگی بسر کی اور آخرت میں بھی دائمی عذاب کا مستحق ہوا۔

آیات الٰہی سے انسلاخ

فرمایا، ان کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیں جسے ہم نے بڑی بزرگی عطا کی تھی اور مستجاب الدعوات بنایا تھا۔ فَانۡسَلَخَ مِنۡهَا مگر وہ ان آیات سے باہر نکل گیا یعنی ہمارے انعامات سے مستقلاً مستفید نہ ہو سکا۔ انسلاخ کا معنی کسی چیز سے نکل جانا ہے کسی کی کھال کھینچ لی جائے تو وہ انسلاخ کہلاتا ہے۔ سانپ جب اپنی کینچلی اتارتا ہے تو اس کو بھی انسلاخ کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس شخص کو ہم نے کرامات عطا کی تھیں وہ ان سے باہر نکل گیا، اس انعام کو اپنے اوپر قائم نہ رکھ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا فَاَتۡبَعَهُ الشَّيۡطٰنُ پس شیطان نے اس کا پیچھا کیا فَكَانَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ پس ہو گیا وہ گمراہوں میں سے اس کو بھی شیطان سے مماثلت ہو گئی۔ شیطان نے بھی بڑی عبادت کی

ا ریاضت کی تھی مگر حکم عدولی کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا۔ اسی طرح یہ شخص بھی بڑا عابد و زاہد تھا، صاحب کرامت اور مستجاب الدعوات تھا مگر لالچ میں آ کر سب کچھ گنوا بیٹھا۔ امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں برصیصا نامی راہب تھا جس نے چار سو سال تک عبادت کی مگر وہ بھی لالچ میں آ کر گمراہ ہوا اور اس کا خاتمہ کفر پر ہوا۔ بلعم بن باعور بھی شیطان کے بہکاوے میں آ گیا۔ شیطان جب دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اصل راستے سے پھسل رہا ہے تو اس کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنا ساتھی بنا کر جہنم کی رفاقت حاصل کر لیتا ہے۔

فرمایا وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا اور اگر ہم چاہتے تو اس شخص کو اپنی آیات کی بدولت بلندی تک پہنچاتے۔ بعض فرماتے ہیں کہ وہ شخص اسم اعظم جانتا تھا جس کی وجہ سے مستجاب الدعوات تھا۔ مگر خدا کا قانون یہ ہے کہ ترقی اور بلندی اس کو حاصل ہوتی ہے جو حق و صداقت پر قائم رہتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ مگر وہ شخص زمین کی طرف جھک گیا۔ زمین سے مراد مادی مفاد ہے۔ یعنی وہ حقیر دنیا، پیسے اور عورت کی طرف جھک گیا ——

—— اللہ کے عظیم انعامات کے بدلے ان حقیر چیزوں کو پسند کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ساری پارسائی واپس لے لی۔ اب نہ اس کے پاس کوئی کرامت باقی رہی اور نہ ہی وہ مستجاب الدعوات باقی رہا۔ اللہ نے اس کی تمام اچھائیاں سلب کر لیں اور وہ ذلیل و خوار ہو کر رہ گیا۔ وہ آیات الٰہی پر عمل کرنے کی بجائے وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ خواہش نفسانی کے پیچھے لگ گیا۔ گویا اس نے ایسا راستہ اختیار کیا جو انسان کو بلندی کی بجائے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔

کتے کی مثال

اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی بہت بڑی مثال بیان فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اس کی مثال کتے جیسی ہے اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اگر تم اس کو ڈانٹ پلاؤ تو ہانپتا ہے اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ یا اگر چھوڑ دو پھر بھی ہانپتا ہے تحمل کے کئی معنی آتے ہیں یعنی کوئی چیز لادنا، حملہ کرنا یا ڈانٹ پلانا۔ مقصد یہ ہے کہ کتا ہمیشہ ہانپتا رہتا ہے خواہ اُسے کوئی تکلیف پہنچے یا نہ پہنچے۔ دراصل کتے میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ بے چین رہتا ہے اور ہانپتا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک حرص ہے اور دوسری شہوت پرستی، اس کی حرص اور لالچ اس بات سے عیاں ہے کہ ہر چیز کو سونگھتا پھرتا ہے۔ اور شہوت پرستی کی مثال یہ ہے کہ ایک ایک مادہ کے پیچھے کئی کئی نر پڑے رہتے ہیں ان دونوں بُری خصلتوں کی وجہ سے کتے کے جسم میں ایک قسم کی گرمی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ ہمیشہ ہانپتا رہتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ کتا ہمیشہ ہانپتا رہتا ہے خواہ ڈانٹ پلائی جائے یا چھوڑ دیا جائے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ کتے کو شیطان کے ساتھ بڑی مناسبت ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے متعلق بڑے سخت احکام دیئے گئے ہیں۔ فرمایا اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو برتن کو سات دفعہ دھونا ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایسے برتن کو ایک دفعہ مٹی سے مانجھنا چاہیئے اور تین دفعہ پانی سے دھویا جائے تو پاک ہوگا۔ اس کے لعاب میں ایسے جراثیم ہوتے ہیں جو صابن کے ساتھ دھونے سے ضائع نہیں ہوتے، لہٰذا برتن میں مٹی مارنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کتے کو قتل کرنے کا حکم بھی ہے تاکہ لوگ اس سے زیادہ محبت نہ کریں۔ اس کو شوقیہ طور پر

پالنے کی اجازت نہیں۔ البتہ گھر، کھیت یا باغ کی حفاظت کیلئے یا شکار کیلئے کتے کو پالا جا سکتا ہے۔ فرمایا جو شخص بلا ضرورت کتا پالے گا اسکی نیکیاں ہر دن میں ایک قیراط یا دو قیراط کے برابر کم ہوتی رہیں گی قدیم زمانے میں عرب کے لوگ بھی کتوں سے محبت کرتے تھے۔ اسی لیے اس کو سخت نجس جانور قرار دیا گیا ہے۔ آجکل انگریز لوگ اس سے بڑی محبت کرتے ہیں، اس کی پرورش کرتے ہیں حتیٰ کہ بسکٹ، ڈبل روٹی اور مکھن بھی کھلاتے ہیں جب کہ اسلام نے اس سے نفرت کی تلقین کی ہے۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی اور فرمایا لَیْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ ہم اہلِ اسلام کی بُری مثال نہیں ہونی چاہیئے۔ فرمایا العائد فی ھبتہ کالکلب یعود فی قیئہ یعنی جو شخص کوئی چیز ہبہ کر کے پھر واپس لیتا ہے اس کی مثال کتے کی ہے جو قے کر کے خود ہی چاٹ لیتا ہے۔ یہ بُری خصلت اس میں شدید حرص کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے فرمایا ہماری مثال کتے جیسی نہیں ہونی چاہیئے یعنی ایماندار کو لالچی نہیں ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہودیوں کی مثال گدھے کے ساتھ دی ہے۔ سورۃ جمعہ میں ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا یعنی جن لوگوں کو تورات دی گئی اور انہوں نے اس پر عمل نہ کیا، ان کی مثال گدھے کی ہے جس پر کتابوں کا گٹھا لدا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ کتابیں لادنے سے گدھا عالم فاضل نہیں بن سکتا، اسی لیے یہودی بھی تورات کے علوم و فیوض سے اسی طرح محروم ہیں جس طرح ایک گدھا محروم ہے، مگر اس سے

بھی بدترین مثال کتے کی ہے جو اللہ نے بیان فرمائی ہے کہ جو شخص دُنیا کی حرص یا عورت کی خاطر حق سے منہ موڑ لیتا ہے، وہ اس کتے کی طرح ہے جو ہر وقت حرص اور شہوت پرستی کی وجہ سے ہانپتا رہتا ہے

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ امام طیبیؒ بیان کرتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں علما سوء کے لیے سخت زجر ہے علما کے حق تو کسی للنیج میں نہیں آتے مگر علمائے سوء سخت ملعون ہیں جو غلط بیانی کرتے ہیں، غلط فتوے دیتے ہیں اور بڑے آدمیوں کی خوشامد کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خود کبھی حق پر عمل نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی حق بات سے روکتے ہیں۔ یہ ایسے ہی علماء کے فتنے ہیں کہ کہیں قبر پرستی ہو رہی ہے اور کہیں رسم و رواج کی آبیاری ہو رہی ہے۔ علما کے سوا نہیں چاہتے کہ عوام الناس قرآن و سنت کے پروگرام کو سمجھیں، لہذا یہ انہیں بدعات میں پھنسائے رکھتے ہیں، کبھی میلاد مناتے ہیں کبھی جھنڈیاں لگاتے ہیں، روشنی کا اہتمام کرتے ہیں۔ نعت خوانی، قوالی اور غزل گوئی میں لوگوں کو الجھائے رکھتے ہیں ان کی مثال بھی بلعم بن باعورا جیسی ہے جو دُنیا کے حقیر مال کی خاطر حق بات کو چھپاتے ہیں۔
حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے "تذکرہ" میں ایک فقرہ لکھا ہے کہ غلاظت پر بیٹھنے والی مکھی ان علمائے سوء سے ہزار درجہ بہتر ہے جو لوگوں کو حق کے قریب نہیں آنے دیتے اور اہل باطل کا راستہ بتلاتے ہیں۔ ایسے لوگ امیروں، وزیروں اور بادشاہوں کا تقرب اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مسائل کو تبدیل کر دیتے ہیں اور حق کے راستے میں رکاوٹ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

فرمایا ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا تھا۔

قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی۔ آجکل کے مسلمان اکثر امور میں قرآن پاک کی عملی تکذیب کر رہے ہیں۔ قرآن کے خلاف عمل کرنا اس کی تکذیب ہی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیغمبر! فَاقْصُصِ الْقَصَصَ آپ یہ حالات و واقعات لوگوں کے سامنے بیان کر دیں لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ تاکہ یہ غور و فکر کریں اور سوچیں کہ خدا تعالیٰ کے عہد و پیمان کو توڑ کر کس قدر ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلعم بن باعوراء امیہ ابن ابی صلت اور راہب ابو عامر صیفی کا انجام ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے ارشاد ہوتا ہے سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ان لوگوں کی بُری مثال ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے ایسے لوگوں کو کتے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو سب سے بری مثال ہے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا وَأَنفُسَهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ وہ اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے تھے یعنی اپنا ہی برا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ تو بے نیاز ہے اسے کچھ پرواہ نہیں۔ نقصان بلعم بن باعور ہی کا ہوگا، یا اس سے ملتے جلتے عمل والے دو نقصان اٹھائیں گے۔

ہدایت خداوندی

فرمایا یاد رکھو! مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي ہدایت وہی شخص پاتا ہے جس کو اللہ ہدایت عطا کرتا ہے، لہذا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرنی چاہیئے اور گمراہی سے بچنا چاہیے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ فَاسْتَهْدُونِي أَهْدِكُمْ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سب بھٹکے ہوئے ہو مگر وہ جسے میں ہدایت دوں۔ لہذا ہدایت مجھ ہی سے طلب کیا کرو۔ میں تمہیں راہ راست پہ چلاؤں گا۔ نماز کی ہر رکعت میں بھی یہی بات سکھلائی گئی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ اے مولا کریم

جنہیں ہر معاملہ میں راہ راست ہی دکھا کیونکہ راہ وہی پاتا ہے جسے اللہ راہ دکھا دے اور جو شخص حق کی مخالفت کریگا اللہ تعالیٰ اُسے لازمی طور پر گمراہ کر دیگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بلا وجہ گمراہ نہیں کرتا اُن کی گمراہی اُن کی استعداد پر موقوف ہوتی ہے۔ جو لوگ حق کی مخالفت کریں گے وہ گمراہی میں پڑیں گے اور جو ہدایت کی طرف آنا چاہیں گے انہیں ہدایت نصیب ہو جائیگی۔ یہاں پر بھی یہی بات فرمائی ہے کہ جس کو اللہ راہ دکھا دے، وہی راہ پانے والا ہے۔ وَمَنْ يُّضْلِلْ اور جس کو اللہ گمراہ کر دے فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ پس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ یہ لوگ ناکام ہوں گے اور ابدی نقصان میں رہیں گے۔ جو شخص دنیا سے گمراہی کا سامان لے کر جائیگا وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہو جائے گا۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ترجمہ :- اور البتہ تحقیق پیدا کیے ہم نے جہنم کے لیے بہت سے جنوں میں سے اور انسانوں میں سے۔ اُن کے لیے دل ہیں کہ نہیں سمجھتے اُن کے ساتھ۔ اور اُن کے لیے آنکھیں ہیں کہ نہیں دیکھتے اُن کے ساتھ اور اُن کے لیے کان ہیں نہیں سُنتے اُن کے ساتھ۔ یہ لوگ ہیں جانوروں کی طرح بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہی لوگ ہیں غافل ﴿۱۷۹﴾

جن وانس کی تخلیق

اللہ تعالیٰ نے گذشتہ دروس کی آیات میں عہد خاص و عام کا ذکر کیا اور پھر اس عہد و پیمان کو توڑنے والوں کی مذمت کی اور اُن کا انجام بھی بیان فرمایا۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کی گمراہی اور اُن کے جہنم میں جانے کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا اور البتہ تحقیق ہم نے پیدا کئے ذرا کا لفظی معنی بکھیرنا اور مراد پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا "هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ" (الملک) وہی ذات ہے جس نے تمہیں زمین میں بکھیرا اور پھر تمہیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ تو گویا ذرا کا معنی پیدا کرنا، بکھیرنا اور پھیلانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کی نسل کو زمین میں بکھیر دیا اور

اُن سے آگے نسلِ انسانی کو پھیلایا۔ تو البتہ تحقیق ہم نے پیدا کیے ہیں لِجَهَنَّمَ
جہنم کے لیے کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ بہت سے لوگ جنوں
میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی۔

ایک اشکال

اس ٹکڑا آیت سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے
محض جہنم رسیدگی کے لیے جنوں اور انسانوں کو کثیر تعداد میں پیدا کیا؟ ایسا
نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے مقصدِ تخلیق جن وانس کو اس طرح بیان
فرمایا ہے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"
(الذاریات) میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اپنی عبادت
کے لیے۔ گویا جنوں اور انسانوں کی پیدائش کا مقصد معرفتِ الٰہی اور عبادت
الٰہی ہے۔ مگر آیت زیرِ درس سے مترشح ہوتا ہے کہ جنوں اور انسانوں
کی تخلیق کا مقصد اُن کو جہنم میں ڈالنا ہے۔ مفسرین کرام نے اس اشکال
کو اس طرح رد کیا ہے کہ مقصدِ تخلیق تو اللہ کی پہچان اور اس کی عبادت
ہی ہے مگر جب لوگ اپنے مرکز سے ہٹ جاتے ہیں اور مقصدِ تخلیق
کو پورا نہیں کرتے تو پھر اُس کا نتیجہ جہنم کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

اس بات کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ لِجَهَنَّمَ کا لام ابتدا
کے لیے نہیں بلکہ عاقبت کے لیے آیا ہے۔ یعنی مقصد جہنم نہیں بلکہ
اس کی عاقبت یا انتہا جہنم ہے۔ اس کی مثال سورۃ قصص میں موجود
ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے آپ کو پانی میں بہا دیا۔ فَالْتَقَطَهٗ
اٰلُ فِرْعَوْنَ "پس اٹھا لیا اُس بچے کو آلِ فرعون نے" لِيَكُوْنَ لَهُمْ
عَدُوًّا وَّحَزَنًا "کہ ہو جائے وہ اُن کے لیے دشمن اور باعثِ غم۔"
لِيَكُوْنَ کا لام بھی اسی قسم کا ہے۔ بچے کو اٹھانے کا بنیادی مقصد
یہ نہیں تھا کہ وہ اُن کے لیے باعثِ مصیبت بن جائے۔ بلکہ اُن کا
مقصد تو یہ تھا عَسٰٓی اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا شاید یہ ہمیں

فائدہ دے یا ہم اسے بیٹا بنالیں مگر اُس کی انتہا یہ ہوئی کہ وہ فرعونیوں کا دشمن اور اُن کے لیے باعث غم ثابت ہوا۔ ظاہر ہے کہ فرعون اور اُس کی قوم کا زوال اس بچے کی وجہ سے آیا جسے انھوں نے دریا سے اُٹھا لیا تھا۔ بہر حال اس آیت کریمہ کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو پیدا کیا جن کی انتہا جہنم میں پہنچنا ہوگا۔
اس قسم کے طرز کلام کی مثالیں عربی ادب میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً عرب کہتے ہیں۔ ـــ

فلا تجزعی ام اوس فانه للموت ما غذت الوالدة

اے ام اوس! تو غم نہ کر کیونکہ ماں اپنے بچے کو موت ہی کے لیے غذا دیتی ہے یعنی کھلاتی پلاتی اور پرورش کرتی ہے
اگرچہ ماں بچے کو موت کے لیے نہیں پالتی مگر اُس کی غایت یہی ہے کہ بالآخر ہر پیدا ہونے والا موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ ایک اور عربی شاعر کہتا ہے ـــ

لنا ملك ينادی كل يوم لدوا للموت وابنوا للخراب

ہمارے لیے ہر روز فرشتہ آواز دیتا ہے کہ اے انسانو! اولاد موت کے لیے جنو اور عمارتیں بربادی کے لیے تعمیر کرو۔ مقصد یہ کہ جننے کا نتیجہ موت ہے اور تعمیر کا نتیجہ ویرانی۔
جنوں اور انسانوں کی اکثریت کی جہنم میں جانے کی تاویل اللہ تعالٰی کے علم کی بنیاد پر بھی ہوسکتی ہے یعنی یہ بات اللہ تعالٰی کے قطعی علم میں ہے کہ جن و انس کی اکثریت جہنم میں جائیگی۔ چنانچہ حدیث شریف کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ نے پیدا کیا مخلوق کو حالانکہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی پشت میں ہے لیکن ہیں وہ جہنمی۔ نیز فرمایا کہ پیدا کیا اللہ نے مخلوق کو حالانکہ وہ اپنے

آباؤاجداد کی پشت میں ہیں لیکن ہیں وہ جنتی۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے متعلق خوب جانتا ہے کہ فلاں وقت وہ اپنے اختیار سے کفر کرے گا اور جہنم کا مستحق ہوگا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے تقدیر کا مسئلہ سمجھانے کے لیے فرمایا یاد رکھو! کہ جہنم میں جانے والے کا آخری عمل ایسا ہوگا جسے انجام دے کر وہ جہنم میں چلا جائے گا اور جنت میں جانے والے کا آخری عمل ایسا ہوگا جسے انجام دے کر وہ جنت میں داخل ہوگا، یہ اللہ تعالیٰ کے ازلی علم میں موجود ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنوں اور انسانوں کی اکثریت کو جہنم کے لیے پیدا کیا۔

آگے اللہ تعالیٰ نے انسان کے جہنمی ہونے کے لیے اس کے تین اجزائے جسم کا ذکر فرمایا ہے یعنی دل، آنکھیں اور کان جو لوگ اللہ کی عطا کردہ ان نعمتوں سے کما حقہ مستفید نہیں ہوتے، وہی جہنم کے مستحق بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ بلاوجہ کسی کو سزا میں مبتلا نہیں کرتا، اُسے پورا پورا اختیار دیا جاتا ہے اور پھر عمل کے لیے میدان مہیا کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے۔ کل میسر لما خلق لہٗ ہر ایک کو اس چیز کی توفیق ملتی ہے جس چیز کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، یہاں تک کہ اس کا خاتمہ اس کے آخری عمل کے مطابق کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص دل، آنکھ اور کان کو صحیح طور پر بروئے کار نہیں لائے گا، وہ نہ تو ان سے مستفید ہو سکے گا اور نہ ہی کامیاب ہوگا بلکہ ایسا شخص جہنم کا حقدار ہوگا۔

دل اور اس کی کارکردگی

ارشاد ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ان کے لیے دل ہیں مگر ان کے ساتھ سمجھتے نہیں۔ یہ پہلی دلیل ہے ان کے جہنمی ہونے کی کہ اللہ نے انہیں دل جیسی دولت عطا فرمائی ہے لیکن وہ اس سے

کام ہی نہیں لیتے۔ سورۃ انفال میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا
"اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ"
یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین جانور بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں
سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل جیسا جوہر عطا کیا ہے مگر وہ اس سے
کام ہی نہیں لیتے۔ امام بیضاویؒ قلب کے متعلق لکھتے ہیں۔
هُوَ الْعَقْلُ کہ اس سے مراد عقل ہے۔ گویا قلب، فواد اور عقل قریب
المعنیٰ الفاظ ہیں۔ پھر ان کا آپس میں ربط ہوتا ہے۔ اطبا کہتے ہیں
کہ ادراک کا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا ہے اور بعض یہ تعلق دل
کے ساتھ مانتے ہیں، گویا ادراک اور سمجھ وغیرہ کا تعلق دل کے ساتھ
ہوتا ہے۔ انسانی جسم کے اعضاء دل، دماغ اور جگر اعضائے رئیسہ
کہلاتے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک جزو بھی ناکام ہو جائے تو انسان
زندہ نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جگر کی صورت
میں بہت بڑی فیکٹری لگا دی ہے جو خوراک کو خون میں تبدیل کرتی ہے
انسان جو بھی خوراک کھاتا ہے وہ معدے میں پہنچتی ہے۔ وہاں سے
باریک نالیوں کے ذریعے جگر میں جاتی ہے جو اسے خون میں تبدیل
کرتا ہے۔ خون میں انسانی غذا کے جملہ اجزاء موجود ہوتے ہیں جگر
اس خون کو نالیوں کے ذریعے قلب تک پہنچاتا ہے اور پھر قلب
اس کو پورے جسم میں پھیلاتا ہے۔ ایک منٹ میں دل بہتر مرتبہ حرکت
کرتا ہے اور باریک ترین نالیوں کے ذریعے خون کو ہر حصہ جسم تک
پہنچاتا ہے اس طرح جسم کا ہر عضو اپنی ضرورت کی غذا خون سے
حاصل کرتا ہے، دماغ، ہڈیوں اور بالوں وغیرہ کو مختلف قسم کی غذا
کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر عضو مطلوبہ غذا لے لیتا ہے اور باقی کو
دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح جو فضلہ بن جاتا ہے

وہ نالیوں کے ذریعے دوسرے راستوں سے خارج ہو جاتا ہے اسی طرح کاربن ڈائی آکسائڈ انسانی جسم سے باہر نکل جاتی ہے جبکہ آکسیجن دوبارہ اندر داخل ہوتی ہے۔ اگر انسانی جسم میں قلب موجود نہ ہو تو انسان کا خون دورہ نہ کر سکے اور نہ ہی جسم کے حصے میں خوراک پہنچائی جا سکے۔ اسی لیے جب انسان کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ تو انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قلب اور انسانی جسم کے نظام کو دماغی اعصاب کنٹرول کرتے ہیں۔ دماغ کی باریک باریک شاخیں سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ اعضائے رئیسہ کہلاتے ہیں۔

اطبا کے نزدیک تو قلب کی کارکردگی اسی قدر ہے۔ مگر درحقیقت قلب ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور یہ ایسی چیزوں کا حامل ہے جو بظاہر نظر نہیں آتیں۔ اہل حق جن کی باطنی نگاہ اور تجربہ بہت وسیع ہوتا ہے وہ قلب کی اصلیت کو خوب سمجھتے ہیں محبت نفرت، خوف، رنجی اور اقدام کے تمام جذبات کا تعلق قلب کے ساتھ ہوتا ہے، اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے۔ اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے اور اگر اس میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ فرمایا اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ ! درکھو ! وہ لوتھڑا دل ہے۔ قلب مرکز اخلاق ہے جب یہ بگڑ جاتا ہے تو سارا نظام ہی خراب ہو جاتا ہے۔ فرض کرو، اگر قلب میں ایمان کی بجائے شرک ، اخلاص کی بجائے ریاکاری اور نفاق پیدا ہو جائے تو نظام بگڑ جائے گا اور اگر اس میں ایمان، توحید اور اخلاص ہے تو دل ٹھیک ٹھاک ہے اور سارا نظام درست ہے۔

قلب کی وجہ تسمیہ

قلب کا لغوی معنی الٹ پلٹ ہونا ہے اور دل کو قلب اس

سے لیے کہتے ہیں کہ یہ جسم میں الٹا لٹکا ہوا ہے۔ اس کا پیندا اوپر اور سر نیچے کی طرف ہے۔ اس کا نام قلب اس لیے بھی ہے کہ یہ جلدی جلدی پلٹیاں کھاتا ہے۔ دل کے متعلق قرآن و سنت میں بہت سی دعائیں بھی مذکور ہیں جیسے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا [1] اے ہمارے پروردگار! ہدایت سے سرفراز کرنے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر (آل عمران) حضور علیہ السلام نے یہ دعا سکھائی ہے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قَلْبِيْ عَلٰى طَاعَتِكَ" اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ انگلی سورۃ میں بھی آ رہا ہے کہ دیکھو نیکی اور اطاعت کرنے میں جلدی کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ دل ہی پلٹ جائے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (انفال) یاد رکھو! اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ ڈال دیگا اور اس کے خیالات ہی پلٹ جائیں گے۔ بہر حال دل کو قلب اس لیے کہتے ہیں اِنَّهٗ يَتَقَلَّبُ کہ یہ پلٹیاں کھاتا رہتا ہے۔ اس کی مثال لفظ انسان سے بھی دی جا سکتی ہے وَمَا سُمِّيَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِهٖ انسان کو انسان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مانوس ہوتا ہے۔ اسے انس کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تنہائی کو پسند نہیں کرتا بلکہ مل جل کر رہنا چاہتا ہے اسی طرح دل کو پلٹیاں کھانے کی وجہ سے قلب کہا جاتا ہے۔ تمام اچھے برے خیالات دل ہی سے اٹھتے ہیں۔ اگر قلب میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوں جن کا تعلق کھانے پینے یا شہوانیات سے ہو تو ایسے قلب کو شریعت میں قلب بہیمی کہتے ہیں۔ گویا یہ جانور والا دل ہے جو نفسانی خواہشات تک محدود ہے۔ اور اگر دل میں پاکیزہ خیالات وارد ہوں نیکی کی بات پیدا ہو، فرشتوں کے الہام کو قبول

---

[1] حصن حصین ص۲۴۳ (فیاض)

کرنے والا مادہ آجائے تو ایسے قلب کو قلبِ ملکی کہا جاتا ہے۔ گویا ملکیت
کے جذبات رکھنے والا دل ہے۔ اس طرح اگر کسی شخص کا دل شیطانی
وسواس کو قبول کرتا ہے تو ایسے انسان کو شیطان کہا جاتا ہے۔

دل کا صحیح استعمال

دل ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ یہ خداشناسی کا مرکز ہے
روح کا تعلق بھی قلب کے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ بزرگانِ دین
کے تجربات میں آنے والے لطائف ظاہرہ و باطنہ، سر، خفی، اخفیٰ اور
حجر بحت وغیرہ کا تعلق دل کے ساتھ ہے۔ قرآن پاک میں اس کو
فواد وغیرہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ
كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل) کان، آنکھ
اور دل بڑی اہم چیزیں ہیں، ان کے متعلق باز پرس ہوگی۔ اللہ تعالےٰ
نے جس مقصد کے لیے دل جیسی عظیم نعمت عطا کی ہے اگر اسے اس
مقصد کے لیے استعمال نہ کیا گیا تو انسان ناکام ہو جائے گا اور پھر
جہنم کا مستحق ٹھہرے گا۔ اگر دل سے صحیح بات نہیں سوچی
دل میں صحیح جذبات نہیں جگائے بلکہ غلط خیالات اور باطل عقاید کو
کو دل میں جگہ دی ہے تو یہ دل کا صحیح استعمال نہیں ہے اس کا نتیجہ
جہنم کی صورت میں برآمد ہوگا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم بھی کہتے ہیں ؎

غافل تر ازیں زمرہ مسلماں نہ دیدہ ام
دل درمیان سینہ و بیگانہ دل است

میں نے مسلمان سے زیادہ غافل کسی انسان کو نہیں دیکھا کہ
اس کے سینے میں دل موجود ہے مگر وہ اس سے بیگانہ ہے۔
اُسے علم ہی نہیں کہ یہ اللہ کی عطا کردہ کتنی بڑی دولت ہے۔
اسی لیے فرمایا کہ ان کے دل ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں اللہ نے دل
تو اس لیے دیا تھا کہ لوگ فہم سے کام لیں اور دل میں پاکیزہ جذبات

پیدا کیں مگر انہوں نے ناسمجھی میں اس کو ضائع کر دیا۔

آنکھوں کی نعمت

دل کا شکوہ کرنے کے بعد فرمایا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن کے ساتھ دیکھتے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آنکھیں اچھی اور بُری چیز کی امتیاز کے لیے دی تھیں۔ آنکھیں آیات الٰہی اور دلائل قدرت کے مشاہدہ کے لیے عطا کی گئی تھیں اور یہ بہت بڑی نعمت ہیں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے مَنْ سَلَبْتُ كَرِيمَتَيْهِ فَصَبَرَ فَلَمْ أَرْضَ لَهُ دُونَ الْجَنَّةِ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص سے دو عزت والی چیزیں یعنی آنکھیں میں نے چھین لیں اور اُس نے صبر کیا تو میں اُس کے لیے جنت سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گا۔ یعنی اُسے ضرور جنت میں داخل کروں گا۔ مشہور مقولہ ہے کہ نظر ہے تو جہان ہے، ورنہ کچھ نہیں ان آنکھوں کی ناقدری یہ ہے کہ جس کام کے لیے عطا کی گئی ہیں اُس سے اغماض برتیں۔ اگر کسی غلط جگہ پر آنکھ اُٹھے گی تو ظاہر ہے کہ اُس کا استعمال صحیح نہیں ہوگا۔ اللہ نے تو یہ آنکھیں اس لیے دی ہیں کہ ان کے ساتھ اچھی چیز کو دیکھا جائے کلام الٰہی کی تلاوت کی جائے قدرت کے نشانات کا مشاہدہ کیا جائے اور اُن سے صحیح نتیجہ اخذ کیا جائے۔ کفر، شرک اور حرام اشیاء کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں کھیل تماشے، فلم، ٹیلیویژن اور ناچ گانے سے پرہیز کیا جائے۔ خدا تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے حکیمانہ کلام کو دیکھا جائے اور اگر ان آنکھوں سے جائز کام نہیں لیا جائے گا بلکہ ان کو ناجائز امور کی طرف لگایا جائے گا تو مطلب یہی ہوگا کہ اُن کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔

کانوں سے استفادہ

کان بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ ان کے ذریعے

لے ترمذی ص۳۲۶ (فیاض)

انسان آنکھوں سے کہیں زیادہ معلومات حاصل کرتا ہے یعنی بصارت کی نسبت سماعت سے انسان زیادہ مستفید ہوتا ہے۔ آنکھیں اور کان معلومات کو دماغ تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ جب یہ معلومات دماغ میں پہنچتی ہیں تو پھر وہ معاملے کا فیصلہ کرتا ہے اور انسان اسکے مطابق عملدرآمد کرتا ہے۔ آنکھوں کی طرح کانوں کا صحیح استعمال ہی انسان کو کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت، احادیث نبوی، احکامات الٰہی، وعظ ونصیحت سنے گا تو یہ کانوں کا صحیح مصرف ہوگا اور اگر کسی شخص نے اپنی سماعت کو گانے بجانے، قصہ کہانیاں بیہودہ باتیں، لطیفہ گوئی، ٹیلیویژن اور وی سی آر کی طرف مرکوز کردیا تو ظاہر ہے کہ اس نے اس نعمت کی قدر نہیں کی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق یہاں ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا اُن کے کان تو موجود ہیں مگر وہ اِن سے سنتے نہیں۔

جانوروں سے بدتر

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر انسان کے تین اہم اجزا دل، آنکھ اور کان کا ذکر کرکے فرمایا کہ جن لوگوں نے ان اعضا کے رتبہ سے صحیح کام نہ لیا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ یہ جانوروں اور مویشیوں کی طرح ہیں۔ جانور بھی اپنی مادی ضروریات، کھانے پینے اور شہوانیات تک محدود رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اور کوئی اعلیٰ وارفع مقصد نہیں ہوتا، اسی طرح یہ لوگ بھی مادیت کے پجاری ہیں، لہذا یہ بھی جانوروں کی مانند ہیں۔ فرمایا بَلْ هُمْ أَضَلُّ بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں وجہ یہ ہے کہ کوئی جانور اپنے مقصد تخلیق کو فراموش نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے جس مقصد کے لیے پیدا فرمایا ہے، وہ اپنا فرض انجام دیتا ہے جب اس کا مالک کسی کام کے لیے پکارتا ہے تو وہ اس کی آواز

کو سنتا ہے اور اس کے حکم پر عمل کرتا ہے۔ اور جس چیز سے منع
کرتا ہے اُس سے رُک جاتا ہے۔ مگر یہ حضرت انسان ہے کہ
اس کا مالک اُسے دن میں پانچ دفعہ بلاتا ہے۔ مگر یہ سنی ان سنی کر
دیتا ہے وہ جس کام کا حکم دیتا ہے، اُسے ٹال جاتا ہے اور جس کام
سے منع کرتا ہے، یہ اُس پہ اڑا رہتا ہے۔ جانور اپنے مالک کی
خواہش کو اپنی خواہش پہ مقدم رکھتے ہیں۔ مگر انسان اپنی مرضی کو مالک
کی مرضی پہ ترجیح دیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ کی نعمتوں کی ناقدری
کرنے والے انسان جانوروں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی بدتر ہیں
شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ کفر اور شرک کرنے والے اللہ کی بدترین
مخلوق ہیں جنہیں اللہ نے "شَرُّ الْبَرِيَّةِ" فرمایا ہے۔ وجہ یہی ہے
کہ وہ اپنی خواہش کو مالک کی خواہش پہ مقدم رکھتے ہیں۔

غافل لوگ

فرمایا مذکورہ تعریف کی بناء پہ جو لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں
أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ وہ حقیقت میں غافل ہیں غفلت
انسان کو دوزخ تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اللہ کے ذکر
سے غافل ہونا ناکامی کی دلیل ہے۔ غفلت ہی مادیت، حرص اور
دنیا میں انہماک کا سبب بنتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ لوگ غافل ہیں
جو اپنے رب تعالیٰ کو یاد ہی نہیں کرتے اُس کا حکم تو یہ ہے کہ اپنے
رب کو صبح و شام یاد کرو "وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ" (اعراف)
اور غفلت کرنے والوں میں نہ ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ سے سب سے بعید چیز
قلب غافل ہے۔ لہذا خدا کی یاد سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ
لوگ کامل درجے کے غافل ہیں لہذا اِن کا ٹھکانا جہنم ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۸۰) وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (۱۸۱)

ترجمہ:۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں نام اچھے ، پس پکارو اس کو ان ناموں کے ذریعے اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو ٹیڑھا چلتے ہیں اس کے ناموں میں ، عنقریب ان کو بدلہ دیا جائے گا اس کا جو کچھ وہ کام کرتے تھے (۱۸۰) اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک امت ایسی ہے جو راہ بتلاتی ہے حق کا اور اسی حق کے ساتھ وہ انصاف کرتے ہیں (۱۸۱)

ربط آیات

عہد و پیمان کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو اس کی دی ہوئی نعمتوں کو صحیح طریقے سے استعمال نہیں کرتے۔ دل، آنکھیں اور کان اللہ کی عطا کردہ خاص نعمتیں ہیں، ان کو ٹھیک طور سے استعمال نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ غافل بن جائیں گے اور بالآخر جہنم میں پہنچیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ کا ذکر آ رہا ہے اور یہ سلسلہ سورۃ کے ابتدائی حصہ کے ساتھ ہی مربوط ہے۔

سورۃ الاعراف مکی سورۃ ہے اور اس میں ان اہم ترین مسائل کا ذکر ہے جن میں مشرک لوگ اختلاف کرتے تھے۔ ان مسائل میں توحید، رسالت، معاد اور قرآن کریم کی حقانیت کے مسائل شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ کی ابتداء ہی میں اپنی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ کا ذکر فرما کر توحید کا مسئلہ سمجھا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت اور کفر و شرک کی تردید تمام انبیائے کرام کا مشترک مسئلہ رہا ہے۔ ہر نبی نے اپنی امت

کو یہی دعوت دی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ اللہ نے فرمایا لوگو! میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، لہٰذا عبادت صرف میری ہی کرو۔

بہرحال اس سورۃ کی ابتداء میں بیان کردہ چاروں مسائل کو اب آخر میں پھر بیان کیا جا رہا ہے چنانچہ آج کے درس میں اللہ تعالیٰ کو اچھے ناموں کے ساتھ پکارنے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنی حاجات میں صرف اللہ ہی کو پکارو اور اس کا تعلق ابتدائی مسائل میں سے مسئلہ توحید کے ساتھ ہے

اسمائے حسنہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کو کن ناموں کے ساتھ پکارنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی اللہ کے سب نام اچھے ہیں فَادْعُوْهُ بِهَا پس اُسے انہی ناموں سے پکارو۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس کے تمام اسمائے پاک اور صفات کے ساتھ لانا ضروری ہے، جیسا کہ ہم ایمانِ مفصل کے بیان میں اقرار کرتے ہیں اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسمائے پاک اور صفات کمال کے ساتھ متصف ہے اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک کے متعلق صحیح حدیث میں آتا ہے اِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰی تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ اِسْمًا مَّنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ نام ہیں، جو شخص ان کو یاد کریگا وہ جنت میں داخل ہوگا یاد کرنے سے مراد محض زبانی رٹ لینا نہیں بلکہ ان کے مفہوم پر ایمان لانا اور ان کے مطالب پر عمل کرنا ضروری ہے، جو شخص ایسا کرے گا۔ وہ یقیناً جنت کا مستحق ہوگا۔ ان میں سے اکثر نام قرآن پاک میں مذکور ہیں اور سب کے سب اسمائے حسنہ ہیں، لہٰذا انہی ناموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارنا چاہیئے۔

ذاتی اور صفاتی نام

اللہ تعالےٰ کے ناموں میں سے بعض اس کے ذاتی نام اور

بعض صفاتی ہیں۔ جن اسمار کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر کیا جاتا ہے
وہ ذاتی ہیں اور جو اُس کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ صفاتی نام کہلاتے
ہیں۔ بہر حال یہ یقینی بات ہے کہ لفظ اَللّٰہ خدا تعالیٰ کا ذاتی نام ہے
کسی شخص کا نام لینے سے اُس کی ذات سمجھ میں آتی ہے اور اُس کی
ہستی متعین ہوتی ہے۔ جب ہم لفظ اللہ بولتے ہیں تو اس سے
وہ ہستی مراد ہوتی ہے جو واجب الوجود یعنی جس کی ہستی خود بخود ہے اور
وہ کسی دوسری ہستی کی عطا کردہ نہیں ہے۔ یہ ہستی تمام صفات کمال
کے ساتھ متصف ہے اور اس میں نقص یا عیب کی کوئی صفت
نہیں پائی جاتی۔ وہ ہر کمزوری سے مبرا ہے۔ دنیا میں اللہ کے سوا
کوئی دوسری ہستی نہیں جس کا وجود خود بخود ہو۔ فارسی زبان میں خدا
کا معنی بھی یہی ہے کہ ایسی ذات جس کا وجود اپنا ہو کسی کا عطا کردہ
نہ ہو۔ اللہ کے علاوہ باقی تمام مخلوق کا وجود اللہ کا عطا کردہ ہے
بہر حال اللہ خدا تعالیٰ کا ذاتی نام ہے جو اُس کی ذات اور ہستی کو
واضح کرتا ہے۔ اور جو صفاتی نام ہیں وہ خدا تعالیٰ کی پاکیزگی یا اُن
صفات کو ظاہر کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً
اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام رحیم اُس کے رحم کو ظاہر کرتا ہے۔ رؤف
اُس کی نرمی پہ دلالت کرتا ہے اور قدوس اس کی تقدیس کو واضح کرتا ہے
درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اسم یا اُس کی جملہ صفات اُس کی تجلی کو
ظاہر کرتی ہیں۔ قرآن پاک میں ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ
(مزمل) اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو۔ یا اُس کی صفت کا ذکر کرتے
رہو۔ جب تک اُس کا ذکر کرتے رہوگے تمہارا تعلق خدا تعالیٰ کی
تجلی کے ساتھ قائم رہیگا۔ گویا انسان اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک اور
صفات مقدسہ کے ذریعے اپنا رشتہ خدا تعالیٰ سے جوڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بعض نام خاص ہیں کہ جن کے ساتھ سوائے
خدا تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں پکارا جا سکتا۔ ایسے ناموں میں رحمان بھی
ہے، یہ ایسا اسم ہے جو اسم اللہ کے بعد ذاتِ خداوندی کے ساتھ
مختص ہے قرآن پاک میں ہے "قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ"
(بنی اسرائیل) اللہ تعالیٰ کو لفظ اللہ کے ساتھ پکارو یا لفظ رحمان کے
ساتھ پکارو ——————— اس کے سارے ہی
نام بھلے ہیں۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ مشرکین اعتراض
کرتے تھے کہ اللہ کا نبی ایک طرف توحید کی دعوت دیتا ہے
اور دوسری طرف اس کے بہت سے نام بھی ہیں تو اللہ نے اس
کے جواب میں فرمایا کہ آپ ان سے کہ دیں کہ اسم اللہ کے ساتھ
پکارو یا رحمان کے ساتھ، اس کے سارے نام اچھے ہیں اور کسی بھی نام
سے پکارنا درست ہے۔ بغرضیکہ اسمائے اللہ اور رحمان قریب قریب
ہیں۔ لہٰذا اس نام کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں کیا جا سکتا مگر بنی حنیفہ والے
مسیلمہ کذاب کو رحمان کا نام دیتے تھے اور اُسے رحمان یمامہ یعنی شہر یمامہ
کا رحمان کہتے تھے۔ ایسا درست نہیں ہے کیونکہ لفظ رحمان اللہ کے
ساتھ خاص ہے اور اس کا اطلاق کسی دوسری ہستی پر نہیں کیا جا سکتا
البتہ بعض نام ایسے بھی ہیں جن کا اطلاق غیر اللہ پر بھی ہو سکتا ہے۔
جیسے لفظ رحیم کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر بھی ہوتا ہے اور مخلوق پر بھی۔
جب مخلوق کے ساتھ رحیم، کریم، یا رؤف وغیرہ صفات کا اطلاق
کیا جاتا ہے تو اس سے لغوی معنیٰ مراد ہوتا ہے یعنی فلاں شخص رحمدل
مہربان یا شفیق ہے۔ یہ مشترک نام ہیں۔ چنانچہ بعض ناموں کا اطلاق
حضور علیہ السلام پر بھی کیا گیا ہے۔ جیسے سورۃ توبہ کے آخر میں
آتا ہے "بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" یعنی آپ علیہ السلام

مومنوں کے ساتھ پوری مخلوق میں زیادہ شفیق اور زیادہ مہربان ہیں۔ اور جب یہی لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے بولے جاتے ہیں تو ان سے اللہ تعالیٰ کا فیضان عام اور شفقت تامہ مراد ہوتی ہے۔ بہر حال جس طرح لفظ رحمان اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے اسی طرح اسم خالق بھی صرف اسی کے لیے روا ہے کسی دوسری ذات کے لیے خالق کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔

اسماء میں الحاد

فرمایا اللہ تعالیٰ کے بھلے نام ہیں، تم سے ان کے ساتھ پکارو وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اللہ کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں۔ یعنی ٹیڑھا چلتے ہیں۔ لحد کے معنی ٹیڑھا ہونا ہے۔ قبر کی سامی کو لحد اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ٹیڑھی ہوتی ہے ملحد ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی فکر ٹیڑھی اور فاسد ہوتی ہے، تو فرمایا اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کرنے والوں کو چھوڑ دو۔ اور اللہ کے ناموں کے ساتھ الحاد کا مطلب یہ ہے کہ جو نام اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے خاص ہیں، ان کا اطلاق کسی دوسری ذات پر کردو۔ جیسے رحمان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کہ وہ لوگ اس کا اطلاق مسیلمہ کذاب پر کرتے تھے۔ یا جیسے مشرکین نے اپنے معبودوں کے نام اللہ کے نام پر رکھ لیے تھے۔ مثلاً اللہ سے لات بنا لیا اور عزیز سے عزیٰ کا نام نکال لیا، اسی طرح مناۃ کا نام منان سے اخذ کیا گیا تھا۔ فرمایا یہ الحاد اور کج روی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اصل ناموں کو بگاڑ کر وہی نام اپنے معبودان باطلہ کے لیے مقرر کر لیے جائیں۔

علم کلام والے بحث کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ پر وہی نام بولنے چاہئیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہوں اور اپنی طرف سے کوئی ایسا نام وضع نہیں کرنا چاہیے جو شریعت میں ثابت نہ ہو۔ شریعت

سے کے بتلائے ہوئے صفاتی نام ہی درست ہیں۔ جیسے عیسائیوں نے اللہ کے لیے اَبْ یعنی باپ کا نام تجویز کر لیا ہے۔ خدا تعالیٰ کو باپ کہنے سے شرک کی ابتداء ہوئی ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ اکبر کا ترجمہ ہم "خدا بڑا ہے" تو کرتے ہیں مگر "خدا لمبا ہے" نہیں کر سکتے۔ ایسا نام یا صفت بالکل خود ساختہ اور غلط کام ہوگا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کے لیے قدیم کا لفظ استعمال ہوتا ہے مگر ہم اس لفظ کا ترجمہ کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے پرانا کا اطلاق نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا الحاد، کجروی اور گمراہی ہوگا۔

الحاد کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام کو مطلقاً کسی مخلوق پر بولا جائے جیسے آجکل عام بول چال میں آتا ہے مجید صاحب کہاں ہیں؟ خالق صاحب نے یہ کہا، رؤف صاحب چلے گئے ہیں یا صمد صاحب مصروف ہیں۔ اللہ کے صفاتی نام کسی بندے پر بولنا مکروہ تحریمی ہے۔ لہٰذا ہمیشہ عبدالمجید، عبدالخالق، عبدالرؤف یا عبدالصمد وغیرہ کہنا چاہیئے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے فوائد میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک کو کسی غلط مقصد کے لیے استعمال کرنا بھی الحاد ہی کی ایک قسم ہے، گنڈا، تعویذ یا سحر کے لیے خدا تعالیٰ کے نام کا استعمال، کفر، شرک، نفاق اور ارتداد وغیرہ کے ارتکاب کی مانند ہے۔ لہٰذا اس سے بچنا چاہیئے۔

الحاد بذریعہ تحریف معنوی

علم عقائد والے کہتے ہیں کہ کسی لفظ سے ایسا معنیٰ مراد لینا جو اللہ، اس کے رسول یا سلف سے ثابت نہیں، یہ بھی الحاد کی ایک قسم ہے مثلاً پرویز لفظ اللہ سے قانون مراد لیتا ہے جو کہ الحاد ہے اس نے اللہ کی ذات کی نفی کر دی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر سبحان اللہ یا الحمد للہ کہنے کا کیا مطلب رہ جاتا ہے غلام احمد قادیانی

نے بھی اس قسم کا الحاد کیا ہے۔ اپنی کتاب ازالہ اوہام میں سورۃ فتح کی آخری آیت میں آمدہ الفاظ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے متعلق لکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا نام محمد بھی رکھا ہے اور رسول بھی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرزائیوں کے کلمہ طیبہ میں محمد رسول اللہ سے مراد وہ محمد نہیں ہیں جو مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ اور آمنہ کے گھر پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ سے تھے بلکہ ان کے نزدیک محمد اور رسول قادیاں کے رہنے والا غلام احمد ہے اس لیے علمائے نے ہمیشہ یہ بات واضح کی ہے کہ مرزائیوں کے کلمہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ یہ لوگ الفاظ تو وہی بولتے ہیں مگر مراد کچھ اور لیتے ہیں۔ یہی الحاد ہے۔ اس قسم کا الحاد پرویز نے بھی کیا ہے وہ حُوْرٌ عِیْنٌ کا ترجمہ پاکیزہ فکر کرتا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد وہ خوبصورت عورتیں ہیں جو جنت میں اہل ایمان کو نصیب ہوں گی۔ بہر حال اللہ کی کسی صفت کو غلط معانی پہنانا یا اس کا اطلاق کسی مخلوق پر کرنا۔ الحاد میں داخل ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ کے اسماء میں الحاد کرنے والوں کو چھوڑ دیں سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ عنقریب انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائیگا۔ یہ لوگ اللہ کے اسمائے پاک میں کج روی اختیار کر کے بچ نہیں سکتے۔

اسمائے پاک کے ساتھ پکارنا

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اُسے اس کے پاک ناموں کے ساتھ پکارنے کا حکم دیا ہے اس کی تعمیل کے لیے حدیث شریف میں دعا کے یہ الفاظ سکھائے گئے ہیں اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ

رَبِیعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ بَصَرِیْ وَجِلَآءَ حُزْنِیْ وَذَھَابَ ھَمِّیْ
اے اللہ میں ہر اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جو تونے اپنا
نام رکھا ہے یا اُسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے یا اپنی مخلوق میں
سے کسی کو سکھلایا ہے یا عالم غیب میں اسے اپنے ہی پاس رکھا ہے
کہ قرآن پاک کو میرے دل کی بہار بنا دے، میری آنکھوں کا نور بنا دے
اور میرے غم و فکر کو دور کرنے کا ذریعہ بنا دے۔ بہرحال فرمایا کہ اللہ کے
ناموں کے ساتھ کجروی کرنے والوں کو چھوڑ دو۔ میں نے کجروی کی مختلف
صورتیں بھی عرض کر دیں، ان سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔

حق پرست لوگ

آگے ارشاد باری تعالیٰ ہے وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ یَّھْدُوْنَ
بِالْحَقِّ اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے اُن میں ایسے لوگ بھی ہیں جو
حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ اور اسی کے
ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ اسی قسم کے الفاظ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے
بارے میں بھی پہلے آچکے ہیں وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓی اُمَّةٌ یَّھْدُوْنَ
بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ مقصد یہ ہے کہ ہر امت کے لوگ سارے
کے سارے گمراہ نہیں ہوتے۔ یہودیوں میں بھی بعض حق پرست لوگ
موجود ہیں جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق فیصلہ
کرتے ہیں۔ ایسے لوگ حضور علیہ السلام پر فوراً ایمان لے آئے اس زمانے
میں بھی اِکّا دُکّا یہودی نکل آتے ہیں جو حق کو پہچان کر اُسے قبول کر
لیتے ہیں۔ تاہم اس آیت کریمہ سے حضور علیہ السلام کی امت مراد ہے
کہ یہ ایسی امت ہے جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتی ہے حدیث شریف
میں آتا ہے لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی
الحق لا یضرهم من خالفهم حتی یاتی امر الله
یعنی میری امت میں ایک ایسا گروہ ضرور موجود رہے گا جو حق کے ساتھ

راہنمائی کرے گا اور حق کے ساتھ ہی فیصلہ کریگا۔ یہاں تک کہ خدا کا حکم آجائے یعنی مسیح علیہ السلام کا نزول ہوجائے یا قیامت برپا ہوجائے اور پھر یہ بھی ہے کہ مخالفت کرنے والوں کی عداوت ایسے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی، وہ حق پہ ہمیشہ قائم رہیں گے، مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح آخری امت حق سے بالکل خالی نہیں ہوگی۔ اس میں کچھ نہ کچھ حق پرست ضرور موجود رہیں گے۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٨٢﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿١٨٣﴾ أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا ۗ مَا بِصَاحِبِهِم مِّن جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿١٨٤﴾ أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ وَأَنْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ ۖ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٥﴾ مَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ ۚ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٨٦﴾

ترجمہ:- اور وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، ہم عنقریب آہستہ آہستہ اُن کو پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں اُن کو خبر بھی نہ ہو گی (۱۸۲) اور میں مہلت دیتا ہوں اُن کو، بیشک میری تدبیر مضبوط ہے (۱۸۳) کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ اُن کے صاحب میں کوئی جنون نہیں ہے، وہ تو ڈرانے والے ہیں، کھول کر (۱۸۴) کیا انہوں نے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں اور جو چیز بھی اللہ نے پیدا کی ہے اور شاید کہ اُن کے وعدے کا وقت قریب ہو، پس کس بات پر اس (قرآن) کے بعد یہ لوگ ایمان لائیں گے (۱۸۵) جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے، اُس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے اور وہ اللہ چھوڑتا ہے اُن کو، اپنی سرکشی میں یہ سرگرداں پھرتے ہیں (۱۸۶)

ربط آیات

گذشتہ درس میں عہد و پیمان توڑنے والوں کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اُن کی سزا کا بیان کیا۔ نیز فرمایا کہ جو لوگ غفلت اختیار کرتے ہیں اُن کا نتیجہ بالآخر جہنم ہوگا۔ پھر اللہ نے توحید اور ایمان کے سلسلے میں اللہ کے اسمائے پاک اور صفات کے ساتھ اُسے پکارنے کا حکم دیا۔ اور اس میں کجی کرنے سے منع فرمایا کیونکہ کجی کرنے والے مجرم ہوں گے اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں کو اللہ کے علاوہ کسی غیر پر بولنے، اُن کا غلط مطلب لینے اور غلط مقام پر استعمال کرنے سے بھی منع فرمایا کہ ایسا کرنا جرم ہے پھر اللہ نے آخری امت کے لوگوں کی توصیف فرمائی کہ اس اُمت میں ایسے لوگ ضرور رہیں گے جو راہ حق کی ہدایت دیتے رہیں گے اور اسی کے مطابق انصاف کریں گے۔ فرمایا یہ امت حق پرست لوگوں سے کبھی خالی نہیں ہوگی۔

مکذبین کی تدریجی گرفت

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے مکذبین اور ان کے لیے سزا کا ذکر کیا اور ساتھ منکر رسالت کا بھی بیان فرمایا ہے پھر آگے معاد یعنی قیامت کا ذکر بھی آئے گا۔ اس سورۃ کے آخر میں اللہ نے تمام مرکزی مضامین کا اعادہ فرمایا ہے۔ مکذبین کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے، وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ آیات سے مراد احکام بھی ہیں، معجزات بھی اور دلائل بھی۔ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب نازل فرمائی ہے یا جو دین اور شریعت اپنے پیغمبر کو عطا کی ہے، جو لوگ ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں، اُن کے متعلق فرمایا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ ہم عنقریب انہیں آہستہ آہستہ پکڑیں گے بعض اوقات اللہ کی گرفت جلد بھی آجاتی ہے مگر اس کا عام قانون یہی ہے کہ وہ جلد گرفت نہیں کرتا بلکہ ابتداء میں مہلت دیتا رہتا ہے پھر جب یہ مہلت پوری ہو جاتی تو اس کی گرفت آجاتی ہے۔ اور یہ گرفت ایسی

جگہ سے آتی ہے۔ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ جہاں سے انہیں علم ہی نہیں ہوتا۔ اُن کی توقع کے برخلاف اُن کی سرکوبی کے لیے کوئی نامعلوم دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ سزا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

استدراج کے معانی

استدراج کا لغوی معنی کسی چیز کو آہستہ آہستہ آگے بڑھانا یا مہلت دے کر ترقی کرنا ہے اور اس آیت میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے تاہم خرقِ عادت اشیاء کے ظہور کے ضمن میں یہ لفظ اصطلاحی مفہوم بھی رکھتا ہے۔ یہ بیان پہلے گزر چکا ہے کہ اگر کوئی خرقِ عادت چیز نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو اُسے معجزہ کہا جاتا ہے اور اگر نبوت سے پہلے کوئی چیز ظاہر ہو تو اُسے ارہاص کہتے ہیں۔ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہونے والا فعل اُس کا ذاتی فعل نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اُس کی مشیت اور ارادے سے ایسا واقع ہوتا ہے اور اگر نبی کے علاوہ کسی دیگر اہلِ ایمان کے ہاتھ پر عادت کے خلاف کوئی چیز ظاہر ہو تو اُسے کرامت کہتے ہیں۔ بعض اوقات مجذوبوں یا مجنونوں کے ہاتھ پر بھی کوئی خرقِ عادات چیز ظاہر ہو جاتی ہے، ایسی چیز کو معونت کہا جاتا ہے۔ صاحبِ سالک السلوک نے لکھا ہے کہ اگر کافر کے ہاتھ پر کوئی ایسی چیز ظاہر ہو جائے جو عادت کے خلاف ہو، تو پھر اگر وہ چیز کافر کے مقصد کے مطابق ہے تو اُسے استدراج کہیں گے جیسے قربِ قیامت میں دجال کے ہاتھ پر ایسی بہت سی چیزیں ظاہر ہوں گی جنہیں دیکھ کر بڑے بڑے سائنسدان بھی دنگ رہ جائیں گے۔ اور اگر کافر کے ہاتھ پر خرقِ عادت ظاہر ہونے والی چیز اُس کی مرضی کے خلاف ہو جیسے بلعم بن باعور کا واقعہ ہے، تو ایسی چیز کو اہانت کہتے ہیں۔ سحر یا جادو بھی اسی قسم کی چیز ہے جو کافر یا غیر شرع لوگ کرتے ہیں۔ سحر کرنے سے بھی بعض غیر معمولی چیزیں پیش آجاتی ہیں، بہرحال

استدراج اصطلاحی طور پر ایسی خرقِ عادت چیز کو کہتے ہیں جو کسی کافر کے ہاتھ پر ظاہر ہو تاہم اس کا لفظی معنی آہستہ آہستہ مہلت دے کر گرفت کرنا ہے اور اس مقام پر یہی مطلب ہے ۔

فرمایا وَاُمْلِیْ لَهُمْ میں مہلت یا ڈھیل دیتا ہوں ان لوگوں کو کیونکہ اِنَّ كَيْدِىْ مَتِيْنٌ میری تدبیر مضبوط ہے ۔ میری تدبیر سے کوئی بھی باہر نہیں نکل سکتا جب چاہوں گا پکڑ لوں گا ۔ سورۃ بروج میں موجود ہے اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے ۔ مکر اور کید ہم معنی الفاظ ہیں اور معنی تدبیر ہے تاہم مکر مخفی تدبیر کو کہتے ہیں ۔ تو فرمایا میری تدبیر ہر چیز پر حاوی ہے تاہم مجرموں کو بعض اوقات فوری گرفت نہیں کی جاتی بلکہ انہیں دنیا میں عیش و عشرت کا موقع دیا جاتا ہے ، ان پر ہر قسم کی فراوانی کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور وہ لوگ دلیر ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھے ہیں ، ہم پر اللہ تعالیٰ راضی ہے ، مگر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے موقع پر ان کو گرفت میں لاتا ہے کہ مجرموں کو پتہ بھی نہیں چلتا ۔ بعض اوقات بعض لوگ دنیا کی زندگی میں گرفت سے بچے رہتے ہیں ، ایسے لوگ مرنے کے بعد اللہ کی پکڑ میں آتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق بہتر جانتا ہے کہ کس شخص کو کس وقت اور کس طرح پکڑتا ہے تاہم وہ تکذیب کرنے والے مجرموں کو چھوڑتا نہیں اور کسی نہ کسی نوعیت انہیں سزا میں ضرور مبتلا کرتا ہے ۔

تصدیقِ رسالت

آگے اللہ تعالیٰ نے رسالت کے باب میں مشرکین کا تذکرہ بیان کیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا کیا ان لوگوں نے غور فکر نہیں کیا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ کہ ان کے صاحب یعنی رفیق میں کوئی جنون نہیں ہے ۔ یہاں پر صاحب سے مراد حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارک ہے۔ آپ کی ذات کے لیے یہ لفظ قرآن پاک کے درجنوں مقامات پر بھی آیا ہے۔ جیسے "مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى" ۔ (النجم) تمہارے رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ راستہ بھولے ہیں اور نہ بھٹکے ہیں۔ "وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ" (التکویر) تمہارے رفیق یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجنون نہیں ہیں۔ غرضیکہ صاحب کا معنیٰ رفیق اور ساتھی ہے اور مکے والوں کو بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے خاندان اور برادری کے فرد ہیں، تم ان کے حالات سے بخوبی واقف ہو۔ سورۃ یونس میں خود حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے کہلوایا "فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" میں نے تمہارے درمیان چالیس سالہ زندگی کا حصہ گزارا ہے، تم میری زندگی کے ایک ایک لمحے سے واقف ہو، پھر تمہیں اتنی بھی عقل نہیں کہ حق اور باطل میں تمیز کر سکو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چالیس سال تک تو میں صادق اور امین رہوں اور پھر یکدم خدا تعالیٰ پر جھوٹ بولنے لگوں۔

تو صاحب کے لفظ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرمائی ہے کہ مشرکین! تم حضور علیہ السلام کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہو، تم آپ کے اخلاق و کردار سے واقف ہو اور خوب جانتے ہو کہ آپ (العیاذ باللہ) مجنون نہیں ہیں۔ مجنون کا دماغ تو خراب ہو چکا ہوتا ہے اور وہ کوئی ٹھیک بات نہیں کرتا مگر حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام تو علم و حکمت کے دریا بہا رہے ہیں، بھلا آپ کیسے مجنون ہو سکتے ہیں؟ فرمایا اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ آپ تو اللہ کی گرفت سے واضح طور پر ڈرانے والے ہیں۔ آپ تمہیں اچھی طرح سمجھا رہے ہیں کہ اگر اللہ کی وحدانیت کا انکار کرو گے

اس کی آیات کی تکذیب کرو گے تو ضرور پکڑے جاؤ گے اور عذاب میں مبتلا ہو گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ رسالت کا مسئلہ بھی بیان کر دیا۔

غور و فکر کی دعوت

آگے اللہ تعالیٰ نے غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ دیکھو اگر انسان غور و فکر کرے، اپنے دماغ، عقل اور دل کو بروئے کار لائے تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بھی سمجھ میں آجاتی ہے اور قیامت کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا انہوں نے نہیں دیکھا، آسمان و زمین کی سلطنت میں وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِن شَيْءٍ اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے پیدا کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ زمین و آسمان جیسی بڑی بڑی اشیاء اور دیگر چھوٹی سے چھوٹی مصنوعات میں غور کرتے تو آیات الٰہی کا انکار کرتے اور نہ ہی نبی علیہ السلام کو معاذ اللہ دیوانہ کہتے۔ مگر افسوس کہ لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔ ایسے لوگوں کی حالت پہلے بیان ہو چکی ہے لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا اُن کے دل ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ یہ سب چیزیں غور و فکر کے فقدان پر دلالت کرتی ہیں ؎

ففی کل شیء لہ اٰیۃ تدل علی انہ واحد

ہر چیز میں دلائل قدرت موجود ہیں جن میں غور و فکر کرنے سے اُس مالک الملک کی وحدانیت سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے جسکی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ کے ذریعے ان تمام چیزوں کا ظہور ہوا ہے۔ اُس کے سوا ان اشیاء کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے اسی غور و فکر کے نتیجے میں معاد یعنی قیامت کی سمجھ بھی آتی ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ لوگ نہ تو عالم بالا کی چیزوں میں غور و فکر کرتے

ہیں اور تہ عالم زیریں کی چیزوں میں ۔
حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے فرمایا کہ معراج کے موقع پر جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو کچھ
عجیب وغریب چیزیں دیکھیں، میں نے بادل، گرج اور چمک
دیکھی۔ دوسری روایت میں سمندر کا ذکر بھی ملتا ہے۔ پھر آگے گیا تو
کچھ ایسے لوگ دیکھے جن کے پیٹ بہت بڑے بڑے تھے ۔
بطونھم کالبیوت کے لفظ آتے ہیں کہ ان کے
پیٹ مکانوں جتنے بڑے بڑے تھے اور ان پیٹوں میں بڑے
بڑے سانپ تھے۔ حضور فرماتے ہیں کہ میں نے جبرائیل علیہ السلام
سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں تو بتایا گیا کہ یہ سود خور ہیں۔ سود خور بڑا
حریص آدمی ہوتا ہے، اس میں پاکیزہ جذبات کم ہو جاتے ہیں شیطانی جذبات
بڑھنے لگتے ہیں، انسانی ہمدردی ختم ہو جاتی ہے۔ بحیثیت قوم یہود
اور ہنود دونوں سود خور قومیں ہیں۔ یہ بڑے سنگدل لوگ ہوتے ہیں یہود
کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کیا گیا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے
ان کی سزا بھی سخت رکھی ہے۔ ایسی حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام
نے فرمایا کہ جب میں آسمان دنیا پر واپس آیا تو نیچے میں نے بڑا دھواں
اور گرد و غبار دیکھا جس کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اس
کے متعلق جبریل علیہ السلام سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا ھٰؤلاء
شیاطین یعنی شیطان ہیں جو انسانوں کے سامنے چھائے ہوئے ہیں۔
تاکہ یہ آسمان و زمین کے دلائل قدرت میں غور و فکر نہ کرسکیں نشانات
قدرت اور انسانوں کے درمیان شیاطین حائل ہیں جن کی وجہ سے انسان
غور و فکر نہیں کر پاتے۔ اگر انسان غور و فکر کرتے تو اللہ تعالیٰ کی
وحدانیت اور معاد کو جان لیتے ۔

موت سے چشم پوشی

فرمایا کیا انھوں نے زمین و آسمان کی سلطنت پر غور نہیں کیا وَاَنْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُھُمْ اور اس بات پر بھی کہ شاید اُن کے وعدے کا وقت قریب ہی ہو۔ وعدے کے وقت سے مراد مجرمین کی گرفت کا وقت بھی ہو سکتا ہے اور زندگی کے اختتام کا وقت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور اس حقیقت کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے کہ اُن کی زندگی کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے روزمرہ کے مشاہدات ہمارے سامنے ہیں کہ کوئی شخص بالکل تندرست ہوتا ہے، کھاتا پیتا، کھیلتا کودتا ہے مگر موت کا وقت اچانک آجاتا ہے اور اس کے تمام پروگرام دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ انسانوں کی انفرادی موت کی طرح اقوام کی مجموعی موت بھی ایسے ہی واقع ہو جاتی ہے اور پھر اُن کی گرفت ہو جاتی ہے۔ لوگ بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ دُنیا بھر کے فیصلے کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ڈھیل دیتے رہتے ہیں مگر جب ان کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو پھر ان کی ساری نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ وہ ناشکری کی پاداش میں ذلیل و خوار اور مغلوب ہو کر رہ جاتے ہیں اور پوری پوری قوموں کی ہلاکت واقع ہو جاتی ہے۔

اِس وقت مسلمان بھی دنیا میں عمومی گرفت میں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی پچاس قومی حکومتیں موجود ہیں مگر بحیثیت مجموعی سلطنت عامہ کی نعمت چھن چکی ہے۔ کافر قوموں نے سازش کے ذریعے ترکی خلافت کو ختم کیا اور اب پوری دُنیا میں مسلمان روس اور امریکہ کے کاسہ لیس بن کر رہ گئے ہیں کسی ملک میں یہ ہمت نہیں کہ ان سپر طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں۔ جب اہل اسلام اپنے

مشن سے ہٹ گئے، احکام الٰہی سے غفلت اختیار کر لی تو ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔ آج کل مسلم ریاستیں اس قدر بے اثر ہو چکی ہیں کہ گذشتہ کئی سال سے برسرپیکار ملکوں کے درمیان صلح نہیں کرا سکتے۔ ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ ان کا کام کھیل تماشے، عیاشی اور آرام طلبی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ مسلمان معاشی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے تباہ ہو چکے ہیں، اخلاق تباہ ہو چکے ہیں، تعلیم کے لحاظ سے پس ماندہ ہیں، لوگ کافر اور عیسائی بننے جا رہے ہیں، مگر دعویٰ یہ ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں یہ سب کچھ غور و فکر کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ اللہ نے فرمایا شاید کہ ان کے وعدے کا وقت قریب ہو اور یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہوں۔

اللہ کا آخری پروگرام

فرمایا اللہ نے اپنا آخری دین مکمل کر دیا ہے، آخری شریعت آ چکی ہے۔ آخری نبی آ چکا ہے اور قرآن پاک کی صورت میں آخری پروگرام آ چکا ہے۔ اگر اب بھی لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اللہ کے اس آخری پروگرام کو اپنانے کے لیے تیار نہیں فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ تو پھر اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔ اب نہ تو کوئی نبی آئے گا، نہ دین، نہ شریعت اور نہ کتاب اب یہ کس پروگرام کے انتظار میں ہیں۔ جب یہ سلسلہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے شروع کیا تھا تو اسی وقت فرما دیا تھا کہ میری طرف سے وقتاً فوقتاً تمہارے پاس ہدایت کا پروگرام آئے گا۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرہ) جس نے میری ہدایت کا اتباع کیا، وہ آگے چل کر مامون ہوگا اور اسے کوئی خوف و خطر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں انبیاء مبعوث فرمائے، کتابیں نازل کیں، شریعتیں دیں اور پھر آخر میں قرآن پاک نازل کر کے اعلان فرما دیا۔ اَلْیَوْمَ

اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ)
آج میں نے تمہارے لیے دین مکمل کر دیا، اپنی نعمت پوری کر دی
ہے اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا ہے۔ اب اس
کے بعد کوئی نئی ہدایت، کوئی نیا پروگرام نہیں آئے گا۔ اب تو تمہارے
لیے قیامت ہی آئیگی۔ چنانچہ قرآن پاک کا تقریباً تیسرا حصہ قیامت
کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم قرآن پاک پر
ایمان نہیں لاتے، اس کے پروگرام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں
تو پھر اس کے بعد کونسا پروگرام اور کون سی ہدایت آئے گی جس پر
ایمان لے آؤ گے۔

فرمایا حقیقت یہ ہے مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا
هَادِيَ لَهٗ، جس کو اللہ تعالیٰ اس کی سوءِ استعداد، ضد اور عناد کی
وجہ سے گمراہ کر دے اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہے اللہ
کی ہدایت کے سوا ہدایت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ پھر جب
لوگ سرکش ہو جاتے ہیں۔ اس کی ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ تو
پھر اللہ کا قانون بھی یہ ہے وَيَذَرُهُمْ کہ وہ ان کو چھوڑ دیتا
ہے فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ وہ اپنی سرکشی میں ہی
سرگرداں رہتے ہیں۔ اور بالآخر وہ اپنے انجام کو پہنچ کر گرفتارِ عذاب
ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جہالت کی تاریکیوں میں سرگرداں رہنے
کے لیے مہلت دے دیتا ہے، وہ وہیں بھٹکتے رہتے ہیں اچھی
باتوں کو بُرا اور بُری باتوں کو اچھا سمجھتے رہتے ہیں، انبیاء کی تکذیب
کرتے رہتے ہیں اور شیطان کا اتباع کرتے ہیں، قیامت کے
متعلق شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ اور آخرت کے لیے
کوئی تیاری نہیں کرتے۔ بالآخر ان کے وعدے کا وقت

ہدایت بدست خدا

آجاتا ہے اور وہ اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں اللہ تعالے نے
نبوت و رسالت کی تصدیق بھی کر دی ہے اور توحید کے بارے
میں غور و فکر کی دعوت بھی دے دی ہے۔ آگے مستقل طور پر قیامت
کا ذکر فرمایا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

ترجمہ:- یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں قیامت کے بارے میں کہ کب ہوگا اس کا قائم ہونا۔ آپ کہ دیجئے (اے پیغمبر!) بیشک اس کا علم میرے رب کے پاس ہے۔ نہیں ظاہر کرے گا اُس کو اُس کے وقت پر مگر وہی۔ یہ بھاری ہے آسمانوں اور زمین میں۔ نہیں آئے گی تمہارے پاس مگر اچانک یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اُس کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ اے پیغمبر! آپ کہ دیں کہ اس کا علم اللہ کے پاس ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (۱۸۷) اے پیغمبر! آپ کہ دیجئے نہیں مالک میں اپنے نفس کے لیے نفع کا اور نہ

نقصان کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو
زیادہ کرتا بھلائی سے اور نہ پہنچتی مجھے کوئی برائی۔ نہیں ہوں میں
مگر ڈر سنانے والا اور خوشخبری دینے والا ان لوگوں کے لیے
جو ایمان رکھتے ہیں (۱۸۸)

ربط آیات ~~عہد و~~ پیمان کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُسے توڑنے والوں کی مذمت
بیان فرمائی۔ پھر فرمایا کہ ہم نے انسان کو دل، آنکھیں اور کان جیسی نعمتیں عطا فرمائیں مگر لوگ ان کا
صحیح استعمال نہ کر کے غفلت میں پڑ جاتے ہیں اور بالآخر جہنم کا شکار بنتے ہیں۔ پھر
اللہ نے ایمان اور توحید کے سلسلے میں اسمائے پاک اور صفاتِ الٰہی کا مسئلہ بھی بیان فرمایا
کہ اللہ تعالیٰ کو انہی اسماء اور صفات کے ساتھ پکارنا چاہیئے اور اللہ کی صفات
کو غلط معانی پہنا کر، یا غلط مقام میں استعمال کر کے یا غلط تاویل کر کے الحاد کے مرتکب
نہیں ہونا چاہیئے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے اسمائے مختصہ کا غیر اللہ پر اطلاق کرنا بھی
الحاد میں داخل ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تکذیب کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ ہم
انہیں مہلت دے کر اس طریقہ سے پکڑیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا اللہ کی تدبیر بڑی مضبوط ہے
پھر اللہ تعالیٰ نے شکوہ کیا کہ لوگ زمین و آسمان کی بادشاہی میں غور و فکر نہیں کرتے
اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تامہ اور حکمتِ بالغہ کے دلائل کو دیکھتے، اُن میں غور و فکر
کرتے تو اس کی وحدانیت کا کبھی انکار نہ کرتے۔ اُن کو کیا پتہ کہ شاید اُن کا وقت قریب
آگیا ہو، فرمایا یہ لوگ اکثر گمراہی میں سرگرداں رہتے ہیں۔

اب آج کے درس میں قیامت کے متعلق ذکر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے
کل عرض کیا تھا اس سورۃ کے آخر میں توحید، رسالت، قضا و قدر اور معاد جیسے اہم
مسائل کا ذکر آرہا ہے۔ تو یہ آیات بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ
نے رسالت کی پوری تاریخ بیان فرمائی ہے اور انبیاء کے مشن کی وضاحت فرمائی ہے
مشرکین جن چیزوں کا انکار کرتے تھے اُن میں توحید سرفہرست ہے توحید کو اختیار

کرنے کے بجائے وہ شرک کی مختلف اقسام میں مبتلا تھے اور اسی طرح
قیامت کا بھی انکار کرتے تھے۔ تو یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے قیامت
کا مسئلہ بیان فرمایا ہے جو کہ ایمان کا ایک بنیادی جزو ہے

وقوع قیامت کا وقت

ارشاد ہوتا ہے یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اے پیغمبر! یہ
لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں اَیَّانَ مُرْسٰهَا کہ وہ
کب قائم ہوگی۔ لفظ اَیْنَ اور اَیَّانَ میں یہ فرق ہے کہ اَیْنَ مکان کو ظاہر
کرتا ہے جب کہ اَیَّانَ وقت کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ
قیامت کب برپا ہوگی اور ارسیٰ کا معنی کسی چیز کا گاڑ دینا ہوتا ہے
جیسے فرمایا وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (النّٰزعٰت) پہاڑوں کو گاڑ دیا۔ بحری
جہاز کے لنگر انداز ہونے کو بھی ارساء سفینۃ کہتے ہیں
تاہم یہاں پر وقوع مراد ہے کہ قیامت کب واقع ہوگی۔ جب حضور علیہ السلام
قیامت کا تذکرہ فرماتے اور لوگوں کو بتاتے کہ وہ وقت آنے والا ہے
جب ہر ایک کو اپنی کارکردگی کا حساب دینا ہوگا، تو مشرکین طنزاً کہتے
مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الملک) اگر تم اپنے
دعوے میں سچے ہو تو بتاؤ کہ وہ قیامت کب آئیگی۔ ہم نے تو آج تک
کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوتے نہیں دیکھا۔ یہاں بھی اسی طرح
کے سوال کے جواب میں اللہ نے فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے
اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ اس وقوع قیامت کا علم تو میرے رب کے پاس ہے
لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ نہیں ظاہر کرے گا اس (قیامت) کو
اس کے وقت پر مگر وہی اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو اپنی ذات
کے ساتھ مختص کر رکھا ہے ان میں قیامت بھی شامل ہے۔ قیامت
کے واقع ہونے کی خبر تو دے دی گئی ہے اور قرآن پاک کا ایک تہائی حصہ اسی
موضوع پر مشتمل ہے مگر اس کے وقوع کا معین وقت نہیں بتایا گیا معراج

کے واقعہ سے متعلق ابن ماجہ اور مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ جب تمام انبیاء علیہم السلام اکٹھے ہوئے تو ان کے درمیان قیامت کا ذکر بھی ہوا تھا۔ ہر نبی نے قیامت کے وقت سے لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اما وجبتها فلا یعلمها الا اللہ یعنی قیامت کے وقوع کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ اللہ نے قیامت کے وقت کے متعلق نہ کسی نبی اور مرسل کو خبر دی ہے اور نہ کسی مقرب فرشتے کو۔ البتہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے زمین پر اتر کر اللہ کے دشمن دجال کو قتل کر دوں۔ قرب قیامت کی بعض دوسری نشانیاں بھی بتلائی گئی ہیں۔ حدیث جبرئیل[1] میں آتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایمان، اسلام اور احسان کے بعد جب متی الساعۃ کا سوال کیا یعنی حضور! یہ بتائیں کہ قیامت کب آئیگی؟ تو آپ نے بھی یہی جواب دیا تھا ما المسئول عنها باعلم من السائل کہ جس سے یہ سوال کیا جا رہا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ یعنی جس طرح اس بات کا علم پوچھنے والے کو نہیں ہے اسی طرح جواب دینے والے کو بھی نہیں ہے۔ اس بات کی وضاحت سورۃ لقمان میں موجود ہے اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ یعنی قیامت کے وقوع کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہی اس کو اپنے وقت پر ظاہر کریگا۔

آسمان و زمین کیلئے بوجھل

آگے قیامت کے متعلق مزید فرمایا ہے ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ قیامت کا وقوع آسمانوں اور زمین میں بھاری ہے، بڑی بوجھل ہے کیونکہ جب یہ واقع ہوگی تو ہر چیز کو درہم برہم کر دے گی جیسے فرمایا اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ (التکویر) جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور

[1] بخاری ص۱۲ ج۱

(فیاض)

جب تارے بے نور ہو جائیں گے۔ غرضیکہ زمین و سما کا یہ موجودہ نظام شمسی ختم ہو جائے گا اس نظام کے تمام سیارے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔ پھر حظیرۃ القدس کا نظام قائم ہوگا۔ اس وقت لوگوں پر بڑی دہشت طاری ہوگی۔ سورۃ الحاقہ میں موجود ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو زمین اور پہاڑ اٹھا لیے جائیں گے وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ اور آسمان پھٹ جائے گا اور فرشتے اس کے کناروں پر آ جائیں گے پورے کا پورا نظام بدل جائیگا۔ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ حضور! جب یہ حالت طاری ہو جائیگی تو اس وقت مخلوق کہاں ہوگی؟ فرمایا وہ پلصراط کے ایک حصے پر ہوں گے۔

قیامت کی اچانک آمد

فرمایا، قیامت بھاری ہے آسمان اور زمین پر لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً نہیں آئے گی تمہارے پاس مگر اچانک، قیامت کی اچانک آمد کے متعلق احادیث میں مختلف روایات ملتی ہیں، مثلاً صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ دو آدمی کپڑا پھیلائیں گے اور اس کا بھاؤ نہیں طے کر پائیں گے کہ قیامت برپا ہو جائیگی۔ کوئی شخص جانور خریدے گا، اس کا دودھ دوہے گا مگر پینے سے پہلے قیامت آ جائے گی۔ پھر فرمایا ایک شخص کھانا کھانے کے لیے برتن سے لقمہ اٹھائے گا مگر منہ میں نہیں ڈال سکے گا، اور قیامت واقع ہو جائیگی۔

فرمایا، یہ لوگ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا آپ سے قیامت کے متعلق اس طرح سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ حفی کا معنی عالم بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ معنی کیا جائے تو پورا جملہ اس طرح ہوگا، یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں گویا آپ اسے جانتے ہیں، یہ درست نہیں ہے

نہ تو آپ اُس کی کھوج میں ہیں اور نہ ہی آپ قیامت کے وقت معین کو جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قیامت کے وقت کا علم نہیں دیا، البتہ بعض نشانیاں بتلائی ہیں کہ قربِ قیامت میں اس قسم کے واقعات پیش آئیں گے اور پھر قیامت برپا ہو جائے گی۔

حفی کا ایک معنی مہربان بھی ہوتا ہے۔ سورۃ مریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوا ہے۔ جب بتوں کو پاش پاش کرنے کی پاداش میں باپ نے گھر سے نکال دیا تو آپ نے جاتے ہوئے سلام کہا اور کہا کہ میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے بخشش مانگوں گا۔ اِنَّہٗ کَانَ بِیۡ حَفِیًّا وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔ مشرکین تو حضور علیہ السلام سے قیامت کا سوال طعن و تشنیع کے طور پر کرتے تھے مگر اہلِ ایمان بھی بعض اوقات قیامت کے متعلق دریافت کر لیتے تھے کیونکہ حضور علیہ السلام ان کے لیے نہایت شفیق اور مہربان تھے۔ بہرحال اس قسم کے سوالات کے جواب میں اللہ نے فرمایا قُلۡ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ اللّٰهِ اس کا علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے اور ایسے سوال کرتے ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور جو اس نے کسی کو نہیں دیا۔

اللہ اور رسول کی محبت

صحیحین کی روایت میں ایک دیہاتی مسلمان کا ذکر آتا ہے کہ اس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا کہ حضور! یہ بتائیے مَتَی السَّاعَةُ کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا، افسوس ہے کہ تم نے قیامت کے لیے تیاری کیا کر رکھی ہے؟ اس نے کہا حضور! بڑی بڑی نمازیں اور روزے تو خیر نہیں ہو سکے ولکنی

احب اللّٰہ و رسولہٗ البتہ میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت ضرور رکھتا ہوں۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ تم اسی کے ساتھ ہوگے جس کے ساتھ محبت ہوگی۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور کی یہ بات سن کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ کسی دوسری بات سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حضور نے اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر اتنی بڑی بشارت سنا دی۔

قیامت کے بارے میں اہل ایمان بھی سوال کرتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے وقت کو مخلوق سے اس لیے مخفی رکھا ہے تاکہ لوگ محتاط رہیں اور نیکی کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب ہوں۔ وہ ہمیشہ فکرمند رہیں کہ پتہ نہیں قیامت کب آجائے گی، اس لیے ہمیں غافل نہیں ہونا چاہیئے اور نیکی کرنے میں سبقت کرنی چاہیئے۔ اس قسم کا اخفاء اللہ نے لیلۃ القدر کے تعین میں بھی رکھا ہے تاکہ لوگ اس کی تلاش میں زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور پھر اس کا پھل حاصل کر سکیں۔ قیامت کے وقت کو مخفی رکھنے میں بھی یہی حکمت ہے۔

نافع اور ضار

قیامت کے بارے میں جاننا تو بہت بڑی بات ہے فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہ دیں لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا میں تو اپنی ذات کے لیے بھی نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ مگر جو اللہ چاہے میرے اختیار میں تو یہ بھی نہیں کہ میں اپنے آپ کو نفع پہنچا سکوں یا نقصان کو دور کر سکوں، یہ سب اختیارات تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ چنانچہ ہر انسان کا پختہ یقین ہونا چاہیئے بلکہ یہ بات اس کے ایمان میں داخل ہے کہ نافع اور ضار

صرف خدا تعالیٰ ہے۔ مافوق الاسباب اور غائبانہ طور پر وہی نفع پہنچاتا ہے
اور وہی نقصان پہنچاتا ہے۔ النافع اور الضار اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک
بھی ہیں مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی
حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں۔

مسئلہ علم غیب

اللہ نے فرمایا آپ یہ بھی کہہ دیں وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ
اور اگر میں غیب جانتا لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ تو بہت
سی بھلائی حاصل کر لیتا۔ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ اور مجھے کوئی برائی اور
تکلیف نہ پہنچتی۔ گویا حضور علیہ السلام نے اپنے متعلق علم غیب کی صریح
الفاظ میں نفی کر دی ہے۔ غیب اس علم کو کہا جاتا ہے جو نہ عقل سے
معلوم ہو اور نہ حواس ظاہرہ و باطنہ سے۔ جو چیز غور و فکر کرنے سے
یا کسی دوسرے کے بتلانے سے معلوم ہو وہ کبھی غیب نہیں ہوتا علم غیب
اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے لہذا اس کا اطلاق کسی فرشتے، نبی یا ولی
پر کرنا درست نہیں ہے۔ انبیاء بھی غیب نہیں جانتے الا ما علمھم
اللہ سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ انہیں وحی کے ذریعے عطا کرتا
ہے۔ اور غیب وہ ہوتا ہے جو بغیر کسی واسطے کے خود بخود ہو۔ ایسا علم
صرف اللہ کے پاس ہے، یہ چیز مخلوق میں سے کسی کو حاصل نہیں
انبیاء کو بھی اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے، ذرے ذرے
کا علم خدا کے سوا کسی مخلوق کو حاصل نہیں، مولوی احمد رضا خان بریلوی
نے بالکل غلط بات کی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زمین کی پیدائش
سے لے کر قیامت تک کے ذرّے ذرّے کا علم ہے یہ تو مشرکانہ
عقیدہ ہے کیونکہ علم محیط اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور قرآن کریم
میں حضور علیہ السلام کے کلی علم کی صراحتاً نفی کی گئی ہے، مثلاً سورۃ یٰسٓ
میں فرمایا وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ہم نے اپنے نبی

کو شعر کا علم نہیں سکھایا اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان ہے۔ اب کلی علم کہاں رہ گیا۔ خود حضور علیہ السلام نے دعا میں سکھایا اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ عِلۡمٍ لَّا یَنۡفَعُ اے اللہ! میں تیری ذات پاک کیساتھ ایسے علم سے پناہ چاہتا ہوں جو مفید نہ ہو جیسے سحر، کہانت اور رمل کا علم کہ حضورؐ نے اس سے پناہ مانگی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبیوں سے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مختصہ کی نفی کرنا واجب ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کے بارے قادرِ مطلق، علیم کل، واجب الوجود ہونے کی نفی کرنا ضروری ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اس کے سامنے عاجز ہیں۔ بھائی! صفاتِ مختصہ کی نفی کرنا انبیاء علیہم السلام کی توہین نہیں ہے۔ یہ صفات تو اللہ تعالیٰ کا حق ہیں اور حق صرف حقدار کو ہی ملنا چاہیئے۔ ہاں شریعت کا علم نبی مکمل طور پر جانتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نبی شریعت کا کوئی مسئلہ نہیں جانتا تو یہ کفر ہوگا۔ شریعت کے علاوہ کائنات میں جو تکوینی چیزیں واقع ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کا وافر حصہ بھی نبی کو عطا کرتا ہے مگر ہر چیز کا علم نہیں دیتا کہ یہ اس کا اپنا خاصہ ہے۔ بیشمار چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا، انہیں اللہ ہی جانتا ہے۔

فرمایا میں غیب نہیں جانتا، اگر جانتا تو اپنے لیے بہت سی بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ حضور علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ بیمار بھی ہوئے، آپ زخمی بھی ہوئے۔ آپ کے عزیز ساتھی شہید ہوئے۔ اگر آپ کو غیب کا علم ہوتا تو اتنی تکالیف برداشت نہ کرتے۔ بئرِ معونہ والا واقعہ بڑا دلخراش ہے۔ آپ نے ستر جلیل القدر صحابہؓ کو تبلیغِ دین کے لیے بھیجا مگر وہ سارے کے سارے راستے میں ہی قتل کر دیے گئے۔ حضور علیہ السلام کو اتنا صدمہ ہوا کہ مہینہ بھر قنوتِ نازلہ

پڑھتے رہے ہے۔ اگر آپ کو علم ہوتا کہ یہ لوگ دھوکے سے آدمی لیے جا رہے ہیں اور انہیں قتل کر دیں گے تو آپ کبھی نہ بھیجتے۔ دنیا میں پیش آنے والے کتنے امور ہیں کہ اُن کے متعلق پیشگی علم ہو جائے تو انسان کو کبھی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ صحت، بیماری، قحط، فراوانی، فتح، شکست، نفع نقصان کتنی چیزیں ہیں کہ قدرت کا سارا نظام انسان کی لاعلمی کی وجہ سے ہی چل رہا ہے۔ اگر ہر شخص کو نفع نقصان یا موت و حیات کا پیشگی علم ہو جائے تو دُنیا کا نظام ٹھپ ہو کر رہ جائے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے کلی علم صرف اپنے پاس رکھا ہے۔

صفت تدبیر میں شرک

اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود اور خالق ہونے میں تو مشرکین بھی متفق ہیں مگر آگے چل کر وہ اللہ تعالیٰ کی صفت تدبیر میں شرک کرنے لگتے ہیں حالانکہ تدبیر بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ عالم بالا سے لے کر عالم زیریں تک تمام امور کی تدبیر اللہ ہی کرتا ہے اور اس کام میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ "فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا" میں اگرچہ فرشتوں کے امور انجام دینے کا بیان ہے مگر وہ اللہ تعالیٰ ہی کے کارندے ہیں اور اسی کے حکم کے مطابق تمام کام کرتے ہیں۔ کمی بیشی، عروج زوال، تنگی وسعت، صحت، بیماری وغیرہ تدبیر کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اور یہ سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس مقام پہ لوگ بہک جاتے ہیں اور یہ عقیدہ اختیار کر لیتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ نبی ولی وغیرہ بھی کچھ تدبیر کرتے ہیں مشکل کشائی اور حاجت روائی کرتے ہیں لہٰذا اُن کے نام پر نذر و نیاز دیتے ہیں اور ان کی عبادت کرنے لگتے ہیں

اسی طرح قادر مطلق اور علیم کل ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی خاص صفات ہیں۔ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والی صرف وہی ذات ہے اور ازل سے لے کر ابد تک ذرے ذرے کا علم بھی اُسی کے پاس ہے۔

ان دو صفات میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ خدا کے سوا کوئی قادر مطلق بھی نہیں ہے۔ اسی طرح الوہیت کی صفات میں غیر مرئی ہونا یعنی دکھائی نہ دینا بھی خاصۂ خداوندی ہے۔ مسیح علیہ السلام کیسے الٰہ ہو سکتے ہیں، وہ تو دکھائی دیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ غیر محدود اور غیر مرئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت نذیر و بشیر

فرمایا کہ قیامت کے وقوع کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس نے اسے اپنے لیے خاص رکھا ہے اور وہ مقررہ وقت پر اچانک ظاہر کر دیگا۔

إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ میں تو ڈر سنانے والا ہوں کہ دیکھو قیامت آنے والی ہے، اس کے لیے تیاری کر لو، اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کر لو۔ اور شرک سے باز آجاؤ۔ میں اللہ کا رسول ہوں تمہیں ہدایت کی باتیں بتاتا ہوں اور تمہیں برے انجام سے ڈراتا ہوں نیز میں اطاعت گزاروں اور فرمانبرداروں کے لیے خوشخبری سنانے والا بھی ہوں۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں "أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (یونس) ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچائی کا پایہ ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام اچھا ہوگا۔ برے انجام سے ڈرانا اور اچھے اعمال پر خوشخبری سنانا ہر نبی کا کام رہا ہے "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ" (الانعام) ہم ہر رسول کو بشارت سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں بشمول حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بشارت و نذارت تمام انبیاء کی مشترک صفت ہے فرمایا بشارت ان لوگوں کے لیے ہے لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ جو خدا کی وحدانیت اور اس کے رسولوں کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں۔ جو قرآن کو برحق سمجھتے ہیں معاد پر یقین رکھتے

ہیں اور شرک سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جو لوگ سرکشی اختیار رکھتے
ہیں ان کے لیے کوئی بشارت نہیں، بلکہ وہ تو انذار کے حق دار ہیں ۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

ترجمہ :- اللہ کی ذات وہ ہے جس نے پیدا کیا ہے تم کو ایک جان سے اور بنایا ہے اُس سے اُس کا جوڑا تاکہ سکون پکڑے اُس کی طرف۔ پھر جب مرد نے ڈھانپا اُس عورت کو تو حمل ٹھہرا اُس عورت کو ہلکا سا۔ پھر وہ اس کو لے کر چلتی پھرتی رہی۔ جب وہ بوجھل ہو گئی تو پکارا دونوں نے اپنے پروردگار کو کہ اگر تو دے گا ہمیں اچھا بھلا بچہ تو ہم ضرور ہوں گے شکرگزاروں میں سے ﴿۱۸۹﴾ پس جب کر دیا اُن کو اچھا بھلا بچہ، ٹھہرائے اُن دونوں نے اُس کے لیے شریک اُس میں جو اللہ نے اُن کو دیا تھا۔ پس بلند ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اُن چیزوں سے جن کو یہ لوگ شریک بناتے ہیں ﴿۱۹۰﴾

ربطِ آیات گزشتہ سے پیوستہ رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسمائے حسنہ کا ذکر فرمایا اور حکم دیا کہ مجھے انہی ناموں سے پکارا کرو اور یہ کہ ان ناموں میں الحاد نہ کرو یعنی اللہ تعالیٰ

کا اسم خاص غیر اللہ پرست ہو، اس کی صفت اور اسم کو غلط معنی پہناؤ یا
ان کو غلط جگہ پر استعمال نہ کرو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارض و سما کی سلطنت
میں غور و فکر کی دعوت دی جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا بیان کرنا
اور اس کی وحدانیت کو سمجھنا مقصود ہے۔ اس کے ساتھ معاد کا بیان بھی ہوا
کہ لوگ آپ سے وقوع قیامت کے وقت کے متعلق دریافت کرتے
ہیں تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ چیز باری تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص
ہے اور اس کا علم اس نے کسی کو نہیں دیا۔ کوئی نبی، فرشتہ یا انسان قیامت
برپا ہونے کے وقت کو نہیں جانتا۔ البتہ قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والی
بعض نشانیوں کا ذکر ملتا ہے۔ پھر اللہ نے پیغمبر علیہ السلام سے کہلوایا کہ
قیامت کا علم تو بڑی بات ہے، میں تو اپنی جان کے لیے بھی نفع اور
نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ خداوند تعالیٰ کے قبضہ قدرت
میں ہے سوائے اس کے کہ جو اللہ چاہے۔ پھر فرمایا کہ اگر میں غیب
کا علم جانتا تو اپنے لیے بہت سے مفاد حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف
بھی نہ پہنچتی۔ غیب جاننے کی وجہ سے میں پیش بندی کر لیتا اور نقصان
سے بچنے کی تدبیر کر لیتا۔ مگر علم غیب بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص
ہے اس کے سوا علم غیب کوئی نہیں جانتا۔

اب آج کے درس میں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور شرک کی
تردید کا بیان ہے۔ ایمان کی حقیقت کو بگاڑنے والی چیز شرک ہی
ہے یہ روحانی بیماریوں میں سب سے بڑی بیماری ہے۔ عقیدے کو خراب
کرنے والے امراض کفر، نفاق، شک، تردد، الحاد، زندقہ وغیرہ
میں سے شرک سب سے خطرناک بیماری ہے، اس کے بعد عملی اور اخلاقی
بیماریوں کا نمبر آتا ہے، سو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے شرک کی صراحتاً
تردید فرمائی ہے۔ اس رکوع میں اللہ نے اس مضمون کو کافی تفصیل

کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

نفس واحدہ سے تخلیق

ارشاد ہوتا ہے هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ خدا کی ذات وہ رحیم اور کریم ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔ تخلیق انسانی کا مسئلہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ سورۃ نساء کی ابتداء اسی مسئلہ سے ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ مومن، سورۃ انبیاء اور بعض دیگر سورتوں میں بھی اس کا بیان آتا ہے۔ تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ یہاں پر ایک جان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور جوڑے سے مراد آپ کی بیوی حوا ہیں جو تمام انسانوں کی ماں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا اور پھر جیسا کہ صحیحین کی روایت میں آتا ہے آپ کی پسلیوں سے حوا کی تخلیق کی چونکہ پسلیاں ٹیڑھی ہوتی ہیں اس لیے عورت کی فطرت میں قدرے کجی پائی جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عورت سے اس کے ٹیڑھاپن سے ہی فائدہ حاصل کرو، اس کو سیدھا کرنے کی کوشش نہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ٹوٹ جائیگی مگر سیدھی نہیں ہوگی۔ آگے حدیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں وکسرھا طلاقھا اس کا توڑنا یہ ہے کہ طلاق دے کر علیحدہ کر دو گے۔ جیسا کہ عرض کیا نفس واحدہ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی، اللہ نے فرمایا "خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ" تم سب کو مٹی سے پیدا کیا، چونکہ انسانوں کے جد امجد کو مٹی سے پیدا کیا، اس لحاظ سے تمام انسان مٹی سے تخلیق ہوئے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا اِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِينٍ کہ میں مٹی سے انسان پیدا کرنے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو حکم دیا کہ تمام روئے زمین کی مٹی لی جائے۔ چنانچہ ہر جگہ کی کالی، سفید، سرخ، ریتلی، چکنی وغیرہ سبھی

حاصل کر کے اُس سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نسلِ انسانی میں اسی مٹی کا اثر ہے کہ کوئی آدمی کالا ہے۔ کوئی گورا ہے، کوئی سخت مزاج اور کوئی نرم خو، کوئی طیب اور کوئی خبیث اور پھر ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ کسی انسان کی تخلیق جس جگہ کی مٹی سے ہوتی ہے انسان مرنے کے بعد اُسی مٹی میں آکر مل جاتا ہے یعنی اُسی مقام پہ اس کی قبر بنتی ہے۔

تخلیق کا جدید نظریہ

بہرحال قرآن پاک نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ تمام انسان ایک نفس کی اولاد ہیں جس سے بعض فلاسفروں کے نظریات کی نفی ہوتی ہے۔ جو بنی نوعِ انسان کو کسی ایک شخص کی اولاد نہیں متعدد اشخاص سے سمجھتے ہیں انیسویں صدی کے ڈارون کا فلسفہ یہ ہے کہ نسلِ انسانی بندروں کی ترقی یافتہ نسل ہے۔ پہلے سب بندر تھے، پھر آہستہ آہستہ انسانوں کی شکل میں ترقی کر گئے۔ پہلے عقل و شعور بھی کم تھا جو بعد میں مکمل ہو گیا۔ ہندو بھی نفسِ واحدہ کو نہیں مانتے برخلاف اس کے قرآنی نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو سب سے پہلا انسان پیدا کیا وہ نبی تھا اور نبی ذہنی اور عقلی اعتبار سے کامل درجے کا انسان ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے۔

الناس من جهة التمثال اکفاء

ابوهم آدم والام حواء

تمام لوگ ایک دوسرے کے ہم شکل ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں اُن کا باپ آدم علیہ السلام ہے اور ماں حواؑ ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے الناس کلهم ابناء آدم و آدم من تراب تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی مذکورہ نفسِ واحدہ کا نظریہ قرآن پاک کے علاوہ باقی

آسمانی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ تورات کا پہلا باب ہی تخلیق (پیدائش) کے نام پر ہے۔

تخلیق زوج

فرمایا اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔ آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور پھر حوا کو ان کا جوڑا یعنی مادہ بنایا حضرت حوا کی پیدائش کے متعلق تفاسیر میں آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سوئے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے حضرت حوا کو پیدا فرمایا۔ دراصل جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو وہ جنت میں تنہا تھے جس کی وجہ سے انہیں وحشت ہوتی تھی اور بے اطمینانی کی سی کیفیت تھی۔ اس بے سکونی کی حالت کو تبدیل کرنے کے لیے اللہ نے حوا کی صورت میں ان کا جوڑا پیدا کیا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا تاکہ آدم علیہ السلام حوا کی طرف سکون پکڑیں۔ چنانچہ جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو حوا آپ کے پاس موجود تھیں جنہیں پاکر آپ کو تسکین ہونے لگی۔ اب اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی سے کہا یَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (البقرۃ) یعنی اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ خوب کھاؤ پیو، یہاں تمہیں راحت کے تمام سامان میسر ہوں گے، البتہ یاد رکھو (اس ایک درخت کے قریب نہ جانا۔ میاں بیوی کچھ عرصہ تک جنت میں رہے اور پھر شیطان کے بہکانے اور جنت کے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے میاں بیوی کا لباس بھی اتر گیا اور بالآخر انہیں جنت سے نکلنا پڑا۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی ابتدا کا ذکر کیا ہے کہ پہلے ایک مرد کو پیدا کیا گیا اور پھر اسی سے اس کا جوڑ پیدا کیا اور پھر

ان دونوں سے نسل انسانی آگے بڑھی۔ سورۃ نساء کی ابتداء میں بھی ہے۔
اے لوگو! اس پروردگار سے ڈر جاؤ جس نے تمہیں نفس واحدۃ سے
پیدا فرمایا۔ پھر اس سے اس کا جوڑ پیدا کیا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا
كَثِيرًا وَّنِسَاءً پھر ان دونوں سے کثیر تعداد میں مرد و زن پھیلا
دیئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسان کا جوڑا پیدا کرنے کی ایک وجہ تو یہ
بیان فرمائی تاکہ وہ سکون پکڑے اور ساتھ یہ بھی فرما دیا وَجَعَلَ
بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم) تمہارے درمیان محبت
اور شفقت کے جذبات پیدا کر دیئے۔ اور محبت والفت
کے بھی جذبات ہیں جو نسل انسانی کے آگے پھیلانے کا ذریعہ
بنتے ہیں۔ اس میں طبعی خواہشات بھی ہیں، عقلی ضروریات بھی اور
قانون کی پابندی بھی۔ جب کوئی انسان تنہا ہوتا ہے تو وہ ضابطہ اخلاق
کا پابند ہوتا ہے اور جب وہ دو ہو جاتے ہیں تو انہیں قانون کی پابندی
کرنا پڑتی ہے اور یہی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ میاں بیوی کے اپنے اپنے حقوق
و فرائض ہیں۔ جب یہ حقوق ادا کیے جاتے ہیں تو قانون کی پابندی ہوتی
ہے اور انسان کو ترقی اور عروج حاصل ہوتا ہے۔ جب تک قانون کی
پابندی نہیں کی جائیگی کوئی انسان حظیرۃ القدس کے راستے پر قدم بھی نہیں
رکھ سکتا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے ایک انسان سے دو بنائے۔ پھر دو
سے بڑھے تو خاندان بن گیا، رشتہ داریاں قائم ہوئیں۔ قبائل بنے اور
نسل انسانی وجود میں آ گئی۔

اولاد کے لیے شرک

نسل انسانی کی عمومی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے بچے کی
پیدائش کے سلسلے میں کیے جانے والے شرک کا ذکر کیا ہے ارشاد ہوتا
ہے فَلَمَّا تَغَشّٰهَا جب مرد نے عورت کو ڈھانپ لیا۔
تغشیہ پردے کو کہتے ہیں، ڈھانپ دینا، کپڑا ڈال دینا اور مراد

یہ ہے کہ جب مرد نے اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کی حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا تو پہلے ہلکا سا حمل رہا فَمَرَّتْ بِهٖ تو عورت اس حمل کے ساتھ چلتی پھرتی رہی۔ کوئی خاص تکلیف محسوس نہ کی۔ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی۔ آہستہ آہستہ حمل بڑھ گیا اور پیٹ بھاری ہوگیا، بچے کی پیدائش کا وقت قریب آگیا اور انہیں زچہ و بچہ کے متعلق فکر لاحق ہوئی تو دونوں بیوی اور خاوند نے دَعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا اپنے رب سے دعا کی۔ لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا" کہ اگر تو ہمیں صحیح سلامت اچھا بھلا بچہ عطا کرے گا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہوں گے فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا" پھر جب اللہ نے انہیں صحیح سلامت، صحت مند بچہ عطا کر دیا۔ جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا تو اللہ کے عطا کردہ میں دونوں نے اسی کا شریک بنا لیا۔ یعنی بچے کے عطا کرنے میں غیروں کو بھی شریک کر لیا۔

اس سلسلے میں ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں روایت آئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حواؑ کے بچے پیدا ہو کر مر جاتے تھے جس کی وجہ سے وہ بڑے متفکر رہتے تھے۔ اس اثنا میں ان کے پاس شیطان آیا اور انہیں خوفزدہ کیا کہ بچے کی پیدائش بڑی تکلیف دہ چیز ہے، نیز یہ کہ ہونے والا بچہ ناقص الخلقت بھی ہو سکتا ہے اور پھر خود ہی انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ بچے کی پیدائش صحیح سلامت چاہتے ہیں اور اس کا زندہ رہنا بھی مطلوب ہے، تو پھر پیدائش کے بعد اس کا نام عبدالحارث رکھنے کا عہد کرو۔ فرشتوں میں حارث شیطان کا نام مشہور تھا اور وہ اس قسم کا نام رکھوا کر آدم و حوا کو شرک میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں خوفزدہ تھے چنانچہ انہوں نے یہ نام رکھنے

کا وعدہ کر لیا۔ پھر جب بچہ صحیح سلامت پیدا ہوا تو اس کا نام عبدالحارث رکھا اور وہ زندہ رہا۔ اسی چیز کے متعلق فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں صحیح سلامت بچہ عطا فرمایا تو انہوں نے بچے کا نام شیطان کے نام پہ رکھ کر شرک کا ارتکاب کیا۔

اس روایت کو جمہور محدثین نے تسلیم نہیں کیا کیونکہ اللہ کے نبی آدم علیہ السلام کی طرف شرک کی نسبت کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ بھی کہ آدم علیہ السلام ایک دفعہ پہلے بھی شیطان کے ہاتھوں زک اٹھا چکے تھے جب انہیں جنت سے نکلنا پڑا تو اب وہ دوبارہ اس کے دھوکے میں نہیں آ سکتے تھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان بھی ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا، لہٰذا یہ روایت اصلاً ہی غلط ہے۔

اس آیت کریمہ کی توضیح امام حسن بصریؒ اور مجاہدؒ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آیت کا پہلا حصہ هُوَ الَّذِي سے لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا تک حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواؑ کے بیان پر مشتمل ہے جب کہ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا سے شروع کر کے اگلی بات عام بنی نوع انسان کے متعلق ہے نہ کہ صرف آدم علیہ السلام اور حواؑ کے متعلق۔ چنانچہ اس حصہ آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ نوع انسانی میں جب کسی مرد نے عورت کو ڈھانپا یعنی اس کے ساتھ اختلاط کیا تو پہلے اُسے ہلکا سا حمل ٹھہرا اور پھر وہ بڑھ کر بھاری ہو گیا تو میاں بیوی نے صحیح سلامت بچے کی دعا کی، جب بچہ پیدا ہو گیا تو انہوں نے خدا تعالیٰ کا شریک بنا لیا۔ فرماتے ہیں یہ عام انسانوں کی بات ہے۔ اللہ کے نبی تو معصوم عن الخطا ہوتے ہیں، وہ تو ایک لحظہ کے لیے بھی شرک میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ حضرت حواؑ بھی اہل ایمان اور نبی کی بیوی تھیں، ان سے بھی ایسی توقع نہیں

کی جا سکتی ۔

نام میں شرک

نومولود کے نام رکھنے میں شرک ابتداء سے چلا آ رہا ہے۔ اور آج بھی اس کا ارتکاب ہوتا ہے۔ عبدالحارث کے علاوہ عبدالعزیٰ، عبدالمسیح، عبدالمناۃ وغیرہ قسم کے نام حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی پائے جاتے تھے اور فقیر بخش، نبی بخش، عبدالرسول، عبدالحسین، عبدالعلی، پیراں دتہ وغیرہ قسم کے نام آج ہمارے معاشرے میں بھی موجود ہیں۔ عطا تو اللہ کرتا ہے مگر منسوب اغیار کے نام پر کر دیتے ہیں یہی شرک ہے۔ اسی سلسلہ میں پھر غیر اللہ کی نذر بھی مانتے ہیں اور بچے کی پیدائش پر سلام کے لیے داتا صاحب لے جاتے ہیں وہاں پرمنت پوری کرنے کے لیے بچے کا سر قبر یا غلاف کے ساتھ لگاتے ہیں۔ غرضیکہ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ جو نعمت کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں مگر جب وہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو اس میں شرک کرنے لگتے ہیں۔ اللہ نے دوسرے مقام پر فرمایا "فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰھُمْ اِلَی الْبَرِّ اِذَا ھُمْ یُشْرِکُوْنَ" (العنکبوت) جب سمندر میں پھنس جاتے ہیں تو گڑگڑا کر خدا وحدہٗ لاشریک کو پکارتے ہیں اور جب ساحل پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور غیر اللہ کی نذر دوبارہ شروع ہو جاتی ہے غرضیکہ اولاد کے شرکیہ نام نہیں رکھنا چاہیئے اور اگر کسی وجہ سے بچے کا غلط نام رکھ دیا گیا ہو تو بعد میں اس کی تصحیح کر دینی چاہیئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ابوہریرہؓ کا پہلا نام عبدالشمس تھا جو تبدیل کر کے حضور علیہ السلام نے عبدالرحمٰن کر دیا۔ بعض دیگر لوگوں کے نام بھی درست فرمائے اور اصول کے طور پر یہ بات سمجھا دی کہ بچے کی

پیدائش پر ساتویں دن اُس کا عقیقہ کریں، اس کے بال اتاریں اور اس کا اچھا نام رکھیں۔ پھر اس کی اچھی طرح تربیت کریں۔ نام اللہ کی طرف منسوب ہونے چاہئیں جیسے عبداللہ، عبدالرحمن، عبدالغفور وغیرہ یا انبیاء کے نام پر ابراہیم، یونس، موسیٰ، الیاس علیہ السلام وغیرہ نام رکھنے چاہئیں۔ انگریزوں جیسے کینیڈی اور جارج وغیرہ نام رکھنا درست نہیں ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اگر ناموں میں لغوی مقصد مراد نہ بھی ہو تب بھی اس میں شرک کی بُو ضرور آئیگی۔ مثلاً اگر کوئی شخص عبدالحسین نام رکھ لیتا ہے اور اس کی نیت حسین کے بندہ ہونے کی نہیں ہے پھر بھی یہ نام درست نہیں ہے کیونکہ اس میں شرک کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ نام ایسا صاف ستھرا اور توحید پر مبنی ہونا چاہیے جس سے اللہ تعالیٰ کی عبدیت ظاہر ہو اور شرک کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔

بلند و برتر ذات

فرمایا والدین پہلے تو یہ دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صحیح سلامت تندرست اور صحت مند بچہ عطا فرمائے مگر اللہ تعالیٰ اُن کی دعا قبول کر کے ٹھیک ٹھاک بچہ عطا کر دیتا ہے تو اس میں اللہ کے شریک بنانے لگتے ہیں۔ مگر اللہ نے فرمایا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و برتر ہے اُن چیزوں سے جن کو یہ خدا کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔ شرک کبھی نام رکھنے میں ہوتا ہے کبھی نذر و نیاز میں، کبھی رکوع و سجود میں اور کبھی دیگر عبادات میں۔ بعض اوقات غیر اللہ کی انتہائی تعظیم کر کے شرک کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور کبھی اس سے مراد مانگ کر شرک کیا جاتا ہے۔ بہر حال شرک اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہو یا اُس کی صفات کے ساتھ یا عبادت میں، اُس کی ذات ان چیزوں سے بلند و برتر ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ذات ہے

آگے کافی دُور تک شرک اور مشرکین کا رَدّ آرہا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے بت پرستی اور انسان پرستی کی پوری طریقے سے تردید فرمائی ہے یہاں پر بچے کی پیدائش کے سلسلے میں جو شرک کیا جاتا ہے۔ اس کی خصوصاً تردید فرمائی گئی ہے۔ بچے کا نام بھی ایسا نہیں رکھنا چاہیئے جس سے شرک کی بُو آتی ہو بلکہ اگر کوئی ایسا نام موجود ہو تو اس کی اصلاح کر لینی چاہیئے حضور علیہ السلام نے عبدالرحمٰن اور عبداللہ کو بہترین نام قرار دیا ہے کیونکہ ان میں بندے کی نسبت اپنے اللہ کے ساتھ کی گئی ہے۔

أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿١٩١﴾ وَلَا
يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿١٩٢﴾
وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ ۚ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ
أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنْتُمْ صَامِتُونَ ﴿١٩٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ
تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ
فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿١٩٤﴾ أَلَهُمْ
أَرْجُلٌ يَّمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَّبْطِشُونَ بِهَا ۖ
أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُّبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ
يَّسْمَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ
فَلَا تُنْظِرُونِ ﴿١٩٥﴾

ترجمہ:- کیا یہ شریک بناتے ہیں اُن کو جو نہیں پیدا
کرتے کسی چیز کو اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں ﴿١٩١﴾ اور
نہیں طاقت رکھتے وہ اُن کے لیے مدد کی اور نہ وہ اپنی
جانوں کی مدد کر سکتے ہیں ﴿١٩٢﴾ اور اگر پکارو تم اُن کو ہدایت
کی طرف تو وہ نہیں پیروی کرتے تمہاری ۔ برابر ہے تم
پر کہ تم اُن کو پکارو یا خاموش رہو ﴿١٩٣﴾ بیشک وہ لوگ جو
پکارتے ہیں اللہ کے سوا دوسروں کو ، وہ تو بندے ہیں تمہارے

سمجھتے ، پس پکارو اُن کو ، چاہیئے کہ وہ قبول کریں تمہاری پکار کو ، اگر تم سچے ہو (۱۹۴) کیا اُن کے لیے پاؤں ہیں جن کے ساتھ وہ چلتے ہیں یا اُن کے لیے ہاتھ ہیں جن کے ساتھ وہ پکڑتے ہیں ، یا اُن کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے ہیں یا اُن کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے ہیں ، اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ، پکارو اپنے شریکوں کو ، پھر تم جو تدبیر میرے خلاف کر سکتے ہو کر گزرو اور پھر مہلت بھی نہ دو (۱۹۵)

ربط آیات

گزشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے اولین انسان اور اس کے جوڑے کی پیدائش کا تذکرہ فرمایا اور اس پیدائش کی غرض وغایت بھی بیان فرمائی۔ پھر انسان کے شرک میں مبتلا ہونے کی نشانی بیان فرمائی کہ میاں بیوی کی مقاربت سے ہلکا سا حمل ٹھہرتا ہے جب یہ بڑھتا ہے تو میاں بیوی کو خطرات لاحق ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحیح سلامت ، صحت مند بچہ عطا فرمائے۔ پھر جب بچہ کی پیدائش ٹھیک طریقے سے ہو جاتی ہے تو اللہ کے ساتھ شریک بنانے لگتے ہیں۔ اول تو بچے کا نام ہی شرکیہ رکھتے ہیں ، اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی بجائے غیروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی پیدائش ، تندرستی اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ، فرمایا خدا تعالیٰ کی ذات اُن چیزوں سے بلند و برتر ہے جن کو یہ اس کے ساتھ شریک بناتے ہیں ، یہ شرک کا رد ہو گیا۔

بت پرستی

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے بت پرستی کا رد بیان کیا ہے ، مٹی پتھر یا لکڑی کے مجسمے بنا کر اُن کی پوجا کرنا شرک کی ایک صورت ہے اور بت پرستی کی یہ لعنت حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر تمام اقوام میں پائی جاتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس کا بار بار رد فرمایا ہے۔ اس کے

علاوہ جو لوگ ملائکہ اور جنات کو عبادت میں شریک کرتے ہیں، اللہ نے
اُن کا بھی ردّ فرمایا ہے۔ شرک اللہ تعالیٰ کی صفات میں ہو یا عبادت
میں یہ قابلِ مذمت ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بت پرستی
کا اس طرح ردّ فرمایا ہے أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا کیا یہ لوگ
اُن کو شریک بناتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۝
اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ اگلی آیت میں خاص طور پر مٹی اور پتھر کے
گھڑے ہوئے بتوں کا ذکر آئے گا جب کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ کے سوا
تمام معبودان مراد ہیں خواہ وہ بت ہوں، عام انسان ہوں، انبیاء ہوں،
ملائکہ ہوں یا جنات ہوں فرمایا کہ یہ لوگ اُن کی پوجا کرتے ہیں جو کچھ پیدا
نہیں کر سکتے بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ چونکہ کائنات کی
تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اس لیے اُن میں سے کوئی بھی چیز
ایسی نہیں جو الٰہ ہو اور معبودِ برحق کی شریک بنائی جا سکے۔

صفاتِ الوہیت

کسی ذات کے الٰہ ہونے کے لیے اس میں بعض صفات کا
ہونا لازمی ہے مثلاً یہ کہ وہ ذات واجب الوجود ہو۔ ایسی ذات
جس کا وجود خود بخود ہو، نہ کہ کسی دوسری ذات کا عطا کردہ، یہ الوہیت
کی سب سے پہلی صفت ہے۔ ظاہر ہے واجب الوجود صرف
ذاتِ خداوندی ہے، اس کے علاوہ ہر ذات کا وجود خدا تعالیٰ کا
عطا کردہ ہے، لہٰذا اللہ کے بغیر نہ کوئی واجب الوجود ہے اور نہ
وہ الٰہ ہو سکتا ہے۔ الٰہ کی دوسری صفت یہ کہ وہ خالق ہو، مخلوق نہ ہو
اور یہ صفت بھی صرف باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہے، اُس کے علاوہ
کوئی خالق نہیں، لہٰذا معبودِ برحق بھی صرف وہی ہے۔ الوہیت کے
لیے علیمِ کل ہونا بھی ضروری ہے۔ اور یہ صفت بھی صرف اللہ تعالیٰ

کا خاصہ ہے "اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" وہی ہر چیز کا علم رکھنے والا
ہے اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (الملک)
یاد رکھو! ہر چیز کا ظاہر و باطن اور اس کی ضرورت وہی جانتا ہے
جو اس کا خالق ہے۔ چونکہ خالق اللہ تعالیٰ ہے لہٰذا مخلوق کی تمام
جزئیات کو جاننے والا یعنی علیم کل بھی وہی ہے۔ الوہیت کی صفات
میں مدبر ہونا اور غیر مرئی ہونا بھی شامل ہے۔ وہی ہر چیز کی تدبیر کرتا ہے
وہ خود ہر چیز کو دیکھتا ہے مگر اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ بہر حال اس
آیت کریمہ میں خلق کی صفت کے ساتھ الوہیت کا مسئلہ بیان کیا
گیا ہے۔ کوئی انسان ہو یا جن یا فرشتہ، ان میں سے کوئی بھی خالق
نہیں ہے، بلکہ سب مخلوق ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا کیا یہ اُن کو شریک
بناتے ہیں جو خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو انسان کی پیدائش سے اربوں کھربوں سال
پہلے پیدا فرمایا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
جانتا تھا کہ مصلحتِ انسانی کی تکمیل کے لیے اس سے پہلے فرشتوں
کا پیدا کیا جانا ضروری ہے لہٰذا اس نے فرشتوں کو پہلے پیدا کیا۔
سب سے پہلے ملاءِ اعلیٰ کی جماعت کو پیدا کیا، پھر ملاءِ سافل کی جماعت
کو پیدا فرمایا اور اس کے بعد عام ملائکہ کو۔ اور ان سب سے آخر میں
انسان کو پیدا کیا۔ تو فرمایا جو کسی چیز کے خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں
انہیں خدا کے ساتھ کیسے شریک بناتے ہیں۔

امداد از غیر اللہ

فرمایا جن کو یہ شریک بناتے ہیں اُن کی ایک بات تو یہ ہے کہ
وہ کسی چیز کو پیدا کرنے پر قادر نہیں اور دوسری بات یہ
وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وہ معبودانِ باطلہ شرک کرنے والوں کی مدد
کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ اور نہ

وہ خود اپنی جانوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ گذشتہ رکوع میں حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ کے متعلق گزر چکا ہے قُلْ لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اے لوگو! سن لو، میں اپنی جان کے لیے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ مگر جو اللہ چاہے۔ ظاہر ہے کہ بنی نوع انسان کی بلند ترین ہستی بھی اگر اپنے نفع نقصان کی مالک نہیں ہے تو وہ کسی دوسرے کو مافوق الاسباب نفع نقصان کیسے پہنچا سکتی ہے۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، انبیاء، ملائکہ اور جنات جو زندہ ہستیاں ہیں، وہ بھی اس معاملہ میں بے بس ہیں تو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے مٹی یا پتھر کے مجسمے ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ فرمایا وہ تو اتنے عاجز ہیں فَاِنْ تَدْعُوْهُمْ کہ اگر تم انہیں پکارو اِلَى الْهُدٰى ہدایت کے راستے کی طرف لَا يَتَّبِعُوْكُمْ تو وہ تمہاری پیروی نہیں کر سکتے یعنی وہ تمہاری کوئی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔ جب وہ اس قدر بے بس ہیں تو فرمایا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ تمہارے لیے برابر ہے اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ کہ تم انہیں پکارو یا خاموش رہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ معبودان باطلہ تمہارے لیے کسی چیز پر قادر ہی نہیں ہیں تو انہیں لاکھ پکارتے جاؤ۔ وہ سنتے ہی نہیں تو پھر انہیں پکارنا اور نہ پکارنا برابر ہے۔

غیر اللہ کی پرستش

شرک فی العبادت قدیم اقوام میں بھی پایا جاتا تھا اور آج بھی موجود ہے۔ چنانچہ رومی، یونانی، مصری اور کلدانی قومیں شجر و حجر کی پرستش میں ملوث تھیں۔ بعض لوگ بچھو، سانپ اور درختوں کی پوجا بھی کرتے تھے۔ سورج پرستی بھی قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور سورج کے پجاری کراچی میں آج بھی موجود ہیں جو طلوع شمس کے وقت اس کی طرف ہاتھ باندھے نظر آتے ہیں اور زبان سے کچھ الفاظ بھی ادا کرتے ہیں جو غالباً دعائیہ الفاظ ہوں گے

ستاروں اور سیاروں کے پجاری بھی ہیں۔ اور گائے اور بلی کو پوجنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ انسانی ذوق کی انتہا یہ ہے کہ بعض لوگ گوبر کو بھی پوجتے ہیں قبروں کو پوجنے والے تو خود مسلمانوں میں موجود ہیں، کوئی نہ کوئی زندہ انسان یا مرنے کو پوجنے والا مل جاتا ہے۔ مسلمانوں میں قبر پرستی، پیر پرستی، مشرکانہ تعظیم جیسی بیماریاں موجود ہیں۔ شرک کا رد تمام آسمانی کتب خصوصاً قرآن پاک اور تمام انبیائے کرام نے واضح طور پر کیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں چھوڑا۔ سورۃ انعام میں تمام قسم کے شرک کی تردید ہو چکی ہے۔ شرک نذر و نیاز میں ہو یا تعظیم میں سب کی نفی ہو چکی ہے۔ ظلمت کو اللہ ماننے والوں کا رد بھی ہو چکا ہے۔ جانور ذبح کرتے وقت جو شرک کیا جاتا تھا اللہ نے اس کی بھی تردید فرمائی ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ خود کلمہ گو مسلمان شرک کی بہت سی قسموں میں ملوث ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی (متوفی ۱۹۱۴ء) سرسید کے ہم عصر اور قومی شاعر ہوئے ہیں۔ آپ بڑے صحیح العقیدہ مسلمان تھے آپ نے قاری عبدالرحمٰنؒ اور شاہ اسحاقؒ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ نے مسدس حالی میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ انہوں نے آج کے مسلمانوں کی بد عقیدگی کا نقشہ بڑے عجیب پیرائے میں کھینچا ہے فرماتے ہیں ؎

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ ایمان بگڑے نہ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

قبروں پہ چادریں اور چڑھاوے چڑھانا، اُن پہ سجدہ کرنا، اُن کو چومنا چاٹنا اُن کی حد درجہ تعظیم کرنا، فرشتوں اور جنات کی دہائی دینا، پیر دستگیر کو غائبانہ پکارنا، شیخ معین الدین چشتیؒ اور زکریا ملتانیؒ کو امداد کے لیے پکارنا سب شرکیہ باتیں ہیں۔ اُن کے اختیار میں کوئی چیز نہیں، نہ وہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ فریاد رسی کے قابل ہیں، وہ تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ کسی کے لیے کیا چیز مفید ہے اور کیا مضر ہے مگر مسلمان ہی ہیں جو اُن کو سب کچھ تسلیم کیے بیٹھے ہیں حتیٰ کہ بسوں پہ اُن کے نام کے نعرے لکھے ہیں یا غوث اعظم یا پیر دستگیر، یا علی مدد وغیرہ یہ سب شرک کی باتیں ہیں جن کا قرآن نے رد کیا ہے۔ فرمایا جن کو تم شریک بناتے ہو۔ اُن میں تو الوہیت کی صفت ہی نہیں پائی جاتی۔

اللہ کے عاجز بندے

آگے فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تو تمہاری طرح بندے ہیں جس طرح تم پیدا کیے گئے ہو، اسی طرح وہ بھی پیدا کیے گئے ہیں، تم بھی خدا کے سامنے عاجز ہو اور وہ بھی عاجز ہیں، جس طرح تم ہر چیز کے محتاج ہو، اسی طرح وہ بھی محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرما دی ہے "یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" آسمان و زمین کی ہر چیز اپنی ہر ضرورت کے لیے اُسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہے

تمام مخلوق مانگنے والی ہے اور دینے والی وحدہٗ ذات خداوندی ہے۔ انسان اولاد، دولت اور اقتدار مانگتے ہیں، فرشتے اللہ کا قرب مانگتے ہیں اور اس کی رضا کے طالب ہوتے ہیں۔ فرمایا جب ہر چیز اسی سے مانگتی ہے تو پھر تم اُن کو شریک کیسے بناتے ہو جو خود عاجز اور محتاج ہیں پھر فرمایا فَادْعُوهُمْ انہیں پکار کر دیکھ لو۔ اگر وہ تمہاری پکار سنتے ہیں فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ پس چاہئے کہ وہ تمہاری پکار کو قبول کریں اگر تم سچے ہو مگر وہ تمہاری حاجت روائی اور مشکل کشائی کیسے کریں گے جب کہ نہ تو وہ قادر مطلق ہیں، نہ علیم کل اور نہ واجب الوجود۔ حقیقت یہ ہے کہ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (فاطر) تم سب اللہ کے محتاج ہو، غنی تو صرف وہی ہے۔ اس کے علاوہ کون ہے جو تمہاری غائبانہ مدد کرے، بیچارا تم نے تو خواہ مخواہ بت اور وثن بنا رکھے ہیں جن کے نام کی نذریں مانتے ہو، اُن کے سامنے دودھ، مٹھائی اور کھانا رکھتے ہو، اُن کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے ہو، اُن کے ساتھ عابدانہ تصورات رکھتے ہو، جس طرف کوئی بت پڑا ہوتا ہے اسی طرف رُخ کر لیتے ہو، یہ تو نہایت ہی بیوقوفی کی بات ہے فرمایا ذرا غور تو کرو کہ جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا کیا اُن کے پاؤں ہیں جن کے ساتھ وہ چلتے ہیں أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا کیا ان کے ہاتھ ہیں جن کے ساتھ وہ پکڑتے ہیں۔ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا کیا ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے ہیں أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا کیا اُن کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے ہیں۔ اُن کے پاس تو کچھ بھی نہیں، پھر وہ تمہاری پکار سن کر تمہاری مدد کیسے کر سکتے ہیں۔ سورۃ حج میں ہے کہ اللہ کے سوا تم جن کو پکارتے ہو وہ تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

اور کبھی کوئی چیز اُن سے چھین لے تو وہ اُسے چھڑانے پر بھی قادر نہیں چہ جائیکہ تمہاری فریاد رسی کریں۔ فرمایا ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ طالب اور مطلوب دونوں بودے ہیں کوئی کسی کے کام نہیں آسکتا۔ اللہ نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا تھا، اسے عقل و شعور سے نوازا تھا مگر اس کی حماقت کی انتہا ہے کہ خود ساختہ بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ یہ ہماری بات سنتے ہیں اور حاجت برآری کرتے ہیں۔ فرمایا اگر یہ بات ہے قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ہو پھر اپنے شریکوں کو پکار کر دیکھ لو۔ ثُمَّ كِيدُونِ پھر جو کچھ تم میرے خلاف کرنا چاہتے ہو کر گزرو۔ فَلَا تُنظِرُونِ پس مجھے مہلت بھی نہ دو۔

حضرت ہود اور صالح علیہما السلام کو بھی مشرکین نے یہی کہا تھا، اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ " ہمارے معبودوں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے تم باز نہیں آتے اور بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ اللہ نے فرمایا کہ ایسی باتوں کا یہی جواب ہے کہ اپنے تمام معبودوں کو اکٹھا کر لو اور پھر جو تدبیر میرے خلاف کرنا چاہتے ہو کر لو میں کسی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا ہے

اگر ہر دو جہانم خصم گردند نہ ترسم چوں نگاہ بانم تو باشی

اگر خدا تعالیٰ نگہبان ہے تو دونوں جہان کی مخالفت بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے معبود محض بے اختیار ہیں۔ اگلی آیات میں شرک کی مزید باتوں کی تردید ہو رہی ہے۔

إِنَّ وَلِيِّـۦَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّٰلِحِينَ ﴿١٩٦﴾ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِۦ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٧﴾ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرَىٰهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٩٨﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَٰهِلِينَ ﴿١٩٩﴾

ترجمہ :- بیشک میرا کارساز اللہ ہے جس نے اتاری ہے کتاب اور وہ کارسازی کرتا ہے نیکوکاروں کی (۱۹۶) اور وہ جن کو تم پکارتے ہو اُس کے سوا، نہیں طاقت رکھتے تمہاری مدد کی اور نہ وہ اپنی جانوں کی مدد کر سکتے ہیں (۱۹۷) اور اگر تم انہیں پکارو ہدایت کی طرف تو سنتے نہیں اور تم دیکھو گے اُن کو کہ تک رہے ہیں تمہاری طرف حالانکہ وہ نہیں دیکھتے (۱۹۸) آپ عادت ڈالیں درگزر کرنے کی اور حکم دیں نیک کام کرنے کا اور کنارہ کشی اختیار کریں جاہلوں سے (۱۹۹)

ربط آیات

گذشتہ دروس میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی تردید کے سلسلے میں بت پرستی کا رد فرمایا اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں، اُن سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی توقع رکھتے ہیں، اُن کی بھی تردید فرمائی۔ گذشتہ درس میں یہ بھی ارشاد ہو چکا ہے کہ تم اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ تو تمہاری طرح عاجز

بندے ہیں ، وہ تمہاری مدد کیسے کر سکتے ہیں وہ نہ تو تمہاری مشکل آسان کر سکتے ہیں اور نہ بگڑی بنا سکتے ہیں ، فرمایا اگر کچھ زعم ہے تو اُن کو پکار کر دیکھ لو کر وہ تمہاری بات کو سُن کر تمہاری کون سی مشکل کشائی کرتے ہیں وہ تو تمہاری طرح مخلوق ہیں اور تمہارے کچھ کام نہیں آسکتے ۔ مٹی اور پتھر کے بتوں کے رد میں خاص طور پہ فرمایا کہ تم تو زندہ انسان ہو ۔ ہاتھ پاؤں ، آنکھ اور کان رکھتے ہو اور ان سے کام لیتے ہو مگر یہ بُت تو تم سے بھی گئے گزرے ہیں جو ان اعضا اور حواس سے بھی محروم ہیں مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ تم ان بے جان مجسموں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ۔ اللہ نے چیلنج کے طور پر اپنے نبی سے کہلوایا کہ تم اپنے معبودانِ باطلہ کو بلا لو اور میرے خلاف جو تدبیر کرنا چاہتے ہو کر لو ، مجھے تمہارے شرکا سے کچھ خوف نہیں میرے لیے میرے اللہ کی حفاظت اور نگرانی ہی کافی ہے ۔ اور مجھے اسی پہ اعتماد ہے ۔ تمہارے معبودان کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں لہذا وہ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے ۔ تم اپنا پورا جتن کر لو اور پھر بیشک مجھے مہلت بھی نہ دو ۔

کارساز ما خدا تعالیٰ

اسی سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہلوایا جا رہا ہے إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ بیشک میرا ولی ، کارساز اور حمایتی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور مجھے اسی پہ بھروسہ ہے ۔ سورۃ البقرہ میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا اللہ تعالیٰ کارساز ہے ایمان والوں کا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ جو انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ اور کافروں کا کارساز شیطان ہے جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتا ہے ۔
اہل ایمان چونکہ صحیح عقیدہ پہ ہوتے ہیں اس لیے اُن کی حفاظت

اور کارسازی خداوند تعالیٰ کرتا ہے۔ چنانچہ میرا کارساز بھی وہی اللہ ہے الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ جس نے کتاب یعنی قرآن پاک نازل فرمایا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی کارسازی کی بین دلیل ہے کہ اُس نے ہمارے لیے کتاب نازل فرما کر ہدایت کا سامان مہیا کر دیا ہے اور ہدایت ایک ایسی چیز ہے کہ ہر انسان زندگی کے ہر موڑ پہ اس کا سب سے زیادہ محتاج ہے۔ اور پھر اس قرآن پاک کی صفت یہ ہے۔ کہ یہ "هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى" (البقرہ) لوگوں کے لیے ہدایت اور ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں۔ یہی قرآن "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" (البقرہ) یعنی متقیوں کے لیے ذریعہ ہدایت بھی ہے۔ اللہ کا کلام زندگی کے ہر موڑ پہ راہنمائی کرتا ہے اور تمام مشکلات کے حل کا ذریعہ ہے۔ اگر اس پہ ایمان لا کر عمل کیا جائے تو انسان کی زندگی سنور سکتی ہے۔ انسان کا اخلاق درست ہو سکتا ہے اور اس کی فکر پاک ہو سکتی ہے اسی قرآن کی بدولت آدمی کے اعمال درست ہو سکتے ہیں اور انسانی زندگی ایک کارآمد زندگی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے انسان کو مہمل نہیں چھوڑا بلکہ اپنی عظیم کتاب نازل فرما کر اُس کی ہدایت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ میرا کارساز وہ اللہ رب العزت ہے جس نے کتاب نازل فرمائی ہے۔

نیکوکاروں کا کارساز

فرمایا وہ باری تعالیٰ نہ صرف میرا کارساز ہے بلکہ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ وہ تمام نیکوکاروں کا کارساز ہے اور اُن کی فلاح اور ہدایت کا سامان مہیا کرتا ہے مگر مشرکوں کو وہ سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا صالح اُس شخص کو کہتے ہیں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ادا کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ابرار اور مقربین کی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں۔ قُوْتُ الْقُلُوْبِ والے بزرگ لکھتے ہیں کہ ابرار وہ لوگ

ہوتے ہیں جن کی نگاہ ہر وقت نیکی پر لگی رہتی ہے اور مقربین وہ ہوتے ہیں
جن کی نگاہ ہمیشہ خاتمہ پر مرتکز رہتی ہے وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ
پتہ نہیں خاتمہ کیسا ہوگا یعنی خاتمہ بالخیر ہوگا یا بالشر اور بالآخر وہ جنتی ہوں گے
یا دوزخی، وہ ہمیشہ اسی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلفائے بنوامیہ میں سے ہیں۔ آپ کا
دورِ خلافت تو صرف اڑھائی سال ہے مگر اس بات پر سب متفق
ہیں کہ آپ کی خلافت خلفائے راشدین کا ہوبہو نمونہ تھی۔ آپ کچھ عرصہ
گورنر بھی رہے ہے مگر مکمل خلافت کا موقع زیادہ دیر نہیں ملا۔ آپ کے
متعلق صاحب تفسیر کبیر لکھتے ہیں کہ جب خلافت کی ذمہ داری سنبھالی
تو اپنی اولاد کے لیے کوئی مال و دولت اور جائداد نہ چھوڑی کسی نے
کہا کہ آپ کی اولاد ہے، آپ ان کی بہتری کے لیے بھی کوئی بندوبست
کر دیتے۔ آپ نے فرمایا میری اولاد دو حالتوں سے خالی نہیں
ہو سکتی، یا تو وہ صالحین یا مجرمین۔ اگر وہ صالح ہوں گے تو اس آیت
کے مصداق وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ اللہ تعالیٰ ان کا کارساز ہوگا
اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ضرور کارسازی کرے گا۔ لہٰذا
مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر وہ مجرمین ہوئے تو اللہ تعالیٰ
مجرمین کا مددگار نہیں ہو سکتا، لہٰذا میں بھی ان کا پشت پناہ نہیں بن
سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے "اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ"
(یونس) وہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں کرتا۔ اس نے اپنے پاک
انبیاء سے بھی فرمایا "فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ"
میں مجرموں کا مددگار کیوں بنوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی سورۃ
قصص میں یہی کہا تھا، پروردگار! میں مجرموں کا مددگار نہیں بن سکتا۔
تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی یہی جواب دیا کہ اگر میری اولاد مجرم

ہوگی، تو میں اُن کا مددگار نہیں بن سکتا۔

بے اختیار معبود

آگے مشرکین کے معبودانِ خاص کے متعلق فرمایا وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وہ تمہاری مدد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ اور نہ ہی وہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ جن کو تم مدد کے لیے پکارتے ہو، وہ سب مخلوق ہیں خواہ انبیاء ہوں یا فرشتے، عام انسان ہوں یا پتھر کے بت اور شجر ہوں یا حجر، وہ تمہاری مدد کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مافوق الاسباب مدد تو اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، لہٰذا ان معبودانِ باطلہ کو آوازیں دینا عبث ہے۔

فرمایا وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا اور اگر تم انہیں ہدایت کی طرف پکارو تو وہ تو سنتے ہی نہیں۔ درخت، پتھر وغیرہ بے جان چیزیں تو ویسے ہی حواس سے محروم ہیں اور جاندار بھی ہوں تو انہیں تو علم ہی نہیں کہ کوئی پکار رہا ہے، تو وہ کیا سنیں گے اور کیا مدد کریں گے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اطلاع دے دے تو دوسری بات ہے مگر اُن کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو درود شریف مجھ پر دور سے پڑھا جاتا ہے، وہ مجھے فرشتوں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے اور جو شخص میری قبر پر آ کر درود پڑھتا ہے میں اُس کو سنتا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ دور سے کہی گئی بات کو تو حضور علیہ السلام بھی خود بخود نہیں سنتے چہ جائیکہ کسی دوسری ہستی کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ ہماری ہر بات، ہر وقت اور ہر مقام سے سنتا ہے۔ پھر اسی زعم میں لوگ یا رسول اللہ اور یا علیؓ کے نعرے لگاتے ہیں یا پیر دستگیر امداد کن امداد کن کی آوازیں لگاتے ہیں مگر اللہ نے فرمایا کہ اگر تم انہیں پکارو تو وہ سنتے ہی نہیں۔ بعض مفسرین نے

صرف بت پرستی پر محمول کرتے ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ اس میں انسان پرستی، ملائکہ پرستی اور جنات پرستی سب شامل ہیں تاہم اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیات ان مجسموں کے متعلق ہیں جنہیں مشرکین شریک بناتے تھے اور پھر ان کی نذر و نیاز دیتے تھے۔ ایسے لوگ عرب کے علاوہ روم، یونان، مصر اور ہندوستان میں آج بھی موجود ہیں جو بتوں میں کرشمہ مانتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔

اندھے معبود اور متبعین

انہی معبودان باطلہ کے متعلق فرمایا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف تک رہے ہیں وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ حالانکہ وہ نہیں دیکھتے۔ مشرک لوگ بتوں کے تمام اعضا بناتے تھے حتیٰ کہ ان کی آنکھیں اس طرح نظر آتی تھیں گویا کہ وہ پوجا کرنے والے کو دیکھ رہے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ حقیقت میں وہ کچھ نہیں دیکھتے کیونکہ ان میں دیکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے اور اگر اس سے کافر اور مشرک مراد لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ منکرین لوگ بظاہر جسمانی آنکھوں سے تو حضور علیہ السلام کو دیکھتے ہیں۔ مگر حقیقت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اگر دل کی آنکھوں سے دیکھیں تو ضرور آپ کو پہچان لیں کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں یہ لوگ سمجھ جائیں کہ اللہ کا نبی ہمارا خیر خواہ ہے اور ہمیں خدا کے عذاب سے بچانا چاہتا ہے۔ مگر وہ حقیقت میں دیکھتے ہی نہیں، اس لیے ناکام ہیں، ابوجہل، امیہ بن خلف اور ابولہب جیسے ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود آپ کو نہ پہچان سکے اور نامراد ہوئے جبکہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھ لیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔

سلطان محمود غزنویؒ کے زمانے میں خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ بڑے

پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔ سلطان اکثر اُن کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا اور ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے دُعا کراتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواجہ ابوالحسنؒ نے فرمایا کہ جس نے بایزید بسطامیؒ کو دیکھا ہے۔ اُس پہ آتشِ دوزخ حرام ہے۔ اس پہ سلطان کو بڑا تعجب ہوا کہنے لگا حضرت! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کہ ایک طرف حضور خاتم النبیین افضل الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مبارکہ ہے جنہیں کافر بھی دیکھتے ہیں مگر اُن پہ دوزخ کی آگ حرام نہیں ہے مگر دوسری طرف آپ کے امتی بایزید بسطامیؒ ہیں کہ جنہیں دیکھنے سے دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ اس پہ خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ نے یہی آیت پڑھی "وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ" یعنی آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ آپ کی طرف تک رہے ہیں مگر درحقیقت وہ نہیں دیکھتے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار اور منافقین نے حقیقت کی آنکھوں سے آپ کو دیکھا ہی نہیں اگر ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور عبداللہ بن ابی جیسے آئمۃ الکفر آپ کو دل کی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو ضرور ایمان لے آتے اور اُن پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی۔ سورۃ حج میں اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا گیا کہ "فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ" کہ اُن لوگوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر سینوں میں رکھے ہوئے دل اندھے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے یہ حقیقت کو نہیں پہچان سکتے۔ غرضیکہ یہاں پر فرمایا کہ کفار و مشرکین آپ کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں وہ نہیں دیکھتے لہذا ایمان سے محروم ہیں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے پیغمبر! خُذِ الْعَفْوَ آپ معاف

کرنے کی عادت ڈالیں۔ کافر اور مشرک اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے بہت بگڑیں گے، الٹی سیدھی باتیں کریں گے مگر آپ درگزر ہی کرتے رہیں اور ان سے الجھیں نہیں بشرکین کی طرح کسی سے جھگڑا نہ کریں البتہ آپ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ نیکی کا حکم کرتے رہیں، تبلیغ دین کا کام برابر جاری رکھیں۔ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہیں اور کفر و شرک کی خرابیاں بیان کرتے رہیں مگر کسی کے ساتھ الجھاؤ پیدا نہ کریں البتہ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ آپ جاہلوں سے روگردانی کریں، تعرض نہ کریں اور درگزر کی عادت ڈالیں۔

امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں کہ مکارم اخلاق کے سلسلے میں قرآن پاک میں سب سے جامع آیت یہ ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ معاف اور درگزر کرنے کی عادت ڈالیں اور مخالفین سے الجھیں نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں بھی آتا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نہ فاحش تھے اور نہ بہ تکلف فحش بات کرتے تھے، اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے۔ بلکہ "فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا" (البقرہ) کے مصداق آپ معاف فرماتے اور درگزر فرماتے۔ بہرحال حضور علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ ان لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں کو خاطر میں نہ لائیں بلکہ درگزر اور معافی کی پالیسی اپنائیں، البتہ انہیں نیکی کا حکم کرتے رہیں اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کریں۔

وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُۥ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٠٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ﴿٢٠١﴾ وَإِخْوَٰنُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ﴿٢٠٢﴾ وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِـَٔايَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾

ترجمہ :- اور اگر اچانک تجھ کو شیطان کی طرف سے چھیڑ چھاڑ، پس آپ اللہ کے ساتھ پناہ مانگیں، بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۰۰﴾ بیشک وہ لوگ جو ڈرتے ہیں جب کو پہنچتا ہے اُن کو خیال شیطان کی طرف سے، وہ یاد کرتے ہیں، پس اچانک وہ بصیرت (سمجھ) والے ہوتے ہیں ﴿۲۰۱﴾ اور اُن کے بھائی (شیاطین) کھینچتے ہیں اُن کو گمراہی میں، پھر وہ کوتاہی نہیں کرتے ﴿۲۰۲﴾ اور جب آپ نہ لائیں اُن کے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں، کیوں نہیں چُن کر لایا تو اس نشانی کو۔ اے پیغمبر! آپ کہ دیجئے، بیشک میں پیروی کرتا ہوں اُس بات کی جو وحی کی جاتی میری طرف

میرے پروردگار کی جانب سے یہ (قرآن کی باتیں) بصیرت
کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور یہ ہدایت ہے
اور رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو مومن ہیں (۲۰۳)

ربطِ آیات

پہلے اللہ تعالیٰ نے شرک کرنے والوں کا رد کیا اور پھر اسی سلسلے میں مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی۔ ظاہر ہے کہ جب مشرکین کے کمزور دلائل کو رد کیا جائے گا تو وہ لاجواب ہو کر اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئیں گے اور بیہودہ باتیں کرنے لگیں گے، جاہلوں کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب وہ دلائل کا سامنا کرنے سے عاجز آجاتے ہیں تو دنگا فساد اور گالی گلوچ پر اُتر آتے ہیں۔ ایسی حرکات کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو فرمایا خُذِ الْعَفْوَ کہ آپ درگزر کرنے اور معاف کرنے کی عادت ڈالیں البتہ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ نیکی کی تلقین کرتے رہیں اور توحید کے دلائل دیتے رہیں گویا اللہ تعالیٰ نے مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کے مکارمِ اخلاق کے سلسلے میں آتا ہے کہ لا یجزی السیئۃ بالسیئۃ آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ آپ معاف کر دیتے تھے اور درگزر فرماتے تھے پہلی کتابوں میں بھی حضور علیہ السلام کی تعریف میں آیا ہے کہ آپ بازاروں میں شور و شر کرنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ آپ فحش باتیں کرنے والے ہیں۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا خواہ کتنی بھی بڑی تکلیف پہنچی۔ البتہ اگر کوئی شخص دین اور شریعت کے خلاف کرتا یا کسی دوسرے پر ظلم و زیادتی کرتا تو آپ نے مظلوم کا حق ضرور دلایا۔ آپ نے شریعت کی حدود کو توڑنے والے کو بھی معاف نہیں کیا، مگر یہ آپ کے مکارمِ اخلاق کی انتہا تھی کہ عمر بھر کسی سے اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیا۔

شیطان کے شر سے پناہ

حضور علیہ السلام کے مکارمِ اخلاق کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو شیطانی چھیڑ چھاڑ کا علاج بھی بتلایا۔ ارشاد ہوتا ہے وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ اور اگر ابھارے تجھے شیطان کی طرف سے کوئی چھیڑ چھاڑ یعنی اگر شیطان برائی کے لیے

آپ کے دل میں وسوسہ اندازی کرے تو اس کا علاج یہ ہے فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ کہ آپ اللہ کے ساتھ پناہ مانگیں، وہ آپ کی حفاظت کریگا۔ کیونکہ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ وہ سُننے والا اور جاننے والا ہے وہ تمہاری ہر بات کو سنتا ہے اور تمہاری ہر ضرورت سے واقف ہے لہٰذا شیطان کی وسوسہ اندازی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا چاہیئے مسند احمد کی روایت میں آتا ہے ان للشیطٰن لمۃ یابن آدم یعنی ابن آدم کے ساتھ شیطان کی ضرور چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے، وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ جب کوئی شخص نیکی کے راستے پر جانا چاہتا ہے تو شیطان اس کے راستے میں آکر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے دل میں بُرے خیال ڈال کر اُسے راستے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے عام لوگوں کو بھی شیطان کے بُرے عزائم سے آگاہ فرمادیا حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی شر پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایعاد بالشر و تکذیب بالحق یہ حق کی تکذیب اور برائی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ فرمایا وَاِنَّ لِلْمَلَکِ لمۃ اللہ کے فرشتے بھی انسان کے دل میں خیالات ڈالتے ہیں جو کہ نیکی اور سچائی پر مبنی ہوتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے کہ جب کوئی شخص اپنی طبیعت میں برائی محسوس کرے تو اس وقت اُسے اللہ کی پناہ میں آنا چاہیئے اور بُرے خیالات کو شیطان کی چھیڑ خانی سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر انسان کے دل میں اچھے خیالات وارد ہوں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے، کیونکہ اچھی باتیں اللہ کے فرشتے دل میں ڈالتے ہیں۔

بہرحال فرمایا کہ اگر شیطان کی طرف سے کوئی اُبھار ہو تو اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیئے۔ حضور علیہ السلام نے استعاذہ کے لیے کئی ایک

کلمات کی تعلیم دی ہے جیسے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝ " (المؤمنون) اے اللہ! میں شیطانوں کے وسوسے اور ان کی حاضری سے پناہ مانگتا ہوں۔

ذکر الٰہی بطور قاعدہ

حضور علیہ السلام سے شیطانی وساوس کے متعلق خطاب کے بعد اللہ تعالیٰ نے عام اہل ایمان کو بھی شیطان کے وسوسے سے بچنے کی ترکیب بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ بیشک وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے خوف سے ڈرتے ہیں جب کہ پہنچتا ہے انہیں خیال شیطان کی طرف سے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تقویٰ کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے۔

"تقویٰ محافظت بر حدود شرع است"[1]

یعنی شریعت کی حدود کی حفاظت کرنا تقویٰ ہے۔ کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی اور برائی سے بچنا تقویٰ کی تعریف میں آتا ہے۔ اس دنیا میں سنبھل کر چلنا کہ کہیں دامن برائی کے کانٹوں میں نہ الجھ جائے۔ یہی تقویٰ ہے۔ طائف کا لفظی معنی چکر مارنے والا ہے اور مراد خیال اور وسوسہ ہے۔ خواب کے دوران جو خیالات آتے ہیں ان کو بھی طائف کہتے ہیں تو فرمایا کہ بیشک وہ لوگ کہ جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پہنچتا ہے تَذَکَّرُوْا تو یاد کرتے ہیں یعنی ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں اور خبردار ہو جاتے ہیں فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ پس وہ اچانک صاحب بصیرت یعنی سمجھدار ہو جاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ دل میں خوفِ خدا رکھنے والے لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ جب ان کے خیالات پر شیطان کا حملہ ہوتا ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرنے کے لیے اس کے ذکر میں مصروف ہو جاتے ہیں اور اس طرح وہ شیطان

[1] الطاف القدس مترجم ص۹۳ (فیاض)

سے بچنے کے لیے ذکر کے قلعہ میں قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ سوتے وقت جب انسان کے جسم کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں تو شیطان اس کی ناک پہ آ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہاں سے آدمی کے قلب میں پھونکیں مارتا ہے۔ پھر سونے والا اگر رات کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہے تو خنّاس الشیطٰن شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اس کی وسوسہ اندازی مؤثر نہیں ہوتی۔ اور اگر سونے والے شخص نے سونے سے پہلے اللہ کا ذکر نہیں کیا یعنی نماز بھی ادا نہیں کی۔ وہ سوتا رہا حتیٰ کہ فجر طلوع ہو گئی، پھر سورج نکل آتا ہے اور سونے والا سویا رہتا ہے تو پھر شیطان اس کے کان میں پیشاب کر کے چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں کیونکہ میں نے اس شخص کو رات بھر خدا تعالیٰ کے ذکر سے غافل رکھا۔ بہرحال فرمایا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی کا علاج اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

شیطان کے بھائی

فرمایا وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَىِّ شیاطین کے بھائی لوگوں کو گمراہی کی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ شیطان کے بھائی ہمیشہ گمراہ لوگ ہی ہوتے ہیں جو دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ یہاں پر اخ کا لفظ آیا ہے جس سے نسبی بھائی مراد ہوتا ہے۔ تاہم تمام لوگ چونکہ ایک ہی سلسلہ انسانی سے منسلک ہیں اس لیے سارے ایک دوسرے کے بھائی ہیں بعض لوگ دینی طور پر ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں جیسے سورۃ حجرات میں آتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تو گویا جس طرح مومن نیکی اور ایمان میں اکٹھے ہو کر بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح گمراہ لوگ گمراہی میں اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں اور پھر وہ سارے

شیطان کے بھائی بن جاتے ہیں کیونکہ سب سے بڑا گمراہ وہی ہے۔ فضول خرچی کرنے والوں کو بھی شیطان کا بھائی کہا گیا ہے "اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ" (بنی اسرائیل) کیونکہ اسراف شیطانی فعل ہے چنانچہ ایسے لوگوں کو شیطان گمراہی کی طرف کھینچتے رہتے ہیں ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ پھر وہ اس معاملہ میں کوتاہی بھی نہیں کرتے بلکہ برائی سے روکنے میں ہمیشہ، ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں اور گمراہی کی طرف لانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ سورۂ زخرف میں بھی آتا ہے کہ جو شخص اللہ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے "نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ" ہم اس پر شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور پھر وہ عمر بھر اسے گمراہی میں مبتلا رکھتا ہے حتیٰ کہ موت کے وقت کف افسوس ملتا ہوا شیطان سے کہتا ہے "یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ" (الزخرف) کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہوتا، میں نے تیری بات کیوں مانی، تو بہت برا ساتھی ہے مگر اس وقت کا افسوس کرنا کسی کام نہ آئے گا۔ غرضیکہ شیطان انسان کو ہمیشہ گمراہی کی طرف لگائے رکھتے ہیں۔

انقطاع وحی پر اعتراض

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ایک اعتراض کا ذکر کیا ہے جو وہ انقطاع وحی کے موقع پر کرتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ جب آپ نہ لائیں ان کے پاس کوئی نشانی قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا تو کہتے ہیں کیوں نہیں چھانٹ کر لایا تو اس کو۔ یہاں پر مفسرین نے آیت کے دونوں معنی بیان کیے ہیں یعنی قرآنی آیت اور معجزہ۔ اگر قرآن کی آیت مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب کبھی کبھی روز یا کئی کئی ماہ تک سلسلہ وحی کا

سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا تو مشرکین بیہودہ اعتراضات کرتے تھے بعض
ظالم کہتے تھے قد ترکک الشیطن یعنی شیطان نے تجھے چھوڑ
دیا ہے (العیاذ باللہ) اب وہ تجھے کچھ نہیں سکھاتا۔ اور بعض یہ بھی
کہتے تھے کہ اگر تیرے پاس وحی آنا بند ہو گیا ہے تو تو اپنی طرف
سے قرآن بنا کر سنا دیا کر، کافر کہتے تھے اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز
نہیں اتاری تو خود ہی بنا کر لے آئیں، اس قسم کا طعن کرتے تھے۔

اور اگر آیت سے معجزہ مراد لیا جائے تو بھی درست ہے کیونکہ
مشرکین حضور علیہ السلام سے اپنی مرضی کے معجزات طلب کرتے تھے
اور پھر ملے نہ پاکر طرح طرح کے بیہودہ اعتراضات کرتے تھے۔ اور
کہتے کہ آپ مطلوبہ نشانی کیوں نہیں پیش کرتے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ
مشرکوں کی طرف سے طلب کردہ معجزہ ظاہر فرما دیتے تھے جیسے شق القمر
والا معجزہ مشہور ہے یا اللہ نے صالح علیہ السلام کے لیے اونٹنی کا معجزہ
ظاہر فرما دیا مگر بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے نزدیک معجزے کا ظاہر
کرنا مناسب نہیں ہوتا تھا، لہٰذا کفار کی فرمائش پوری نہیں ہوتی تھی۔
سورۃ بنی اسرائیل میں مذکور ہے کہ مشرکین حضور علیہ السلام سے کہتے تھے
کہ آپ کے لیے کھجور اور انگور کا باغ ہو۔ جس میں چشمے بہتے
ہوں، یا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے، یا خدا تعالیٰ اور فرشتوں کو
ہمارے سامنے لے آ۔ یا تمہارے لیے سونے کا گھر ہونا چاہیئے، یا
ہمارے سامنے آسمان سے کتاب نازل کرے تو پھر ہم ایمان لائیں
گے، تو فرمایا جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے۔ تو
کہتے ہیں کہ آپ چن کر کیوں نہیں لے آتے۔

اتباع وحی کا عزم

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ اعتراض کا جواب اس طرح دیا قُلْ
إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي لے پیغمبر! آپ کہہ

دیں کہ میں تو اتباع کرتا ہوں اس چیز کا جو میری طرف وحی کی جاتی ہے میرے پروردگار کی طرف سے۔ آپ کی مطلوبہ نشانیاں پیش کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے جب چاہے کوئی نشانی ظاہر فرمادے۔ اس معاملہ میں اللہ کا قانون ہے وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (المؤمن) اللہ کے کسی رسول کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی یا معجزہ ظاہر کردے، نشانی کا ظاہر کرنا تو اللہ کا فعل ہوتا ہے جو وہ اپنے نبی کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے اسی طرح کرامت بھی کسی ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی بلکہ جب اللہ کی مصلحت میں اس کا ظاہر ہونا ضروری ہوتا ہے، تو اللہ ایسا کر دیتا ہے لوگ ولی کا ذاتی فعل سمجھ کر شرک میں مبتلا ہوتے ہیں حالانکہ یہ ان کا ذاتی فعل نہیں ہوتا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر اللہ نے احیائے موتیٰ کا معجزہ ظاہر کیا تو عیسائی اسے عیسیٰ علیہ السلام کا ذاتی فعل سمجھ کر ہی مبتلائے شرک ہوگئے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا کہ آپ کہہ دیں کہ میں تو وحی الٰہی کا اتباع کرتا ہوں، آپ کی فرمائشیں پوری کرنا میرا کام نہیں ہے۔

فرمایا هَٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ یہ قرآن پاک بصیرت جس کی آیات لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے یہ تو تمہارے پروردگار کی طرف کی آیات سے بصیرت کی باتیں ہیں۔ بصارت آنکھوں کی روشنی کو کہتے ہیں اور بصیرت سے دل کی روشنی مراد ہے۔ تو فرمایا اس قرآن پاک کے مطالعہ سے دل میں نور ایمان اور نور توحید پیدا ہوتا ہے۔ نبی کی رسالت معاد اور تمام حقائق دینیہ سمجھ میں آتے ہیں اور انسان کا دل منور

ہو جاتا ہے۔ تمام شکوک و شبہات ختم ہو جاتے ہیں اور انسان صراط مستقیم پہ گامزن ہو جاتا ہے۔ سورۃ یوسف میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہی میرا راستہ ہے جس کی طرف میں تم کو دعوت دیتا ہوں۔ "عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ" میں بھی بصیرت پہ ہوں اور میرے متبعین بھی۔ صحیح معنوں میں صاحب بصیرت وہی ہوگا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا متبع ہوگا اور جسے تمام حقائق دینیہ پہ پختہ یقین ہوگا۔ تردد تو جہالت، نفاق اور معاصی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جب کہ قرآن پاک دل میں نور ایمان پیدا کرتا ہے اور یہ اہل ایمان کے لیے بصیرت ہے۔

ہدایت اور روشنی

فرمایا قرآن پاک بصیرت کے علاوہ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ہدایت اور رحمت بھی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پہ تین چیزیں بیان کی گئی ہیں یعنی بصیرت، ہدایت اور رحمت۔ اور ان کا مصداق بھی تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو لوگ توحید، رسالت یا معاد کو مشاہدے کی طرح دیکھتے ہیں یعنی وہ تمام دلائل قدرت کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے تو ان لوگوں کے لیے یہ قرآن پاک بصیرت ہے۔ اس کے بعد ایسے لوگ جو ان سے کم درجے کے ہوتے ہیں اور جو کسی چیز کو عقلی یا نقلی دلائل کے ساتھ سمجھتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں ایسے لوگ صفت ہدایت کے مصداق ہدایت یافتہ کہلاتے ہیں۔ فرمایا تیسرے درجے میں عام اہل ایمان لوگوں کے لیے یہ قرآن حکیم باعث رحمت ہے۔ وہ اپنی توجہ اس کی طرف رکھتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی چادر ان پہ ڈال دیتا ہے۔

بصیرت تو بلند تر درجے کی بات ہے۔ قرآن پاک میں ہدایت کے ساتھ بینات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں یہودیوں کے متعلق آتا ہے کہ وہ لوگ جو چھپاتے ہیں جو ہم نے نازل کیا "مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى" بینات اور ہدایت سے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ بینات واضح باتوں کو کہتے ہیں جو ہر آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے، البتہ ہدیٰ کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے، جب معلم کوئی مسئلہ سمجھاتا ہے تو پھر سمجھ میں آتا ہے۔ غرضیکہ فرمایا یہ قرآن پاک بصیرت، ہدایت اور رحمت ہے۔ بصیرت کے ذریعے اعلیٰ درجے کی روشنی اور ہدایت نصیب ہوتی ہے اور پھر جو آدمی ہدایت اختیار کر لیتا ہے وہ رحمتِ الٰہی کا مستحق بھی ہو جاتا ہے۔ تو جو شخص قرآن پر ایمان لایا، اس کے حقائق کو سمجھا اور پھر اس پر عمل پیرا ہو گیا تو اللہ کی رحمت اس کے شاملِ حال ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ دنیا میں بھی سرخرو ہو گا، برزخ میں بھی کامیاب ہو گا اور پھر آخرت میں دائمی فلاح پا جائے گا اس لیے فرمایا کہ یہ بصیرت، ہدایت اور رحمت ہے لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ان لوگوں کے لیے جو ایمان دار ہیں۔ اور جو ایمان نہیں لائے یعنی کافروں، مشرکوں اور منافقوں کے لیے یہ قرآن اندھا پن اور تاریکی کا باعث بنے۔

قال الملاء ۹ — الاعراف ۷
درس شصت وسہ ۶۳ — آیت ۲۰۴

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۲۰۴﴾

ترجمہ :- اور جب قرآن کریم پڑھا جائے ، پس کان لگا کر سنو اس کو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۲۰۴﴾

ربط آیات

گذشتہ دروس میں قرآن کریم کے نزول اور اس کے فضائل کا ذکر تھا نیز مشرکین کے جاہلانہ اعتراضات کے جواب میں حکم ہوا کہ آپ مکارم اخلاق کو لازم پکڑیں ۔ اور اُن کی باتوں سے متاثر نہ ہوں ، بلکہ درگذر کرنے اور معاف کرنے کی عادت ڈالیں ، فرمایا امر بالمعروف کا فریضہ ادا کرتے رہیں اور جاہلوں سے نہ الجھیں ، اگر کسی وقت شیطان کی طرف سے چھیڑ چھاڑ اور وسوسہ اندازی ہو تو فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ یعنی اللہ کی پناہ میں آجائیں ۔ پھر ایمان والوں کے متعلق فرمایا کہ جب انہیں شیطان کی طرف سے وسوسہ آتا ہے تو وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں ایسے لوگ صاحب بصیرت ہوتے ہیں اور شیطان کے پھندے میں نہیں آتے ۔ البتہ شیطان کے راستہ پر چلنے والے اس کے بھائی ہوتے ہیں اور وہ انہیں ہمیشہ گمراہ کرتا رہتا ہے ۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی کے معجزات طلب کرنے والوں کا رد فرمایا ۔ انقطاع وحی کے زمانہ میں مشرکین طعن کرتے تھے کہ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں آتی تو آپ اپنی طرف سے قرآن بنا کر لے آئیں ، دراصل وہ قرآن کو خدا تعالیٰ کا کلام ہی نہیں سمجھتے تھے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ السلام سے فرمایا ، آپ کہہ دیں کہ میں تو وحی الٰہی کا متبع ہوں ، نہ تو میں خود قرآن بنا سکتا ہوں ، اور نہ معجزات لانا میرے اختیار میں ہے ۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حیثیت کو بھی واضح کیا اور

فرمایا کہ قرآن پاک بصیرت یعنی سوجھ بوجھ کی باتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ماننے والوں کے دلوں میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ دل میں یقین پیدا ہوتا ہے۔ یہ قرآن ہدایت کا سامان مہیا کرتا ہے اور اہل ایمان کے لیے باعث رحمت ہے۔

آداب قرآن

اب آج کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے آداب بیان کیے ہیں اور اس سے مستفید ہونے کا طریقہ بتلایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ جب قرآن پاک پڑھا جائے فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ تو اس کو کان لگا کر سنو وَاَنْصِتُوْا اور خاموش ہو لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ قرآن کریم ایک عظیم کتاب اور منبع رشد و ہدایت ہے، لہٰذا جب یہ پڑھی جائے تو اس کو غور سے سننا چاہیے اور بالکل خاموشی اختیار کر لی جائے، یہ ایسی بابرکت کتاب ہے کہ اس کا منکر بھی اسے توجہ سے سنے گا تو امید ہے کہ وہ بھی ایمان لے آئیگا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے باعث ہدایت اور رحمت بنایا ہے۔ اور جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لیے تو بدرجہ اولیٰ لازم ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت شور شر نہ کریں، کوئی جھگڑا تنازعہ برپا نہ کریں بلکہ اسے خاموشی کے ساتھ سنیں۔ سورۃ حٰم السجدہ میں کفار کا یہ قول بھی بیان کیا گیا ہے لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ کہ جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اس کو مت سنو بلکہ شور و غوغا کرو تاکہ تمہیں غلبہ حاصل ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تلاوت قرآن کے وقت خوب کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ اللہ کی رحمت تمہارے شامل حال ہو۔

نماز میں کلام کی ممانعت

مفسرین کرام اس آیت کا شان نزول یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس سے پہلے مسلمان نماز کے دوران کلام بھی کر لیتے تھے۔ ایک دوسرے

ل تفسیر ابن جریر طبری ص۱۰۳ ج۹ و ابن کثیر ص۲۸۱ ج۲ (فیاض)

سے کوئی بات پوچھنا ہوتی تو پوچھ لیتے مثلاً رکعتوں کی تعداد دریافت کر لیتے یا باہر سے آنے والا سلام کہتا تو اس کا جواب دیتے۔ ترمذی شریف کی روایت[1] میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہو گئی فنهينا عن السلام والكلام تو ہمیں نماز کے دوران سلام کرنے یا کوئی دیگر کلام کرنے سے روک دیا گیا۔ سورۃ البقرہ کی آیت وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا یعنی اللہ کے دربار میں عاجزی اور خاموشی اختیار کرتے ہوئے کھڑے ہو۔ اور نماز کو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرو۔

فروعی اختلافات

چونکہ نماز میں قرآن پاک کی تلاوت لازمی ہے، اس لیے فقہائے کرام نے اس آیت کا اطلاق نماز پر بھی کیا ہے تاہم محدثین اور فقہائے کرام کا بعض فروعی مسائل میں اختلاف ہے، اس قسم کے اختلافات صحابہ کرامؓ میں بھی پائے گئے ہیں اور ان کی ممانعت نہیں کیونکہ یہ اختلاف کسی اصول میں نہیں ہوتے بلکہ کسی ایسی فرع میں ہوتے ہیں جہاں اختلاف کی فی الواقع گنجائش موجود ہو۔ دلائل کو سمجھنے میں اختلاف کا پیدا ہونا ایک فطری بات ہے اور اس ضمن میں قوی دلائل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا نماز کی عمومی حیثیت میں تو کسی صحابی یا اہل حق فقیہ کا اختلاف نہیں ہے تاہم اس کی کیفیت اور بعض جزئیات میں اختلاف ضرور موجود ہے۔ حنفی شافعی، مالکی اور ظاہری مسالک انہی اختلافات پر مبنی ہیں۔ ہر مسلک کا پیروکار اپنے اپنے مسلک کے مطابق نماز ادا کرتا ہے مگر دوسرے کو کسی بات پر مجبور نہیں کرتا۔ اس کے باوجود بعض لوگ تشدد سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے مسلک کو ہی حرف آخر سمجھ کر دوسروں پر گمراہی کا فتویٰ لگاتے ہیں حالانکہ ایسا کرنا بذات خود گمراہی ہے۔ دلائل کے ساتھ اختلاف رائے اچھی بات ہے مگر اس میں تشدد کا

[1] ترمذی صـ۹۲ ج۱ (فیاض)

پہلو نمایاں نہیں ہونا چاہیئے۔

اس بات پر تمام فقہائے کرام متفق ہیں کہ صدقہ و خیرات کا ثواب مرنے والے کو پہنچتا ہے لیکن نماز کے ثواب پہنچنے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نماز کا ثواب بھی پہنچتا ہے جب کہ بعض دوسرے اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ چونکہ اس مسئلہ میں کوئی صحیح حدیث نہیں پہنچی اس لیے اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح تلاوت قرآن پاک کے ایصال ثواب کا مسئلہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ مرنے والے کو ثواب پہنچتا ہے جب کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ قرآن مجید پڑھنے کا ثواب مرنے والے کو نہیں پہنچتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ صدقہ خیرات، دعا اور استغفار کا فائدہ تو مُردے کو ہوتا ہے۔ مگر تلاوت قرآن کا فائدہ تلاوت کرنے والے کو ہی ہوتا ہے۔ کسی دوسرے کو ایصالِ ثواب نہیں ہوتا۔ اس قسم کے اختلافات مختلف دلائل کی بناء پر ہوتے ہیں۔

قرأت فاتحہ میں اختلاف

فقہائے کرام کا اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ نماز میں سورۃ فاتحہ متعین ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، امام سفیان ثوری اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ متعین نہیں ہے۔ اور قرآن کا کوئی بھی حصہ نماز میں پڑھ لیا جائے تو فرض ادا ہو جاتا ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کی تاکید آئی ہے، لہٰذا اس کا پڑھنا وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ اور واجب کے ترک سے نماز میں نقصان آتا ہے۔ بالکل باطل نہیں ہوتی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی فَهِيَ خِدَاجٌ غَيْرُ تَمَامٍ[1] ایسی نماز ناقص ہے، لہٰذا سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ اس مسئلہ میں سورۃ مزمل کی آیت "فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ

[1] مسلم ص ۱۶۹/ج ۱ و ابو داؤد ص ۱۱۹/ج ۱ و ابن حبان ج ۱/۲۰۶ و ابو عوانہ ص ۱۲۶/ج ۲ (فیاض)

الْقُرْاٰنِ کا حوالہ بھی دیتے ہیں کہ قرآن پاک کا جو حصہ بھی میسر ہو، پڑھ لو۔ ایک لمبی آیت یا تین چھوٹی آیات کی تلاوت ادائیگی فرض کے لیے کافی ہوگی۔ یہ کوئی بھی آیات ہو سکتی ہیں، سورۃ فاتحہ ضروری نہیں۔ تاہم جیسا کہ پہلے عرض کیا حدیث میں تاکید کی بنا پر سورۃ فاتحہ کا وجوب کا درجہ حاصل ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ دوسری سورۃ کا ملانا بھی واجب ہے کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِقِرَاءَۃٍ یعنی قرأت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَءْ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فَصَاعِدًا یعنی اُس شخص کی نماز نہیں جس نے ام القرآن (سورۃ فاتحہ) اور کچھ زیادہ حصہ قرآن نہیں پڑھا۔ تاہم امام بخاریؒ نے فَصَاعِدًا کا لفظ نقل نہیں کیا۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ دوسری سورۃ ملانا دونوں واجب ہیں مگر فاتحہ رکن نہیں ہے کہ اس کے بغیر نماز بالکل باطل ہی ہو جاتی ہو۔ البتہ مطلق قرأت فرض ہے۔ اگر قرأت بالکل ترک کی جائے تو نماز نہیں ہوگی اور اگر واجب ترک ہو جائے تو سجدہ سہو کرنے سے تلافی ہو جائیگی۔ مثلاً اگر کوئی شخص فرائض یعنی قیام، رکوع، سجود یا قعدہ قدرت کے باوجود ترک کر دے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اسی طرح مطلقاً قرأت کے ترک سے بھی نماز باطل ہوگی۔

نمازی کی تین حالتیں

کوئی نمازی تین حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو وہ منفرد ہوتا ہے یا امام ہوتا ہے اور یا مقتدی۔ ہر حالت کے الگ الگ احکام ہیں اور ان کو آپس میں خلط ملط کر کے اکٹھا دیا جاتا ہے، جو کہ کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔ امامت کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[1] ہے کہ اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ یعنی امام پوری جماعت کا ضامن ہوتا ہے

[1] ابو داؤد صفحہ ۸۳ و ترمذی صفحہ ۲۸ (فیاض)

اس لیے اُسے نہایت احتیاط کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیئے تاکہ مقتدیوں کی نماز خراب نہ ہوں اور ساتھ اقتدا کی نیت بھی کرنی چاہیئے۔

جو شخص انفرادی طور پر نماز ادا کرتا ہے وہ ثنا کے بعد سورۃ فاتحہ بھی پڑھے گا اور اس کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ بھی ملائیگا۔ پھر فرائض اور نوافل کی قرأت میں بھی فرق ہے۔ سنن اور نوافل میں چاروں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ ملانا ضروری ہے۔ وتر کی تیسری رکعت میں بھی ایسا ہی کریگا، البتہ فرائض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں فاتحہ کے بعد کوئی دوسری سورۃ ملانا ضروری نہیں، بلکہ صرف سورۃ فاتحہ پڑھنا ہی سنت ہے اگر فاتحہ بھی نہ پڑھے، صرف تسبیح کرے یا خاموش کھڑا رہے تب بھی نماز ہوجائے گی۔ امام کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ فرائض کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ بھی ملائیگا ورنہ سب کی نماز باطل ہوگی۔ امام احمدؒ اپنی کتاب الصلوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ میں نے کم و بیش ایک سو مسجدوں میں نماز ادا کی اور لوگوں کو نماز میں کوتاہی کرتے پایا چنانچہ میں نے یہ کتاب لکھی، اگر امام پورے شرائط کے ساتھ نماز پڑھائے گا تو اُسے جملہ نمازیوں کے برابر ثواب ملیگا، لہٰذا امامت میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ رب العزت سے دعا کی کہ مولا کریم! ہمارے اماموں کو ہدایت عطا فرما۔ مؤذنین کے لیے بھی بروقت اذان کہنے کی دعا کی بے وقت اذان سے نماز میں خلل واقع ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پہ اگر نماز فجر کی اذان طلوع فجر سے پندرہ منٹ پہلے دیدی جائے اور اس دوران کسی شخص نے سنتیں ادا کیں تو وہ ادا نہیں ہوں گی۔

فاتحہ خلف امام

تیسری حالت مقتدی کی ہے اور اس کے لیے الگ احکام ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ ہر مقام اور محل کے الگ

الگ آداب ہیں۔ مقتدی شخص تکبیر و تحمید تو کہیگا مگر قرأت نہیں کریگا بلکہ قرأت صرف امام کریگا اور مقتدی اسے سنیں گے۔ بشرطیکہ امام کا میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے۔ مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ یعنی امام کی قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے، لہٰذا مقتدی کو قرأت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اس کے علاوہ آج کی آیت بھی اس بات کی تائید کر رہی ہے کہ جب قرآن پاک پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔

اس پہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سورۃ اعراف مکی ہے جب کہ نماز باجماعت کے احکام زیادہ تر مدنی زندگی میں نازل ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض مکی سورتوں میں مدنی آیات بھی شامل ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہی ہو۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ قرآن پاک بغور سننے کا حکم عام ہے اور اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے لہٰذا اسے نماز پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ بعض احکام ایسے ہیں کہ ان کا اجمالی ذکر مکی زندگی میں ہوا مگر تفصیلات مدنی زندگی میں جا کر نازل ہوئیں۔ مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم مکی سورۃ مزمل میں موجود ہے وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ مگر اس کا نصاب اور دیگر تفصیلات مدینہ طیبہ میں ۲ھ میں مقرر ہوا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس آیت کو مدنی بھی تسلیم کیا جائے، تب بھی یہ نماز ہی کے متعلق ہے اور اس کا حکم خطبہ جمعہ پہ بھی عائد ہوتا ہے کہ اس کا سننا بھی ضروری ہے جیسا کہ احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں پہلی بات یہ ہے کہ جب نماز میں قرأت بلند آواز سے ہو رہی ہو تو فَاسْتَمِعُوا لَهُ اس کو کان لگا کر سنو۔

له طحاوی ج۱ ص۱۵۹ و مصنف ابن ابی شیبہ ص۳۷۷ ج۱ و ابن ماجہ ص۶۱ و مسند احمد ج۳ ص۳۳۹ ۳۷۰ و کتاب القراۃ للبیہقی ص۱۲۸ (فیاض)

اور جب قرأت بالسر ہو رہی ہو یا مقتدی تک امام کی قرأت کی آواز نہ پہنچ رہی ہو تو ایسی صورت میں فَانْصِتُوْا کا حکم ہے یعنی خاموش رہو۔ اسی لیے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نماز جہری ہو یا سری مقتدی کو بہر حالت میں خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ اُسے خود قرأت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ امام کی قرأت اس کے لیئے کافی ہے۔

اس سلسلے میں بہت سی صحیح احادیث بھی موجود ہیں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات[1] مسلم شریف، سنن اربعہ (ابن ماجہ، ترمذی، ابو داؤد اور نسائی) مسند احمد وغیرہ میں موجود ہیں۔ اِذَا كَبَّرَ الْإِمَامُ فَكَبِّرُوْا جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔ پھر جب امام وَلَا الضَّالِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کی اکثریت امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے سے منع کرتی ہے، البتہ بعض اکا دکا صحابی اس کے حق میں ہیں ان میں محمود ابن ربیعؓ ہیں جو چھوٹی عمر کے صحابی ہیں اور عبادہ بن صامتؓ انصار مدینہ میں سے ہیں مسلم شریف میں زید بن ثابتؓ سے روایت[2] ہے لَا قِرَاءَةَ مَعَ الْإِمَامِ فِيْ شَيْءٍ یعنی امام کے ساتھ قرأت کا حکم نہیں ہے حضرت جابرؓ سے موطا امام مالک میں روایت[3] ہے کہ جس نماز میں فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے اِلَّا وَرَاءَ الْإِمَامِ ماسوائے اس کے کہ کوئی شخص امام کے پیچھے نماز ادا کر رہا ہو۔

امام ترمذیؒ سے ہی یہ روایت[4] بھی نقل کی جاتی ہے لَا صَلٰوةَ إِلَّا بِقِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ یعنی فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام ابو حنیفہؒ اس حدیث کو مطلق قرأت پر محمول کرتے ہیں اور فاتحہ کو واجب کا درجہ دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ

[1] ابن ماجہ ص۶۱ و دارقطنی ص۳۳۰ ج۱ و نسائی ص۱۴۸ ج۱ و صحیح مسلم ص۱۷۴ ج۱ [2] مسلم ص۲۱۵ ج۱ [3] موطا امام مالک ص۲۸ و ترمذی [4] ترمذی ص۵۷ ج۱ (فیاض)

نے حدیث کے الفاظ اس طرح نقل کیے ہیں لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتٰبِ یعنی سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی مگر آپ نے اس کے ساتھ فَصَاعِدًا کا لفظ چھوڑ دیا ہے حالانکہ امام مسلمؒ نے اسے نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ ملانا بھی ضروری ہے مگر فاتحہ کو ضروری قرار دینے والے لوگ دوسری سورۃ کو ضروری قرار نہیں دیتے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ صحیح مسلک یہی ہے کہ مقتدی سورۃ فاتحہ نہ پڑھے۔ دلیل کے اعتبار سے فاتحہ خلف امام کمزور ہے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ موطا کی فارسی شرح مصفا میں لکھتے ہیں "قرأت فاتحہ با امام در صحابہ شائع نہ بود" یعنی امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا صحابہ کرام میں مشہور نہیں تھا کوئی اکا دکا ہی پڑھتا ہوگا۔ ان میں سے عبادہ بن صامتؓ اور کم عمر صحابی محمود ابن ربیعؓ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے

امام ترمذیؒ نے اس مسئلہ میں کافی بحث کی ہے اور فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ مَنْ لَّمْ یَقْرَاْ فَصَلٰوتُہٗ جَائِزَۃٌ یعنی جس آدمی نے امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز صحیح ہے البتہ بعض نے تشدد کیا ہے جن میں امام ترمذیؒ کے استاد امام بخاریؒ اور چوتھی صدی کے محدث امام بیہقیؒ ہیں، یہ سورۃ فاتحہ کو نماز کا رکن قرار دیتے ہیں جس کے بغیر نماز باطل ہوتی ہے۔ تاہم جو دلائل پیش کیے ہیں۔ وہ کمزور ہیں۔ امام بخاریؒ نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے مگر دلائل قوی نہیں ہیں۔ باقی آئمہ فاتحہ نہ پڑھنے کے حق میں ہیں اور ان کے دلائل بھی قوی ہیں۔ ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ جہری نماز میں جب امام کی قرأت سنائی دے رہی ہو تو مقتدی قرأت نہ کرے، اور سری نماز میں مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے یعنی نہ تو فرض ہے اور نہ واجب

لہ ترمذی صفحہ ۱۷ (فیاض)

اور نہ ہی اس کے ترک سے گناہ لازم آتا ہے۔ بہرحال آئمہ اربعہ میں سے
کوئی بھی فاتحہ خلف الامام کو لازمی نہیں سمجھتا۔

امام شافعیؒ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ فاتحہ کو فرض قرار دیتے
تھے مگر یہ بات درست ثابت نہیں ہوسکی۔ قیام عراق کے دوران آپ
یہ فتویٰ دیتے تھے مگر آپ کی کتاب الام جلد ہفتم میں یہ مسئلہ موجود ہے
کہ اگر امام قرأت بالجہر کر رہا ہو تو مقتدی کے لیے فاتحہ پڑھنے کا حکم نہیں
ہے۔ البتہ اگر قرأت بالسر ہو رہی ہو تو مقتدی بھی پڑھ سکتا ہے۔ آپ
نے کتاب الام اپنی عمر کے آخری چار سالوں میں قیام مصر کے دوران
لکھی اور وہیں فوت ہوئے اور وہیں آپ کی قبر ہے مطلب یہ کہ امام شافعیؒ
کا آخری مسلک بھی یہی ہے کہ وہ سورۃ فاتحہ کی فرضیت کے قائل نہیں ہیں

نماز میں جھگڑا

مسلم شریف میں روایت[1] موجود ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
نماز پڑھائی ایک شخص نے پیچھے پڑھنا شروع کر دیا۔ نماز ختم ہوئی تو حضور نے
فرمایا مالی انازع القرآن کیا بات ہے میرے ساتھ قرآن میں جھگڑا
کیا جارہا ہے۔ فرمایا امام کے پیچھے مت پڑھا کرو۔ چنانچہ امام زہریؒ فرماتے
ہیں فانتھی الناس پس لوگ جہری نماز میں امام کے پیچھے پڑھنے
سے رک گئے۔ امام ابوحنیفہؒ امام سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ اور ان
کے شاگردوں کا بھی یہی مسلک ہے۔ ہدایہ میں امام محمدؒ کی طرف یہ بات
منسوب کی گئی ہے کہ آپ سری نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے
کے قائل تھے مگر یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ ان کی اپنی کتاب
میں مذکور ہے کہ میں اور میرے استاد اس بات کے قائل ہیں کہ نماز
سری ہو یا جہری مقتدی کے لیے قرأت کرنا جائز نہیں ہے۔

حاصل کلام

حاصل کلام یہ ہوا کہ ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی فاتحہ خلف الامام
کی فرضیت کا قائل نہیں ہے۔ جمہور صحابہؓ اور امام شاہ ولی اللہؒ کا

[1] مسلم ص — ومؤطا امام مالک ص ۲۹ ونسائی ص [illegible] وابوداؤد ص ۱۲۰ (فیاض)

بھی یہی مسلک ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، خلفائے راشدینؓ، ابوسعید خدریؓ، زید بن ثابتؓ، جابر بن عبداللہ وغیرہم عدم قرأت کے قائل ہیں، بہرحال اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف کمزور نہیں ہے۔ لوگ غلط پراپیگنڈا کرتے ہیں کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں اور جس کی نماز نہیں وہ جہنمی ہے ان لوگوں کے دلائل کمزور ہیں۔ صرف دو اماموں نے تشدد کیا ہے اور امام بخاریؒ کے شاگرد بھی کہتے ہیں کہ ہمارے امام متشدد ہیں۔ احناف اس مسئلہ میں اپنا موقف پیش کرتے ہیں اور کسی سے جھگڑا نہیں کرتے اور نہ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ فاتحہ خلف الامام پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی لہٰذا دوسرے لوگوں کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ فاتحہ نہ پڑھنے والوں پر فتویٰ لگائیں کہ ان کی نماز نہیں ہوتی۔ اس کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ پر ہے فروعی مسائل میں اپنی اپنی رائے ہے اور پھر اس کے پیچھے دلائل ہیں، جو کسی پر نماز نہ ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے وہ گمراہ ہوگا یا متشدد ہوگا، اور تشدد درست نہیں ہے۔ مضبوط موقف کو اختیار کرنا چاہیئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ تشدد نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر تشدد کریگا۔

سورۃ فاتحہ کے متعلق بہت سی تفصیلات ہیں۔ میں نے چند باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ قوی مسلک یہی ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیئے اور جو پڑھتا ہے اس کے ساتھ لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال اس آیت کریمہ کا حکم یہی ہے کہ جب قرآن پاک پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدة

ترجمہ:۔ اور یاد کریں آپ اپنے رب کو اپنے جی میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور بلند آواز سے کم، صبح کے وقت اور پچھلے پہر اور نہ ہوں آپ غافلوں میں سے ﴿۲۰۵﴾ بیشک وہ لوگ جو تیرے پروردگار کے پاس ہیں، وہ نہیں تکبر کرتے اس کی عبادت سے اور وہ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کے لیے سجدہ ریز ہوتے ہیں ﴿۲۰۶﴾

سجدہ تلاوت

سورۃ اعراف کی یہ آخری آیتیں ہیں اور بالکل آخری آیت سجدے والی آیت ہے قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں کل چودہ مقامات پر سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے جن میں سے پہلا مقام یہ ہے۔ یہ سجدہ ہر پڑھنے والے اور سننے والے پر لازم آتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک سجدہ تلاوت واجب ہے جب کہ باقی ائمہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ جس وقت کوئی شخص تلاوت کرے یا سنے تو اس وقت سجدہ کر لے مگر فی الفور کرنا ضروری بھی نہیں، بلکہ بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ سجدہ تلاوت کے بھی وہی شرائط ہیں جو سجدہ نماز کے ہیں۔ اس کے لیے بھی جگہ، جسم اور کپڑے کی پاکیزگی ضروری

ہے، قبلہ رُو ہونا بھی لازم ہے ورنہ سجدہ ادا نہیں ہوگا۔ جس طرح نماز کیلئے
وضو کی ضرورت ہے، اسی طرح سجدہ تلاوت کے لیے بھی طہارت
ضروری ہے۔ اس ضمن میں مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ سجدہ تلاوت
کے لیے جمہور انہی شرائط کے قائل ہیں جو نماز کی شرطیں ہیں مگر ان شرائط
کے لیے انہیں کوئی دلیل نہیں ملی چنانچہ انہوں نے بعض آثار سے یہ
رائے قائم کی ہے کہ اس سجدہ کے لیے باوضو ہونا، یا قبلہ رُو ہونا یا زمین
پر سر رکھنا ضروری نہیں ہے اُن کی یہ تحقیق درست نہیں ہے، اُن
کی تفسیر میں اس طرح کی اور بھی اغلاط پائی گئی ہیں مثلاً رمضان میں اختتام
سحری کے متعلق اُن کی تحقیق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور
اذان کی آواز آجائے تو فوراً چھوڑ نہ دے بلکہ اپنی حاجت پر کھا لے
ملا علی قاری شرح نقایہ میں لکھتے ہیں کہ یہ شاذ قول ہے بعض لوگوں
نے ایسا کیا ہے مگر غلط ہے صحیح مسئلہ یہ ہے کہ جب طلوع فجر کا یقین
ہو جائے تو سحری کھانا بند کر دینی چاہیے۔

ذکر الٰہی کے آداب

گزشتہ درس میں قرآن پاک کے آداب بیان ہوئے تھے کہ جب
اس کی تلاوت ہو رہی ہو تو اس کو بغور سنو اور خاموش رہو تاکہ اللہ تعالیٰ
کی مہربانی تمہارے شامل حال ہو۔ اب آج کے درس میں ذکر الٰہی کے
آداب کا بیان ہے ارشاد ہوتا ہے وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ
یاد کریں آپ اپنے پروردگار کو اپنے جی میں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ
اس جملے کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ آپ یاد کریں اور دوسروں کو
بھی حکم دیں کہ ہر شخص ایسا ہی کرے۔ نیز تمام امتیوں کو بھی اس بات
کا حکم دے دیں اور خود بھی اس بات پر عمل کریں۔ اور یاد کس طرح کریں
تَضَرُّعًا عاجزی کے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے، اور دوسری بات
وَخِيفَةً یعنی خدا کے جلال سے ڈرتے ہوئے، پھر تیسرے نمبر پہ

وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ یعنی بلند آواز سے کم

یہاں پر ذکر سے مراد زبانی ذکر ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جاتی ہے، قرآن پاک کی تلاوت کی جاتی ہے۔ نماز پڑھی جاتی ہے اور دوسرے اذکار کیے جاتے ہیں۔ زبانی ذکر کے سلسلے میں سورۃ بنی اسرائیل میں آتا ہے وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا آپ نماز نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھیں اور نہ بہت آہستہ بلکہ درمیانی راستہ اختیار کریں۔
حدیث شریف میں آتا ہے کہ مکی زندگی میں حضور علیہ السلام کفار کی موجودگی میں بطریق احسن نماز ایسی جگہ ادا کرتے تھے جہاں کفار کا ہجوم نہ ہو کیونکہ کفار قرآن پاک کی بلند آواز سے تلاوت برداشت نہیں کرتے تھے اور اس میں خلل ڈالتے تھے، اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت نہ کریں مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اتنا آہستہ بھی قرآن نہ پڑھیں کہ آپ کے ساتھی بھی نہ سن سکیں، لہٰذا ان دونوں حالتوں کا درمیانی راستہ اختیار کریں۔

لسانی ذکر کے بارے میں قانون یہ ہے کہ ذکر بالجہر اور ذکر بالسر دونوں درست ہیں مگر فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ذکر بالجہر اس وقت روا ہوگا جب کہ دوسروں کے لیے باعث اذیت نہ ہو۔ اگر کوئی آدمی پاس سویا ہوا ہو، کوئی شخص بیمار ہے یا کوئی مطالعہ میں مصروف ہے تو ذکر بالجہر مکروہ ہو جاتا ہے۔ البتہ جہاں کسی دوسرے شخص کے معمولات میں نقص نہ آتا ہو، وہاں ذکر بالجہر درست ہوگا۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ ذکر بالجہر اشاعت قرآن و دین کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ رات کی نمازوں میں قرآن پاک بلند آواز سے پڑھا جاتا ہے جب کہ دن کی نمازوں میں آہستہ پڑھنے کا حکم ہے

مطلق تلاوت ہے۔ قرآن بالجہر کا مقصد یہ ہے کہ لوگ قرآن پاک سیکھیں اور آہستہ
پڑھنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان کا تعلق حظیرۃ القدس اور ملاء اعلیٰ
کے ساتھ قائم رہے اور اس طرح عالم بالا کے فرشتوں کے ساتھ اس
کا اتصال رہے۔ خود انسان کی توجہ بھی ملاء اعلیٰ کی طرف لگی رہے اور یہ
بھی اس پاک جماعت میں شامل رہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص
نماز میں سورۃ فاتحہ کے اختتام پر آمین کہتا ہے یا امام کے ساتھ
سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہتا ہے اور پھر اس کی تحمید
اور آمین فرشتوں کے ساتھ موافق ہوگئی تو وہ مغفور ہوگا۔ گویا فرشتوں
کے ساتھ شریک ہونا ملاء اعلیٰ کی جماعت میں شریک ہونا ہے
اور یہ مقصد ذکر بالسر سے حاصل ہوتا ہے۔

نفسی یعنی قلبی ذکر

امام ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ذکر نفسی بھی ہوتا ہے
جو کہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کی قدرت اور دلائل قدرت
میں غور و فکر کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ غور و فکر ایسی عبادت ہے
جس میں ریا کا کچھ دخل نہیں ہوسکتا۔ اگر غور و فکر کرے گا تو اس کے دل
میں اللہ تعالیٰ کی پہچان، اس کی عظمت اور بڑائی بیٹھے گی۔ امام صاحب
فرماتے ہیں کہ نفسی ذکر کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اپنے قلب
روح یا لطائف کے ساتھ خدا تعالیٰ کا ذکر کرے۔ نفسی ذکر سانس کے ذریعے
بھی ہوتا ہے چنانچہ اصحاب طریقت ذکر میں پاس انفاس کی بھی تلقین
کرتے ہیں۔ چنانچہ سانس کے ذریعے ذکر کے لیے ایسی مشق کی جاتی
ہے کہ ہر اندر جانے اور باہر آنے والے ...... سانس کے ساتھ
خدا تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی انسان سو رہا ہو تب بھی سانس
کے ذریعے اس کا ذکر جاری رہتا ہے۔

قلبی ذکر کی مشق کرنے سے آتا ہے۔ یہ اگرچہ نہ محسوس ہوتا ہے

اور نہ کوئی دوسرا شخص جان سکتا ہے مگر قلبی ذکر ہمیشہ جاری رہتا ہے اور انسان کا قلب ہر وقت اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ حدیث شریف میں قلبی ذکر کی فضیلت میں آتا ہے کہ حشر کے دن اس کا مرتبہ زبانی ذکر سے ستر گنا زیادہ ہوگا۔ کیونکہ ظاہری ذکر میں تو ریا کا شبہ بھی ہو سکتا ہے مگر قلبی ذکر ریا سے بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ زیادہ افضل ہے۔ قلبی، روحی اور سری اذکار انسان کے لطائف کو بیدار کرتے ہیں اور وہ کبھی فکر خداوندی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ ایسا ذکر عام آدمی کے بس میں نہیں ہے بلکہ اسے سلوک اور تصوف سے تعلق رکھنے والے ہی انجام دے سکتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت[1] میں آتا ہے کہ کان رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے تو بعض بزرگان دین اسے قلبی ذکر پر ہی محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ زبانی ذکر تو بول براز یا مباشرت کے دوران معطل ہو جاتا ہے مگر قلبی ذکر ہر حالت میں جاری رہتا ہے۔ بہرحال ذکر کی ایک صورت یہ بھی ہے۔

باعث تکلیف ذکر

ہمارے ملک میں ذکر کا جو طریقہ رائج ہے یا صلوٰۃ وسلام جس طرح پڑھا جاتا ہے، یہ مکروہات میں داخل ہے۔ وقت بے وقت لاؤڈ سپیکر پر تلاوت، نعت خوانی یا درود وسلام پڑھا جاتا ہے۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ اس سے دوسروں کو کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ کسی بیمار کو تکلیف ہوگی، طالبعلم کے مطالعہ میں خلل واقع ہوگا یا گھر میں کوئی نماز، تلاوت یا تسبیح میں مصروف ہے مگر ادھر چیخ و پکار جاری ہے۔ منع کریں تو الٹا الزام لگتا ہے کہ ذکر سے روکتے ہیں۔ اخبارات میں اس کے خلاف آواز اٹھتی ہے مگر کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں حکومت

[1] ابوداؤد ص۲ ج۱ (فیاض)

بھی بے لبس ہے، اگر کسی کو سختی سے منع کیا جائے تو بدنامی ہوتی ہے،
اللہ کا ذکر ہے، اس کو کیسے بند کریں، حالانکہ یہ غلط بات ہے جو
چیز دوسروں کے لیے اذیت کا باعث ہے وہ مکروہ تحریمی کے
درجے میں آتی ہے۔ غرضیکہ بعض عوارض کی وجہ سے ذکر بالجہر بعض اوقات
مکروہ ہوتا ہے۔ پچھلی سورۃ میں بھی گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر عاجزی
کے ساتھ اور آہستہ کرنا بہتر ہے کیونکہ اس میں ریاکاری بھی نہیں ہوتی اور
کسی کو تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ ایسا ذکر اجر کے لحاظ سے بھی بہتر ہوگا کیونکہ
حضور علیہ السلام کا فرمان ہے خَیْرُ الرِّزْقِ مَا یَکْفِیْ وَخَیْرُ الذِّکْرِ
مَا خَفِیَ یعنی بہتر روزی وہ ہے جو انسان کے لیے کفایت کر جائے
اور بہتر ذکر وہ ہے جو آہستہ طریقے سے ہو۔ بعض بزرگان دین اپنے
اپنے سلسلے کے مطابق ابتدا میں ذکر بالجہر کرتے ہیں، یہ دل کی قساوت
کو دور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جسم میں حرارت
پیدا ہو۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت
مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ارشاد کے مطابق میں مکہ اور مدینہ
میں جب ذکر کرتا تھا، تو جسم میں حرکت و حرارت پیدا ہوتی تھی اور
میں باہر چلا جاتا تھا اور جھاڑیوں میں بیٹھ کر ذکر کیا کرتا تھا تاکہ یہ سلسلہ
بھی قائم رہے اور دوسرے لوگوں کے لیے باعث اذیت بھی نہ
ہو۔ غرضیکہ ذکر بالسر بہر طور احسن ہے۔

صبح و شام ذکر

تین باتیں پہلے بیان ہو چکی ہیں کہ اپنے رب کا ذکر کرو عاجزی
کے ساتھ، ڈرتے ہوئے اور بلند آواز سے کم تاکہ ریا پیدا نہ ہو اور
نہ کسی کے لیے تکلیف کا باعث ہو اور اب چوتھی بات یہ فرمائی
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ صبح بھی اور پچھلے پہر بھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ
غدو سے مراد طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک کا وقت ہے

مگر صحیح قول یہ ہے کہ اس کا وقت طلوع فجر سے لے کر زوال شمس
تک ہے، جہاں تک اصال یعنی پچھلے پہر کا تعلق ہے، بعض فرماتے
ہیں کہ یہ وقت عصر سے مغرب تک کا ہے مگر صحیح بات یہ ہے
کہ زوال کے بعد سے لیکر رات کے آنے تک کا وقت مراد ہے
دوسرے مقام پر زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ یعنی رات کی گھڑیوں کے
الفاظ آتے ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ اپنے رب کو یاد کرو صبح کے وقت
بھی اور پچھلے پہر بھی۔ اور مطلب یہ ہے کہ ذکر پر ہمیشہ مداومت
اختیار کرلی جانی چاہیئے۔ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ اور غافلوں
میں نہیں ہونا چاہیئے۔

غفلت کا معنی پردہ پڑ جانا ہے، انسان کے دل پر جہالت
اور معصیت کا پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کا اتصال ملاء اعلیٰ کے ساتھ
قائم نہیں رہتا، اس لیے فرمایا کہ آپ غافلوں میں سے نہ ہوں بلکہ
ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا چاہیئے، حدیث شریف میں آتا
ہے کہ یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ سے بعید چیزوں میں سے بعید
قلب غافل ہے۔ جب انسان غافل ہو جاتا ہے تو اس کا دل
سخت ہو جاتا ہے اور اس پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے، لہٰذا اس سے
بچنے کے لیے اللہ کا ذکر کرنا چاہیئے۔ اس کی اطاعت پر کاربند
ہونا چاہیئے۔ نماز پڑھیں، تلاوت قرآن کریں، تسبیح واستغفار کریں،
تاکہ غفلت کے پردے دور ہو جائیں۔ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ
حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جہاں تک ممکن ہو اللہ کا کچھ نہ کچھ ذکر ضرور
کرو تاکہ غفلت سے بچ جاؤ۔ نماز تو بہرحال فرض ہے اس کے
علاوہ دیگر اذکار کے لیے بھی کچھ وقت نکالنا چاہیئے۔

فرشتوں کی تسبیح اور سجدہ

فرمایا إِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ وہ جو تیرے رب کے پاس

ہیں یعنی ملاء اعلیٰ اور دوسرے فرشتے ہیں لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے۔ فرشتے اگرچہ پاک اور مقدس ہیں، گناہوں سے مبرّا ہیں مگر پھر بھی اللہ کی عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں انسان تو خطا کار ہیں، اس لیے انہیں اس طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ فرمایا ایک تو فرشتے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وَیُسَبِّحُوْنَہٗ وہ ہر وقت اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔ تسبیح کا معنی خدا تعالیٰ کی تنزیہہ ہے۔ جب کوئی شخص سبحان اللہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب، کمزوری اور نقص سے پاک ہے یہ بہت بلند کلمہ ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے لیے یہ چار کلمات منتخب فرمائے ہیں یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ بلاشبہ اللہ ہی بڑا ہے اسی لیے سورۃ مدثر میں حکم ہے وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ یعنی اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کریں۔ اور اس کا ذکر کیا کریں۔

فرمایا اللہ کے فرشتے ایک تو تسبیح بیان کرتے ہیں اور دوسرے وَلَہٗ یَسْجُدُوْنَ اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ سجدہ بھی بہت بڑی عبادت ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ سجدہ کی حالت میں انسان اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے سجدہ میں انتہائی درجے کی عاجزی پائی جاتی ہے اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ انسان جس قدر عاجزی کا اظہار کرے گا اتنا ہی مقرب الٰہی ہوگا۔ سورۃ العلق میں ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ یعنی سجدہ کر کے قرب الٰہی حاصل کرو۔ سجدہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ سجدہ نماز

کے لیے بھی ہوتا ہے۔ سجدہ تلاوت بھی ہے اور عطائے نعمت
پر سجدہ شکر بھی ادا کیا جاتا ہے سجدے میں چونکہ تسبیح بھی کی جاتی ہے
سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى لہٰذا اس میں سجدہ اور تسبیح دونوں چیزیں
آجاتی ہیں۔ اسی لیے یہ تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ صحیح حدیث میں
آتا ہے کہ جب کوئی انسان سجدہ کرتا ہے تو شیطان اپنے سر پر خاک ڈالتا
ہے اور افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ انسان کو سجدے کا حکم ہوا تو اس نے
تعمیل حکم کی مگر مجھے سجدہ کا حکم ہوا تو میں انکار کر کے مردود ٹھہرا۔ شیطان کا
یہ افسوس اس کے حسد کی بنا پر ہوتا ہے کیونکہ وہ اب توبہ تو کرنا نہیں
چاہتا۔ انسان کو سجدہ ریز دیکھ کر اس میں حسد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے
کہ یہ کیوں اللہ کے سامنے پیشانی کو رگڑ رہا ہے، کیونکہ وہ تو چاہتا ہے
کہ ہر انسان اللہ کا باغی بن کر اس کی جماعت میں شامل ہو جائے، تو
فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اللہ کی عبادت کرنے سے تکبر نہیں
کرتے، اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں
اس کی پاکی بیان کریں اور سجدہ کے ذریعے اس کا تقرب حاصل کریں۔

خلاصہ سورۃ

سورۃ کے آخر میں اس کا خلاصہ بیان ہو گیا ہے۔ یہ مکی سورۃ ہے
اس میں عقائد صحیحہ توحید، رسالت، قیامت، عظمت قرآن آ گئے ہیں
تاریخ رسالت اور توحید اس سورۃ کے مرکزی مضامین ہیں چونکہ توحید
ایک بنیادی مسئلہ ہے اس لیے توحید فی العبادت اور توحید فی الاستعانت
کو مکمل طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت، اس کا
ذکر اور تسبیح و تہلیل سورۃ کا لب لباب ہے۔ اللہ تعالیٰ
کی تحمید و تسبیح کرنا فرشتوں اور انسانوں کا مشترکہ فرض
ہے۔ اگر انسان فلاح و فوز کے طالب ہیں۔ تو انہیں
اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق برقرار رکھنا چاہیے اور اس

کا طریقہ وہی ہے جو اس سورۃ میں خاص طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب الیہ
المرجع والمآب وصلی اللہ
تعالیٰ علی رسولہ محمد
والہ واصحابہ وازواجہ
واتباعہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین

مقالات سواتی

افادات۔ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی مدظلہ العالی

مرتب۔ حاجی محمد فیاض خان سواتی مہتمم مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ

اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل اکتیس علمی و تحقیقی مضامین کو ترتیب دیا گیا ہے۔

(۱) توحید کے چند دلائل (۲) اللہ رب العزت کی زیارت کیسے ہوگی (۳) حضور ﷺ کی شریعت کے مقاصد (۴) خواب میں رسول ﷺ کی زیارت (۵) مقام صحابہ ؓ (۶) حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی چند وصیتیں (۷) حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ (۸) حصول علم کے لئے ضروری آداب (۹) علم اور اہل علم کا مرتبہ (۱۰) علم کی راہ میں تمام جہل ست (۱۱) دارالعلوم دیوبند (۱۲) اسلام کا نظام طہارت (۱۳) اسلام کا قانون حدود و تعزیرات (۱۴) انسانیت کی تکمیل کے لئے اخلاق اربعہ کی اہمیت (۱۵) انسانیت کے چار بنیادی اخلاق (اخلاق اربعہ) (۱۶) تمدن میں بگاڑ کے اسباب اور ان کا علاج (۱۷) فرقہ ناجیہ اور نوابت میں فرق (۱۸) مودودی صاحب کے بعض نظریات دین کے لئے نقصان دہ ہیں (۱۹) فتنے کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور انکا علاج (۲۰) بحالت صوم انجکشن کا حکم (۲۱) اسلام میں حلال و حرام کا تشریعی فلسفہ (۲۲) ملت حنیفیہ کی حقیقت (۲۳) مسئلہ توسل پر ایک نظر (۲۴) کائنات میں جانداروں کی تخلیق (۲۵) حکمت ولی اللٰہی کے شارحین (۲۶) شہروں کی آبادی اور بربادی کے اسباب (۲۷) تحقیق وحدت الوجود اور وحدت الشہود (۲۸) وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تطبیق (۲۹) مسئلہ وحدت الوجود میں راہ اعتدال (۳۰) اکابر علماء دیوبند اور مسئلہ وحدت الوجود (۳۱) باب الرؤیا (۳۹۵ صفحات

قیمت -/۹۰ روپے

معالم العرفان فی دروس القرآن

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین صاحب (ایم اے علوم اسلامیہ)

زیر انتظام

انجمن محبان اشاعت قرآن

صدر انجمن

محمد یعقوب عاجز

فنانس [illegible] ری

بابو غلام حیدر صاحب

خزانچی

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ناظم مکتبہ

محمد منیر صاحب Ph:221943

مکتبہ دروس القرآن گوجرانوالہ